مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سُورَةُ الرُّوم، سُورَةُ لُقمٰنَ،

سُورَةُ السَّجدَةِ

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سُوْرَةُ الرُّوْم، سُوْرَةُ الُقْمٰنَ، سُوْرَةُ السَّجْدَةِ

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان۔سورۃ الاحزاب۔سورۃ سبا سورۃ فاطر
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25بی 2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	نومبر 2009ء

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

مطبع	....	باقر پرنٹنگ پریس، لاہور

سرٹیفکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جو ہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق ' دل بند و راہ مصطفےؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۷۴ از۔ علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوعِ اسلام۔اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو
آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مشمولات سورۂ الروم

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: سورة الروم (آیات 1 تا 16)

روزوں کا مقصد دنیائے انسانیت میں خدا کی کبریائی
کو قائم کرنے کا ایک ذریعہ ہے
میدانِ بدر میں خدا کی کبریائی کے قیام کے لیے پہلا معرکہ
قرآنِ حکیم میں ایران اور روم کی مملکتوں کا ذکر اور ان کا تاریخی بیان
ایرانی اور بازنطینی حکومتوں کی 602 عیسوی سے
612 یا 614 عیسوی تک باہمی جنگ وجدل کی روئداد
قرآن حکیم کے نزدیک معاشرتی طور پر اہلِ کتاب
اور مشرکین میں پائے جانے والے فرق کی نوعیت
سورۃ الروم کو ان تاریخی واقعات کی روشنی میں
دیکھنا یا سمجھنا زیادہ مفید ہے
روم اور ایرانیوں کے متعلق قرآن حکیم کا بیان
جنگ بدر کے بعد خود مشرکینِ قریش کے الم انگیز ماتم کی کیفیت
قرآنِ حکیم کے غلط تراجم نے ہماری سوچ کا رخ ہی بدل دیا
ذاتِ خداوندی اگر غلبے اور قوت کی مالک ہے
تو اس میں بھی صفتِ رحیمی کا ہی ظہور ہوتا ہے
خدا تعالیٰ کے وعدہ سے مراد خدا کا غیر متبدل قانون ہوتا ہے
مستقل کامیابی کا انحصار مادی اسباب کے ساتھ ساتھ
انسان کی نفسیاتی تبدیلی پر منحصر ہوتا ہے
جب انسان کی نفسیات خدا کے قانون کی ترجمان
بن جائے تو پھر ہرمزان بھی شکست کھا جاتا ہے
دینِ اسلام میں مالِ غنیمت کی کیفیت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کردار
جیسا سربراہ حکومت ویسی ہی قوم
نصرت کا حصول کس طرح ممکن ہوتا ہے؟
جواب دہی کے عمل سے لاتعلقی کا تصور انسان کی
ابدی زندگی کے لیے پیغامِ موت ہے
قرآن تاریخ کے اوراق اور اجڑی ہوئی بستیوں کے
کھنڈرات بطور شہادت پیش کرتا ہے
اگر پانی کشتی پر غالب آجائے تو پھر وہ ڈوب جاتی ہے
جنتی اور جہنمی معاشرے کا بنیادی فرق: طبقاتی انداز سے
ناہمواریاں پیدا کرنا ہے
قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں محنت کے معاوضہ کے بجائے

اس کے ماحصل کا تصور پیش کیا ہے
خدا تعالیٰ اپنے کسی قانون کے رخ کو کسی دوسری طرف نہیں بدلتا
اقدارِ خداوندی کے تابع عالمِ انسانیت ایک تندرست
اور صالح بیج کی مانند نشوونما پاتی ہے
لفظ مجرم کا قرآنی مفہوم اور اپنی داستانِ غم
عربوں کے ہاں جنت کا تصور اور قرآنِ حکیم کا بیان
فنونِ لطیفہ میں موسیقی جیسی نعمت بھی جنت کا خاصہ ہوگی
کائناتی اشیا جو اقدارِ خداوندی کے تابع ہوں
وہ زندگی کا حسن پیش کرتی ہیں
دوسرا باب: **سورة الروم** (آیات 17 تا 24)
ہمارے ہاں قرآنی تراجم نے قرآنِ حکیم کی تعلیم کو
محدود سے محدود تر کر دیا ہے
رزق کی فراوانی سے معمور، خوف وحزن سے پاک
اور ذوقِ جمالیات سے سرشار زندگی بندۂ مومن کی میراث ہے
ذوقِ جمالیات سے لطف اندوز ہونے والی چشمِ بینا کی کیفیت
قرآن حکیم کی دفتین کے ایک ایک ورق پر ذوقِ جمالیات
کے مناظر بکھرے دیکھائی دیتے ہیں
عہد مغلیہ کے دورِ زوال نے ابھرے ہوئے
فنون لطیفہ کے خوبصورت چہرے کو مسخ کر دیا
فنونِ لطیفہ میں علامہ اقبالؒ کا مقام بدرجہ اتم بلند تھا
عیسائیت کے ہاں تمدنی وسیاسی زندگی کے لیے کوئی مستقل اقدار نہیں
ہندوؤں کے ہاں فنونِ لطیفہ کی شکل وصورت
اسلام کے برعکس سیکولرازم میں صرف مادی طور پر ہی
افادیت پہلو کو پیش نظر رکھا جاتا ہے
اہلِ مغرب کی ساری تاریخ کا نچوڑ یہ ہے کہ پھولوں میں
رنگ تو ہے مگر خوشبو نہیں ہے
قرآنِ حکیم کے نزدیک کائناتی امتزاج کا ذکرِ کثیر
زندگی کے متعلق قرآنی حقائق کی بیان کردہ علامات کو
سمجھنے کے لیے تغیرات کا سمجھنا نہایت ہی اہم ہے
تغیرات کے اس عمل میں بڑے بڑے رموز مضمر ہوتے ہیں
قرآنِ حکیم نے قوموں کی موت وحیات کے بھی
پیمانے متعین کر رکھے ہیں
قندیلِ آسمانی انسانی زندگی کے تاریک راستوں کو
منور کرنے کے لیے ہی عطا کی گئی ہے
صراطِ مستقیم ''ضآلین'' کی راہنمائی کے لیے ہی عطا ہوا تھا
انسان کی اپنی تخلیق بذاتِ خود ایک قابلِ غور امر ہے
آدم کی پسلی سے حوا کے پیدا کرنے کی یہ کہانی
تورات کی بیان کردہ ہے، قرآن کی نہیں
مرد اور عورت باہمی طور پر ایک دوسرے کے زوج ہیں
لفظ مودة کا قرآنی مفہوم
قرآنِ حکیم نے اپنی ہر وہ بات جو سمجھانی ہو، وہ اسے اپنی نشانی کہتا ہے
قوموں کی ارتقائی کیفیت کو جاننے یا ماپنے کا طریق

چودہ سو سال قبل بھی عربوں کی زبان دانی دنیا بھر میں بے مثل تھی
قرآنِ حکیم کے نزدیک لفظ علماء کی تعریف
اس کائنات کا ایک ایک ذرہ الفاظ کی شکل میں ملنے
والے قرآن کی ہی ایک تفسیر ہے
کائنات میں ہر آن ایک تغیر واقع ہو رہا ہوتا ہے
کائنات کا حسن اسی تغیر کا ہی رہینِ منت ہے
تیسرا باب: **سورۃ الروم** (آیات 25 تا 27)
مذہب اپنے تباہ کن نتائج پر غور و فکر کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتا
ذہنی سکون تو ہر مذہب کا پیروکار اپنے اپنے طریق سے حاصل کر لیتا ہے
قرآنِ حکیم دنیا کی وہ واحد کتاب ہے جو بغیر سوچے
سمجھے دن رات پڑھی جاتی ہے
دین پر عمل پیرائی کا نتیجہ تو ہمیشہ محسوس شکل میں سامنے آتا ہے
دعا کے قبول ہونے کی عملی شکل
کسان کی اگر فصل نہ اُگے تو پھر ثواب بھی نہیں ہوتا
قرآنِ حکیم کا تین چوتھائی حصہ مظاہرِ فطرت کی حقانیت پر مبنی ہے
قرآنِ حکیم کو پڑھنے کے سلسلہ میں حافظ اسلم جیراجپوریؒ
کا ایک سبق آموز طریق
قرآن فہمی کے سلسلہ میں اہلِ مغرب کے سائنسدان
ہم مسلمانوں کے بالمقابل زیادہ فعال ثابت ہوئے ہیں
ارض و سما کی وسعتوں کے پیشِ نظر اس کی ہیئت پر غور و فکر کی تاکید
اربوں کی تعداد میں پائے جانے والے کرّوں کا
باہمی ربط بڑے ہی غور و فکر کا متقاضی ہے
آسمانی کُرّوں کی طرح عربی زبان کا دامن بھی بڑا ہی وسیع ہے
امیر المومنین اور امر کے لفظ کا قرآنی مفہوم
اس کائنات میں فطرت یا نیچر کے قوانین کسی انسان
کے بنائے ہوئے ہیں ہی نہیں
کائنات کا تو ذرہ ذرہ ہر آن خدا تعالیٰ کی نظر میں مصروفِ عمل ہے
قانونِ خداوندی کی محکمیت اور باخبری کے سلسلہ میں
چاند پر جانے والوں کی مثال
Cause And Effect (علت و معلول) کی
بنیاد پر قانون کی اہمیت اور اس کو نافذ کرنے والی قوت کا وجود
زندگی کی مثال ایک جوئے رواں کی سی ہے جو موت سے آشنا نہیں
قبروں سے اُٹھ کھڑے ہونے کی حقیقت
خدا کی طرف سے آواز آنے کا مفہوم
ارض و سماوات قرآنِ حکیم کی دو اصطلاحات ہیں
ورنہ نہ کوئی چیز نیچے ہے اور نہ کوئی اوپر
قدرت نے تو فضا کے اندر پھیلے ہوئے کرّوں میں بھی
تنفس پھیلا رکھے ہیں
کائنات کو مسخر کرنے کے سلسلہ میں ہماری ذہنی
پستی کی حالتِ زار اور قرآنِ حکیم کا ارشاد
اس قدر عظیم کارگہ کائنات کو پیدا کرنے اور اسے
اس قدر خوبی سے چلانے کا مقصد کیا ہے؟

آج کے دور میں تہذیبِ مغرب کی سوچ کا ماحصل
خدا جو اس کائنات کا خالق ہے اس نے اس کو بے سود پیدا نہیں کیا
لفظ قانت کے مفہوم کے تحت انسان کی عملی زندگی
پر پڑنے والے لازوال اثرات
کائنات کا ذرہ ذرہ قانت ہونے کے باعث
اسی سنہری اصول پر کاربند ہے
وحی خداوندی کی روشنی میں انسانی معاشرے میں ایک ایسی
بہارِنو آئے گی کہ اس کا کونہ کونہ نغموں کی آواز سے
گونج اٹھے گا اور پھر فرشتے تم پر درود بھیجیں گے
خدا بھی فرشتوں کے سامنے سر اٹھا کے بات کرے گا
تخلیق کے بالمقابل خدا کا عالمِ امر ارتقا کا رہین منت نہیں ہوتا
تخلیق کے مختلف مراحل
ذاتِ خداوندی کو اس عظیم، تحیر انگیز کارگہ کائنات کو
بنانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی
قوت اور غلبے کے ساتھ حکمت کا ہونا بھی ضروری ہے
چوتھا باب: **سورۃ الروم** (آیت 30: انسانی فطرت)
علمی سطح پر صدیوں سے دنیا بھر میں فطرت کے متعلق
پائے جانے والے غلط تصور کی وضاحت
نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کردہ ایک روایت کہ
ہر بچہ فطرت پہ پیدا ہوتا ہے
خارجی کائنات میں فطرت کا مفہوم بڑا واضح، ٹھوس اور غیر متبدل ہے
فطرت کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ کسی شکل میں بدلتی ہی نہیں
انسانی فطرت کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے ایک تجربہ
انسانی فطرت کا تصور پیدا کرنے میں فلاسفروں کا کردار
ہندوستان میں انسانی فطرت کا یہ غلط تصور یونان سے آیا
اور گہرے مضمرات رکھتا ہے
انسانی فطرت کا تصور قرآنِ حکیم کی تعلیم ہی کے خلاف ہے
جہاں فطرت ہوتی ہے وہاں اختیار و ارادہ نہیں ہوتا
فطرت رکھنے والی کسی شے کی طرف کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا
انسانوں کو غلام بنانے کے تصور کے بعد نظامِ سرمایہ داری
کا حربہ اور اس کے اثرات
لفظ ''فطر'' کا قرآنی مفہوم
انسانی کاوش کا تعلق ''فطر'' سے نہیں خلق سے ہے
ذاتِ خداوندی نے خود کو احسن الخالقین تو کہا ہے
لیکن احسن الفاطرین نہیں کہا۔ کیوں؟
انسانی فطرت کے مروجہ تصور سے قرآنِ حکیم کی
ساری تعلیم بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے
انسان کی فطرت کے مطابق خدا کی فطرت کا تصور
وحی کی تعلیم کے بغیر انسان کی حالتِ زار
آج انسانی زندگی نے اپنی ارتقائی منزل کے لیے
اس مادی جسم کا سہارا حاصل کر رکھا ہے
انسان کے لیے خدا کی طرف سے ارادہ و اختیار کا عظیم تحفہ

انسان کے بالمقابل کائنات کی ہر شے کی صلاحیت محدود ہے
وحی کی روشنی کے بغیر انسانی صلاحیتوں کا استعمال سراپا جہنم کو جنم دیتا ہے
انسان کے اندر حیوانی جبلتوں کی تفصیل اور ان کے اثرات
انسان کے لیے حیوانی جبلتوں کو کنٹرول کرنے کی
خاطر وحی کے کنٹرول کی ضرورت
نوعِ انسانی کے متعلق خدا کی مشیت
خدا تعالیٰ نے انسان کے اندر فطرت نہیں رکھی، اسے
خود ہی مومن یا کافر بننا ہوتا ہے
انسان کے لیے شرفِ انسانیت کا معیار
انسانوں کی دنیا میں جنگ وجدل کی وجہ جواز
خیر وشر کے تصور کی حقیقت اور انسان کے نزدیک اس کا مختلف تصور
انسانی جذبات کی مختلف شاخیں
تصوف کی دنیا میں انسانی جذبات کی تحقیر
پانچواں باب: **سورة الروم** (آیات 28 تا 32)
لفظ 'قائم' کا قرآنی مفہوم: اس طرح کھڑے ہو جانا کہ
اس میں کسی قسم کی لڑکھڑاہٹ پیدا نہ ہو
کائنات کے اندر قدم قدم پر بکھری ہوئی نشانیاں دعوتِ غور وفکر دیتی ہیں
یہ ارض وسما قانونِ خداوندی کے تابع ایک پروگرام کی
تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل ہیں
دورِ جہالت میں انسانی سوچ کی کیفیت
مذہبی پیشوائیت کی سیاست وملوکیت کے ساتھ
گٹھ جوڑ کی داستان روزِ اول سے چلی آ رہی ہے
مملکت اسلامیہ کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کی ایک گہری سازش
خدا تعالیٰ کی ذات قادر بھی ہے اور قدیر بھی
صرف خدا کی ذات ہی اقتدار کا سرچشمہ ہے
لہٰذا کوئی اور ظل اللہ علی الارض نہیں ہے
ارتقا کے مرحلہ میں انسانیت کی دنیا کا ایک جہانِ نو کی طرف سفر کا آغاز
انسان کی موجودہ ہیئت کروڑ در کروڑ،
ارب در ارب سال کی رہینِ منت ہے
زندگی بھر کے لیے بچے کی تربیت کا ایک اہم سنہری اصول:
اس کے سامنے متبادل راستہ کھلا رکھو
بچہ ہو یا کوئی قوم، یہ اس وقت سرکش ہوتی ہے
جب اس کے سامنے کوئی متبادل راستہ نہیں ہوتا
لفظ ھویٰ کا قرآنی مفہوم
وحی انسانی جذبات کے استعمال کا طریق وضع کرتی ہے
خدا کی ذات اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کرتی
فطرت اللہ کا اور دین قیم کا مفہوم
دینِ قیم کے برعکس ہمارے ہاں تقلید پرستی کا
مروجہ اسلام جو صدیوں سے رائج ہے
دینِ قیم پر پوری اترنے والی قوم کی نظریں ہمیشہ اپنے
آشیانہ پر ہوتی ہیں: امتِ مسلمہ کا مقام اقبالؒ کی نظر میں
وہی صلوٰۃ جو ہماری اجتماعیت کا نشاں تھا آج فرقہ پرستی

کا نشان بن چکا ہے
نظامِ صلوٰۃ کے لیے سَبَّح کا قرآنی مفہوم ایک
بنیادی حیثیت کا حامل ہے
کائنات کی کوئی شے بھی خدا کے قانون سے
سرتابی اختیار نہیں کرتی یعنی وہ مشرک نہیں
مشرک وہ ہیں جو امتِ واحدہ کے تصور کے
برعکس فرقہ واریت کے پیروکار بن جائیں
دنیا کے تمام جانور اپنی اپنی نوع میں امتِ واحدہ ہیں
فرقوں کا وجود مختلف فقہوں کا رہینِ منت ہے
یہ فقہ بندی مملکتِ خداوندی میں بغاوت کے مترادف ہے
آخر فرقہ واریت کے اس شرک کو مٹانے کا کیوں خیال پیدا نہیں ہوتا؟
فرقہ واریت کی اس مہلک بیماری سے نجات حاصل کرنے کا طریق
فرقہ پیدا کرنا خدا کے ساتھ بغاوت ہے
شرک تو کسی ایک جگہ رہتا ہی نہیں
بٹالہ شہر میں مذہبی مناظراتی ماحول اور ذاتی تحقیق وتجسس کا نتیجہ: پرویزؒ
انسانی سوچ کی نشوونما کے لیے غور وفکر کی آبیاری کرنا ضروری ہے
جھوٹے اور سچے کو پرکھنے کے لیے ایک معیار کا ہونا ضروری ہے
قرآنِ حکیم کو اپنا امام تسلیم کیے بغیر فرقے ختم نہیں ہو سکتے
خدائے رحمٰن کی تخلیق کردہ کائنات میں اختلاف تو کیا
اس میں تو کہیں دراڑ نہیں، درز بھی نہیں
انسان کی نگاہ اس کارخانہ قدرت میں کہیں
کوئی کمزوری یا کمی محسوس نہیں کر سکے گی

چھٹا باب: **سورۃ الروم** (آیات 33 تا 39)

نوعِ انسانی کے لیے دینِ خداوندی خارجی کائنات
کی مانند متناسب بھی ہے اور محکم بھی
مادی کائنات کا ایک ایک ذرہ انسانی زندگی کی
ارتقائی منزل کی شہادت ہے
خدا تعالیٰ نے انسان کو فطرت کی قید سے آزاد
کرتے ہوئے اختیار وارادہ کی نعمت سے نوازا ہے
خارجی کائنات نے سکون اپنے ہاں خود ساختہ
فقہی نظام سے آزادی حاصل کر رکھی ہے
لفظ ''ابتلا'' کا قرآنی مفہوم
خواہ کوئی قوم ہو یا کوئی Species (انواع) ہوں،
آگے وہی بڑھتی ہے جس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہو
انسانی سوچ کی کم ظرفی
انسان ضرورت سے زیادہ جو کچھ چھپاتا ہے
اس کی سند قرآنِ حکیم میں نہیں ملتی
خدا تعالیٰ اپنے احکام خود ہی تحریر کرتا ہے،
کوئی انسان اسے تحریر نہیں کر کے دیتا
نظامِ ربوبیت کے خدوخال اور اس کا عملی طریق تو پھر یہ بھوک کیوں؟
تمام مصائب انسان کے اپنے پیدا کردہ ہیں،
خدا کی طرف سے تو شر نہیں آیا

قرآنِ حکیم کا نظامِ حیات اجتماعیت کی شکل میں نافذ ہوتا ہے
جب خدا کے نظام میں ناہمواری کے لیے
انسان کا ہاتھ دخل انداز ہوتا ہے
شروع شروع میں خرابیوں کی وجوہات اکثر نظروں سے اوجھل رہتی ہیں
برائی کے ذرائع کو فوری طور پر متعین شکل میں
سامنے لانے کی ضرورت ہوتی ہے
قصہ ابلیس وآدم کو ایک تمثیلی انداز میں بیان کرنے کا مقصد اور مدعا
آج کی سائیکولوجی کے تحت قصہ ابلیس وآدم کو دیکھنا
نہایت ہی ضروری ہے
مایوسی کا نتیجہ ہمیشہ سرکشی کی شکل میں نکلتا ہے
نوجوان نسل کے مایوس ہونے کی وجہ
اسلامی نظام کے نفاذ پر 11 فروری 1979ء کو
صدر ضیاء الحق کا انٹرویو
سب سے بڑی مایوسی یہ ہے کہ انسان
قانونِ خداوندی سے ہی مایوس ہو جائے
جو قانون اپنے اندر سدا بہار پھولوں کی مہک لیے
ہوئے ہو اس سے مایوسی کیسی اور کیوں؟
انسان کی بربادی کی اصل وجہ اپنی ذات کا انکار ہے
رزق کے معاملے میں قرآن حکیم کی آیات کا غلط ترجمہ اور تفاسیر
خدا کی طرف سے عطا کردہ نظامِ ربوبیت کے خدوخال
نظامِ ربوبیت کے تمام پہلو انسان کی نفسیاتی تبدیلی پر
اثر انداز ہوتے ہیں
مسکین کا قرآنی مفہوم
قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کی ابتدا' اس کی انتہا کا پیش خیمہ ہے
قرآنِ حکیم کے اصولوں کی پیروی کی مثال کھیتی کی مانند ہے
نظامِ ربوبیت کا ایک اہم جز
دو لفظوں میں قرآن حکیم کا معاشی نظام
''نہ ضرورت سے زیادہ' نہ ضرورت سے کم''
زکوٰۃ کا اڑھائی فی صد کا تصور قرآنی تعلیم قل العفو کے بالکل برعکس ہے
ربوٰ نظامِ سرمایہ داری کا حصہ ہی نہیں بلکہ اس کی بنیاد ہے
قرآنِ حکیم اور فقہ کے معاشی نظام کی پیدا کردہ
ذہنوں میں بنیادی فرق کا ظہور
ربوٰ جیسے بغاوتی معاشی نظام کے خلاف خدا' رسولؐ کا اعلانِ جنگ
مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ربوٰ کے مفہوم کو الجھا
دینے کی ایک فریب انگیز کوشش
سود کے متعلق قرآنِ مبین کی واضح Definition (تعریف)
بلاسود بنکاری کے سلسلہ میں مودودیؒ کا جاری کردہ فتویٰ
سود کے عذاب سے بچنے کے لیے کتاب الحیل ملاحظہ فرمائیں
کتاب الحیل کی چند ایک مثالیں
ساتواں باب: **سورة الروم** (آیات 40 تا 47)
ربوٰ کی بنیاد پر قائم کردہ معاشی نظام' قرآنی نظام کے
خلاف اعلانِ جنگ متصور ہوگا

ہم راکٹ کا پرزہ سائیکل کے اندر لگانے کی
بے سود کوشش میں مصروف ہیں
فقیہ کے بیان کردہ فارمولے کے مطابق
اس حرام سُودی کاروبار کو حلال کرنے کا طریق
ہم نے اسلام کو دنیا بھر کی نظروں میں مذاق بنا دیا ہے
خدا کی ذات کے علاوہ قانون سازی کا حق تو کسی نبی کو بھی حاصل نہیں
قرآنِ حکیم کی تعلیم قرآنی معاشرت کے لیے ہوتی ہیں
انسان کی سب سے زیادہ ذلت اور رسوائی معیشت کی بنا پر ہی ہوتی ہے
انسان کی انسانیت قرآنِ حکیم کے معاشی نظام سے ہی وابستہ ہے
مذہبی سوچ نے دین اور دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے
دین خداوندی کی عطا کردہ بنیادوں کے بغیر
مذہبی سوچ کا محل کھڑا کرنے کی ناکام کوشش
محنت کے بغیر حاصل کردہ دولت خداداد انسانی
صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتی ہے
Investers ہوں یا Business Men
یا Industrialists، اگر ان کی جیب خالی کر دی جائے
تو یہ ایک وقت کی روٹی کمانے سے عاجز دکھائی دیں گے
ربوٰ کے نظام کا ماحصل ہمیشہ دولت اور صلاحیتوں کی
کمی کی شکل میں ظاہر ہوا ہے
مروجہ تراجم نے قرآن کے معاشی نظام کی اصطلاحات کو بدل کر رکھ دیا
اگر ربوٰ کا کتا پانی میں ہی رہے تو زکوٰۃ کے
اڑھائی ڈول نکالنے کا کیا مقصد؟
مذہب کے معاشی نظام کو قرآن کا معاشی نظام سمجھتے ہوئے
اہلِ مغرب کی تنقید
ہر فرد کی معاشی ذمہ داری مملکت کو پوری کرنا ہوں گی
قوموں کے اندر کمانے کی استطاعت کیونکر کمزور پڑتی ہے
بھوک کا خوف ختم ہونے پر انسانی صلاحیتیں کہیں زیادہ نشو و نما پاتی ہیں
جو قوم اپنا رشتہ قرآنی نظام سے وابستہ رکھے
تو اس کی خزاؤں میں بھی بہار کا عنصر پوشیدہ ہوتا ہے
رحمِ مادر میں ایک جرثومے سے انسانی جسم کی
تکمیل اور اس کی پرورش کا حیرت انگیز کرشمہ
پیدائش سے پہلے رحمِ مادر میں کوئی بچہ بھوک سے نہیں مرتا
حیوانی اور انسانی زندگی میں ایک بنیادی فرق ہے
نظام کو عملی شکل دینے کے سلسلہ میں نماز روزہ کا مقام اور اس کی اہمیت
خدائے علیم و خبیر اس نظامِ کائنات کو صرف
آئینی قوت کے ساتھ کنٹرول کرتا ہے
بقا اسی نظامِ حکومت کو ہو گی جو پوری نوعِ انسانی
کے لیے منفعت بخش ہو گا
انسانی ضرورتوں کو متعین کرنے کا فارمولا
دنیا بھر میں ہر قسم کا فساد رزق کی غلط تقسیم کی بنا پر ہی برپا ہوتا ہے
خدا تعالیٰ کی ذات انسانوں کو ان کی بدعملیوں کی بنا
پر ساتھ کے ساتھ جھٹکا دیتی رہتی ہے

ان سبق آموز جھٹکوں کے باوجود سبق حاصل نہ کرنے والوں کا انجام
دینِ خداوندی کا سہارا بننے والے کو پھر
کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں رہی
قوموں کی آخری تباہی کے نشانات کی شکل وصورت
نظامِ خداوندی کے عملی نتائج کی محسوس شکل اور علامات
موسموں کے تغیر وتبدل میں فرق
اچھے نظام کے ابتدائی دور میں بھی راحت کا عنصر موجود ہوتا ہے
شکر اور کفر کے معنی
خدا تعالیٰ نے مومن کی مدد کرنا اپنا فرض قرار دیا ہے
خدا تعالیٰ کی ذات بھی اگر اپنا وعدہ (معاذ اللہ) پورا نہ کرے
تو اس سے بھی پوچھا جاسکتا ہے
خدا سے اپنا کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کی بجائے دعائیں مانگتے رہتے ہیں
آٹھواں باب: **سورۃ الروم** (آیات 48 تا اختتام)
تاریخِ انسانیت میں ابلیس کا کردار
ابلیس کو زندگی بھر کے لیے ضمانت دینے کا وعدہ
حق کا دامن تھامتے ہوئے شکست کی قدر وقیمت
کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا
شرفِ انسانیت کا وقار دلائل وبراہین کے مقدس ترازو میں تولا جاتا ہے
اس قدر محیر العقول کائنات کا مالک اپنے وعدہ کو پورا کرنا
اپنا فریضہ قرار دیتا ہے
نصرتِ خداوندی کی مثال سمندر کی شکل میں، بادلوں کی
شکل میں، بارش کی شکل میں، کھیتی کی شکل میں دیکھیے
فصل اس کی پروان چڑھتی ہے جو زراعت کے
اصولوں کے مطابق محنت کرتا ہے
تعمیری پروگرام کی تکمیل کی خاطر مستحکم طور پر عمل پیرا ہونا اولین شرط ہے
قوموں کی زندگی کے غیر متبدل اصول اسی طرح
موثر ہیں جس طرح انسانی جسم کے لیے طبعی اصول
انسان کے لیے سطحِ ارض پر معیشت کے شعبے کی اہمیت
مُلّا ہم کو کافر اور کافر ہم کو مُلّا کہتا ہے: پرویزؒ
وقت کے تقاضوں نے آج یہ ثابت کردیا ہے کہ دنیا کا
کوئی نظام خدا کے تصور کے بغیر چل ہی نہیں سکتا
کمیونزم کو عملی شکل دینے کے سلسلہ میں مارکس کی ناکامی کی وجہ
مارکس کے پاس مطلوبہ معاشی نظام کے لیے کوئی جذبہ محرکہ نہ تھا
زندگی بھر کے لیے ایک قابلِ عمل جذبہ محرکہ صرف
قرآنِ حکیم ہی دیتا ہے
چین میں ماؤزے تنگ کی پرستش کے بعد
اس کے اصولوں کی انتہا درجے کی نفی
ہر آنے والا انسان پہلے اصولوں کو چھوڑ کر نئے قانون بنالیتا ہے
وحی کی طرف سے دیئے گئے اصولوں کو نہ بدلنے کی ضمانت
تمام عالمِ انسانیت کے لیے سکونِ قلب قرآن حکیم
کے غیر متبدل اصولوں میں ہی مضمر ہے
اسلام کے خلاف گہری سازش

کائنات کا ایک ایک ذرہ پوری انسانیت کے لیے
بلا مزدو معاوضہ ایک تحفہ ہے
نعمائے خداوندی سے انسان صرف استفادہ کرنے
کا حق رکھتا ہے، ملکیت کا نہیں
سورج کے ذریعے سمندر کے نمکیاتی پانی کو کشید
کرنے کا محیّر العقول سلسلہ
کاروبارِ حیات میں انسانی زندگی کی نشو ونما کے لیے
قدرت کی کاریگری کا حصہ
خدا تعالیٰ کا نظامِ ربوبیت لامحدود وسعتوں کی صفات عظمیٰ کا حامل ہے
قرآنی حکومت میں نظامِ ربوبیت کی نشانی الارض للّٰہِ
کی ترجمانی علامہ اقبالؒ کی زبانی
سورج کی روشنی سے وہی شخص استفادہ کرسکتا ہے
جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے
قوموں کی زندگی میں نشیب وفراز زندگی کا ایک لازمی جز ہے
جسمانی صحت کی طرح قوم کی صحت کو برقرار رکھنا زندگی
بھر کے لیے ضروری ہے
موت وحیات کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد قابلِ غور ہے
ہر وہ طاقت یا نظام جو انسانیت کے راستے میں رکاوٹ ہے
خدا تعالیٰ کا قانون اسے اپنے راستے سے ہٹا دے گا
مہلت کا وقفہ ختم ہو جائے تو پھر توبہ کی قبولیت کا وقت بھی ختم ہو جاتا ہے
دلوں پر مہر کیونکر لگتی ہے؟
خدا تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کے قلبِ حساس کا
ذکر اور بدرجہ اتم استقامت کی تلقین
آخر کار نوعِ انسانی کو وحی کی روشنی سے استفادہ
کرتے ہوئے استقامت کا سبق حاصل کرنا ہی پڑے گا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات سورۃ القمان

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: **سورۃ لقمٰن** (آیات 1 تا 11)

حروفِ مقطعات کی وضاحت

حکمت کے لفظ کا قرآنی مفہوم: زندگی کی حدود کو متعین کرنا

قرآنِ حکیم کو قرآن کی زبان میں ہی سمجھا جا سکتا ہے

انسانیت کے لیے دوسری اہم شرط محسنین کا کردار ہے

کائنات کو حسین سے حسین تر بنانے کے فریضہ کی ادائیگی اور اس کا ثمر

فضا کے اندر نظامِ صلوٰۃ پر عمل پیرا ہونے والے پرندوں کی مثال

اشیائے زکوٰۃ کا طریق اور اس کا مقصد ومنتہا

مارک جہاں ناکام رہ گیا اس سے آگے

مارکس کی ناکامی کے بعد سوشل ازم کی شکل میں لینن کی ناکامی

اس سلسلہ کے حل کے لیے قرآن حکیم کی طرف سے

پیش کردہ جذبۂ محرکہ کی لم

روس کی تباہی وبربادی کے بعد چین میں لال کتاب کا حشر

انسانی اعمال کے سلسلہ میں کھیتی کی مثال کی اہمیت

انسان کا ہر آنے والا سانس پہلے سانس کی آخرت ہوتا ہے

قرآنِ حکیم کے Bacic Concepts (بنیادی تصورات)

کو سمجھے بغیر اس کتاب عظیم کا پروگرام سمجھ میں نہیں آ سکتا

نفسیاتی طور پر سب سے زیادہ نخوت اور تکبر میں گرفتار علما

کی اکثریت ہوتی ہے

انسانی ذات کی نشوونما انسان کی اپنی صلاحیتوں کی رہینِ منت

ہوتی ہے

اونٹ کا معدہ چاک کر کے پانی پینے والی قوم کو جنت کی خوشخبری

صداقت اور حق کے الفاظ کے فرق کو واضح کرنے کے لیے

چالیس ہزار شہروں اور قلعوں کا ثبوت

خدا العزیز ہے اور اس کا وعدہ نظری، ذہنی یا لفظی نہیں بلکہ الحق ہوتا ہے

زندہ قوموں کی پہچان

کائنات کے اس وسیع وعریض محیرّ العقول سلسلہ کی پہچان

خدا تعالیٰ کا قائم کردہ نظامِ ربوبیت اور اس کے متعلق ہدایات

دوسرا باب: **سورۃ لقمٰن** (آیات 12 تا 13)

تاریخی طور پر حضرت لقمان کے متعلق مختلف بیانات کی وضاحت
عربوں کے ہاں الفاظ کو محسوسات کی بنیاد پر جانا اور سمجھا جاتا تھا
شکر کے لفظ کا وہ مفہوم جو محسوس شکل میں سمجھا جا سکتا ہے
اسلام مذہب نہ ہونے کی بنا پر ہی سچا دین ہے
مذہب کے اندر انسان کا ہر عمل خدا کے لیے کیا جاتا ہے
جب کہ دین میں انسان کا ہر فعل اس کی اپنی ذات کے لیے ہوتا ہے
مذہب میں خدا کی پرستش کا تصور دین کی ساری عمارت کو
ہی منہدم کر دیتا ہے
انسانی دنیا میں جبر کا پہلو انسان کی انسانیت کو پامال کر دیتا ہے
انسان کا ہر عمل خالصتاً انسانی ذات کے متعلق ہی ہوتا ہے
جبینِ نیاز کا ایک ایک سجدہ انسانی ذات کو قدم قدم پر
سرفرازیوں کی نوید دیتا ہے
حقوق اللہ کا تصور بنیادی طور پر ہی غلط ہے
انسانوں کی طرح خدا تعالیٰ کی ذات کسی سے اپنی
تعریف کروانے کی محتاج نہیں
خدا تعالیٰ نے بھی اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں
قرآن حکیم نے عبادت، پرستش، توحید اور شرک کے بنیادی
تصورات کے فرق کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے
خدا تعالیٰ نے انسان کو جو حکم دینا تھا اسے قرآنِ حکیم میں محفوظ کر دیا
ایک دوسرے پر حکومت کرنے کا تصور حیوانات میں
بھی نہیں پایا جاتا ہے
انسان میں کسی ادنیٰ سی سطح پر بھی حکومت کرنے کا
تصور اسے فرعون بنا دیتا ہے
مالکِ یوم الدین کا عملی مفہوم اور اس کی خصوصیت
1935ء میں توحید کے ہی سلسلہ میں ملازمت کے
دوران علامہ پرویزؒ کے ساتھ ایک ہونے والا ذاتی واقعہ
اسلام کا احیا تو مذہب کی بجائے دین کی حکمرانی سے مشروط ہے

تیسرا باب: **سورۃ لقمٰن** (آیات 14 تا 16)

والدین سے حسنِ سلوک: لقمان کی بات
بچے کی پیدائش کے بعد ماں کی ماتا کا بدرجہ اتم کردار
پرورش کے سلسلہ میں انسانی بچے اور حیوانی بچے میں بنیادی فرق ہے
ماں کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنے دامن کے حسین و جمیل
خوابوں کے تصور میں گزرتا چلا جاتا ہے
خدائے رحیم کی رحمانیت میں طبقاتی تقسیم کوئی وجود نہیں رکھتی
انسانیت کی برادری کو سامانِ نشوونما کے بل بوتے پر
تقسیم کرنا عظیم شرک ہے
انسانی دنیا میں انسان کے اختیار و ارادے پر پہلی پابندی

قرآنی تعلیم کی بنا پر ماں باپ کی اطاعت کا تصور باطل ہے
ماں باپ کی اطاعت کے سلسلہ میں رام چندر کی کہانی
والد کے سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ کا اسوۂ حسنہ
بڑھاپے میں قیدِ تنہائی کا احساس
قرآن حکیم کے نزدیک فیملی سسٹم ایک نعمت سے کم نہیں
یورپ میں سوائے انکل کے نہ چچا ہوتا ہے نہ ماموں، پھوپھا نہ خالو
Homes (گھروں) کے بجائے Houses (مکانات) ہیں
قرآنِ حکیم کی روشنی میں والدین اور اولاد کے لیے حدود کا تعین
اطاعت اور اتباع میں ایک بنیادی فرق ہے
قرآنِ حکیم کے نزدیک عدل کا مقامِ شہادت کی اہمیت اور
اس کی نوعیت
ہوم لائف (گھریلو زندگی) کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی ہدایت
ماں باپ کے لیے فرمانِ ربیّ
قرآنِ حکیم کی ساری کی ساری تعلیم کا مقصد، زندگی کا
محور انسانی ذات کی نشوونما ہے
قرآنِ حکیم قدم قدم پر انسانی عقل کو وحی کی روشنی سے
منور کرتا چلا جاتا ہے
قرآنِ حکیم اپنے ہاں زندگی کا ایک اعلیٰ و ارفع تصور پیش کرتا ہے
گناہ اور جہنم کے سلسلہ میں یہودیت کے تصور کے برعکس
قرآنِ حکیم کی تعلیم
اپنی غلطی کا اعتراف اپنی اصلاح کا ایک لازمی جز ہے
لغزش کے سلسلہ میں توبہ کرنے والے کے لیے
خدا کی طرف سے رحمانیت کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں
عدل کے سلسلہ میں پلڑے کی مثال ایک بڑی واضح مثال ہے
انسانی اعمال کا حساب تو ہر سانس میں ساتھ کے ساتھ ہوتا چلا جاتا ہے
چوتھا باب: **سورة لقمٰن** (آیات 17 تا 21)
اڑھائی ہزار سال سے مسئلہ خیر وشر کی پیچیدگیوں کا قرآنی حل
قوموں کے لیے الفاظ کے حقیقی مفہوم کی اہمیت کے سلسلہ
میں لفظ ''صبر'' کی ایک مثال
قرآنِ حکیم کے مروّجہ تراجم کی وجہ سے غلط نظریات کے
پیدا ہونے کا نتیجہ
الصّبرۃ کا قرآنی مفہوم
کٹھن سے کٹھن منزل کو سر کرنے کے لیے پوری دل جمعی
کے ساتھ سرگرم عمل رہنا صبر کہلاتا ہے
اِنا لِللّٰہ کے الفاظ کا قرآنی مفہوم
مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب ''اعمال قرآنی''
میں قرآن پر عمل کرنے کے طریق
مذہبی دنیا میں عزم کی نوعیت نیز عمالوں اور العزم کا تذکرہ

تمدنی زندگی کے سلسلہ میں لقمان کی قابلِ قدر تعلیم
انسان کی عقل مندی کا ثبوت اس کی نفسیاتی کیفیات
سے ملتا ہے اور انسانی نفسیات کے مختلف پہلو
تنگ نظری یا کم ظرفی کی خطرناک بیماری
کسی کے لیے کچھ نہ کرنے کے باوجود تعریف کروانے کی
انتہائی خواہش
خیالی بدگمانی کی کیفیت
خیالی طور پر اپنی اماجگاہ میں خوش فہمی کے اندر گرفتار شخص کی کیفیت
قدم قدم پر اَن گنت بکھرے ہوئے کائناتی حقائق کو سمجھنے
کے لیے غور و تدبر ایک گوہر تابدار ہے
تسخیرِ کائنات کے سلسلہ میں دوسروں کے بالمقابل قرآن کریم
کی حامل یہ قوم آخر کیوں دسترس حاصل نہ کر سکی؟
تحریک طلوع اسلام 50 سال سے مذہب اور دین کے
فرق کو واضح کرتی چلی آ رہی ہے: پرویزؒ
قرآن حکیم کے نزدیک تقلید پرست قوموں کی حالتِ زار
پر مقلد کی تعریف
تقلید کے مفہوم کو سمجھانے کی ایک دو محسوس اور عملی مثالیں
کسی شخص کا بحیثیت مومن خدا کی آیات پر ایمان لانے کا طریق
ایمان لانے کے سلسلہ میں خود نبی اکرمؐ کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد
مذہب میں تو صرف اسلاف پرستی ہوتی ہے: نہ دلائل و براہین
اور نہ فہم و فراست
ہر صحیح فارمولا اپنے صحیح ہونے کا ثبوت خود پیش کرتا ہے
مذہب ہمیشہ دلیل کا دشمن ہوتا ہے
آج ہمارے ہاں ان فتوؤں کو قانونی حیثیت سے تسلیم کیا جا رہا ہے
نبی اکرمؐ کی زندگی کے دو سو سال بعد بنائی ہوئی تاریخ کی حیثیت
تاریخ کی کسی صحیح بات کی سند کو بھی کتاب اللہ کے ترازو میں تولنا ہوگا
عقل و شعور سے محروم ہو جانے کی وجہ جواز
اگر قدرت انسان کو ارتقائی صلاحیتوں سے نہ نوازتی تو آج اس
کا حشر بھی حشرات الارض یا جنگلی جانوروں جیسا ہی ہوتا
پانچواں باب: **سورة لقمٰن** (آیات 22 تا 32)
اسلاف پرستی یا اندھی تقلید کے تباہ کن نتائج
تقلید پرستی کے باعث قوم صراطِ مستقیم کی منزل سے ہی محروم ہو جاتی ہے
ٹیکسلا کے میوزم میں 5 ہزار سال پیشتر رکھی ہوئی اشیا اور
آج وہاں کے گاؤں کی حالت
تقلید پرست قوم کی حالت: گڑ کی ڈلی اور کڑوے
تیل کی جستجو شگونوں کے لیے
احیائے اسلام کے سلسلہ میں کی جانے والی کوشش کی نوعیت
ہمارے ہاں کی آسودہ حالی اور تحقیق کرنے کا معیار

ہمارے دارالعلوموں کے نو سالہ کورس میں قرآنی حقائق
کو سمجھنے کے سلسلہ میں بے رخی کی کیفیت
قرآنِ حکیم کی طرف سے پیش کردہ تعلیم کا انداز
وحی خداوندی کی مقرر کردہ حدود کو نظرانداز کرنے کی بنا
پر اہلِ یورپ کی حالت
مذہب پرست قوموں کی حالت
تقلید پرستی کے برعکس ایک دوسرا مسلک: ایسا سہارا جو کبھی نہ ٹوٹے
نبی اکرم ﷺ کی حساس خیالی اور وحی کا سہارا اور اس کی اقلیم
انسان کی انسانیت اس کے دل میں گزرنے والے خیالات
کی ہی پرتو ہوتی ہے
خدا کو ماننے اور نہ ماننے میں بھی ایک بنیادی فرق ہے
خدا کے نام پر مسلمانوں کو Exploit (سلب ونہب)
کرنے کا ایک خطرناک حربہ
قرآن انسان سے ارض وسما کے خدا کو ماننے کا مطالبہ کرتا ہے
خدا کی ذات اپنی صفات میں لامحدودیت کی حامل ہے،
اسے محدود نہیں کہا جا سکتا
کائنات میں وحدت کا محیرالعقول سلسلہ نیز سائنسی
انکشافات اور وحی کی راہنمائی
وقت (Time) کے سلسلہ میں آئن اسٹائن اور
برگسان کے انکشافات اور قرآن حکیم کے بیان کردہ حقائق
یہ پوری کائنات ایک نفسِ واحد کی مانند ہے
یہ کائنات بھی ایک وقت تک کے لیے ہے اور خدا کا قانون الحق ہے
خدا کے قانون کے الحق ہونے کے سلسلہ میں کشتی کی مثال
زندگی کی کشتی کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے استقامت
کے ساتھ خدا کے قانون کو اپنانا ہوتا ہے
خدا کے قانون کو مسلسل، زندگی بھر، دھوکا دینے والوں کا انجام
چھٹا باب: **سورۃ لقمٰن** (آیات 33 تا اختتام)
کسی مشکل حالت میں خدا کو یاد کرنے یا اسے ماننے کی نوعیت
خدا کو ماننے کے حقیقی معنی دراصل اس کے قانون کے مطابق چلنا ہے
انسانی زندگی کے لیے خدا تعالیٰ کی طرف سے ملنے والا
قانون پوری نوعِ انسانی کے لیے ہوتا ہے
متقی اور تقویٰ کا حقیقی مفہوم
خدا کے خشیت وخوف سے ڈرنے کا تصور قرآنی تعلیم کی روشنی میں
اصل بات تو مکافاتِ عمل کی ہوتی ہے ڈر نہیں ہوتا
خشیت کا قرآنی مفہوم
اعمالِ انسانی کے ظہورِ نتائج کے وقت کو قرآنِ حکیم نے یوم بھی کہا ہے
انسان کے لیے اس کی انفرادیت کی اہمیت اور اس کی کیفیت
خدا کا وعدہ دراصل خدا کا وہ اٹل قانون ہوتا ہے جو کبھی

اپنا نتیجہ نہیں بدلتا

کسی بات کو واضح انداز میں بیان کرنے کا قرآنی طریق

کلمہ طیبہ اسلام کی ایک ایسی آئیڈیالوجی ہے جس کی کوئی مثل ہی نہیں

انسان ہمیشہ مفادِ عاجلہ سے دھوکا کھاتا ہے

انسانی زندگی نظروں سے تو اوجھل ہوتی ہے مگر ختم نہیں ہوگی

نتائج مرتب ہونے کے سلسلہ میں دو محسوس مثالیں

آیت يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ کے سلسلہ میں پیدا

ہونے والے الجھاؤ اور ان کی حقیقت

قرآن فہمی کے سلسلہ میں ہماری بدقسمتی، ہماری غلط سوچ ہے

اختیار و ارادہ کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس کا

مستقبل Determine (متعین و مقرر) نہیں ہوتا

دنیا کا کوئی شخص بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ مکھی اڑ کر کہاں بیٹھے گی

زندگی کی تمام تر لطف اندوزیوں کا راز انسان کے

اختیار و ارادہ کا رہین منت ہے

سعیٔ بے حاصل انسانی زندگی میں رنگینی پیدا کر دیتی ہے

حضرت صاحب کی پیشین گوئیوں کے بالمقابل قرآنِ حکیم کا ارشاد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات سورۃ السجدہ

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پیش لفظ

پہلا باب: سورة السجدة (آیات 1 تا 4)

لفظ ریب کا قرآنی مفہوم

نبوت کے سلسلہ میں عربوں کی تاریخ

ارض و سمآ کی اصل حقیقت، اور تورات کا بیان، یوم کا

مفہوم اور جمعہ کی چھٹی کا معاملہ

لفظ امر اور خلق کا مفہوم نیز عرش کے سلسلہ میں خدا کے

متعلق پیدا ہونے والا تصور

یورپ کے سائنٹسٹ (سیکولرازم کے حامیوں) کے

نزدیک کائنات کا تصور

نبی اکرم ﷺ کی ذات کے متعلق شفیع المذنبین کے تصور کی حقیقت

لفظ شفیع کا مفہوم

کائنات کے اندر انسان کا مقام بلند ہونے کی وجہ

دوسرا باب: سورة السجدة (آیات 5 تا 9)

سورۃ السجدۃ کی جلیل المرتبت آیت

انسانی علم کتابِ فطرت لکھتا نہیں ہے بلکہ اسے پڑھتا ہے

صدیوں سے رائج ایک غلط العام تصور: ہر چیز پہلے

دن سے مکمل شکل میں پیدا کر دی گئی

دو تین سو سال پہلے خارجی کائنات اور انسان کی تخلیق

کے متعلق سائنس کی تحقیق کا آغاز

کوئی شے بھی By Revolution (انقلاب سے)

وجود میں نہیں آئی

خدا کی دو دنیاؤں کا ذکر: عالمِ امر اور عالمِ خلق

عالمِ امر کے متعلق انسانی سوچ کی بے چارگی

14 سو سال پیشتر نظریہ ارتقا کی وضاحت اور لفظ تدبیر کا مفہوم

آغاز سے تکمیل تک کے تمام مراحل کو پیش نظر رکھتے ہوئے

ارض سے سما کے سفر کی روئداد

کائنات کو صرف دائروی گردش میں محدود کرنے کا

تصور فکرِ قرآنی کے خلاف ہے

ارتقائی منازل کے لیے قدرت کا ایک ایک دن

پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے

کسی منزل کے حصول کے لیے Direction (سمت) کی اہمیت

ہم نے جیسے علامہ اقبالؒ کو صرف شاعر مشرق کے الفاظ

میں ہی محدود کر رکھا ہے

لفظ عزیز کے ساتھ رحیم کا استعمال کیوں؟
انسانی زندگی کی ارتقائی سوچ کے سلسلہ میں ایک غلط نگہی
آج پوری نوعِ انسانی کے لیے عذاب کا باعث بنی ہوئی ہے
انسان کو زندگی گزارنے کے لیے کہا گیا ہے، نہ کہ عمر بسر کرنے کے لیے
تہذیبِ مغرب کی تعریف کے متعلق ہمارے ہاں کی پیدا
کردہ سوچ کی نوعیت
30 سال کی عمر میں تہذیبِ مغرب کے متعلق علامہ اقبالؒ
کی سوچ اور لادینیت کی وضاحت
خالقِ کائنات اپنی ہر تخلیق کا آغاز پست ترین سطح سے
کرتا ہے اور بلند ترین سطح تک لے جاتا ہے
قدرت نے انسان کو انسانیت کی ایک نئی منزل سے روشناس کرایا
انسان کے لیے اطوار کی صورت میں تخلیقِ نو کی نعمت خدائی
توانائیوں کا ایک کرشمہ
انسان خدا کی ذات کا حصہ نہیں، ذات کے حصے بخرے نہیں ہو سکتے
لفظ روح کا قرآنی مفہوم انسان کا اختیار و ارادہ ہے
یعنی یہ اس کا صاحب مشیّت ہونا ہے
انسان کو اختیار و ارادہ کے استعمال کرنے کے لیے
حواسِ خمسہ اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت ملی ہے
یہ آدمِ خاکی، حیوان سے انسان، اختیار و ارادہ کی
سرفرازی کے بعد، بنانا کہ اسے مخاطب کیا جائے
کسی شخص کو تُو کہنے سے پہلے اسے اپنی "میں" ❶" کو ثابت کرنا ہوگا
ہماری دعا اس لیے قبول نہیں کہ ہم میں "میں" نہیں
انسان کی منزل انسان کا خدا ہے
یورپ کے سائنٹسٹ ہوں یا اہلِ تصوف، ان دونوں کی دنیا
میں "میں" کا اپنا الگ وجود کہیں باقی نہیں رہتا
منزلِ مومن

تیسرا باب: سورة السجدة (آیات 10 تا 13)

تجدیدِ یادداشت
قرآنِ حکیم کے من جانب اللہ ہونے کا ثبوت اس کی
تعلیم اور اس کے حقائق ہیں
اگر یہاں کی زندگی، زندگی ہے تو اس کے بعد کی زندگی،
زندگی کی زندگی ہے
قرآن کے حقائق کو سمجھانے کے لیے اقبال کا اسلوب
محکمات اور متشابہات کی اصلیت اور ان کی اہمیت
قرآنِ حکیم کے نزدیک یہ زندگی اُخروی زندگی کا دیباچہ ہے
خدا کا دین مذہب میں کچھ اس طرح بدلا جس
طرح بناس پتی یا ڈالڈا کو گھی کی شکل میں بدلا ہے
اگر انسانی صحت کے لیے غیر متبدل طبعی قوانین ہیں تو
انسانی ذات کے لیے بھی غیر متبدل اقدار ہیں
انسانی ذات کی نشوونما کا تمام تر انحصار قرآنی اقدار پر منحصر ہے
ذات کی نشوونما کے لیے قرآنی اقدار کی کہانی اقبالؒ کی زبانی
یورپ کی مادہ پرست سوچ اور مومن کے نزدیک تسخیرِ کائنات
کی سوچ میں ایک بنیادی فرق ہے
کائنات کی وسعتیں لامحدود ہونے کے باوجود محدود ہیں
قرآنی زبان کی بلاغت کی ایک مثال
آگے نکلنے کے لیے لفظ نفذ کا استعمال کیوں؟

حصولِ منزل کے لیے پروگرام کے ساتھ عشق ہونا ضروری ہے
انسان کی ارتقائی حدود کی اگلی منزل کے متعلق برگسان کا نقطہ نظر
خدا کا قُرب حاصل کرنے کے لیے اس کے قانون کے آگے جھکنا ہوگا
خدا انسان کو جیسا بنانا چاہتا ہے قرآن اس کو وہ کچھ بنا دیتا ہے
مومن کے لیے قضائے اکبر بھی کچھ حیثیت نہیں رکھتی
انسانی خودی کا قطرہ جب گوہر کی شکل اختیار کر جائے تو
پھر وہ حیاتِ جاوید سے ہم کنار ہو جاتا ہے
انسان کے ہر عمل کا نتیجہ اس کی ذات پر اثر انداز ہوتا ہے
انتظامی امور کے سلسلہ میں مملکتِ اسلامیہ کے سربراہ
کی حیثیت نیز مکافاتِ عمل کی اہمیت
گزرا ہوا وقت، خواہ ایک سیکنڈ ہی کیوں نہ ہو، واپس نہیں آیا کرتا
خدا تعالیٰ کی طرف سے ایمان لانے کے لیے انسان پر کوئی جبر نہ ہوگا
قرآن کی اس قدر واضح تعلیم کے برعکس ہمارے ہاں کے
تراجم کی ایک مثال
اس سلسلہ میں قرآن حکیم کا ارشاد

چوتھا باب: **سورۃ السجدۃ** (آیات 14 تا 19)

تجدیدِ یادداشت
قرآنِ حکیم نے اپنی تعلیم کو کئی جگہ مجازی طور پر بھی پیش کیا ہے
قرآنی قوانین کو عملی طور پر دل و جان سے تسلیم
کرنے والوں کی خصوصیات
تصریفِ آیات کی روشنی میں قرآنِ حکیم کا کوئی مقام بھی مشکل نہیں رہتا
قرآنِ تعلیم کے مطابق آیاتِ خداوندی پر علیٰ وجہ البصیرت
ایمان لانا ہوگا
ایمان لانے کے سلسلہ میں ہماری حالت
انسان کو کافر بننا پڑتا ہے، اور ایمان لانا پڑتا ہے
لفظ ربوبیت کا قرآنی مفہوم
قرآنی تعلیم کے برعکس مذہب کی دنیا میں قرآنِ حکیم کے
لفظ ''سجی'' کا مفہوم
مردِ مومن کی سعی و کاوش اور اس کی کبریائی کے مقامِ بلند کی کیفیت
جماعتِ مومن کی پہچان الاعلون کے سوا کچھ اور ہے ہی نہیں
انسان کی اپنی پہچان اس کی 'میں' سے وابستہ ہے
بندۂ مومن خدا کے آستانے کے سوا کہیں کسی اور کے سامنے نہیں جھکتا
Ego (ایغو) میں اور نفس یا خودی میں فرق
ایسا استکبار جو بغیر الحق ہو، وہ شیطنت ہے
روزِ قیامت غیر مسلموں کے متعلق ان کے نیک اعمال کی جزا کا سوال
ضد اور اصول پرستی میں فرق یعنی بغیر الحق استکبار کا نتیجہ فرعونیت ہے
دلی طور پر کسی بات کو تسلیم کرنے کے باوجود اپنی انا کے بت کی پوجا کرنا
زعمِ باطل انسان کی صلاحیتوں کو غیر شعوری طور پر مفلوج کرتا رہتا ہے
ایک رات میں ہزار ہزار نفل اور عمر میں نو لاکھ مرتبہ قرآن حکیم
کے ورد کی حقیقت
نبی اکرمؐ کے متعلق خدا تعالیٰ کا ارشاد
ضربیں لگانے والوں کے برعکس راتوں کو کم سونے والوں
کی عملی زندگی کی کیفیت
قرآنی تعلیم کے برعکس دنیائے تصوف کے نزدیک
کائناتی نعمتوں کی قدر و منزلت
کائنات کے تخلیقی مقصد کو پیشِ نظر نہ رکھنے والوں کی حالت زار

عربوں کے ہاں رزق اپنے اندر وسیع تر مفہوم کی شکل میں
استعمال ہوتا ہے
رزق کی دوسروں کے لیے کھلا رکھنے پر اجر کی تفصیل لامنتہا ہے
جنت مومن کا کوئی آخری مسکن نہیں
قرآنِ حکیم کو سمجھنے اور سمجھانے کی تخلیقی کاوشوں کی ایک جھلک

پانچواں باب: **سورة السجدة** (آیات 20 تا اختتام)

دنیا بھر کے مسلمانوں کی حالت اور یہودیوں کی تباہی کے لیے
دعاؤں کا سلسلہٴ دراز
جہنم میں جہنمیوں کی بے بسی کی کیفیت
جہنم کا ذکر ہو یا جنت کا' یہ سب کا سب تمثیلی طور پر ہی بیان کیا گیا ہے
انسان نے کرّہ ارض پر ہی لکیریں نہیں کھینچیں بلکہ پوری
انسانیت کو ہی ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے
ہجرت کا تصور
خدا کی زمین کا انسانوں کے ہاتھوں ہی تنگ ہو جانے کی
ایک سبق آموز مثال
ربِ کریم نے انسانی اختیارات کو وسیع تر کرنے کے لیے
کرہ ارض کو مستقر بنایا تھا
انسان کی اس میکاوَلی سیاست نے پوری دنیا کو ایک
وسیع جہنم میں تبدیل کر رکھا ہے
جنتی معاشرے میں کسی مجرم کو ذلیل نہیں کیا جائے گا
تا کہ اس کی انسانیت پامال نہ ہو
دنیا بھر کے ستم ظریف انسانوں کے لیے قرآنی نظام
کی طرف سے اعلانِ ضمانت
ابتدائی طور پر بیماری کی شکل میں درد کے چھوٹے چھوٹے
جھٹکے بھی ایک رحمت ہے
خدا تعالیٰ کی ذات کے متعلق انتقام لینے کا تصور صحیح نہیں ہے
قرآنِ حکیم کی تعلیم کے مطابق انتقام کا صحیح مفہوم
تاریخی لحاظ سے قرآن حکیم کا انداز بیان
خدا سے ملاقات کا قرآنی مفہوم اور ذکر سے مراد
اقتصادیات پر یہودی اور بنیا کا قبضہ اور ان کے قبضے
میں مسلمان کی جان
لفظ امام کا حقیقی مفہوم
مسلمانوں میں باہمی اختلافات کے سلسلہ میں ایک غلط روایت کی تشہیر
صدیوں سے موجود باہمی اختلافات مٹانے کا علاج
قندیلِ آسمانی کے سوا کہیں اور نہیں مل سکتا
زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا نتیجہ اور قیامت کا مفہوم
سلطنتِ عباسیہ کے دور میں مذہبی اختلافات کی
ناگفتہ بہ حالت کے باعث ہلاکو اور چنگیز کی چڑھائی
سلطنتِ عباسیہ (750-1258AD) کے علاوہ مغلیہ
سلطنت اور مسلمانوں کی ہزار سالہ ہسٹری کا سیاہ دور
مذہبی فرقہ بندی کا ہی ثمر ہے
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عدالت میں ہرمزان کا حقائق پر مبنی بیان
وحی کے ذریعے قرآنِ حکیم کا آخری پیغام ہی انسانیت
کا آخری سہارا ہے
نبی اکرمؐ کے لیے ہجرت کا حکم قوم کی تباہی کی آخری علامت تھی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ تمنا

آج نوعِ انسانی کا جمِ غفیر معاشرتی، سیاسی اور تمدنی طور پر اپنے اپنے خودساختہ نظریات وتصورات کے فریبِ نفس میں مکمل طور پر اسیر ہونے کے باعث باہمد گر جس قدر غسلِ خوں میں مصروفِ کار ہے اس کے پیشِ نظر اگر اس دور کو تاریخ کا بدترین دور متصور کیا جائے تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ لہٰذا دورِ حاضر کی اِس ناگفتہ بہ اور خون آلود بدنما تصویر کے اِن بدنما داغوں کو مٹانے کی خاطر نوعِ انسانی کے لیے یہ امر اشد ضروری ہی نہیں بلکہ لازم ہے کہ ربِ العٰلمین نے ذکرللعالمین کی شکل میں انسانوں کی اس عالم گیر برادری کے لیے جو لاریب، بین، واضح، مکمل اور محفوظ ضابطۂ حیات عطا کیا ہے وہ اس نسخۂ کیمیا کو ایک بار پھر آزمالے۔ کیونکہ اِس نسخۂ کیمیا کا ہمیشہ سے یہ دعویٰ رہا ہے کہ اس نے انسان کی تمام نفسیاتی بیماریوں کا شافی علاج اپنے اندر محفوظ کر رکھا ہے۔ چنانچہ اسی بناء پر اس کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ یہ وہ نسخہ کیمیا ہے کہ جو انسانی عقل کو کسی شکل میں بھی راہِ اعتدال سے نہیں ہٹنے دیتا بلکہ اس کا ایک ایک لفظ فہم وفراست اور دلیل وبرہان کے چراغ روشن کرتے ہوئے صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور اس طرح زندگی کے الجھے ہوئے گیسوؤں کو سنوارتا چلا جاتا ہے، اور اس گم کردہ راہی کو کبھی مایوس ہونے ہی نہیں دیتا۔ اس سراجِ منیر کا یہی وہ محکم سہارا ہے کہ جس کی بناء پر کہا گیا ہے کہ

رات کے ماتھے پہ افسردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے

برادرانِ عزیز! بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کا یہی وہ جذبِ دروں تھا کہ جس کی بناء پر اُس نے اس فکرِ قرآنی کو عام کرنے کی غرض سے محترم پرویز صاحب علیہ الرحمۃ کے آڈیو ویڈیو پر دیے گئے سات سو کے قریب دروسِ قرآن کو سی ڈیز سے قرطاس پر منتقل کرنے کے بعد اُنہیں کتابی شکل میں پیش کرنے کا پروگرام تشکیل دیا۔ جس کے تحت ربِ کریم کی مہربانی سے زیرِ نظر سورۃ فاتحہ کے علاوہ مذکورہ دروس میں سے اس وقت تک سورۃ نحل، سورۃ بنی اسرائیل، سورۃ کہف ومریم، سورۃ طٰہٰ، سورۃ حج، سورۃ انبیاء، پارہ 29 واں اور پارہ 30 واں مکمل شکل میں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا چکا ہے۔ جبکہ اس طویل سفر کو مکمل کرنے کی غرض سے بزمِ لاہور آج بھی پوری طرح سرگرمِ عمل ہے اور خیال ہے کہ سورۃ فاتحہ سے والناس تک کا یہ طویل سفر تقریباً چالیس جلدوں میں مکمل ہو سکے گا۔

سورۃ فاتحہ چونکہ قرآنِ حکیم کا دیباچہ ہے شاید اس کی بنیاد پر ہی علامہ اقبال نے کہا تھا کہ انسان کی موجودہ زندگی آنے والی زندگی کا دیباچہ ہے۔

اس سورۃ میں رب العزت نے اپنی بنیادی صفات ربوبیت عالمینیٔ رحمانیت‘ رحیمیت‘اور مالکیت کو کچھ اس طرح ترتیب اور جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جس سے انسان حدودِ بشریت کے اندر رہتے ہوئے‘اس کے کائناتی کنٹرول کی ہیئت اور اس کی افادیت کے سمندر سے کچھ قطروں ہی سے اپنی تشنگی بجھا سکتا ہے۔جبکہ وقت کے ساتھ ساتھ مختلف اشیائے کائنات کی نشوونما کے پوشیدہ راز بتدریج اُس کے سامنے کھلتے چلے جائیں گے۔البتہ جہاں تک حیاتِ انسانی کا تعلق ہے تو اس کے متعلق خالقِ کائنات نے حضرت انسان کو اس کی موجودہ زندگی کے مقصدِ عظیم سے بڑی وضاحت اور بلیغ انداز میں آگاہ کر دیا ہے۔بقول شاعر

تیری جلوہ گاہِ جمال میں میرا ذوقِ دید نکھر گیا
تیری ضوفشانیٔ حسن نے میری حیرتوں کو سجا دیا

سورۃ فاتحہ کی یہی وہ بنیادی خصوصیت ہے کہ جس کے پیشِ نظر محترم پرویز صاحبؒ نے اس کے ایک ایک لفظ کی تشریح کے لیے ایک ایک درس مختص کیا جس کی افادیت کا اندازہ قارئین کو ان دروس کے مطالعہ سے ہی ہو سکے گا۔

برادرانِ عزیز! اس موقع پر یہ چیز بغیر کسی تامل کے علی وجہ البصیرت کہی جا سکتی ہے کہ محترم پرویز صاحبؒ کی طرف سے قرآنِ حکیم کی یہ تفسیر جو قرآنِ حکیم ہی کے آئینے میں پیش کی گئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اور ہمیں یقینِ محکم ہے کہ موصوف کی عمر بھر کی دیدہ ریزی اور جگر کاری کا یہ سرمایۂ حیات نوجوان نسل کے علاوہ ہر صاحبِ علم وفکر کے لیے ایک انمول خزینہ ثابت ہوگا اور اس کے مطالعہ کے بعد آخر کار انسان بے ساختہ پکار اٹھے گا کہ قندیلِ آسمانی کا یہ نسخۂ کیمیا اس قدر واضح‘ لاریب‘ آسان اور ہر قسم کے تضادات سے پاک اپنے اندر ایک ایسا ملکہ لیے ہوئے ہے کہ جو دوٹوک الفاظ میں آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح روشن اور مستقل طور پر نوعِ انسانی کے لیے تاحیات راہنمائی کا بنا رہے گا۔

ہر قدم پر بھٹکتی رہی زندگی
ہر قدم پر وہ آواز دیتے رہے

یہی وہ حقیقتِ ثابتہ ہے کہ جس کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ’’کہ اے نوعِ انسانی! تم اس ضابطہ حیات کے بلا مزد و معاوضہ مل جانے پر خوشیاں مناؤ کیونکہ یہ وہ ضابطہ حیات ہے کہ جو کچھ انسان اکٹھا کرتا ہے یہ اُس سے کہیں زیادہ قیمتی متاع ہے‘‘۔

خدا کرے اس کرۂ ارض پر بکھری ہوئی ملتِ اسلامیہ جو اس وقت افسردہ و پژمردہ حالت میں سرگرداں ہے وہ ایک بار پھر امتِ واحدہ کے پرنور نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے قابل ہو جائے۔عزیزانِ من! آبِ حیات کی یہی وہ شرابِ طہور ہے کہ جس کے ساغر سے مانوس ہو کر انسان اُس حسن و جمال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا جسے انسانی آنکھ کے لیے قدرت نے اپنے ہاں مستور کر رکھا ہے۔اور پھر واقعاتی طور پر یہ باور کر لے گا کہ قرآنِ حکیم کا یہ قول یقینی طور پر حتمی ہے کہ تنہا عقلِ انسانی امامت کی سزاوار نہیں

ہوسکتی ۔ یہی وہ حتمی اعتراف ہے کہ جس کی بناء پر یہ عالمگیر برادری مصائب و آلام کی موجودہ چیخ و پکار سے آزادی حاصل کرتے ہوئے فکرِقرآنی کے مضراب سے نکلنے والی دھیمی دھیمی اور دلوں کوموہ لینے والے اُن مسحورکن نغموں کی پرکیف آوازوں سے لطف اندوز ہوسکے گی۔عزیزانِ من! انسانی زندگی کا یہی وہ حسین منظر ہے کہ جس کو دیکھنے کے لیے آسمانِ عالم اس انتظار میں ہے کہ یہ بھٹکا ہوا راہی اس قندیلِ رحمانی کی روشنی میں اپناسفرِ زندگی کب شروع کرتا ہے۔

عزیزانِ من! انسانی زندگی کے سلسلہ میں خواہ یہاں کی زندگی کے لمحات ہوں یا جہانِ فردا کا دورِحیات' ربِ کریم تو ہر دور میں انسان کے لیے رب بھی ہے' الرحمٰن بھی' الرحیم بھی' اور مالک یوم الدین بھی۔لہٰذا اس بناء پر خالقِ کائنات' کائنات کا مالک ہونے کے ناطے اس میں ہر آن اضافہ کرتا رہتا ہے۔یہ وہ صفاتِ ربِ کریم ہیں کہ جن کی ترجمانی کرتے ہوئے غالب نے کہا تھا:

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

برادرانِ عزیز! آخر پر ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

محمد اشرف ظفر
نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور
جنوری 2007

سُـــوَرَةُ الـــرُّوُم

پہلا باب: سورۃ الروم (آیات 1 تا16)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اگست 1979ء کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الروم کے شروع سے ہوتا ہے۔ یہ اکیسویں پارے کی تیسویں سورۃ ہے: (30:1)۔

روزوں کا مقصد دنیائے انسانیت میں خدا کی کبریائی کو قائم کرنے کا ایک ذریعہ ہے

رمضان المبارک شروع ہوا ہے۔ جہاں تک روزوں کے احکام کا تعلق ہے وہ اسی مہینے کے طلوعِ اسلام میں دیدیئے گئے ہیں۔ قرآن کی دو چار آیات میں وہ سارے آ گئے ہیں۔ جہاں تک روزوں کے مقصد کا تعلق ہے اُس کے متعلق دو ایک سابقہ درسوں میں' میں بڑی تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ قرآن نے کہا ہے کہ صیام یعنی روزوں کا مقصد یہ ہے کہ **لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰئكُمْ**(2:185) تا کہ تم دنیائے انسانیت میں خدا کی کبریائی کو قائم کر سکو۔ کبریائی کے معنی اقتدارِ مطلق(Sovereignty) ہوتا ہے۔ یہ روزے اس مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہیں کہ دنیا میں انسانی نظام کی جگہ خدا کی حکومت قائم کی جا سکے۔ عربی زبان جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ جو **لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ** کہا گیا ہے تو وہ کہا ہی یہ گیا ہے کہ روزے اس لیے فرض کیے گئے ہیں کہ تم دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کرنے کے قابل ہو جاؤ۔ اور اُس کا عملی ثبوت ہمیں تاریخ دے رہی ہے۔

میدانِ بدر میں خدا کی کبریائی کے قیام کے لیے پہلا معرکہ

روزے 2 ہجری میں پہلی بار فرض ہوئے اور 17 رمضان کو حق اور باطل کا سب سے پہلا معرکہ بدر [1] کے میدان میں ہوا۔

---

[1] جنگ بدر 17 رمضان 2 ہجری مطابق 13 مارچ 624ء

اسی لیے اُسے یوم الفرقان کہا گیا ہے۔ ابھی سترہ ہی دن کے روزے رکھے تھے کہ اس جماعت کوحق کی پہلی فتح بدر کے میدان میں ہوئی اور اُس آغاز کے بعد اُس کی تکمیل فتح مکہ ❶ میں جا کر ہوئی اور وہ بھی رمضان ہی کے مہینے میں۔ قرآن نے جو کہا تھا کہ اس لیے ہم نے یہ صیام یا روزے فرض کیے ہیں تا کہ تم خدا کی کبریائی کو قائم کرسکو۔ پہلی دفعہ جب روزے فرض ہوئے' تو خدا کی کبریائی کے قیام کا آغاز ہوا۔ آخر میں جا کر 8 ہجری میں مکہ فتح ہوا اور وہ بھی رمضان میں ہی اُس احاطے کے اندر ہوا جہاں سے خدا کی کبریائی کی یہ بات شروع کی گئی تھی۔ اس کے بعد اس کی وسعت تو بہت دور تک پھیل گئی لیکن وہ مقام جہاں سے نبی اکرم ﷺ نے اس کا آغاز کیا تھا وہ ہے جسے آپ جزیرۃ ❷ العرب کہہ لیجئے اُس میں خدا کی کبریائی کی تکمیل فتح مکہ سے ہوئی۔ یہ تھا قرآن کا مقصد اور اس طرح سے اُس مقصد کو حاصل کر کے دکھا دیا۔ اس چیز کو میں دو ایک درسوں میں بڑی تفصیل سے بیان کر چکا تھا اس لیے یہاں اُسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اب ہم اپنے تسلسل سے ہی آج کے درس کا آغاز کرتے ہیں۔

قرآنِ کریم میں آنے والے واقعات کے متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے لیکن وہ کچھ ایسی باتیں ہیں جن کا تعلق حوادثِ کائنات سے ہے۔ جب ہم آگے آئیں گے تو دیکھیں گے کہ ان کی زیادہ تفصیل آخری پاروں میں ہی ہے۔ نظر آتا ہے کہ وہ جو اس کے بعد دنیائے انسانیت یا خارجی کائنات کے اندر تبدیلیاں پیدا ہونے والی ہونگی' جو انقلابات آئیں گے' ان کے متعلق ان آیات میں یا ان سورتوں میں بتایا گیا ہے۔ یہ جو قبل از وقت یا جسے آپ پیشین گوئیاں کہیں گے یا جسے آپ مستقبل کے متعلق کچھ کہنا کہیں گے تو یہ حوادث کے متعلق ہے' آنے والے واقعات کے متعلق ہے لیکن قرآن میں ایک پیش گوئی ایسی ہے جو زمانۂ نزولِ قرآن کے اندر متعین طور پر نام لے کر کی گئی ہے اور وہ اُسی دور کے اندر پوری بھی ہوگئی۔

قرآنِ حکیم میں ایران اور روم کی مملکتوں کا ذکر اور ان کا تاریخی بیان

وہ پیشین گوئی سورۃ الروم میں ہے جس سے آج کے درس کا آغاز ہوتا ہے۔ عربوں کے دائیں بائیں کہہ لیجیے یا دونوں اطراف میں کہہ لیجئے' دنیا کی وہ دو بڑی مملکتیں تھیں جن کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ ایک طرف ایران کی مملکت تھی اور دوسری طرف رومن ایمپائر تھی۔ ایران میں تو مجوسی تھے جنہیں آپ آتش پرست کہتے ہیں' وہ کھلے بندوں مشرک ہو چکے تھے۔ رومنز عیسائی تھے۔ ان

---

❶ فتح مکہ رمضان 8 ہجری مطابق جنوری 630ء

❷ محلِ وقوع کے اعتبار سے عرب کے مشرق میں خلیج فارس جنوب میں بحیرۂ عرب اور مغرب میں بحیرۂ قلزم واقعہ ہے۔ اس اعتبار سے اسے جزیرہ نمائے عرب کہا جاتا ہے لیکن اس کے شمال میں دریائے دجلہ اور فرات بہتے ہیں (پرویزؒ: شاہکارِ رسالت' ادارۂ طلوع اسلام' لاہور' 1987ء' ص 163)

دونوں کی تہذیبیں بھی صدیوں سے چلی آ رہی تھیں اور ساری دنیا پر اُن کا سکہ رائج تھا۔ عربوں کے ہاں مملکت کا ہونا تو ایک طرف رہا' کوئی منظّم حکومت بھی نہیں تھی۔ یہ قبائلی زندگی بسر کرتے تھے۔ اِن ایران والوں اور رومنز کی آپس میں آویزشیں' کشمکشیں' تصادمات اور لڑائیاں ہمیشہ لگی رہتی تھیں۔

میں جب رومنز کہتا ہوں تو اس کو سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے ہاں قیصرِ قسطنطین نے جسے Constantine کہتے ہیں' عیسائیت کو قبول کیا تو اپنا دارالسلطنت قسطنطنیہ کو بنایا۔ چوتھی صدی عیسوی میں رومن ایمپائر یعنی مملکتِ روما دوحصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک حصہ کا دارالسلطنت روم ہوا۔ یہ وہی ہے جسے ہمارے ہاں روم کہتے ہیں اور دوسری سلطنت جو عرب کی سمت میں واقع ہوئی تھی اس کو بازنطینی حکومت کہتے تھے۔ اس کا دارالخلافہ قسطنطنیہ تھا۔ گویا یہ جو تاریخ میں آپ کو بازنطین ملے گا جس کا دارالحکومت قسطنطنیہ تھا' یہ وہی ہے جو چوتھی صدی میں جب رومن ایمپائر دوحصوں میں تقسیم ہوئی ہے تو ان کا مشرقی حصہ جو عرب کی سمت واقع تھا' اُسے بازنطینی حکومت کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد عرب کے مسلمانوں سے براہِ راست جن کا تصادم ہوا ہے تو وہ یہی مشرقی رومن ایمپائر تھی جسے بازنطینی ایمپائر کہا جاتا ہے اور جس کا دارالسلطنت قسطنطنیہ تھا۔ شام' آج کا بیت المقدس' فلسطین' مصر اور عراق کے علاقے اس بازنطینی حکومت کے ماتحت تھے۔ انہوں نے' عرب کا جو بارڈر تھا' اس پر چھوٹے چھوٹے جاگیردار سمجھ لیجیے یا سردار کہہ لیجیے' بسا رکھے تھے' ان کو کچھ فوج بھی دے رکھی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عرب کی سمت سے ان کو کسی قسم کا خطرہ نہ ہو۔ تاریخ میں انہیں غسّانی کہتے ہیں۔

ایرانی اور بازنطینی حکومتوں کی 602 عیسوی سے 612 یا 614 عیسوی تک باہمی جنگ وجدل کی روئداد

یہ تاریخی تفصیل اس لیے ضروری ہے کہ آگے چل کر بات سمجھ میں آئے گی کہ جب بازنطینی حکومت کہیں گے' یا رومن ایمپائر کہیں گے تو رومن ایمپائر سے مفہوم بازنطینی ایمپائر ہوگا جو عرب کی سرحد کی طرف واقع ہوئی تھی۔ رومن ایمپائر جو دوسری طرف واقع ہوئی تھی جو مغربی حصہ تھا' عربوں کا اُس سے تعلق نہیں ہے۔ ایرانیوں کی کشمکش اس بازنطینی حکومت کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ لڑائیوں کا سلسلہ اس زمانے میں بڑا لمبا چوڑا ہوا کرتا تھا۔ ایٹم بم تو تھے نہیں کہ ایک سیکنڈ کے اندر پوری کی پوری مملکت کو تباہ کر کے رکھ دیا جائے۔ چھ سو دو عیسوی (**602**ء) میں ان کی جنگوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا اور وہ اچھا خاصا عرصہ یعنی چھ سو بارہ (**612**ء) یا چودہ (**614**ء) تک وہ سلسلہ جاری رہا۔ اُس میں ایرانیوں کو بازنطینی عیسائیوں کے خلاف فتح پر فتح ہوتی چلی گئی۔ انہوں نے شام کو' فلسطین کو' فتح کرلیا' مصر تک بھی پہنچ گئے' ان کے ہاں یروشلم میں جو صلیبِ مقدس تھی وہ یہ بھی اٹھا کر لے گئے۔ گویا بہت بڑی شکست تھی جو رومنز کو ملی۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ ایرانی مجوسی تھے' ان کا شمار مشرکین کی صف میں کیا گیا ہے۔ قرآنِ کریم نے عیسائیوں اور یہودیوں کو تو اہلِ کتاب کہا ہے۔ یہ جو مجوسی تھے یہ بھی حالانکہ ایک پیغمبر کے ماننے والے تھے لیکن ان کے پاس اُس کی کوئی کتاب نہیں تھی' یہ آتش پرست تھے اس لیے انہیں مشرکین کی صف میں رکھا جاتا تھا۔ یہ چیزیں معلومات کے لیے ہیں' ورنہ قرآنِ کریم کی رو سے دنیا میں قومیں بھی دو ہیں' جماعتیں بھی دو ہیں' انسانیت بھی دو حصوں میں ہی بٹتی ہے۔ **فَمِنۡكُمۡ كَافِرٌ وَّمِنۡكُمۡ مُّؤۡمِنٌ** (64:2) ایک وہ جو خدا کی کبریائی پر ایمان رکھنے والے ہیں' عملاً اُس کو قائم کرتے ہیں' یہ ہیں جنہیں وہ مومن کہتا ہے۔ ایک وہ ہیں جو اسے تسلیم نہیں کرتے بلکہ اس کے سوا' اس کو چھوڑ کر' کوئی نظامِ حکومت بھی وہ قائم کرلیں' وہ ان میں سے نہیں ہیں' وہ دوسروں سے ہیں اس لیے انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ آگے اصطلاحی طور پر ان کو پارسی کہا ہے' مشرکین بھی وہ ہوتے ہیں' کفار بھی ہوتے ہیں' منافق بھی ہوتے ہیں۔ یہ دو شقیں تھیں۔ ان مجوسیوں کو اہلِ کتاب پر غلبہ حاصل ہوا۔

قرآن حکیم کے نزدیک معاشرتی طور پر اہلِ کتاب اور مشرکین میں پائے جانے والے فرق کی نوعیت

قرآنِ کریم میں ان اہلِ کتاب کو بھی کفار ہی کی صف میں رکھا گیا ہے کیونکہ یہ قرآن کی حکومت کو نہیں مانتے تھے لیکن اس کے باوجود قومی سطح پر یا تمدنی سطح پر یا معاشرتی طور پر قرآن نے اہلِ کتاب میں اور مشرکین میں کچھ فرق رکھا ہے۔ مثلاً اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز رکھا ہے' ان کے ہاں کا ایسا کھانا جو ہمارے نقطۂ نگاہ سے حرام کی صف میں نہ آتا ہو تو ان کے ہاں کے ایسے کھانے کو بھی جائز رکھا ہے لیکن جو مشرکین ہیں' ان کے ساتھ اس قسم کے تعلقات بھی قرآن نے روا نہیں رکھے۔ گویا اتنا سا فرق تھا۔ اس فرق کے اعتبار سے مکے کے مشرکین ایرانیوں کے ساتھ اپنی نسبت رکھتے تھے۔ اور ان عیسائیوں یعنی بازنطینی رومنز اور اِس نئی جماعت جو مکے میں پیدا ہوئی ہے' کے متعلق یہ تھا کہ ان کا آپس میں رابطہ ہوسکتا ہے۔

یاد رکھیے! ابھی یہ جماعت مکے میں ہی تھی' یہ جو 602ء سے 613ء تک کا واقعہ ہے' اُس زمانے میں حضور ﷺ کی مکی زندگی ہے۔ اس کو چھٹا یا ساتواں نبوی سال کہیں گے۔ حضور ﷺ پہ چالیس سال کی عمر میں وحی کا نزول ہوا۔ اُس کے پانچ چھ سات سال کے بعد کی بات ہی سمجھ لیجیے کہ اتنا ہی عرصہ اس جماعت کو ہوا تھا۔ اس تفریق کے باعث مکے کے مشرک اپنی نسبت ان ایرانیوں کے ساتھ رکھتے تھے۔ اور یہ جو نئی جماعت مکے کے اندر پیدا ہو رہی تھی وہ عیسیٰ علیہ السلام کو بھی نبی مانتی تھی' حضرتِ موسیٰؑ کو بھی نبی مانتی تھی۔ وہ اپنے ذہن میں یہ سمجھتے تھے کہ ان کا اُن کے ساتھ تعلق اور رابطہ ہوسکتا ہے اسی لیے یہ ہمارے بھی خلاف ہیں اور ایرانیوں کے بھی خلاف ہیں۔ اس نسبت سے جب ایرانیوں کو اِن رومنز پر یا عیسائیوں پر مسلسل فتوحات حاصل ہوئیں اور آخرالامر وہ اتنی بڑی فتح عظیم ہوئی کہ وہ یروشلم کی صلیب کو بھی اٹھا کر لے گئے تو اس سے اہلِ مکہ نے ایک بڑا جشن منایا حالانکہ اِن اہلِ مکہ یا اہلِ عرب کو

اس فتح سے خود کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے اس اعتبار سے انہوں نے بھی خوشی منائی۔ یہ جو اتنی سی جماعت ہے' ان کے لیے مکے میں پانچویں یا چھٹے نبوی سال کے دن انتہائی تکالیف' مشکلات اور پریشانیوں کے دن تھے۔ لیکن دعویٰ ان کا اُس وقت بھی یہ تھا کہ یہی نہیں کہ قریش ہمارے مغلوب ہونگے' یہی نہیں کہ عرب میں خدا کی حکومت قائم ہوگی' بلکہ یہ بھی کہ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ (9:33) دنیا کے ہر نظام کے اوپر ہم غالب آ کر رہیں گے۔ وہ اس پر ہنسا کرتے تھے کہ

ذرہٗ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر

اندازہ لگائیے کہ یہ چند نفوس ہیں: غریب تریں' کمزور تریں' اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ دعویٰ یہ کیا جا رہا ہے کہ ہم قریش پر ہی فتح نہیں بلکہ سارے عرب پر' عجم پر' ایران پر فتح حاصل کریں گے۔ اس پر وہ مخالفین کہا کرتے تھے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ ان کا مذاق اُڑایا کرتے تھے چنانچہ جب ایرانیوں کی رومنز پر یہ فتح ہوئی ہے تو انہوں نے یہ کہہ کر ذہن بنایا کہ آپ دیکھیے اتنی بڑی خدا پرستوں کی قوم کا حال کہ خدا نے ان کا کیا کیا۔ کیا خدا نے ان کی کوئی مدد کی؟ اور یہ جن کو آتش پرست کہہ رہے ہیں انہوں نے کس طرح ان کو رگید کر رکھ دیا۔ اُس کے بعد وہ ان سے کہتے تھے کہ صاحب! رومنز ایمپائر جیسے لوگوں کی خدا کچھ مدد نہ کر سکا تو آپ کس کھیت کی مولی ہیں۔ یہ تھا وہ پوائنٹ جو ایسے وقت میں وہاں اٹھا۔ اس کا اثر بھی یقیناً ان دلوں کے اوپر ہو سکتا تھا کہ واقعی رومنز ایمپائر جیسی جو ایک مملکت ہے وہ بھی ان کے سامنے نہیں ٹھہر سکی تو اگر کل کو ان قریش نے ایرانیوں کے ساتھ اپنا Alliance (اتحاد) کر لیا جو کہ مشرک ہونے کی جہت سے اپنے آپ کو ایک دوسرے کے ساتھ متحدہ محاذ والوں میں سے سمجھتے ہیں' اگر انہوں نے Alliance (اتحاد) کر لیا تو بات تو واقعی بڑی سخت ہو جائے گی۔ اس کا بھی ایک اثر تھا جو دلوں پہ پڑنا تھا۔

سورۃ الروم کو ان تاریخی واقعات کی روشنی میں دیکھنا یا سمجھنا زیادہ مفید ہے

میں یہ اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ یہ جو سورۃ الروم ہے اس کو عام طور پہ اس تناظر میں سمجھا نہیں جاتا۔ معاملہ رومنز ایمپائر کا' ایرانیوں کی سلطنت کا' آتش پرستوں کا' عیسائیوں کا تھا۔ اور ان کی آپس میں لڑائی تھی۔ ایک نے فتح حاصل کی اور دوسرا مغلوب ہو گیا۔ اُس کی اتنی بڑی اہمیت سے قرآنِ کریم میں اس کے لیے وحی نازل ہو رہی ہے۔ ایک سورۃ کی ابتدا یہاں سے کی جا رہی ہے اور اس کا نام ہی سورۃ الروم ہے۔ یہ کیوں اتنی اہمیت ہے؟ اس پس منظر کو سمجھنا بڑا ضروری ہے اور اس اہمیت کی وضاحت تو قرآنِ کریم نے دوسری ہی آیت کے اندر سمجھا دی۔ اور اب اس پس منظر کے بعد دیکھیے۔ پہلی ہی آیت سے کہ الٓمّٓ (30:1)۔ یہ وہ مقطعات ہیں جن کے متعلق کئی دفعہ عرض کر چکا ہوں کہ قرآنِ کریم کی بہت سی سورتیں ہیں جن کے ابتدا میں یہ حروف آتے ہیں۔ ان

کو الفاظ نہیں کہتے' یہ حروف ہی ہوتے ہیں' یہ Abbreviations (مخففات) ہوتی ہیں۔ میں اس کے متعلق بہت کچھ کہہ چکا ہوں [1] اس لیے بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں۔

روم اور ایرانیوں کے متعلق قرآن حکیم کا بیان

اس سورۃ کی ابتدا بھی الٓمٓ ہی ہے جو میں ہمیشہ یوں کہا کرتا ہوں کہ ''خدائے علیم وحکیم کا ارشاد یہ ہے کہ **غُلِبَتِ الرُّوْمُ o فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ o فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ** [2] (30:2-4)۔ان رومیوں اور ایرانیوں دونوں کی یہ لڑائی ہو رہی ہے ان کا براہِ راست قریش سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ وحی نازل ہو رہی کہ روم مغلوب ہوگیا' عیسائی مفتوح ہوگئے' ان کو شکست ہوگئی ہے۔ یہ تمہارے قریب ہی واقع ہوا ہے لیکن ان مشرکینِ مکہ کو کہہ دو کہ اس میں جشن منانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ ہے وہ پیشین گوئی جو کی کہ ان سے کہہ دو کہ چند سالوں کے اندر تم دیکھو گے کہ یہی رومی ایرانیوں کو شکست دے دیں گے۔ یہاں ''بضع'' کا لفظ آیا ہے۔عربی زبان میں یہ جو **بضع** کا لفظ آتا ہے اس کا ترجمہ چند سال کیا جاتا ہے اور یہ عرصہ عربی زبان میں تین سے نو کی تعداد کے لیے بولتے ہیں۔ گویا تین سے نو سال کا عرصہ متعین کر دیا۔ کہا کہ ان سے کہہ دیجیے کہ تین سے نو سال کے اندر تم دیکھو گے کہ یہی رومی کس طرح ایرانیوں کو شکست دیتے ہیں۔ یہ جسے میں نے ایک قسم کی Specific (متعین) پیشین گوئی کہا' یہ قرآنِ کریم میں صرف ایک ہی واقعہ میں ملتی ہے۔ جس کا ذکر سورۃ الروم کی ان ابتدائی آیات میں آیا ہے۔ ان سے یہ کہا گیا ہے کہ ٹھیک ہے یہ رومی' یہ بازنطینی' یہ عیسائی مفتوح ہوگئے لیکن تم دیکھو گے کہ یہ پھر غالب آئیں گے اور یہ بھی ساتھ کہہ دیا گیا ہے کہ تین سے نو یا چھ سال کے عرصے میں تم دیکھو گے کہ ایسا ہو جائے گا۔ پھر کہا کہ **لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ** (30:4) بات یہ ہے کہ جس کے لیے کہا گیا ہے کہ ماضی کے واقعات ہوں یا مستقبل کے' سب قانونِ خداوندی کے مطابق واقع ہوتے ہیں **وَ يَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ o بِنَصْرِ اللّٰهِ** (30:4-5) اور یہ جو تم دل میں ٹھانے بیٹھے ہو اور اس وقت طنزاً تمسخر اڑا رہے ہو کہ یہ اتنی سی جماعت

---

1. ان کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: مفہوم القرآن' تعارف ص۔ نیز: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورہ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص۔ 21 تا 22۔ مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ الکھف و سورۃ مریم' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004 ص ص۔ 215 تا 216 نیز مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 29 مکمل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006 ص۔ 97۔
2. اس سرزمین میں' جو عرب کی سرحد سے قریب واقع ہے (یعنی فلسطین اور شام میں) رومی' (ایرانیوں سے) مغلوب ہوگئے۔ (اور یہ چیز مشرکین عرب کے لیے بڑی خوشی کا باعث ہوئی کہ اہلِ کتاب' مشرکین کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔) لیکن تم دیکھو گے کہ چند سال کے اندر اندر' یہی مغلوب رومی' اپنے دشمنوں پر غالب آ جائیں گے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 929)۔

ہے اور ان کے اتنے اتنے بڑے عزائم ہیں گویا ''کیا پدی کیا پدی کا شوربا''۔ کہا کہ یہ جو تم نے رومن ایمپائر کے متعلق کہا ہے تو اسے تم دیکھ لو گے کہ زیادہ سے زیادہ چھ سے 9 (نو) سال کے عرصے میں یہی رومن پھر ایرانیوں کے اوپر غالب آئیں گے۔ اور آپ حیران ہونگے کہ نو سال کے اندر 622ء میں رومن نے پلٹ کر پھر حملہ کیا اور ایران کے دارالخلافہ تک جا پہنچے تھے۔ اور جب یہ یہاں ایران کے دارالخلافہ تک پہنچے ہیں تو یہ وہ دن تھا جس دن بدر کے میدان میں مسلمانوں کی جماعت کو قریش پر فتح حاصل ہوئی۔ بات یہ کہی تھی۔ **يَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ o بِنَصْرِ اللّٰهِ (30:4-5)** ۔آج یہ جشن منا رہے ہیں، چند سالوں کے عرصے میں جو زیادہ سے زیادہ تین سے نو یعنی چھ سال کا عرصہ ہوسکتا ہے، یہ رومی پھر ایرانیوں پر فتح پالیں گے۔

جنگِ بدر کے بعد خود مشرکینِ قریش کے الم انگیز ماتم کی کیفیت

کہنے والی بات تو قریش سے تھی کہ تم جو انہیں کہہ رہے ہو کہ یہ اس قدر کمزور اور ناتواں قوم ہے اور ان کے یہ عزائم اس قدر اعلیٰ ہیں اور تم ان کا مذاق اڑا رہے ہو اور اس کے لیے اتنی بڑی مملکت بازنطینی ایمپائر کی نظیر پیش کر رہے ہو تو کہا کہ جہاں تک اس شکست کا تعلق ہے تو یہ بھی تمہیں ہم بتائے دیتے ہیں کہ اسی چھ سال کے عرصے میں تم دیکھو گے کہ یہی رومن ایمپائر، یہی عیسائی، کس طرح سے ان مجوسیوں کے اوپر غالب آتے ہیں۔ اور بات یہ ہے کہ یہ جو تم اس ننھی سی جماعت کا، اس ضعیف سی جماعت کا، آج اس طرح سے مذاق اڑا رہے ہو، مضحکہ اڑا رہے ہو، تم دیکھو گے کہ اُدھر یہ ہوگا اور ادھر انہی کے ہاتھوں تمہیں وہ شکست نصیب ہوگی کہ روتے رہو گے۔ اور واقعی جنگِ بدر کے بعد قریش کے ہاں جو ماتم ہوا ہے تو پوچھیے نہیں کہ کتنا عظیم ماتم تھا۔ کہرام مچ گیا تھا یعنی اہلِ مکہ کو آرڈیننس ایشو کرنے کی ضرورت پڑ گئی تھی کہ کسی گھر سے اونچی آواز سے رونے کی آواز نہیں آنی چاہیے کیونکہ اس سے قبائل کے اوپر بڑا اثر ہو جانا تھا۔ قریش کے ہاں ہونا اور پھر رونا باعث تعجب تھا۔ انہوں نے By Ordinance (آرڈیننس سے) منع کر دیا کہ رونے کی کوئی آواز نہ اٹھے۔ بدر کے میدان میں ان کے بڑے بڑے ابنائے قوم، کسی کا بیٹا، کسی کا باپ، کسی کا بھائی، کسی کا شوہر، تمام کے تمام، وہاں قتل ہو گئے تھے [1]۔ ہر گھر کے اندر ماتم کی صف بچھی ہوئی تھی لیکن انہوں نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ کوئی شخص رونے نہ پائے۔ تاریخ میں بڑا دلچسپ واقعہ آتا ہے کہ ان کے ہاں کا ایک سردار [2] تھا۔ اُس کا بیٹا اس جنگ میں مر گیا تھا۔ اُس کو بھی وہ

---

[1] رؤسائے قریش جو شجاعت میں نامور اور قبائل کے سپہ سالار تھے، ایک ایک کر کے مارے گئے۔ ان میں شیبہ، عتبہ، ابوجہل، ابوالبختری، زمعہ بن الاسود، عاص بن ہشام، امیہ بن خلف، منبہ بن الحجاج، قریش کے سرتاج تھے۔ (شبلی نعمانی: سیرۃ النبیؐ، ناشران قرآن، ص۔335)۔

[2] تاریخ اس سردار کا نام اسود بتاتی ہے (شبلی نعمانی: سیرۃ النبی ﷺ، ناشران، ص۔340)

ضبطِ فغاں کرنا پڑا تھا کیونکہ یہ جو ان کے ہاں پنچائیت کے احکام ہوتے تھے وہ بادشاہوں کے حکموں سے بھی زیادہ سخت ہوتے تھے۔ اُس کو بھی ضبطِ فغاں کرنا پڑا۔ ایک دن اُس نے سنا کہ کہیں کوئی رونے کی آواز آ رہی ہے' تو اُس نے اپنے نوکر سے کہا: جاؤ دیکھو کہ کیا قریش نے اپنا وہ حکم واپس لے لیا ہے جس میں رونا بند کیا ہوا تھا۔ جاؤ اور جا کر دیکھو تا کہ میں بھی اپنے دل کی بھڑاس نکال سکوں۔ وہ گیا' واپس آیا' کہنے لگا کہ جی نہیں' وہ تو فلاں (عورت) کا اونٹ مر گیا تھا وہ اُس پہ رو رہی تھی۔ اُس پہ ایک نے بڑا عجیب [1] مرثیہ لکھا ہے کہ ہماری حالت بھی اے آسماں! دیکھ' اونٹ کے مرنے کے اوپر تو رونے کی اجازت ہے لیکن مجھے بیٹے کے مرنے پہ رونے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ جو بدر کی جنگ ہے اس کے متعلق دنیا کے مورخین سے پوچھیے۔ Historian's History of the World کے اندر دیکھیے کہ وہ کس طرح سے اس جنگ کے متعلق لکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس جنگِ بدر نے تو دنیا کی تاریخ کو بدل دیا تھا۔ مسلمان صرف تین سو تیرہ نفوس تھے۔ اب اس سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ یہ جو قرآن نے اس وقت مشرکین کو یہ کہا تھا کہ یہ جشن یوں نہ مناؤ' یہ جن کے متعلق تم کہتے ہو تو انہی کو تم نے دیکھ لینا ہے کہ اتنے دنوں میں کیا ہوتا ہے۔ اور یہ جن کا تم اس وقت طنز اور مذاق اڑا رہے ہو' ان کے متعلق تم دیکھ لینا کہ انہی چھ سال کے عرصے میں کیا ہوتا ہے۔ یہ 2 ھجری کا واقعہ ہے۔ اُس دوران میں یہ جو انقلاب تھا کہ بدر کے میدان نے دنیا کی تاریخ کا رخ بدل کر رکھ دیا۔ یہ ہے وہ بات جس کے لیے یہ جو سورۃ الروم ہے یہ وحی کی رو سے نازل ہوئی اور اُس میں یہ بات کہی گئی تھی کہ تم دیکھو گے خارجی دنیا میں' ان ایرانیوں و رومیوں' اور خود تمہاری اپنی دنیا کے اندر بھی کہ یہ کس طرح سے ایک انقلاب واقع ہوتا ہے۔ تم جو قریش ہو تمہیں اپنی قوت و تمکنت کے اوپر جو اس قدر فخر و ناز ہے تو تم دیکھو گے کہ اس کمزور اور ناتواں سی جماعت کے ہاتھوں تمہیں کتنی بڑی شکست اٹھانی پڑتی ہے۔ پہلی دفعہ جو روزے فرض ہوئے تھے تو یہ 17 روزے رکھنے کا نتیجہ تھا۔ اور جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ پہلے سال کے روزے تھے۔

---

[3] شبلی نعمانی نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

اونٹ کے گم ہونے پر روتی ہے' اور اس کو نیند نہیں آتی' اونٹ پر مت رو' بدر پر آنسو بہا' جہاں قسمت نے کمی کی' تجھ کو رونا ہے' تو عقیل پر رو' اور حارث پر رو' جو شیروں کا شیر تھا۔

اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

اتبکی ان یضل لها بعیر	ویمنعها من النوم السهود
ولا تبکی علی بکر ولکن	علی بدر تقاصرت الجدود
فتبکی ان بکیت علی عقیل	وتبکی حارثا اسد الاسود

(شبلی نعمانی: سیرۃ النبیؐ' ناشرانِ قرآن' ص ص 340 تا 341)۔

اُس کے بعد سن 8 ھجری کے جو رمضان کے روزے تھے اُس میں تو ابھی نو دس روزے ہی رکھے تھے کہ مکہ فتح ہوگیا۔ آپ صیام یا روزوں کا فلسفہ پوچھتے ہیں تو فلسفہ مجھ سے کیوں پوچھیے بلکہ قرآن سے پوچھیے کہ جس نے کہا ہے کہ **لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ** (2:185) تا کہ تم خدا کی کبریائی قائم کرسکو اور پھر دنیا کی تاریخ سے پوچھیے کہ ان روزوں نے کس طرح سے انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ پھر بیان وہیں چلا جاتا ہے:

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تُو باقی نہیں ہے

وَ يَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (30:4-5) یہ دن مومنین کے لیے بڑی خوشی کا موجب ہوگا۔ یہ نصرت ہے لیکن ملتی اُسے ہے جو حاصل کرنا چاہے۔

قرآنِ حکیم کے غلط تراجم نے ہماری سوچ کا رخ ہی بدل دیا

میں بار بار اس لفظ ''**من يشآء**'' کے ترجمے پہ آیا کرتا ہوں کہ جب ہم نے سب کچھ تقدیر کے حوالے کر دیا تو اس کے ترجمے کر دیئے کہ جسے وہ چاہتا ہے اپنی نصرت دیدیتا ہے۔ تو ہم تو بے بس ہو کر رہ گئے۔ اگر ہمیں نہیں مل رہی ہے تو ہمارا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ وہ دینا نہیں چاہتا۔ اور اگر اُس کے بعد ہم لینا چاہیں' کوشش کریں تو یہ تو خدا کے خلاف جنگ ہوگئی کہ وہ دینا نہیں چاہتا اور ہم لینا چاہتے ہیں۔ یہ تو چھینا جھپٹی ہوگئی۔ کیا پوچھتے ہو کہ ہم نے اس قرآن کے ساتھ کیا کیا۔ اور پھر اس قرآن نے جو ہمارے ساتھ کیا ہے اُس کو دیکھیے۔ **يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ** (30:5) غلبے کی کیفیت یہ ہے کہ اسی مٹھی بھر جماعت نے چند سالوں کے عرصے میں اُس دور کی ساری تاریخ کی کایا پلٹ کر رکھ دی ہے۔ وہ قریش کہ جن کی یہ کیفیت تھی وہ اسی مٹھی بھر جماعت کے سامنے پابجولاں قیدیوں کی حیثیت سے حضور ﷺ کے سامنے کھڑے تھے۔

ذاتِ خداوندی اگر غلبے اور قوت کی مالک ہے تو اس میں بھی صفتِ رحیمی کا ہی ظہور ہوتا ہے

خدا تو عزیز تھا' غلبے کی کیفیت تو یہ تھی۔ کہا کہ وہ ساتھ رحیم بھی ہے' وہ چنگیز اور ہلاکو [1] نہیں ہے' مستبد حاکم نہیں ہے کہ غلبہ ہی

---

[1] چنگیز اور ہلاکو کے کوائف کے لیے ملاحظہ کیجیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص۔310 (فٹ نوٹ 2)

غلبہ ہے بلکہ اُس کے ساتھ رحمت کی کیفیت بھی یہ ہے یعنی وہ مواقع بہم پہنچاتا ہے کہ تم میں جو کمزوریاں رہ گئیں تھیں ان کو پورا بھی کرلو۔ اور مواقع کی کیفیت یہ تھی کہ یہ سارے سردار پابجولاں حضور ﷺ کے سامنے کھڑے تھے' آپ ﷺ نے پوچھا کہ کہو' تمہارے ساتھ اب کیا سلوک کیا جائے؟ وہ خواہ قیدی تھے' مفتوح تھے لیکن پھر بھی ان کی رگوں میں حمیت تھی' وہ معافیاں مانگنے والی قوم نہیں تھی' اُنہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے ہم نے جنگ کی ہے اور جنگ میں فتح بھی ہوتی ہے' شکست بھی ہوتی ہے۔ ہمیں شکست ہوئی ہے تو فاتح مفتوح کے ساتھ جو سلوک کیا کرتا ہے تو ہم اس کے مستحق ہیں۔ ان کے ہاں گردن اڑا دیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے کہا کہ یہ تم نے ٹھیک کہا ہے کہ فاتح مفتوح کے ساتھ یہ کیا کرتا ہے لیکن ایک شریف انسان دوسرے شریف انسان کے ساتھ یہ نہیں کیا کرتا۔ **لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ** (12:92) کوئی تمہارے اوپر گرفت نہیں ہے' کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ **وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ** (30:5) آپ نے دیکھا کہ خدا کی یہ صفت کہاں آئی ہیں۔ عزیز ہے تو ایسا کہ قریش کے اوپر فتح ہے تو اس قسم کی فتح ہے اور اُس کے بعد رحمت ہے تو ایسی رحمت ہے کہ کسی ایک سے بھی کوئی انتقام نہیں لیا گیا۔ چھوٹے چھوٹے سے بھی واقعات آتے ہیں۔ ایک شاعر [1] تھا' وہ حضور ﷺ کے خلاف ہجو میں بڑی سخت کلامی سے کام لیا کرتا تھا' وہ بھی سامنے آیا تو ایک صحابیؓ [2] نے کہا کہ حضور ﷺ اتنی تو اجازت دید یجیے کہ اس کے سامنے سے دو دانت میں اکھیڑ دوں تا کہ یہ وہ الفاظ' جو یہ کہا کرتا تھا' دوبارہ نہ کہہ سکے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اُس زمانے میں یہ ان دانتوں سے ہمارے اور خدا کے اسلام کے خلاف کہتا تھا' اب یہ دانت رہنے دو تا کہ ان سے یہ خدا کی حمد وستائش کیا کرے۔ قرآن نے کہا ہے کہ **اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ** (94:1)۔ دیکھا ہم نے تمہارے دل میں کشاد پیدا کر دی ہے۔ یہ شرح صدر ہے۔ عزیز کے ساتھ رحیم ہے۔

خدا تعالیٰ کے وعدہ سے مراد خدا کا غیر متبدل قانون ہوتا ہے

وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا یُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَ لٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (30:6)۔ جہاں بھی خدا کا وعدہ آتا ہے تو اُس کے معنی وہ بات ہوتی ہے جو اُس کے قانون کی رو سے ہو کر رہتی ہے۔ اُس کے قانون کی رو سے تو یہ ہے کہ جو اُس نے قانون بنایا ہے' وہ اٹل ہے' وہ الحق ہے۔ اُس کے خلاف کوئی کچھ نہیں کرسکتا' اُس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے جب یہ کہا گیا ہے کہ نو سال کے اندر اندر یہ ایسا ہو کر رہے گا تو اُس وقت بھی یہ خدا کی رو سے ہم نے یہ کہا تھا۔ یہ ہوا ہے اور خدا کا قانون کبھی بدلتا ہی نہیں ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

---

[1] یہ سہیل بن عمرو تھا' نہایت فصیح اللسان تھا (شبلی نعمانی: سیرۃ النبیؐ' ناشران قرآن' ص۔ 336)۔

[2] یہ ہیں حضرت عمرؓ جنہوں نے یہ کہا تھا (شبلی نعمانی: سیرۃ النبیؐ' ناشرانِ قرآن' ص۔ 336)۔

مستقل کامیابی کا انحصار مادی اسباب کے ساتھ ساتھ انسان کی نفسیاتی تبدیلی پر منحصر ہوتا ہے

آگے بات کہی ہے کہ وہ کون نہیں جانتے اور کیوں نہیں جانتے؟ کہ **یَعۡلَمُوۡنَ ظَاهِرًا مِّنَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَ هُمۡ عَنِ الۡاٰخِرَةِ هُمۡ غٰفِلُوۡنَ** (30:7) ان کی نگاہیں صرف Physical (طبعی) سامان اور اسباب پر ہوتی ہیں۔ یہ بھی نہایت ضروری ہے لیکن قرآن کہتا ہے کہ توپ پہ نہیں بلکہ توپ کے پیچھے جو آدمی کھڑا ہوتا ہے شکست و فتح کا انحصار اُس پہ ہوتا ہے۔ شمشیر و سناں ضروری ہیں' توپ اور بندوق نہایت ضروری ہیں لیکن یہ **ظَاهِرًا مِّنَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا** (30:7) ہے' یہ طبعی اسباب ہیں اور طبعی اسباب بھی ضروری ہیں لیکن اصل شے تو وہ انسان ہے' اُس انسان کے اندر کی تبدیلی ہے' اُس کی ذہنیت کی تبدیلی ہے جو شکست کا اور فتح کا معیار ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ظاہری اسباب کی بنا پہ کچھ وقت کے لیے آپ غلبہ حاصل کرلیں۔ عربی زبان کے اندر **ظَاهِرًا** کا لفظ عجیب لفظ ہے۔ ویسے تو ظاہر کے معنی وہی ہیں کہ جو نمود میں آجائے' **ظَاهِرًا** کے معنی غالب آجانا بھی ہوتے ہیں۔ یہ ٹھیک بات ہے کہ محض طبعی ساز و سامان کی بنا پر بھی غالب آیا جاسکتا ہے لیکن وہ بہت تھوڑے وقت کے لیے ہوتا ہے۔ **وَ هُمۡ عَنِ الۡاٰخِرَةِ هُمۡ غٰفِلُوۡنَ** (30:7) مستقبل کے اوپر ان کی نگاہ نہیں ہوتی لیکن وہ لوگ جن کے ذہن میں' جن کی نگاہوں میں **ظَاهِرًا** سامانِ دنیا کے علاوہ اقدارِ خداوندی بھی ہوتی ہیں تو یہ اصل وہ لوگ ہیں جن کو حقیقت میں فتح اور نصرت حاصل ہوتی ہے۔ اور جو مستقبل ہے' وہ انہی کے حصے میں آتا ہے۔ وہ عارضی چیز ہوتی ہے' ہنگامی چیز ہوتی ہے' حوادث کی رو سے آتی ہے۔ یہ قانون کی رو سے آتی ہے اس لیے مستقبل ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو اقدارِ خداوندی کے بھی قائل ہوتے ہیں اور اُس پہ بھی قائم رہتے ہیں۔ یہ جو 313 لوگ تھے جن کو بدر کے میدان میں اس طرح سے فتح حاصل ہوئی ہے اور مکہ اس طرح سے جا فتح کیا' اور اُس کے بعد تو آپ تاریخ میں دیکھیے گا کہ سارا ایران فتح کیا' رومن ایمپائر کے یہ سارے حصے صرف چند سالوں کے عرصے کے اندر فتح کیے۔ لیکن فتح کیسے کیے تھے؟ یہ ٹھیک ہے کہ **ظَاهِرًا مِّنَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا** (30:7) جنگی ساز و سامان کی بھی ضرورت تھی' وہ بھی حاصل کیا' وہ بھی ان کے پاس تھا کیونکہ اُس کے بغیر تو جنگ لڑی نہیں جاسکتی تھی لیکن ان کا مدار صرف اُس پر نہیں تھا' ان کا مدار کیریکٹر کے اوپر تھا۔ دراصل یہ جتنی فتوحات حاصل ہوئی ہیں تو یہ ان کے حسنِ کردار اور کیریکٹر کی مضبوطی کی بنا پر حاصل ہوئی ہیں۔

جب انسان کی نفسیات خدا کے قانون کی ترجمان بن جائے تو پھر ہرمزان بھی شکست کھا جاتا ہے

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے' ہرمزان کا واقعہ سنایا تھا۔ یہ ایران کا گورنر تھا۔ جب وہ قید ہوکر حضرتِ عمرؓ (581-644/45ء) کے سامنے آیا تو آپؓ نے اُس سے یہ سوال کیا تھا کہ تمہارا معاملہ تو بعد میں طے کریں گے' پہلے ایک سوال کا جواب دو کہ تم وہ ایرانی

تھے جو ہمیں اس قدر حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے کہ ہمارے ساتھ کوئی حسنِ معاملہ یا معاملات یا روابط قائم کرنا تو ایک طرف رہا' تم ایرانی عرب والوں کے ساتھ جنگ کرنا بھی باعثِ ہتک سمجھتے تھے۔ کہا کہ تم تو ہمیں اس قدر باعثِ نفرت سمجھا کرتے تھے' ہمارے ساتھ جنگ کرنا بھی باعثِ ننگ سمجھتے تھے۔ آج کیا ہوا ہے کہ ہم وہی عرب ہیں اور تم وہی ایرانی ہو' کیفیت یہ ہے کہ سارا ایران ہمارے پاؤں تلے ہے' تمہارا بادشاہ جان ❶ بچانے کے لیے پن چکیوں میں پناہ ڈھونڈھ رہا ہے۔ کہا: ہمیں یہ بتادو کہ یہ ہوا کیا ہے' یہ کیسے ہوا ہے؟ ہم سے پوچھا جاتا تو ہم کوئی جواب ہی نہیں دے سکتے' یہی کہتے کہ اللہ کی مرضی سے ہوگیا۔ وہ جواب دے رہا ہے۔ کہنے لگا کہ عمر رضی اللہ عنہ! مجھ سے کیوں پوچھتے ہو' اپنے آپ سے پوچھو' بات تو بڑی صاف ہے۔ اس سے پیشتر جب ایرانی اور عرب ایک دوسرے کے سامنے آتے تھے تو ایک طرف ہم اکیلے ایرانی ہوتے تھے اور دوسری طرف تم عرب اکیلے ہوتے تھے۔ اب جب میدانِ جنگ میں آتے ہو تو ہم ایرانی تو اکیلے ہوتے ہیں اور تم عرب اور تمہارے ساتھ تمہارا خدا ہوتا ہے' یہ دو مل جائیں تو دنیا کی کوئی طاقت تم کو شکست نہیں دے سکتی۔ یہ ہرمزان کے الفاظ ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ! ایران کیا شے ہے؟ یہ ہے نصرتِ خداوندی۔ لیکن یہ نصرت کیا تھی؟

عزیزانِ من! ایک چیز کو یاد رکھیے کہ صرف ان الفاظ کو ذہن میں اس طرح نہ رکھیے کہ ہاں صاحب! وہ کوئی اللہ کی طرف سے ایسا ہوجاتا ہے' ہمیں اس پہ ایمان رکھنا چاہیے کہ اللہ کی نصرت ہوتی ہے اور اُس کی وجہ سے یہ ہوجاتا ہے۔ آج کل بھی آپ دیکھتے ہونگے کہ عام طور پہ اشتہارات بھی لگے ہوتے ہیں' رمضان کے مہینے کی برکات کا لکھا ہوتا ہے کہ اس مہینے کا پہلا عشرہ (یعنی دس دن) رحمت کے ہوتے ہیں' درمیان کے دس دن مغفرت کے ہوتے ہیں اور آخری دس دن نجات کے ہوتے ہیں۔ یہ ہزاروں لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں اشتہار بانٹے جاتے ہیں' ہر سال بانٹے جاتے ہیں۔ ہر ایک ان کو پڑھتا بھی ہے لیکن کبھی کسی نے کھڑے ہوکر سوچا بھی ہے کہ یہ بات کیا ہے' یہ ہوتا کیا ہے؟ ان عربوں نے پورے کا پورا ایران فتح کیا ہے۔

دینِ اسلام میں مالِ غنیمت کی کیفیت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کردار

یہ ''غنیمت'' کیا ہوتا ہے؟ یہ عرب بھیڑیں اور بکریاں پالتے تھے اور جب جنگ میں لوٹ مار ہوتی تھی تو یہ بھیڑ بکریاں لوٹ کر لے جاتے تھے۔ وہ غنم بھیڑ کو کہتے ہیں اور ''غنیمت'' کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ''ان کی اتنی بھیڑیں لے گئے۔'' اور آج ہمارے ہاں غنیمت کا لفظ اس طرح ہوگیا کہ ''صاحب! اس کو غنیمت جانو۔'' یہ وہی عرب تھے جنہوں نے پورے کا پورا ایران فتح کیا ہے۔ ان کی

---

❶ یزدگرد

ہزاروں سال کی جمع شدہ دولت، نوادرات انہیں ملے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ وہاں پہ ایک ایک ہیرا کتنی کتنی قیمت کا ہوگا، یہ سارا کچھ وہاں ایران میں ان عربوں کے ہاتھ میں آیا۔ پہلے میدانِ جنگ میں ہوتا یہ تھا کہ جب فتح ہوتی تھی تو جو کسی سپاہی کے ہاتھ میں آتا تھا وہ اُس کا مالِ غنیمت ہوتا تھا، ہر فرد جتنا لوٹ سکتا تھا وہ زیادہ سے زیادہ لوٹ لیتا تھا۔ اسلام کی جنگ میں پہلی تبدیلی تو یہ آئی کہ جنگ مالِ غنیمت کے لیے نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ (581-644/45 AD) کا وہ فقرہ بڑا عجیب ہے کہ ''جس طرح مملکت کے لیے جنگ ملک فتح کرنے کے لیے نہیں ہے، اسی طرح سپاہی کے لیے جنگ مالِ غنیمت لوٹنے کے لیے نہیں ہے۔'' فتح ایران کے بعد وہ سارا جتنا مال تھا وہ اپنے مرکز میں بھیج دیا۔ یہ پوچھو نہیں کہ وہ کتنا تھا۔ اُس کے ساتھ جرنیل [1] نے ایک چٹھی بھی بھیجی۔ اُس میں لکھا یہ تھا کہ ''خلیفۃ المؤمنین! آپ کو یہ مال و دولت دیکھ کر یقیناً تعجب ہوگا، ہمارے تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ ہمیں ایک دن یہ کچھ بھی مل جائے گا۔ ہم کھجوروں کی گٹھلیوں کے ستو پہ گذارہ کرنے والی قوم تھے۔ یہ سارا کچھ ہمارے حصے میں آیا ہے۔ آپؓ کے لیے یہ دولت، یہ انبار، یہ نوادرات بڑی خوشی کا موجب ہونگے۔ لیکن عمرؓ! اس سے زیادہ خوشی کا موجب ایک اور خبر ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ ساری دولت اور نوادرات جو ہیں یہ پورے ملک میں بکھرے ہوئے تھے اور ہمارے سپاہی فاتحین کی حیثیت سے پورے ملک میں بکھرے ہوئے تھے، جہاں انہیں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ عمرؓ! ان سپاہیوں میں سے کسی نے ایک سوئی بھی اپنے پاس نہیں رکھی اور سارے کا سارا لا کر یہاں جمع کر دیا ہے۔'' آپ دیکھتے ہیں کہ خدا کی نصرت کس کو ملتی ہے۔ خط کا یہ حصہ پڑھا تو حضرت عمرؓ (581-644/45 AD) کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ حضرتِ علیؓ (600-661 AD) ساتھ کھڑے تھے۔ کہا کہ عمرؓ کیا بات ہے؟ آپؓ نے وہ خط ان کو دیا کہ یہ ہے۔ کہنے لگے کہ ''عمرؓ! واقعی خوشی کی بات ہے لیکن عمرؓ! تم سمجھے بھی ہو کہ یہ سپاہی اتنے دیانتدار کیوں ہو گئے؟ اس لیے کہ مملکت کا سربراہ دیانتدار ہے۔''

جیسا سربراہ حکومت ویسی ہی قوم

عزیزانِ من! تاریخ کے اس ایک ایک فقرے کے اندر آپ کے اسلام کی ساری تاریخ پنہاں ہے۔ تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ ''جس انداز کی حکومت ہوگی، اُسی انداز کی قوم ہو جائے گی۔'' وہ کہتے ہیں کہ تاریخ کی اس حقیقت کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ ''عمرؓ! تمہارا سپاہی اس لیے دیانتدار ہے کہ سربراہِ مملکت دیانتدار ہے۔'' یہ جو اللہ کی نصرت ''من یشآء'' والی چیز ہے وہ یہی ہے جو لینا چاہے

---

[1] یہ ہیں فاتحِ ایران حضرت سعدؓ جنہوں نے 16ھ مطابق 637ء فتح مدائن کے بعد یہ چٹھی بھیجی تھی (پرویزؒ: شاہکارِ رسالت، ادارۂ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)، لاہور، 1987، ص 181)۔

یہ اُس کو ملتی ہے' یہ انہیں ملی تھی' جنہوں نے اسے لینا چاہا تھا۔ یہ نصرت اس لیے ملی تھی کہ ان کی نگاہیں مستقبل کے اوپر تھیں' مفادِ عاجلہ کے اوپر نہیں تھیں: اس زندگی کے مستقبل پہ بھی اور آنے والی زندگی کے مستقبل کے اوپر بھی۔ اسی کو کہتے ہیں کہ یہ جتنے طبعی اور مادی اسباب ہیں ان کے ساتھ اقدار و اصول جو خدا نے بیان کیے ہوئے ہیں کی پابندی ساتھ رکھیے تو یہ **ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (30:7)** بھی تمہیں حاصل ہوگا اور مستقبل کی شادمانیاں بھی حاصل ہونگی۔ کہا کہ اس پہ غور کرو۔ یہ وہی ہے جو میں نے کہا ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ اُس نے کہہ دیا نصرت حاصل ہوگی اور ہم نے سمجھ لیا کہ سبحان اللہ جی واقعی اللہ کی نصرت ہے' جسے چاہتا ہے دیدیتا ہے۔ کہا کہ **اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا (30:8)** یہ غور و فکر کی بات ہے جو ہم کہہ رہے ہیں۔ جو بات غور و فکر کی ہوتی ہے وہ تو ہمیشہ اسباب اور دلائل کے ساتھ سامنے آتی ہے' جب **Cause** (سبب) ہوتا ہے تو **Effect** (نتیجہ) سامنے آتا ہے۔ فکر کے تو معنی ہی یہ ہیں۔ اس لیے کہا کہ اس پہ سوچو۔

نصرت کا حصول کس طرح ممکن ہوتا ہے؟

فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ (30:8) پہلے اپنے اندر غور کرو کہ یہ نصرت کیسے ملی ہے؟ یہ غور تو ہوگیا جو میں نے ابھی ایران کے فاتح جرنیل کے خط کا یہ واقعہ سنایا ہے۔ میں نے تو ایسا ایک واقعہ سنایا' اُس دور کی تو پوری ہسٹری اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی بات سے بھی یوں گزر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ تو بڑی بات بتا دی کہ ایران کی اُس دولت میں سے کسی فاتح سپاہی نے ایک سوئی بھی نہیں لی۔ خلیفہؓ ❶ نے شاید کہیں کہہ دیا کہ دودھ میں پانی مت ملایا کرو۔ رات ❷ کو خیمے کے باہر خلیفہؓ خود سنتے ہیں کہ ماں بچی سے کہہ رہی ہے کہ بیٹا! اٹھو دودھ میں تھوڑا سا پانی ملا کر چولہے پر رکھ دو۔ ہمارے ہاں ہر گھر میں یہ ہوتا تھا۔ اب تو ہمارے ہاں دودھ وہ ہوتا ہی نہیں کہ چولہے پہ رکھا جائے۔ ہمارے ہاں جو دودھ میں پانی ملایا جاتا تھا' اُسے ''دھون'' ❸ کہتے تھے' وہ اس لیے ڈالا جاتا تھا کہ گرم کرتے وقت پانی اڑ جائے گا اور دودھ رہ جائے۔ اسی طرح سے ماں نے کہہ دیا کہ بیٹا! چولہے پہ دودھ رکھ دو اور وہ تھوڑا سا پانی اُس میں ڈال دینا۔ بچی کہنے لگی کہ اماں جان! دودھ کو تو میں چولہے پہ رکھ دونگی لیکن پانی نہیں ڈالوں گی۔ ماں کہنے لگی کہ تمہیں کیا ہوگیا ہے' روز تو یہ کرتے تھے۔ بچی کہنے لگی کہ وہ تو ٹھیک ہے لیکن آج خلیفہؓ نے یہ کہا تھا کہ دودھ میں پانی نہ ڈالا

---

❶ یہ حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ دوم (634-644/45AD) ہیں۔

❷ حضرت عمر فاروقؓ ایک رات گشت کرتے کرتے تھک گئے تو ایک خیمہ کے باہر کہیں ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

❸ پانی ملا ایسا دودھ جس میں دودھ کم ہو اور پانی زیادہ (یہ لفظ موجودہ مشرقی پنجاب کے ضلع گورداسپور اور اس کے گرد و نواح میں بولی جانے والی پنجابی زبان کا ہے)۔

کرو۔ ماں نے اسے Seriously (توجہ وسنجیدگی سے) لیا ہی نہیں' اُس نے کہا کہ ڈالو جیسے روز ڈالتی ہو''ایتھے کیہڑا تیرا خلیفہ دیکھدا پیا ہیگا اے۔''❶ کہنے لگی کہ امی جان! خلیفہ نے کہا تھا کہ یہ خدا کا حکم ہے' اس لیے یہ خلیفہ کی بات نہیں ہے' خدا دیکھ رہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ انہیں یہ نصرت کیسے ملی تھی؟ قرآن کہتا ہے کہ **اَوَلَمۡ یَتَفَکَّرُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ** (30:8) اپنی دنیا میں تم کیا دیکھو گے' ہماری دنیا میں دیکھو کہ کیا تمہیں اُس میں کہیں بددیانتی نظر آتی ہے۔ سوچو کہ ایک پودے کو جتنی کھاد' جتنا پانی' جتنی روشنی کی ضرورت ہے تو کیا اُس میں وہ ذرا سی بھی بددیانتی کرتا ہے اور کس طرح سے تمہیں وہ عمدہ پھل دیدیتا ہے' وہ اپنے حصے میں تو کچھ نہیں رکھتا۔ کبھی بھی یہ نہیں ہوتا کہ شام کو دیکھو کہ اُس میں کچھ نہایت عمدہ آم لٹک رہے ہوں اور صبح دیکھیں کہ دو آم غائب ہیں' کہ جی' دو آم یہ درخت کھا گیا۔ وہ درخت اُس میں سے نہیں کھاتا۔ یہ سارا سلسلہ پوری دیانت سے چل رہا ہے۔ اگر سورج اپنی حرارت کے اندر سے اربواں حصہ ایک دن کم کردے تو یہ ساری زمین اُسی وقت یخ بستہ ہوجائے' دیکھو کہ پوری مشینری' مفادِ کلی کے قانون کے مطابق چل رہی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اس خارجی کائنات پر غور کریں کہ **مَا خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَمَا بَیۡنَہُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ** ❷ (30:8)۔ اسے بالحق کہتے ہیں کہ کہیں کوئی بددیانتی نہ ہو' کسی کے حق میں کمی نہ کی جائے کہ وہاں کچھ بھی نہ ہو اور پھر کہا کہ یہ چیز ابدی نہیں ہے۔ یہ ایک وقتِ معینہ تک کے لیے ہے۔

جوابدہی کے عمل سے لاتعلقی کا تصور انسان کی ابدی زندگی کے لیے پیغامِ موت ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے اسے **اَجَلٍ مُّسَمًّی** (30:8) کہا ہے یعنی یہ کائنات تو ایک وقتِ معین تک کے لیے اس طرح سے کام کرنے والی چیز ہے۔ لیکن انسان ہے کہ اُس نے تو یہ طبعی زندگی بسر نہیں کرنی' اس نے تو اس سے بھی آگے چلنا ہے۔ اس قدر بیّن شہادت کے باوجود اکثر لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ **وَ اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآیِٔ رَبِّہِمۡ لَکٰفِرُوۡنَ** (30:8) بددیانتیاں وہی کرتے ہیں جن کو اس پہ ایمان نہیں ہوتا کہ ہم نے اپنی ان تمام چیزوں کا جواب دینا ہے' اس کا نتیجہ بھگتنا ہے۔ ذہن میں یہی ہوتا ہے کہ جو دنیاوی اسباب و سامان ہیں ان کے مطابق زندگی بسر کررہے ہیں' انتظام کرلیا ہے کہ پکڑا نہ جاؤں' اگر پکڑا جاؤں تو رشوت سے چھوٹ جاؤں۔ یہ ذہن میں ہوتا ہے تو پھر اُس نے کہا کہ ان کے لیے کوئی نصرتِ خداوندی نہیں ہے۔ یہ کچھ وہی کرتے ہیں کہ **بِلِقَآیِٔ رَبِّہِمۡ لَکٰفِرُوۡنَ** (30:8) جنہیں اس کا انکار ہو۔ ایک ایمان ہے جسے قرآن **لقآء رب** کہتا ہے تو

---

❶ یہاں کونسا تمہارا (وہ) خلیفہ دیکھ رہا ہے۔

❷ یہ تمام نظام (ارض و سما اور جو کچھ ان کے درمیان ہے) ایک وقتِ معینہ تک تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص۔931)۔

یوں ترجمہ کرنے سے کہ جیسے کسی دن تو سامنے آ و گے' بات سمجھ میں آتی ہے۔ پہلی چیز تو شہادت میں قرآنِ کریم نے کارگہ کائنات پیش کی۔

قرآن تاریخ کے اوراق اور اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات بطور شہادت پیش کرتا ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن جہاں کوئی دعویٰ کرتا ہے تو اُس کے لیے ہمیشہ شہادات پیش کرتا ہے۔ اُس کی پہلی شہادت خارجی کائنات ہوتی ہے کہ اُس میں کس طرح نظم ونسق سے خدا کا یہ نظام چل رہا ہے' کس طرح اُس کی کبریائی کارفرما ہے۔ پہلی شہادت تو وہ یہ پیش کرتا ہے۔ اُس سے اگلی شہادت تاریخ کی شہادت ہوتی ہے کہ **اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ کَانُوۡۤا اَشَدَّ مِنۡہُمۡ قُوَّۃً وَّ اَثَارُوا الۡاَرۡضَ وَ عَمَرُوۡہَاۤ اَکۡثَرَ مِمَّا عَمَرُوۡہَا (30:9)** یہ قریش جو تمہارا مذاق اڑا رہے ہیں کہ اتنی ننھی سی جماعت ہے اور اس کے بل بوتے پر نصرتِ خداوندی کے دعویدار بنے پھرتے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ایک دن تم دیکھو گے کہ تمام نظام ہائے عالم کے اوپر یہ نظام فاتح ہوگا' غالب آئے گا۔ کہا کہ ان سے کہو کہ یہ راستے جن پہ تم صبح و شام چلتے رہتے ہو' ان میں تم اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات دیکھتے ہو' ان کی کہانیاں تمہارے ہاں از بر ہیں' بچوں سے بڑوں تک سب ان کی کہانیاں بیان کرتے ہیں' ان کھنڈرات کی ایک ایک اینٹ پر ان کی داستانیں لکھی ہوئی ہیں۔ تو کیا ان اقوام کے انجام سے تم نہیں سوچتے؟ تم تو ہو ہی کچھ نہیں' ان کے پاس تو بڑے بڑے ساز و سامان تھے' ان کی زمینیں سونا اگلتی تھیں۔ وہ اگلنے کا لفظ تو کسی زمانے میں یونہی محاورہ تھا' اب تو واقعی عرب کی یہ جتنی زمینیں ہیں سونا اگل رہی ہیں۔

اگر پانی کشتی پر غالب آ جائے تو پھر وہ ڈوب جاتی ہے

کہا کہ انہوں نے بڑی بڑی بستیاں بسا رکھی تھیں۔ **کَانُوۡۤا اَشَدَّ مِنۡہُمۡ قُوَّۃً (30:9)** ان کے پاس بڑی قوت تھی۔ **وَ جَآءَتۡہُمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ (30:9)** ان کی طرف تو خدا کے فرستادہ آئے کہ طبعی اسباب کی یہ ساری قوت جو تم نے حاصل کر لی ہے تم اِسے اقدارِ خداوندی کے تابع رکھو' ورنہ یاد رکھو! یہی پانی جو کشتی کے اندر آ کر پڑ گیا تو اسی کے بوجھ سے کشتی ڈوب جائے گی۔ پانی کشتی کے تیرنے کا سہارا ہوتا ہے بشرطیکہ وہ کشتی پانی پر غالب رہے لیکن جب وہ پانی کشتی پہ غالب آ جاتا ہے تو وہی پانی اُسے ڈبو دیتا ہے۔ کہا کہ یہ جس قدر ان کی خوشحالیاں تھیں' ان کا افراطِ زر' ان کی اتنی دولت تھی وہ جب ایسا پانی بنا کہ وہ کشتی کے اندر آ گیا تو اُسی نے ان کی کشتیوں کو ڈبو دیا۔ تمہاری آنکھوں کے سامنے ان کے یہ کھنڈرات ہیں تو کیا تم انہیں نہیں دیکھتے کہ جو آخری فیصلہ ہے وہ طبعی سامان سے نہیں ہوتا بلکہ Values (اقدار) کے تابع ہوتا ہے۔ یہ **وَ جَآءَتۡہُمۡ رُسُلُہُمۡ (30:9)**۔ درمیان میں جلدی

سے ایک ٹکڑا لاکر قرآن نے آگے بات پھر چلائی ہے۔ کہا کہ **فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (30:9)**۔ کیسا حسین انداز ہے قرآن کا! وہ کہانی بیان کرتے کرتے درمیان میں یہ کہہ گیا کہ وہ دیکھنا کہ وہ بستیاں ہم نے گنائی ہیں' ان کے کھنڈرات دیکھو' وہ تباہ ہوئی ہیں' برباد ہوئی ہیں۔ یاد رکھو کہ ہم یونہی کسی بستی کو تباہ نہیں کر دیتے بلکہ وہ اپنے ہاتھوں آپ تباہ ہوا کرتی ہیں۔ یہ سمجھ لیا ہے تو اب آگے چلو۔ کہا کہ **ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ (30:10)** اُسی وقت درمیان میں جو ذہن میں خیال آ سکتا تھا کہ اب خدا یہ کہے گا کہ اتنی قوتوں والے' دولت والے' افراطِ زر والے جو لوگ تھے' ہم نے ان کو اس طرح سے تباہ و برباد کر دیا تو دیکھتے نہیں ہو کہ ہم کتنی سختی سے پکڑتے ہیں' ہم ہڈیاں توڑتے ہیں۔ کہنے لگے کہ یہ بات نہیں ہے' ہم کسی کو ظلم و زیادتی سے تباہ نہیں کیا کرتے' بلکہ یہ سب اپنے اوپر ظلم و زیادتی کیا کرتے ہیں جو تباہ ہوا کرتے ہیں۔

جنتی اور جہنمی معاشرے کا بنیادی فرق: طبقاتی انداز سے ناہمواریاں پیدا کرنا ہے

قرآن کریم نے کہا کہ **ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ (30:10)** ہوتا یہ ہے کہ جب معاشرے کے اندر ناہمواریاں پیدا کی جاتی ہیں' جہاں بھی دولت کا اور قوت کا اور خوشحالیوں کا ذکر آئے گا تو یہ وہ قومیں ہیں جو اس کی وجہ سے طبقاتی ناہمواریاں پیدا کرتی ہیں۔ یعنی ایک طبقہ جو اتنی زیادہ دولت کا مالک بنتا ہے تو وہ ایک طبقے سے دولت چھین کر مالک بنتا ہے۔ وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا نوٹ نہیں چھاپ رہا ہوتا بلکہ وہ جو صبح سے شام تک محنت کرتا کرتا مر جاتا ہے' تو اُس بیچارے کو شام کو جو چار پیسے ملتے ہیں' وہ لے کر گھر تک چلتا ہے تو راستے میں جو کچھ اپنے گھر کے لیے نمک تیل لکڑیاں وغیرہ لینی ہوتی ہیں' اُس میں سے یہ 75% دوسروں کو دیجاتا ہے۔ یہ نوٹ وہ ہوتے ہیں۔ کیا لفظ ہے **اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى (30:10)** ناہمواریاں پیدا کرنا۔ یہ ناہمواریاں تھیں جو پیدا ہوئی تھیں۔ آپ نے کبھی اس پہ بھی غور کیا ہے کہ جنت کی نعما کا' آسائشوں کا' ستائشوں کا' آرائشوں کا ذکر کیا جاتا ہے کہ اُس سے آگے انسان کا تصور ہی نہیں جا سکتا۔ اتنی بڑی خوشحالی کی زندگی' اتنی بڑی امارت کی زندگی لیکن اُس میں کسی ایک غریب کا نام نہیں آتا' کوئی ایک محروم نہیں ہوتا بلکہ ان سب کو یکساں طور پہ وہ زندگی ملتی ہے۔ اُسی کو طبقاتی انداز سے ناہمواریوں میں تقسیم کیجیے تو جہنم ہو جاتی ہے۔ اور ایسے تقسیم کیجیے کہ ہر ایک کا لیول وہی ہوتا ہے تو وہ جنت ہوتی ہے۔ یہ ہے **اسآء وا السوی**۔ یہ جو ظلم کہا تھا تو یہ وہ ظلم تھا کہ وہ دوسروں کی محنت میں کمی کرتے تھے۔

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں محنت کے معاوضہ کے بجائے اس کے ماحصل کا تصور پیش کیا ہے

ضمناً ایک بات یاد آ گئی اس کو ذہن میں رکھیے گا۔ یہ جو ہمارے ہاں ہے کہ مزدور کو اُس کی محنت کا صحیح معاوضہ ملنا چاہیے' تو یہ بڑا

فریب انگیز ہے۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ یہ تو بڑا صحیح ہے کہ محنت کا معاوضہ صحیح ملنا چاہیے۔ یہ جو معاوضہ ہے یہی تو سارا ظلم ہے' یہی تو تباہی کا نکتہ ہے۔ معاوضہ دینے والا معاوضہ مقرر کرتا ہے' مزدور خود اپنا معاوضہ مقرر نہیں کرتا بلکہ وہ مقرر کرتا ہے۔ قرآن معاوضہ نہیں کہتا۔ عزیزانِ من! سنیے اور جھوم جائیے۔ قرآن کہتا ہے کہ محنت کش یا کام کرنے والے کو اُس کی محنت کا ماحصل ملنا چاہیے۔ **لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53:39)** میں **ماسعی** کا ترجمہ ہی ماحصل ہے۔

خدا تعالیٰ اپنے کسی قانون کے رخ کو کسی دوسری طرف نہیں بدلتا

قرآن حکیم کہتا ہے کہ **عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ (30:10)** ان سے کہتے تھے کہ یاد رکھو! اس کا انجام تباہی ہے۔ اور وہ کہتے تھے کہ کوئی تباہی نہیں ہوتی۔ وہ اتنا ہی نہیں کہتے تھے بلکہ ان لوگوں کا مذاق اُڑاتے تھے کہ یہ کہتے ہیں اس قسم کے نظام کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ ایک دوسری جگہ اس چیز کو اور بھی خوبصورت الفاظ میں بیان کیا ہے: **اسْتِكْبَارًا فِى الْاَرْضِ (35:43)** پہلی قوموں کے متعلق یہ کہا کہ استکبار یعنی تکبر کرتی تھیں۔ **وَ مَكْرَ السَّيِّئِ (35:43)** اور ایسی سازشیں کرتی تھیں جو اس قسم کی ناہمواریاں پیدا کریں۔ یہ ساری ان کے مخالفین کی طرف سے ہو تو سازش کہلاتی ہے' اگر ان کی اپنی طرف سے ہو تو پلاننگ (Planning) کہلاتی ہے۔ تو یہ ساری اس قسم کی جو پلاننگز (Plannings) ہیں' اس کے متعلق کہا کہ **وَ لَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ (35:43)** یاد رکھو! اس قسم کی پلاننگز (Plannings) کرنے والوں کا انجام انہی کے خلاف الٹ کے پڑتا ہے۔ کہا کہ **فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ (35:43)** کیا یہ اسی انتظار میں ہیں کہ جو حشر پہلوں کا ہوا تھا' وہی ان کا ہو؟ اگر اس انتظار میں ہیں تو ان سے کہہ دیجیے کہ **فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (35:43)**۔ خدا کی سنت میں کبھی تبدیلی نہیں آیا کرتی' خدا کی روش کا تبدیل ہونا تو ایک طرف رہا اُس کا رخ بھی نہیں بدلا کرتا کہ رخ تمہاری طرف ہو اور وہ اُدھر جا نکلے۔ ایسا بالکل نہیں ہوا کرتا۔ پھر انتظار کرنا ہے تو کرو۔ اصول یہ بیان کیا تھا کہ اس قسم کے ناہمواریاں پیدا کرنے والے جو پلاننگز (Plannings) یا تدابیر یا سازشیں ہیں تو انجامِ کار یہ پلٹ کر انہی کے اوپر آیا کرتی ہیں۔ یہ ہے جو کہا تھا کہ ہم نے تو ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے آپ پہ ظلم کیا تھا۔ کہا کہ **وَ كَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ (30:10)** یہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا رہا اور وہ تھے کہ اس کا مذاق اڑاتے رہے۔

اقدارِ خداوندی کے تابع عالمِ انسانیت ایک تندرست اور صالح بیج کی مانند نشوونما پاتی ہے

نظامِ کائنات میں تم دیکھو کہ ہم کیا کرتے ہیں؟ **اَللّٰهُ يَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ ثُمَّ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ (30:11)** ہر شے کی ابتدا ایک ننھے سے بیج سے ہوتی ہے' اگر وہ قانونِ خداوندی کے مطابق بیج صالح ہے یعنی پہلی شرط یہ ہے کہ اُس میں اگنے کی صلاحیت ہے' دوسری شرط یہ ہے کہ قانونِ خداوندی نے اس کے اگنے کے لیے جتنے ذرائع مقرر کیے ہیں کہ زمین یعنی **Soil** کا اچھا ہونا' اُس میں کھاد ہونا' پانی وقت پہ ملنا' روشنی کا ملنا' حرارت کا ملنا' اگر یہ سارا کچھ ہو تو پھر اُسے ہم گردشیں دیتے ہوئے بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ **ثُمَّ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ (30:11)** اور وہ ہماری مقرر کی ہوئی منزل کی طرف آ جاتا ہے۔ یہ ہے جو عالمِ انسانیت میں بھی ہونا چاہیے۔ ان بڑھنے' پھولنے' پھلنے والی اقدار کے مطابق اگر نظام قائم کرتے چلے جاؤ گے تو اُس میں نشوونما ہوتی چلی جائے گی' تمہاری ذات کی **Development** (نمود) ہوتی چلی جائے گی۔ وہ جو ہم نے آخر میں انسانیت کی منزل' نصب العین حیات مقرر کی ہے یہ انسانیت وہاں چلی جائے گی۔

لفظ مجرم کا قرآنی مفہوم اور اپنی داستانِ غم

یہ انسانیت تو اُس منزل کی طرف چلی جائے گی لیکن **وَ يَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَةُ يُبۡلِسُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ (30:12)** یہ اپنے ہاں قانون شکن کو مجرم کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ جب ان کے سامنے انقلاب آ کھڑا ہو گا' تو ان بڑے بڑے سرکش' مجرموں پر ہر طرح کی مایوسیاں چھا جائیں گے۔ عربوں کے ہاں بنیادی طور پہ جرم اُس کو کہتے تھے کہ ''کسی دوسرے کے درخت کی پھلدار شاخ کو کاٹ کر اپنے گھر لے جانا۔''

دانہ ایں می کارد آں حاصل بُرد
اُمّتے بر امتے دیگر چرد

ایک قوم کی کھیتی دوسری قوم چر رہی ہے' بوتا یہ ہے کاٹتا وہ ہے۔ اس نظام میں تو کیفیت یہ ہے لیکن **يَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَةُ (30:12)** جب ہمارے نظام کے تابع انقلاب آئے گا تو اُس انقلاب میں وہ جو دوسروں کے پھلوں کو کاٹ کر لے جائیں گے تو سب سے زیادہ مایوس وہ ہونگے۔ **وَ لَمۡ يَكُنۡ لَّهُمۡ مِّنۡ شُرَكَآئِهِمۡ شُفَعٰٓؤُا وَ كَانُوۡا بِشُرَكَآئِهِمۡ كٰفِرِيۡنَ (30:13)** یہ سازشیں' یہ تدبیریں تنہا نہیں ہوا کرتیں بلکہ ان کے ساتھ بہت سے مشیر بھی ہوتے ہیں' صلاح کار بھی ہوتے ہیں۔ یہ سارے ان کے اس دور کے یار ہیں۔ جب وہ انقلاب کا دور آتا ہے تو اس سے ہر ایک انکار کر دیا کرتا ہے' مکر جاتا ہے اور کہہ دیا کرتا ہے کہ

صاحب! ہم تو ساتھ تھے ہی نہیں، ہم اس میں شریک نہیں تھے۔" دھیے نی! تُوں گل سن، نونہے نی! تُوں کن کر۔" ❶ یہ باتیں اقوامِ سابقہ کی ہورہی ہیں۔ ذرا توجہ دیجیے تو لگتا ہے کہ

ارے دل، یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

یہ اپنی داستاں ہی نہیں بلکہ انسان کی داستان ہے۔ انسان کی تاریخ بیان ہورہی ہے۔ جہاں یہ ہوگا وہاں یہی ہوگا، وہ ہزار سال پہلے ہو یا دس ہزار سال پہلے یا آج کے زمانے میں ہو یا آنے والے زمانے میں، ہوتا یہی ہے۔ یہ **فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (35:43)** ہے۔ **وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ (30:14)** انقلاب کی گھڑی آنے دیجیے، ان میں نفسا نفسی پڑ جائے گی، ایک کے ساتھ دوسرا وہاں کھڑا نہیں ہوگا، جی چرائے گا کہ کہیں کوئی یہ نہ کہہ دے کہ یہ بھی اس کا ساتھی تھا۔ کہا کہ یہ جو کھنڈرات تمہیں نظر آرہے ہیں یہ ایسے ہی بارشوں اور زلزلوں سے نہیں ہوگئے تھے بلکہ وہ ان چیزوں کا نتیجہ تھا۔ ان کی یہ کیفیت ہوگئی اور دوسری طرف کہا کہ **فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ (30:15)** ان کے برعکس جن لوگوں نے خدا کی ان اقدار اور قوانین پر یقینِ محکم رکھ کر ان کے مطابق نظام قائم کیا ہوگا تو ان کے لیے قرآن کہیں جنت کہتا ہے، کہیں روضہ کہتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ عربوں کے پس منظر میں تو میل ہا میل تک کہیں درخت تو ایک طرف جھاڑی تک نظر نہیں آیا کرتی تھی۔ جہاں کہیں چھوٹا سا چشمہ ہوا اور وہیں چار درخت نخلستان کے بھی ہوئے تو وہ ان کے ہاں جنت کہلایا کرتی تھی۔ ہم پانی کی اور سبزے کی قدر نہیں کرسکتے یہ تو عربوں سے پوچھیے۔ ہمارے ہاں بھی یہ جو تھل کے علاقے ہیں، وہاں معلوم ہوتا ہے کہ سبزے کی اہمیت کتنی ہے۔

عربوں کے ہاں جنت کا تصور اور قرآنِ حکیم کا بیان

قرآنِ کریم نے جنت کی جتنی بھی تفاصیل دی ہیں تو میں نے عرض کیا ہے کہ انہی کو عربوں کی زندگی کے بیک گراؤنڈ (پس منظر) میں دیکھنا چاہیے کہ وہ کیا کیفیت تھی، ورنہ ذہن میں یہ آتا ہے کہ آبِ رواں بھی جنت میں کہا تو ہمارے ہاں تو کوئی اس کو Appreciate (پسند) نہیں کرسکتا۔ یہ عرب سے پوچھیے کہ جہاں پانی کا چشمہ ہوتا تھا تو وہاں ڈیرہ ڈال لیتے تھے اور جب وہاں سے پانی سوکھ جاتا تھا تو خانہ بدوش وہاں سے چل کر پھر کسی اور چشمہ پر آباد ہوتے تھے۔ اگر اُنہیں آبِ رواں مل جائے تو پھر تو پوچھو ہی نہیں پھر تو موج ہوگئی: درختوں کے سائے، جھکے ہوئے درخت، پھلوں سے لدے ہوئے درخت، دودھ کی رواں ندیاں، شہد کی رواں

---

❶ اے بیٹی! تُو بات سُن، اے بہو! تو ذرا غور کر، توجہ دے۔

ندیاں' سبزہ زار' گلستان' پرندوں کے چہچہے اور اُس کے بعد جب رومن ایمپائر اور ایران کی تہذیب بھی سامنے آئی' یہ جسے آپ ایرانی قالین کہتے ہیں تو ان کا بھی ذکر قرآن میں ہے' یہ حریر و اطلس کے پردے' عالی شان صوفے وہاں بتائے گئے' اور پرندوں کا گوشت بھی۔ آپ اس کو نہ بھولیے کہ یہ ہر ایک کو دیا جا رہا ہے۔ یہ وہ نقشہ ہے جو قرآن نے جنت کا کھینچا ہے کہ ہر قسم کی آسائشیں ہونگی۔ اس میں ایک لفظ **یحبرون** آ گیا ہے۔ ویسے تو عربوں کے ہاں ہر وہ شے جس میں زیبائی اور رعنائی اور دلکشی اور خوبصورتی اور جنتِ نگاہ ہو تو اُس کے لیے یہ لفظ استعمال کیا کرتے تھے حتیٰ کہ یہ لکھنے والی روشنائی جو ہے اُس کے لیے بھی استعمال کرتے تھے۔ گویا ہر شے جس میں رعنائی ہو اور زیبائی ہو اور دلکشی ہو اُس کے لیے استعمال کرتے تھے۔ میں نے اِسے جنتِ نگاہ کہا ہے۔

فنونِ لطیفہ میں موسیقی جیسی نعمت بھی جنت کا خاصہ ہوگی

آپ حیران ہونگے کہ عربوں کے ہاں فردوسِ گوش کو بھی **حبو** ہی کہا کرتے تھے' بہترین موسیقی کو بھی **حبو** کہتے تھے۔ اور جنت کے لیے یہ ذکر آیا ہے کہ **رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ (30:15)** بہترین موسیقی بھی وہاں ہوگی۔ انسان کو یہ صرف روٹی پہ ہی جینے والا جانور نہیں بنایا' یہ تو حیوانی زندگی ہے بلکہ اس کو تو حسِ لطیف بھی دی گئی ہے۔ فنونِ لطیفہ سے جو Appreciation (نگاہِ استحسان) ہے یہ خاصۂ انسانیت ہے' یہ اس کو Appreciate (پسند) کرتا ہے۔ پچھلے ہی پرچے [1] میں میرا وہ آرٹیکل شائع ہوا ہے ''اسلام اور آرٹ'' تو اُسے ذرا ایک نظر دیکھیے۔ قرآنِ کریم نے آرٹ کے متعلق بتایا ہے کہ اس کے کون کون سے گوشے ہیں' اصل تو یہ ہے کہ اس نے ان کو کس حسن و کیف سے بیان کیا ہے! آپ سوچتے ہیں کہ جب فنونِ لطیفہ میں وہ ان چیزوں کو اس طرح سے بیان کرے تو یہ جو موسیقی ہے یہ تو فنونِ لطیفہ میں بلند تریں مقام ہے۔ اتنا وقت نہیں کہ میں اس تفصیل میں جاؤں لیکن بہرحال اس کا اثر براہِ راست انسان کے جذبات کے اوپر ہوتا ہے۔ اب آپ کہیں گے کہ ہمارے ہاں تو یہ بحث چلی آتی ہے کہ صاحب! موسیقی حرام ہے۔ پہلے تو یہ سوچ لیجیے کہ یہ اتنی سی بات ہے جو جنت کی موسیقی کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہاں یہ حرام ہے۔ یہاں ہمارے مولوی صاحبان کے ہاں' کونسی چیز ایسی ہے جو حرام نہیں ہے: سونا یہاں حرام جبکہ جنت میں سب سے بڑی نعمت ہے' ریشم پہننا ان کے ہاں حرام جبکہ قرآن نے ریشمی پردے تک بیان کر دیئے لباس تو ایک طرف رہا۔ عجیب چیز یہ ہے کہ اس کو کہا جاتا ہے کہ موسیقی بھی حرام ہے اور مصوری بھی حرام ہے۔

---

[1] مجلد طلوعِ اسلام جولائی 1979 میں۔

کائناتی اشیا جو اقدارِ خداوندی کے تابع ہوں، وہ زندگی کا حسن پیش کرتی ہیں

عزیزانِ من! بات ساری یہ ہے کہ یہ فنونِ لطیفہ ہیں، ان کو Appreciate (تحسین کی نظر) کرنے کے لیے حسِ لطیف کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس میں حسِ لطیف نہیں ہوتی وہ ان کو Appreciate (پسند) نہیں کرسکتا، وہ Animal Level (حیوانی سطح) کے اوپر زندہ رہتا ہے۔ اب بجائے اس کے کہ اس کا اعتراف کریں کہ صاحب! یہ چیز ہمارے حسِ لطیفہ سے بلند ہے، ہمیں یہ چیز دی نہیں گئی، ہمیں اس سے نوازا ہی نہیں گیا۔ جس چیز سے وہ خود محروم رہ رہے ہیں، اُس کو انہوں نے حرام قرار دیدیا ہے۔ عزیزانِ من! ویسے تو دنیا کی ہر شے جو حلال سے حلال تر ہے، اگر وہ اقدارِ خداوندی کی حدود سے تجاوز کر جاتی ہے تو حرام ہو جاتی ہے۔ اور اگر وہ ان اقدار کے تابع رہتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو بھی انسان کے لیے پیدا کیا ہے، بجز ان کے کہ جن کو اس نے بہ نصِ صریح خود حرام کہہ دیا ہے، اس کے علاوہ اور کوئی چیز انسان کے لیے حرام نہیں ہے بشرطیکہ وہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے یہ کچھ کرے۔ اس ضمن میں اقبالؒ (1877-1938) کے دو چار شعر یاد آ گئے:

وہ نغمہ سردیٔ خونِ غزل سرا کی دلیل
کہ جس کو سُن کے ترا چہرہ تاب ناک نہیں
نَوا کو کرتا ہے موجِ نفس سے زہر آلُود
وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں

(ضربِ کلیم: موسیقی)

انہی کا ایک اور شعر ہے:

اگر نَوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب!

(ضربِ کلیم: سرودِ حرام)

جنت کی موسیقی میں تو حیات کا پیغام ہوتا ہے۔ ہر وہ شے جس میں ضعف اور ناتوانی کا پیغام ہے وہ آپ کے ہاں کی فقہ کی رو سے خواہ کتنا ہی آپ اس کو حلال کہہ لیں لیکن وہ قرآن کی اقدار کی رو سے حرام ہوگی۔ حدودِ خداوندی کے اندر رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ

نے جو بھی انسان کے لیے پیدا کیا ہے اُس سے تمتع ہونا اور زندگی اور حیات حاصل کرنا عین حلال اور منشائے قرآن کے مطابق ہے۔ **فِیْ رَوْضَةٍ یُّحْبَرُوْنَ** ❶ (30:15) اُس معاشرے کے اندر جس کا قرآن نے کہا ہے ہر قسم کی رعنائی' زیبائی' دلکشی' جنتِ نگاہ اور فردوسِ گوش ہوگی۔ اُس کے بعد کہا ہے کہ **وَ اَمَّا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ لِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِکَ فِی الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ** ❷ (30:16) اس کے برعکس جو ان صداقتوں کے انکار پہ چلنے والے ہیں تو پوچھو نہیں کہ یہ کس قسم کے جہنم کے اندر زندگی بسر کریں گے۔

عزیزانِ من! سورۃ الروم کی آیت 16 تک ہم آ گئے 17 ویں سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

---

❶ وہ زندگی کی شادابیوں اور خوشگواریوں سے بہرہ یاب (42:22) اور نغماتِ حیات آور سے لذت اندوز ہوں گے (43:70) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔932)۔

❷ اور جو لوگ ہمارے قوانین کی صداقت سے انکار کرتے ہیں اور ان کی' اور مستقبل کی زندگی کی تکذیب کرتے ہیں' وہ اپنے آپ کو تباہیوں کے اندر موجود پائیں گے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔932)۔

دوسرا باب: سورة الروم (آیات 17 تا 24)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج اگست 1979ء کی 10 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الروم کی آیت 17 سے ہو رہا ہے:(30:17)

ہمارے ہاں قرآنی تراجم نے قرآنِ حکیم کی تعلیم کو محدود سے محدود تر کر دیا ہے

ارشادِ خداوندی ہے کہ **فَسُبۡحٰنَ اللّٰہِ حِیۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَ حِیۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ o وَ لَہُ الۡحَمۡدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ عَشِیًّا وَّ حِیۡنَ تُظۡہِرُوۡنَ** (30:17-18)۔ان دو آیات کا عام لفظی ترجمہ تو آپ کو یہی نظر آئے گا کہ صبح کا وقت ہو یا شام کا، سبحان اللہ، اُس کے لیے حمد ہے۔ سماوات اور ارض میں رات کا وقت ہو یا دوپہر کا۔ اس سے آپ نے دیکھا کہ محض ان تراجم سے نہ آپ کے دماغ پر کوئی خاص اثر ہوا ہے، نہ دل پہ کوئی چوٹ پڑی ہے، نہ ادراک میں اور نہ جذبات میں کسی قسم کا کوئی تحرک پیدا ہوا ہے: سبحان اللہ صبح ہو یا شام، الحمدللہ رات ہو یا دوپہر۔ لیکن جب قرآن کی گہرائیوں میں جائیے تو نظر آتا ہے کہ قرآن انہی

لفظوں کے اندر کیا کیا کچھ نہیں کہہ جاتا۔ ان الفاظ کے دو پہلو ہیں: ایک تو یہ ہے کہ پیچھے سے سلسلہ یہ چلا آ رہا تھا کہ جو لوگ صرف ایک خدا کے قوانین کے سامنے جھکنے والے ہیں' ان کا سینہ کس طرح خوف اور حزن سے پاک ہو جاتا ہے اور کتنی بیبا کیوں کا محور اور آماجگاہ بن جاتا ہے' ان کی زندگی کس قدر جنت کی زندگی ہوتی ہے۔ اور اُس کے مقابلے میں جو لوگ ان قوانین کے خلاف چلتے ہیں' وہ کس طرح اضطراب اور درد اور اذیت کے جہنم میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ قوموں کے تغیرات کا ذکر آ رہا تھا تو اُسی ربط کے اندر اگر ان آیات کو دیکھا جائے گا تو میں ابھی عرض کرونگا کہ قوموں کے اشارے سے' ان کی نسبت سے' ان الفاظ کے اندر کیا معنویت پوشیدہ ہے۔ لیکن ایک چیز اور ہے جس سے نگاہ کا رخ دوسری طرف چلا جاتا ہے۔

رزق کی فراوانی سے معمور' خوف وحزن سے پاک اور ذوقِ جمالیات سے سرشار زندگی' بندۂ مومن کی میراث ہے

جنت کے متعلق اور نعما گنانے کے بعد اُس نے کہا تھا کہ **فِىْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ** (30:15)۔ اس میں ایک تو جنت کو نہایت سرسبز وشاداب باغ کہا اور اُس باغ کے اندر حسن و جمال' زیبائی اور رعنائی کی تمام جتنی بھی بلند ترین خوبصورت چیزیں ہوتی ہیں' ان کا ذکر کیا۔ میں نے کہا تھا کہ اس **یحبرون** میں فردوسِ گوش موسیقی کا بھی ذکر ہے۔ گویا جن چیزوں کا تعلق انسان کی حسِ لطیف سے ہے' جسے ذوقِ جمالیات کہتے ہیں' اُس کی تسکین کا سامان بھی مہیا کیا جاتا ہے۔ حیوانی سطح تک جو زندگی ہے اس میں افادی پہلو ہے جسے انگریزی میں Utility (افادیت پہلو) کہتے ہیں۔ یہ چیزیں ان کی طبعی زندگی کے لیے مفید ہوتی ہیں: گھاس ہے' چارہ ہے' درختوں کے پتے ہیں' یہ تمام چیزیں ہیں۔ یہ صرف ان کی طبعی زندگی کے تقاضے کو پورا کرنے کی چیزیں ہوتی ہیں' اس سے زیادہ ان میں ذوقِ جمالیات کی بات نہیں ہوتی۔ لیکن جب انسان کی زندگی شروع ہوتی ہے تو جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ انسان صرف روٹی کے سہارے زندہ نہیں رہتا بلکہ اس میں ایک اور چیز بھی دی گئی ہے جسے آپ ذوقِ جمالیات (Aesthetic Sense) کہیں گے۔ یہ انسانی سطح کی خصوصیت ہے۔ یاد رکھیے کہ جس میں Aesthetic Sense (جمالیاتی حِس) نہیں ہوتی اُس کی Development (نشوونما) میں کمی رہ گئی ہوتی ہے' وہ حیوانی سطح کے اوپر ہوتا ہے' وہ انسانی سطح پر نہیں پہنچ سکتا کیونکہ فطرت نے جو اپنا شاہکار پیدا کیا ہے اسے اس نے جسے احسنِ تقویم کہا ہے تو اس کے اندر یہ دونوں چیزیں ہیں۔ افادی پہلو بھی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ روٹی بھی ضروری ہے لیکن بکری اور بیل کی طرح کی روٹی نہیں کہ صرف چارہ مل گیا اور زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔ آپ غور کیجیے کہ اگر صرف افادی پہلو ہی ہوتا تو کیا ہوتا؟ سنیے! گلاب کا پھول بڑی دوائیوں کے کام آتا ہے' یہ اُس کا افادی پہلو ہے یہ تاثیر اُس پھول کے اندر ہے۔ اگر مقصد صرف افادی پہلو ہوتا تو اُس پودے کی جڑوں میں' اُس کی شاخوں میں' اُس کے پتوں میں' اُس کے کانٹوں میں بھی' یہ تاثیر رکھ دی جاسکتی تھی لیکن اس کے ساتھ ایک اور چیز بھی ہے۔

ذوقِ جمالیات سے لطف اندوز ہونے والی چشمِ بینا کی کیفیت

عزیزانِ من! یہ کیا ہے کہ وہ جو تاثیر ہے اُس کے لیے ان شاخوں، جڑوں، کانٹوں کے اوپر حسن و زیبائی کا ایک مجسمہ، قہقہہ مارتا اور مسکراتا ہوا آپ کے سامنے آتا ہے:

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

آپ اُس کے پاس سے آنکھیں بند کر کے نہیں گزر سکتے۔ بکری اور بیل تو گزر جائیں گے اور وہ انسان بھی گزر جائے گا جو اس سطح کے اوپر زندگی بسر کر رہا ہے۔ جو انسانیت کی سطح پہ پہنچ جاتا ہے وہ اُس سے ایسے نہیں گزر جاتا۔ وہ کیا چیز ہے جو اُس کی نگاہوں کو کھینچ رہی ہے۔ وہ اس کے ذوقِ جمالیات کی تسکین ہے۔ یہ کتنی ضروری ہے، اُس کی تو ایک ہی دلیل کافی ہے کہ خالقِ کائنات نے اس کی ربوبیت کے لیے جو چیزیں پیدا کی ہیں وہ صرف افادی پہلو لیے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر ذوقِ جمالیات کی تسکین کا پہلو بھی موجود ہے۔ یہ تو خالقِ کائنات کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں۔ اُس کا تو کوئی ذرا سا کام بھی بے مقصد اور بے مطلب نہیں ہوتا۔ ایسے ہی نہیں اُس نے پھول میں رنگینیاں اور رعنائیاں پیدا کر دیں۔ میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ اگر مقصد صرف Utility Value (افادی قدر و منزلت) ہوتا یعنی افادی پہلو ہوتا تو کیکر (ببول) کے کانٹوں میں بھی یہ چیز رکھی جا سکتی تھی۔ اُس کے لیے یہ رنگینیاں، رعنائیاں، خوشبو اور نزاکت کیوں رکھی؟ کبھی کھڑے ہو کر اُس پتی کو لے کر دیکھیے کہ ایک حسن کی پوری دنیا اُس کے اندر مسکراتی ہوئی، ناچتی ہوئی، نظر آتی ہے بشرطیکہ نگاہ انسانی سطح پہ پہنچی ہوئی ہو۔ آپ حیران ہونگے کہ قرآنِ کریم نے شروع سے آخر تک ان دونوں پہلوؤں پہ زور دیا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے وہ بات آ گئی تھی لیکن چونکہ وہ دیر کی بات ہے، وہ سورۃ النحل ❶ تھی جس میں یہ بات سامنے آئی تھی لیکن چونکہ یہاں بھی وہ بات پھر آئی ہے تو وہ جو میرا انداز قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کا تصریفِ آیات کی رو سے ہے تو میں نہیں چاہتا کہ اس طرح جو میں نے کہا ہے کہ کھلے ہوئے پھول کے پاس آدمی یونہی گزر جائے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح سے یہ بھی میرے لیے مشکل ہے کہ اس مقام پہ میں آؤں اور وہ جو قرآنِ کریم نے مقام پیش کیا ہے اُس سے ویسے ہی گزر جاؤں۔

آپ غور کیجیے کہ Aesthetic Sense (ذوقِ جمالیات) پر قرآن نے کتنا زور دیا ہے! ذکر مویشیوں کا آ رہا ہے، بتایا جا رہا ہے کہ دیکھو تمہارے لیے یہ مویشی کس قدر افادیت کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ ان کا گوشت کھاتے ہو، ان کا دودھ پیتے ہو، ان کی اون سے تم کمبل اور کپڑے بناتے ہو، خیمے بناتے ہو، ان کی کھالوں سے مختلف قسم کی اپنی مفیدِ مطلب چیزیں بناتے ہو۔ دیکھتے ہو کہ ایک

---

❷ اس کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن، سورۃ النحل، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2003، ص ص۔ 9 تا 16۔

ایک مویشی کے اندر کس قدر افادیت کے پہلو پنہاں چلے آتے ہیں۔ یہ بالکل صحیح بات ہے۔تو یہیں تک ہی بات رُہنی چاہیے تھی۔ کہا کہ یہیں تک بات نہیں ہے۔ میں نے جو لفظ کہا تھا کہ ذوقِ جمالیات بھی ہے' یہ میری اصطلاح نہیں ہے۔ یہ سارا گنانے کے بعد کہا کہ **مَنَافِعُ وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ** (16:5) یہ تمہاری منفعت کی چیزیں ہیں' یہ افادی پہلو لیے ہوئے ہیں' یہ اس کا Utilitarian Aspect (افادیت پہلو) ہے۔ یہ کہہ کر ساتھ ہی ساتھ آگے بڑھ جانا چاہیے تھا۔لیکن نہیں' کہا کہ **وَ لَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ** (16:6) عزیزانِ من! یہ مقامات ہیں جہاں انسان کی بصیرت وجد میں آجاتی ہے۔ افادی پہلو سے تو صرف انسان کی طبعی اور حیوانی زندگی کی تسکین مقصود ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی کہا کہ **وَ لَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ** ❷ (16:6)۔ ذہن میں نہیں آسکتا کہ مویشیوں کا ذکر ہو رہا ہے تو ان میں جمال کا پہلو کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ جو بات کہی گئی ہے اُسے ہم شہر کے رہنے والے تو شاید Appreciate (پسند) ہی نہ کر سکیں' ہمیں یہ چیزیں نصیب ہی نہیں ہوئیں۔

قرآن حکیم کی دفتین کے ایک ایک ورق پر ذوقِ جمالیات کے مناظر بکھرے دیکھائی دیتے ہیں

اول تو ویسے ہی افادی (Utility) چیزوں کی جو پریشانیاں ہیں اُنہوں نے اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ ہم انسانی سطح کے اوپر آئیں۔ جیسا میں کہا کرتا ہوں کہ گدھا اور اُس کا کمہار سارا دن اتنا سفر کرتے ہیں' کمہار گدھے سے بھی زیادہ سفر کرتا ہے۔ وہ جب واپس آتا ہے تو گدھے کے چارے کا فکر گدھے کو نہیں ہوتا' اُسے یہ پریشانی نہیں ستاتی کیونکہ اُس کے لیے تو کمہار لے آتا ہے لیکن اپنے اور اپنے بچوں کی روٹی کا فکر گدھے والے کو ستاتا ہے۔ انسان ان پریشانیوں میں مبتلا ہے جن میں حیوان مبتلا نہیں ہے۔ ایک تو اتنی ہی فرصت کہاں کہ ''تیری تمنا کرے کوئی'' اور ویسے بھی ہمیں یہ مواقع میسر نہیں۔ میں اس لیے اس پہ زور دے رہا ہوں کہ آگے جو دو الفاظ آرہے ہیں یہ سمجھ میں نہیں آسکتے تاوقتیکہ وہ مناظر ہم نے خود نہ دیکھیں ہوں۔ کہا کہ جمالیات کا پہلو دیکھنا چاہتے ہو؟ آؤ تمہیں بتائیں کہ **حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَ حِيْنَ تَسْرَحُوْنَ** (16:6) صبح کی اذان کے ساتھ' نور کے تڑکے' آخری تارے جگمگا رہے ہوں' چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی ہو' فضا گرد مرمریں سے بھری ہوئی ہو' عین اُس سکوت کے عالم میں گاؤں سے مویشیوں کا گلہ جس طرح خراماں خراماں باہر چراہ گاہوں کی طرف جاتا ہے کہا کہ اگر تمہاری آنکھوں میں خدا نے بصیرت دی ہے تو پوچھو نہیں کہ کتنے حسن و جمال کی رعنائیاں ان میں پوشیدہ ہیں! میں تو گاؤں کا رہنے والا تھا' مجھے پتہ ہے کہ یہ منظر کیا ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! خدا بیان کر رہا ہے اور قرآن کے اندر بیان کر رہا ہے' افادی پہلو کے بعد کہتا ہے کہ اس کے اندر کچھ اور بھی ہے۔

---

❷ یہ مناظر حسن و جمال کی کس قدر دلآویز کیفیتیں اپنے اندر لیے ہوئے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔594)۔

اور اُس کچھ اور کے لیے وہ ایک لفظ استعمال کرتا ہے کہ اگر خدا نے دیدۂ بینا عطا کیا ہو تو ذرا اس نقشے کو سامنے لاؤ کہ وہ کیا منظر ہوتا ہے۔ یہ وہی مویشی ہیں، کچھ بھیڑیں بکریاں بھی ہونگی اُس کے ساتھ گائے بیل بھی ہوتے ہیں۔ کہتا ہے کہ اُس وقت جس انداز سے یہ چراہ گاہوں کی طرف خاموشی سے چلے جا رہے ہیں، یہ منظر کس قدر حسین ہوتا ہے! کہنے لگے کہ وہاں **حِيۡنَ تُرِيۡحُوۡنَ (16:6)** دن بھر ان کا افادی پہلو ہوتا ہے اور پھر شام کے سکوت میں جب وہ سورج ڈوبتا ہے اور وہ لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑتا ہے اُس وقت بھی نہ اندھیرا ہوتا ہے نہ روشنی ہوتی ہے، اُس کے بین بین سماں ہوتا ہے، فضا ہلکی ہلکی گرد آلود ہوتی ہے، سکوت ہوتا ہے، خاموشی ہوتی ہے لیکن یہ خاموشی صبح کی خاموشی سے مختلف ہوتی ہے۔ اُس وقت جب یہ ان چراہ گاہوں سے اُسی انداز سے لوٹتے ہیں تو اس خاموشی کو ان کی گھنٹی کی آواز توڑتی ہے۔ کہا کہ کبھی دور سے تم نے اس منظر کو دیکھا ہے کہ یہ کتنا حسین ہوتا ہے! اس انداز سے اگر یہ تمہاری نگاہ ذوقِ جمالیات کو لیے ہوئے چلتی ہو تو تم دیکھو گے کہ ہم نے تو صبح اور شام کے مناظر بنائے ہیں۔ صبح ہو، شام ہو، دوپہر ہو یا رات ہو، ہر مقام پر تم دیکھو گے کہ یہ Physical Value (طبعی قدر و منزلت) کے گوشے کے ساتھ ساتھ ذوقِ جمالیات کی تسکین کے سامان کس طرح ہم نے بکھیر دیئے ہیں! کہا کہ جب انسانی سطح پہ زندگی پہنچتی ہے تو اس کی نشوونما وارتقا کے لیے صرف روٹی کافی نہیں ہے۔ وہ روٹی تو طبعی اور حیوانی زندگی کے لیے ضرورت ہے لیکن جو انسانی زندگی ہے وہ تو اس سے آگے چلتی ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے ہاں پینٹنگز (Paintings) کے اندر بھی یہ مناظر بہت کم نظر آتے ہیں، مغرب میں یہ چیز ہے۔ آپ نے ان کے ہاں کی بہترین تصاویر کو دیکھا ہوگا جو ان کے ہاں کے پینٹنگز (Paintings) کے ماسٹرز (ماہرین) نے بنائی ہیں۔ ان تصاویر کے اندر آپ دیکھیں گے کہ کہیں کسی جاندار کا تصور تک بھی نہیں آئے گا، یونہی ایک ندی سی ہے، اُس کے اوپر ٹوٹا ہوا پل ہے، ادھر اُدھر چراہ گاہیں ہیں، دور دور درخت ہیں، ان درختوں کے اندر سے دور ڈوبتے ہوئے سورج کی شفق آ رہی ہے، شعاع آ رہی ہے۔ یہ تصویریں Master Piece (شاہکار) ہوتی ہیں۔ ان کے ہاں کے Master Pieces (شاہکارات) قرآن کے دو لفظوں کے اندر بیان کیے گئے ہیں۔ یہ ہیں پہلو کائنات کی تخلیق کے کہ جو قرآن اس طرح سے سامنے لاتا ہے لیکن پھر میں وہیں آ جاؤنگا کہ جب قومیں زوال پہ پہنچتی ہیں تو یہ ساری اس قسم کی خوشگواریوں کی چیزیں جو قلب و نگاہ اور دیدۂ بینا کے ارتقا کا موجب بنتی تھیں، وہ ان پر حرام قرار دے دی جاتی ہیں: جاندار کی تصویر بھی حرام، موسیقی بھی حرام، بہترین شاعری بھی حرام:

جنابِ شیخ سے مے کا جواز کیا پوچھیں
کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

عہدِ مغلیہ کے دورِ زوال نے ابھرے ہوئے فنونِ لطیفہ کے خوبصورت چہرے کو مسخ کر رکھ دیا

ہمارے ہاں بدقسمتی سے یہ ہوا کہ یہ جو ہمارے زوال کا ہندوستان میں آخری دور مغلیہ سلطنت کا زوال تھا وہ دور فنونِ لطیفہ کے خوبصورت چہرے مسخ کرنے میں زیادہ پنپا۔ اُس دور کے آپ کے ہاں کے جو فنونِ لطیفہ ہیں' وہ مصوری ہو' شاعری ہو' موسیقی ہو' اُس میں آپ دیکھیں گے کہ اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں یا تو بیچاروں کے اعصاب پہ عورت سوار ہے یا ان کے ہاں زوال پذیر حزن کی اور افسردگی کی کیفیت ہے۔ ہمارے ہاں بہترین شعر وہ ہوتا ہے جسے سننے کے بعد ''واہ'' نہ کہے بلکہ ''آہ'' کہے یعنی زبان سے آہ نکلے۔ بہترین موسیقی وہ ہوتی ہے کہ دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے۔ یہ زوال کے زمانے کی چیزیں ہوتی ہیں۔ قوموں کے عروج کے زمانے میں یہی جو چیزیں ہیں وہ ان کے اندر حرکت اور حرارت پیدا کرنے کا موجب بنتی ہیں۔ یہ مناظر ان کے ہاں بھی ہوتے ہیں لیکن ایک اور انداز لیے ہوئے ہوتے ہیں!

فنونِ لطیفہ میں علامہ اقبالؒ کا مقام بدرجہ اتم بلند تھا

یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اس کے بعد ہمارے ہاں ایک ایسا آرٹسٹ [1] پیدا ہو گیا جس کے سامنے قرآن کی بصیرت تھی۔ اور یہ فطرت کا عطیہ تھا کہ اُسے افادی پہلو جسے آپ فلسفہ کہہ لیجئے' پیغام کہہ لیجئے' سے بہرۂ وافر ملا تھا اور وہ ذوقِ جمالیات کے مظاہر کے کھینچنے میں بھی بڑی بلندیوں پر تھا۔ اب آپ کے ذہن میں یہ بات آئی ہو گی کہ میں کیوں قرآن کی آیات کے اندر جہاں جہاں آتا ہے وہاں جھٹ سے اقبالؒ لے آتا ہوں۔ اس میں یہ دونوں چیزیں موجود تھیں۔ گویا یہ جانتا تھا کہ قرآن نے آگے ایک بہت بڑی بات کہی ہے اور یہ کہہ رہا ہے کہ ذرا ان مناظر کو دیکھیے کہ جو صبح کے وقت مویشیوں کے گلے (Herd) میں اور شام کے وقت ان کی واپسی میں ہوتا ہے۔ اُس کو معلوم تھا کہ اس کی اہمیت کتنی ہے کہ اس تناظر میں' اس پس منظر کے اندر' بات کہی جائے گی۔ آپ دیکھیے گا اقبالؒ کے ہاں شعریت بھی اپنے معراج پر پہنچی ہوئی ہوتی ہے اور افادیت کا وہ پہلو نہیں ہے جو عرب کی شاعری میں اور مغلیہ زوال کے پیدا کردہ فنون میں ہے۔ نہ اُس میں عورت سوار ہے' نہ اُس میں حزن کی کیفیت ہے' نہ خوردگی کی کیفیت ہے بلکہ زندگی کی کیفیت ہے' حرارت کی کیفیت ہے' حرکت کی کیفیت ہے۔ لیکن یہ تمام چیزیں پابندیوں کے اندر ہیں' حدود کے اندر رہتے ہوئے ہیں۔ یہ ہے وہ بڑی خوبی۔ یوں تو کونسا درس ہے جس میں' میں اقبالؒ (1877-1938) کو پیش نہیں کرتا' بانگِ درا میں ''جوابِ خضر: زندگی'' نظم ہے اُس میں زندگی اور حرارت کا اتنا بڑا سامان ہے کہ وہ نظم یہ کہتی ہے کہ

---

[1] یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

یہ نظم ہے۔ اُس نے یہاں تک آنا ہے لیکن اُس سے پہلے وہ دلوں کو کس قدر نرماتا ہے اور کہتا ہے کہ

اے رہینِ خانہ تُو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل

صحرا میں وہی صبح نور کا تڑکا ہوتا ہے جب یہ قافلے والے اٹھتے ہیں اور وہاں اُس خاموشی کو توڑنے والی چیز' جسے بانگِ رحیل کہا ہے' وہ گھنٹی ہوتی ہے۔

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ حضر بے برگ و ساماں' وہ سفر بے سنگ و میل

عزیزانِ من! شاعری اسے کہتے ہیں:

وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح

صبح کے وقت ایک تارہ طلوع ہوا کرتا ہے۔ پوچھو نہیں کہ وہ کیا کرتا ہے!

وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح
یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیلؑ
وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیلؑ

عیسائیت کے ہاں تمدنی و سیاسی زندگی کے لیے کوئی مستقل اقدار نہیں

اقبالؒ (1877-1938) کے سامنے وہی قرآن کے دو الفاظ ہیں کہ **حِیۡنَ تُرِیۡحُوۡنَ وَ حِیۡنَ تَسۡرَحُوۡنَ (16:6)** آپ نے دیکھا کہ جس نکتے پر پہنچانا ہے تو وہ کیسے پہنچا رہا ہے کہ جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیلؑ۔

اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں
اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل

اس نے یہ قرآن سے لیا ہے' یہی جو قرآن نے دو الفاظ کہے تھے: وہ صبح کے وقت کا سماں' وہ شام کے وقت کا سماں۔تصور اُس سے لیا ہے اور اُس کے بعد جو فطرت نے صلاحیتیں دی ہیں' ان سے کام لیا ہے۔ذوقِ لطیف کی تسکین کا جو سامان ہے اُس میں یہ چیز نہ ہو کہ جذبات ہی جذبات ہوں کہ جیسے عیسائیت کے ہاں ہوا۔عیسائیت کے ہاں Laws (قوانین) نہیں ہیں' احکام نہیں ہیں' تمدنی و سیاسی زندگی کے لیے وہاں کوئی پیغام نہیں ملتا بلکہ ان کے ہاں صرف جذبات کی تسکین کا ساماں ہے۔جس قدر ان کے ہاں کی پینٹنگز(Paintings) ہیں آپ دیکھیے ان میں کوئی افادی پہلو نہیں ہے' صرف جذبات کا پہلو ہے۔

ہندوؤں کے ہاں فنونِ لطیفہ کی شکل وصورت

دوسری طرف ہمارے ہاں یہ ہندوؤں کی قوم ہے جو انسانی سطح پہ پہنچی ہی نہیں ہے۔ان کے ہاں کے سنیاسیوں' سادھوؤں کے غاروں کے اندر جا کر وہ تصاویر دیکھیے' ان کے خداؤں کے مجسمے دیکھیے' پھر اندازہ لگائیے کہ وہ کیا ہوتے ہیں: کالی سیاہ اور اتنی بڑی سرخ زبان نکلی ہوئی' گلے میں انسانوں کی کھوپڑیوں کا ہار ڈالا ہوا' چار ہاتھ ایک میں تلوار ایک میں نیزہ' اتنی بڑی بھیانک صورت۔اس میں خوف ہے' ڈر ہے' لطافت کا کوئی پہلو ہی نہیں ہے۔نیچے کی طرف آئیے تو درویشی مہاراج ہیں: آدھا دھڑ ہاتھی کے سونڈ کا اور نیچے کا دھڑ' آپ دیکھیں گے کہ ان کے ہاں یہ ذوق نہیں ہے۔

عزیزانِ من! کیا خوب بات کہہ گیا ہے بابر[1]! وہ اپنے ساتھ چند آدمی لے کر غربت کی حالت میں اپنے وطن[2] سے یہاں ہندوستان میں پہنچا تھا۔اس نے کس قسم کی نگاہ پائی تھی' اُس کے لیے آپ تزک بابری دیکھیے کہ اس کے بعد وہ صرف چار سال زندہ رہا اور چار سال ہی لڑائیوں میں مصروف رہا۔ ہندوستان کے معاشرے' ہندوستان کے تناظر' ہندوستان کے جغرافیہ' ہندوستان کی سیاحت کے متعلق اُس نے اپنی اس کتاب میں جو کچھ کہا' اُس کا کہیں جواب نہیں۔اُس کے دوست نے لکھا کہ جہاں تم گئے ہو وہ تو بہت بڑا ملک ہے وہاں اتنی بڑی قوم بستی ہے اُس کا مقابلہ تم کس طرح سے کرو گے اور کیا اس قوم پہ فتح حاصل کرلو گے؟ بابر(1483-1530AD) اُس کے جواب میں لکھتا ہے کہ اس قوم پر فتح حاصل کرنا کونسا مشکل ہے کہ جس قوم کے ذوقِ جمالیات کی کیفیت یہ ہے کہ وہ دریا کے کنارے مکان بناتے ہیں اور مکان کی پشت دریا کی طرف رکھتے ہیں۔اس کا فتح کرلینا کونسا مشکل ہے! یہ تعلق ہے انسانی زندگی میں ذوقِ جمالیات کا۔اور پھر اس قوم کی ساری تاریخ ایسی ہے کہ جو اوپر سے آیا وہ دھڑا دھڑ ان لوگوں کو مارتا دھاڑتا چلا گیا۔

---

1. ظہیرالدین بابر (1483-1530) ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کا بانی' پہلا شاہنشاہ ((1526-1530ء)۔باپ کی طرف سے ٹیمرلین اور ماں کی طرف سے چنگیز خاں کا رشتہ۔
2. مغلوں کا آبائی وطن سمرقند تھا۔اپنے باپ کے بعد 12 سال کی عمر میں ظہیرالدین بابر سلطنت فرغانہ (موجودہ ازبکستان) کا حکمران بنا۔اکتوبر 1504ء میں کابل پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے ہندوستان کا رخ کیا اور 1526ء میں سلطنتِ مغلیہ کی بنیاد رکھی۔

موسیقی کی کیفیت کیا ہے؟ مسلمانوں کی وجہ سے اب موسیقی کی صورتِ حال یہ ہے ورنہ مندروں کے گھنٹے اور گھڑیال ہیں جو سارے محلے کو سونے نہیں دیتے۔ عیسائیت کی خالص Emotionalism ہے جس میں صرف جذبات کی تسکین کا پہلو ہے' افادیت کا پہلو ہی اُس میں نہیں تھا۔ یا یہ Jews (یہودی) یا ہندو ہیں کہ ان کے ہاں جمالیات ہوتی ہی نہیں' ان کے ہاں ساری بات اس طرح ہے جس طرح بنیا ہوتا ہے کہ لکشمی ہو یعنی سارا معاملہ روپے کا ہے' زندگی کا صرف افادی پہلو ہے' ذوقِ جمالیات ہے ہی نہیں۔ قرآن آیا اور اُس نے یہ کہا کہ دیکھیے! ان کے اندر کس قدر افادی پہلو ہے اور اُس کے ساتھ ہی کہتا ہے کہ انہی کے اندر ذوقِ جمالیات کی تسکین بھی دی ہے۔

اسلام کے برعکس سیکولرازم میں صرف مادی طور پر ہی افادی پہلو کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے

اگر آپ کے ہاں صرف افادی پہلو ہی غالب آیا ہوا ہے تو یہ حیوانی زندگی ہے' یہ سیکولرازم (Secularism) ہے۔ اگر صرف جذباتی پہلو آپ کے اوپر غالب آیا ہوا ہے تو یہ موت کی زندگی ہے' یہ درحقیقت زندگی نہیں ہے' یہ جذبات انسان کی عقل وفکر وشعور کے اوپر غالب آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان دونوں کے امتزاج سے قرآن اپنی زندگی کا ایک تصور دیتا ہے کہ زندگی جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں بھی ہے اور اُس تک پہنچنے کے لیے یہ جو منظر میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے تو یہ منظر بھی اُس کے سامنے ہے۔ ان دونوں کو اکٹھا کیجیے تو پھر اسلام آتا ہے۔ خدا نے جو کہا تھا کہ ہم نے دین کو تکمیل تک پہنچا دیا ہے تو یوں تکمیل تک پہنچتا ہے کہ اُس میں دونوں پہلو ہونے چاہئیں۔

اہلِ مغرب کی ساری تاریخ کا نچوڑ یہ ہے کہ پھولوں میں رنگ تو ہے مگر خوشبو نہیں ہے

عجیب بات ہے جو میں نے ابھی پھول کے متعلق کہا ہے کہ پہلے یہ ہمارے ہاں بھی ذوق تھا لیکن اب اس قسم کا ذوق بھی ہمارے ہاں سے ختم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مغرب والوں کے ہاں ابھی تک بھی پھولوں کے ساتھ ان کی محبت و وابستگی ضرب المثل ہے لیکن ان کی بدنصیبی ہے کہ ان کے ہاں پھول میں رنگ تو ہوتا ہے خوشبو نہیں ہوتی۔ اور ان کی ساری تاریخ کا نچوڑ ہی وہ ہے کہ اُس میں رنگ ہی ہوتا ہے خوشبو نہیں ہوتی۔ یہاں یہ چیز تھی کہ ہمارے ہاں کے حکماء نے گلاب کے پھول کے افادی پہلو کے اوپر ایک کتاب لکھ دی اور جب ہمارے ہاں کے شعراء ذوقِ جمالیات کی طرف آئے تو پوچھو نہیں کہ انہوں نے پھول کی خوشبو اور رنگینیوں سے کیا کیا کام لیا۔ [1]

---

[1] ان تمام تفاصیل کے لیے یہ پمفلٹ دیکھیے: پرویزؒ' علامہ غلام احمد: آرٹ اور اسلام' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' ص ص۔ 1 تا 32۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک کائناتی امتزاج کا ذکرِ کثیر

قرآن میں اس افادی اور جمالیاتی پہلو کا امتزاج ہے۔ اب اس تناظر کی روشنی میں یہ چار الفاظ لیجیے جو قرآن نے کہے ہیں کہ **فَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ حِیۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَ حِیۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ ○ وَ لَهُ الۡحَمۡدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ عَشِیًّا وَّ حِیۡنَ تُظۡهِرُوۡنَ** [1] **(30:17-18)**۔ کیا بات ہے، صبح نور کا تڑکا ہو یا شام کا سکوت، اُس میں بھی آپ کو نظر آئے گا کہ خالقِ کائنات کی تخلیق میں کہیں کوئی کجی نہیں، کوئی نقص نہیں اور **مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ** [2] **(67:3)** تمہیں کائنات کی تخلیق میں کہیں کوئی سلوٹ نہیں نظر آئے گا۔ کہا کہ وہ اُس سے بہت دور ہے کہ اُس کی تخلیق ہو اور اُس میں کہیں ذرا سا سقم رہ جائے۔ شاعری ہے تو کہیں کوئی ذرا سا فرق پڑ جائے، موسیقی ہے تو کسی مقام کے اوپر بھی وہ بے سُرا ہو جائے یا بے تالہ ہو جائے۔ اُس کی تخلیق میں تم یہ بات نہیں پاؤ گے: **مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ (67:3)**۔ یہ لفظِ **ترٰی** محسوس چیزوں کے لیے آتا ہے کہ اُس کی تخلیق میں تم کسی قسم کا سقم نہیں پاؤ گے۔ **حِیۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَ حِیۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ ○ وَ لَهُ الۡحَمۡدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ عَشِیًّا وَّ حِیۡنَ تُظۡهِرُوۡنَ (30:17-18)**۔ اس میں تمام پہلو ہیں، اس میں زمان اور مکان دونوں آ گئے: **سمٰوٰت و الارض** کہا تو Space (مکان) آئی، جب یہ صبح اور شام اور زوالِ آفتاب، عشاء کا، رات کا وقت کہا تو اُس میں ٹائم (زمان) آ گیا۔ اور کہا کہ **سبحٰن اللہ**. خدا Space & Time (مکان و زمان) کی نسبتوں سے بلند ہے لیکن اُس کی جو تخلیق ہے وہ انہی حدود کے اندر ہے۔ جوں جوں نگاہ بلند ہوتی چلی جائے گی یہ **Space** (مکان) اور ٹائم (زمان) کی حدود پہلے سے وسیع ہوتی چلی جائیں گی اور آخر میں تو مٹ ہی جاتی ہیں، پھر انسان Durationless Time [3] (بلا دورانیہ زمان) پہ پہنچ جاتا ہے۔

---

[1] لہٰذا کسی قوم کی زندگی کے آغاز کا وقت ہو یا اس کے ختم ہونے کا زمانہ، اس کا آفتاب نصف النہار پر ہو یا زوال کے قریب، وہ کسی دور سے بھی گزر رہی ہو جب اس کے سامنے قوانینِ خداوندی آئیں تو اُسے ان قوانین کی مسلسل اور پیہم اطاعت کرنی چاہیے۔ وہ دیکھ لے گی کہ جس طرح قوانین خداوندی خارجی کائنات میں ایسے خوشگوار نتائج پیدا کرتے ہیں جنہیں دیکھ کر ہر ایک بے ساختہ واہ، واہ پکار اٹھتا ہے، جب یہ اپنے معاشرے کو ان قوانین کے قالب میں ڈھالے گی تو وہ بھی اسی قسم کے قابلِ تحسین ثمرات کی حامل بن جائے گی۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص ص۔ 832-833)۔

[2] تمہیں خدائے رحمٰن کی تخلیق کردہ کائنات میں کہیں بے ترتیبی یا عدم تناسب نظر نہیں آئے گا (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1339)۔

[3] اسے مثال سے یوں سمجھیے کہ جیسے سونے والے کو (نیند کی حالت میں) وقت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ یہ احساس اسے ہوتا ہے جو جاگ رہا ہے، اسی طرح جسے کلوروفارم سنگھا دیا جائے، اسے بھی وقت کا احساس نہیں ہوتا۔ اسے اصطلاحی زبان میں یوں کہیں گے کہ زمان (Time) ایک اعتباری یعنی اضافی (Relative) شے ہے اس لیے اہلِ فلسفہ اُس زمان (Time) کو جس کے گزرنے کا احساس نہ ہو **Duration-less Time** (زمان بلا دورانیہ) کہتے ہیں۔ اس کی مزید تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۃ النور، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2007، ص ص۔ 202-203)۔

زندگی کے متعلق قرآنی حقائق کی بیان کردہ علامات کو سمجھنے کے لیے تغیرات کا سمجھنا نہایت ہی اہم ہے

قرآن نے انسانی ارتقا کے لیے یہ مقام بتایا ہے۔ان دو آیات کے اندر وہ جو پہلا پہلوٗ جمالیات کا تھا' میں نے کہا ہے کہ اُس کے ربط کو دیکھیے تو اس میں یہ چیز سامنے آئے گی۔اور اگر اس اعتبار سے دیکھیے کہ قوموں کے زوال اور عروج کے متعلق قرآن ذکر کرتا چلا آ رہا تھا تو اُس نے ان چیزوں کو آغاز کہا ہے کہ قرآن جو کچھ کہنا چاہتا ہے اُس تک پہنچنے کے لیے اُس کی علامات کے طور پر جو تغیر ہے' Change یہ بہت بڑی چیز ہے۔قرآن نے اس کو بہت اہمیت دی ہے۔ درس کے تھوڑے سے وقت کے اندر نہ تو فرصت ہوتی ہے' نہ گنجائش کہ میں ان پہلوؤں کو آپ کے سامنے لاؤں' ویسے بھی یہ کچھ فلسفے سے متعلق چیزیں ہیں لیکن قرآن جسے اختلافِ لیل ونہار کہتا ہے' جہاں لفظِ اختلاف آیا ہے تو وہ تغیر ہے۔اور قرآن کی رو سے تغیر بڑی چیز ہے۔

تغیرات کے اس عمل میں بڑے بڑے رموز مضمر ہوتے ہیں

میں ابھی عرض کرونگا کہ قرآن کریم کیا کہتا ہے۔قوموں کے تغیرات میں بھی وہ کہتا ہے کہ قوموں کی ابتدائی نمود کا زمانہ ہو جسے آپ صبح کہہ رہے ہیں یا اُس کے غروب کا زمانہ ہو جسے آپ شام کہہ رہے ہیں' اُس کا آفتابِ سطوت نصف النہار پہ ہو جسے قرآن نے **تُظْهِرُوْنَ** کہا ہے جسے آپ ظہر کا وقت کہتے ہیں یا اُس کے بعد وہ قوم بالکل ختم ہوگئی ہو' جسے آپ رات کہتے ہیں' وہ کہتا ہے کہ قوموں کی زندگی پوری تاریخ ہے۔آپ دیکھ لیجیے' وہ انہی تغیرات سے ہی مرتب ہوئی نظر آئے گی۔قومیں ابھرتی ہیں' ترقی کرتی چلی جاتی ہیں۔وہ جیسے ''نصف النہار پہ آفتاب'' تو محاورہ ہے تو وہاں تک پہنچتی ہیں' پھر آمادہ بہ زوال ہوتی ہیں' پہلے ان کا انحطاط ہوتا ہے' Decline (زوال) ہوتا ہے اور اُس کے بعد Fall (ہبوط) ہو جاتا ہے' اسے اُس نے عشاء سے تعبیر کیا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ ان چیزوں کے اندر آپ دیکھیں گے کہ یہاں ایک قانون کام کر رہا ہے۔ یہ سارا کچھ By Chance یا Accidentally (اتفاقاً) نہیں ہو رہا' یونہی اتفاقیہ نہیں ہو رہا بلکہ ان کے متعلق قوانین ہیں جیسے باہر کی کائنات کے متعلق یہ قانون کہ کس طرح آہستہ آہستہ درخت کی سرسبزیاں شادابیاں ہیں' پھر اس کی ایک ایک پتی جھڑنی شروع ہوتی ہے تو آخر میں وہ ٹنڈ منڈ رہ جاتا ہے اور ایک پتی بھی نہیں ہوتی لیکن اگر اُس کے اندر زندگی حاصل کرنے کی صلاحیت ابھی باقی ہے' جڑیں مضبوط ہیں' تو اس میں از سرِ نو زندگی کی ایک نمود ہوتی ہے جو پہلے سے زیادہ مسکراتی ہوئی تمہارے سامنے آتی ہے۔ یہ تغیر ہے۔ابھی تغیر کی آیات آ رہی ہیں اس لیے اس پہ زیادہ تفصیل سے نہیں جاتا' آگے چل کر میں عرض کرونگا۔ یہ بڑی چیز ہے۔اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ جو قرآن نے صبح اور شام اور دوپہر اور رات کے اوقات کا ذکر کیا ہے' اسے قوموں کی زندگی کے ربط میں دیکھیے تو تاریخ کا یہ فلسفہ' جو تغیر کا' Change

کا ہے' وہ اس میں بیان کیا گیا ہے۔ اور اسی اعتبار سے میں سمجھتا ہوں کہ اگلی آیت کے ساتھ اس کا گہرا ربط ہے۔

قرآنِ حکیم نے قوموں کی موت وحیات کے بھی پیمانے متعین کر رکھے ہیں

اگلی آیت ہے کہ **يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ** ❶ **(30:19)**۔ اس آیت میں قرآن کہتا ہے کہ اسی طرح سے تم دیکھو گے کہ خدا کس طرح سے ایک مردہ قوم کو ازسرِ نو زندہ کر دیتا ہے اور کس طرح سے ایک زندہ قوم موت کے آغوش میں جا کر سو جاتی ہے۔ جس طرح دن اور رات کے لیے ہمارا قانون مقرر ہے' اُس کے مطابق یہ کچھ ہوتا ہے' اسی طرح قوموں کی زندگی عروج اور زوال اور موت کے لیے بھی ہمارا قانون مقرر ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ زندہ قومیں اس طرح قبرستان بن جاتی ہیں کہ ان کی صرف احادیث باقی رہتی ہیں' صرف تاریخ میں ان کے نام باقی رہتے ہیں۔ وہ عرب کی قوم جو صدرِ اولؐ میں امتِ محمدیہ ﷺ بن گئی تھی' وہ ایک نئی جماعت قریش میں پیدا ہو رہی تھی' بات وہاں سے چلی تھی۔ وہ اس پہ ہنستے تھے کہ

ذرّہٴ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر!

اندازہ لگائیے! کھانے کو روٹی نہیں ملتی' پہننے کو کپڑا نہیں ہے' ان کے پاس تلواریں بھی پوری نہیں ہیں اور دعویٰ یہ ہے کہ عرب اور عجم پہ صرف ہمارا نظام قائم ہوگا۔ قرآنِ مجید نے کہا کہ ان سے کہیے کہ تم نے کبھی دیکھا ہے کہ **وَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا** **(30:19)** بنجر زمین ہے' اس میں نمود کا' سبزی کا' شادابی کا نشان تک نہیں ہے' تمہارے ذہن میں اس سبزی و شادابی کا امکان بھی نہیں ہے۔ کیا تم نے اُس کی ویرانیوں کو دیکھا ہے؟ اور پھر جب ہمارے ابرِ کرم کا ایک چھینٹا اُس پہ پڑتا ہے تو پھر اُس کو جا کر دیکھا کرو۔ ریت کا ایک ایک ذرہ شگوفہ بنا ہوا ہوتا ہے۔ ہمارا قانون یہ کر سکتا ہے تو ہمارے قانون کی پابندی کرنے والی یہ جماعت جسے تم اس قدر کمزور' حرکت اور حرارت سے عاری سمجھتے ہو' جس کو تم زمینِ بنجر سمجھ رہے ہو تو کیا اِس میں زندگی کی نمود نہیں ہو سکتی؟

قندیلِ آسمانی انسانی زندگی کے تاریک راستوں کو منور کرنے کے لیے ہی عطا کی گئی ہے

آپ دیکھ رہے ہیں کس کس انداز سے قرآن بات سمجھاتا ہے! کہتا ہے کہ **يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ** ❷ **(30:19)**۔ ارے اس طرح سے زندگی ہوگی۔ ٹھیک ہے کہ مرنے کی زندگی پہ تو ہمارا ایمان ہے لیکن وہ یہاں کی

---

❶ انہی قوانین کی اطاعت سے مردہ قوموں کو حیاتِ تازہ مل جاتی ہے اور انہی کی خلاف ورزی سے زندہ قومیں' موت کے گھاٹ اتر جاتی ہیں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔933)۔

❷ تم دیکھتے نہیں کہ جب زمینِ مردہ کی' قوانینِ فطرت کے مطابق' آبیاری کی جائے تو اس میں سے کس طرح زندگی لہلہاتی ہوئی نمودار ہو جاتی ہے۔ اسی قانون کے مطابق تمہیں بھی زندگی مل جائے گی۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔933)۔

زندگی کے اوپر زور دیتا ہے کہ مایوس نہیں ہوجانا چاہیے۔ایسے حالات پیدا ہوسکتے ہیں جن کی وجہ سے واقعی کسی کو کوئی راستہ سجھائی ہی نہیں دیتا۔

عزیزانِ من! مایوسی اُسے کہتے ہیں کہ جب کوئی راستہ سجھائی ہی نہ دے۔راستہ ہو تو مایوسی نہیں ہوتی۔غلط ہی ہو تو چلنے کے بعد احساس ہوجاتا ہے کہ غلط تھا تو اُس سے آدمی پھر لوٹ کر صحیح راستے پہ آجاتا ہے لیکن جب کوئی راستہ ہی سجھائی نہ دے تو وہاں مایوسی ہوتی ہے۔قرآن کہتا ہے: **كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ** [1] (30:19)۔مایوس ہونے کی بات نہیں ہے۔سنو! **لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا** [2] (29:69)۔ٹھیک ہے تم نے ہائی وے پر پہنچنا ہے' صراطِ مستقیم پہ جانا ہے' شاہراہِ اعظم کے اوپر پہنچنا ہے۔اگر تم دور افتادہ گاؤں میں ہو تو کوئی بات نہیں' ہم نے پگڈنڈیاں بنا رکھی ہیں جو تم گاؤں سے اُس پگڈنڈی کے اوپر چلو گے تو اُس سڑک پہ جا پہنچو گے۔اگر کسی ملک کے اندر یہ شاہراہ ہی نہ ہو تو کراچی سے چلنے والا کون یقین سے کہے گا کہ میں پشاور جا پہنچوں گا؟ اس شاہراہِ اعظم کو صراطِ مستقیم کہتے ہیں لیکن اگر کسی ملک کے اندر ایک ہی شاہراہ ہو اور کسی دور افتادہ بستی یا گاؤں سے کوئی راستے وہاں تک پہنچ ہی نہ پائیں تو صراطِ مستقیم تک تو آ ہی نہیں سکتا۔

صراطِ مستقیم ''ضآلین'' کی راہنمائی کے لیے ہی عطا ہوا تھا

سورۃ الفاتحۃ میں صراطِ مستقیم کے بعد کہا کہ **غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ** [3] (1-7)۔ ضآلین وہ ہوتے ہیں جن کے سامنے پگڈنڈیاں نہ ہوں' تلاش کر رہے ہوں کہ صراطِ مستقیم پر پہنچنا ہے لیکن پہنچنے کے لیے پگڈنڈیاں نظر نہ آئیں۔تو یہ جو چیزیں ہیں اُن کے لیے قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے یہ انتظامات کر رکھے ہیں۔اگر ان کے اوپر چلتے جاؤ گے تو **كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ** (30:19) اس طرح سے مردوں کی بستیوں پہ حیاتِ تازہ لے کر نئی قوم ابھر سکتی ہے۔اسی لیے اس نے مایوسی کو کفر قرار دیا ہے۔قرآن سامنے ہوگا تو اس مقام پہ تم کبھی نہیں پہنچو گے کہ تمہارے سامنے کوئی راستہ ہی نہ ہو۔

---

[1] اسی قانون کے مطابق' تمہیں بھی زندگی مل جائے گی۔

[2] ہمارے قانونِ ہدایت کے مطابق ان کے سامنے زندگی کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں جو ہر طرف سے آ کر صراطِ مستقیم میں مل جاتی ہیں اور اس طرح انسانی سعی و عمل کا رُخ ہمارے متعین کردہ پروگرام کی طرف پھیر دیتی ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔928)۔

[3] اس کی مکمل تشریح کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الفاتحۃ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007' ص ص۔217 تا 239۔

انسان کی اپنی تخلیق بذاتِ خود ایک قابلِ غور امر ہے

قرآنِ کریم کہتا ہے کہ دیکھنا چاہتے ہو کہ ایک ذرۂ ناچیز سے تعمیرِ بیاباں کس طرح سے ہوتا ہے تو اپنی حالت پرغور کرو کہ **وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖۤ اَنۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنۡتُمۡ بَشَرٌ تَنۡتَشِرُوۡنَ** ❶ (30:20)۔ تمہاری تخلیق کا آغاز کس طرح سے ہوا؟ زندگی سے عاری **Inanimated** (غیر جاندار) مادہ جس میں زندگی نہیں ہوتی یعنی مٹی اور پانی کا جب جوہڑوں کے کنارے امتزاج ہوتا ہے تو وہاں لائف سیلز (جرثومہ زندگی) پیدا ہوتے ہیں۔قرآن کہتا ہے کہ ننھا سا لائف سیل (جرثومہ حیات) اس قسم کا بشر بن سکتا ہے تو تم تو بشر ہو۔تمہیں پتہ ہے کہ اس ننھے سے لائف سیل (جرثومہ حیات) نے زندگی کے ارتقائی مراحل طے کیے ہیں تو کتنی کتنی مشکلات اور موانعات اس کے راستے میں آئے ہیں۔

عزیزانِ من! ہم کیا جانیں، یہ تو مغرب کے سائنٹسٹ سے قرآن کی ان آیات کا ترجمہ پوچھیے۔ وہ بتائیں گے کہ قرآن یہ کیا بات کہہ گیا ہے کہ اُس مادے سے، جس کے اندر زندگی کا نشان تک نہیں تھا، اس انداز کی زندگی جو انسان میں ہے، کن ارتقائی مراحل سے گزر کر یہاں تک آئی ہے۔قرآن کہنا یہ چاہتا ہے کہ کیوں گھبرا رہے ہو، کیوں مایوس ہو رہے ہو، تم جب وہاں سے چل کر یہاں تک پہنچ سکتے ہو تو ان مزاحمات سے گھبراتے کیوں ہو۔ یہاں کہا ہے کہ **بَشَرٌ تَنۡتَشِرُوۡنَ** (30:20) ایک ہی بشر نہیں پیدا کیا، دیکھو تو سہی کتنے پھیلے ہوئے ہیں، کرۂ ارض ان سے بھرا ہوا ہے۔اور پھر اس کو انسان بنایا۔

عزیزانِ من! اُس زندگی کو سامنے رکھیے کہ اس نوعِ بشری میں ایک ہی نوع ہو یعنی مرد ہی مرد ہوں یا عورتیں ہی عورتیں ہوں ''تے کڈی بے سوادی، تے پھکی زندگی ہوندی''۔ ❷ کہا لائف سیل نے، اُس جرثومے نے، تو بشر ہی بننا تھا۔ وہ بشر جو بنا ہے تو ایسا نہیں بنا ہے کہ وہ صرف مرد ہی بن جاتا یا صرف عورت ہی بن جاتا۔ میں کیا عرض کروں کہ آج کی سائیکولوجی نے کیا کچھ ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے کہ اس تنوع کے اندر کیا کیا چیزیں پوشیدہ ہیں! کہا کہ **خَلَقَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا** ❸ (30:21)۔

---

❶ قانونِ خداوندی کی حیات بخشی کا اندازہ لگانا ہو تو تم خود اپنی پیدائش پر غور کرو۔ جامد مادہ (مٹی) میں زندگی کے کوئی آثار نہیں ہوتے۔ خدا نے اس جامد مادہ سے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی۔ اور پھر اسے مختلف گردشیں دیتا ہوا، اس مقام تک لے آیا، جہاں تم پیکرِ بشریّت اختیار کر کے ساری دنیا میں پھیل گئے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔933)۔

❷ تو کتنی بے مزہ اور روکھی پھیکی زندگی ہوتی۔

❸ جامد مادہ سے جب زندگی کی ابتدا ہوئی تو وہ ایک جرثومہ (Life Cell) کی شکل میں تھی۔ وہ جوشِ نمو سے پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تو اس کا ایک حصہ نر بن گیا اور دوسرا مادہ۔ اس طرح تم، مرد اور عورت، ایک دوسرے کے زوج (جوڑے یعنی Complementary to each other) بن گئے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔933)۔

وہ جو ایک جرثومہ ہوتا ہے وہ نہ Female (مادہ) ہوتا ہے اور نہ Male (نر) ہوتا ہے، وہ نہ مذکر ہوتا ہے، نہ مؤنث ہوتا ہے۔ وہ ذوقِ نمو سے شق ہوتا ہے۔ اس کے لیے سائنسدانوں ❶ نے بھی ذوقِ نمو ہی کی ایک اصطلاح وضع کی ہوئی ہے۔ اُسے اپنی نمو کا ایک ذوق ہوتا ہے۔ جب اُس سے وہ شق ہوتا ہے تو اُس میں سے اُسی کا ایک حصہ نر ہو جاتا ہے اور دوسرا حصہ اُس کا مادہ ہوتا ہے۔ اور پھر چل سو چل۔ یعنی **تَنۡتَشِرُوۡنَ (30:20)** تم ساری دنیا میں پھیل گئے۔ یہ ہے اس کا ترجمہ۔ یہ ہے **مِنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا (30:21)**۔ ہمارے ہاں تو ''زوج'' بیوی کو کہتے ہیں، خاوند کو کبھی زوج نہیں کہتے۔ یہ چیزیں ہمارے اوپر ایسی مسلط ہوئیں کہ وہ مرد کی کچھ زوج ہوتی ہے، مرد اس کا یہ کچھ زوج نہیں ہوتا۔ ''تے او تے برابر دی گل ہو جانی ہیگی''۔ ❷ یہ تصور لے لینا کہ صاحب! یہ دونوں برابر ہیں کتنی بڑی عمدہ بات ہے! اس لیے تو کہا جاتا ہے کہ توبہ توبہ توبہ۔

آدم کی پسلی سے حوا کے پیدا کرنے کی یہ کہانی تورات کی بیان کردہ ہے، قرآن کی نہیں

ہمارے ہاں قصوں میں ہے کہ ابتدا یہاں سے ہوئی تھی کہ خدا نے مرد پیدا کیا، پھر وہ اداس ہو گیا ''اوہدی اُداسی لہان واسطے اوہدی پسلی وچوں بیوی پیدا کر دتی''۔ ❸ اب پسلی کے اندر سے جو بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ تو اُس کی بیٹی ہوتی ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق وہ بابا آدم کی پسلی سے جو پیدا کیا تو وہ اُس کی بیوی بنی۔ یعنی یہ ہے وہاں۔ یہ تورات کے قصے ہیں اور آپ کے ہاں آ گئے ہوئے ہیں۔ آپ کے ہاں حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں یہی لکھا ہوا ہے کہ وہ آدم اداس ہو گیا تو اُس کی اداسی مٹانے کے لیے پسلی سے عورت پیدا کی۔ یعنی مقصود بالذات تو وہ مرد ہی تھا، اب وہ جو اداس ہوا، جیسے بچے کے پاس اگر کھلونا نہ ہو تو اتنا اداس ہوتا ہے کہ وہ رونے لگ جاتا ہے اور پھر اُسے کھلونے دیدیتے ہیں، گویا ہمارے ہاں عورت کی یہ حیثیت رکھی گئی ہے۔

عزیزانِ من! عربی زبان میں لفظِ زوج اس معنی میں آتا ہی نہیں ہے۔ زوج کے معنی ہوتا ہے کہ دو ایسی چیزیں جن میں سے اگر ایک اُس کے برابر نہ ہو تو گاڑی چل ہی نہ سکے۔ جیسے یہ گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں تو ان کو ازواج کہتے ہیں یعنی ایک دوسرے کی زوج۔ اُس کے بغیر یہ ناکارہ، اِس کے بغیر وہ ناکارہ۔

مرد اور عورت باہمی طور پر ایک دوسرے کے زوج ہیں

اگر کیفیت یہ ہو کہ ٹانگے کا ایک پہیہ تو اتنا بڑا ہو اور دوسرا چھوٹا سا ہو تو کیا ٹانگہ چل پڑے گا؟ اور اگر ایک پہیہ گول ہو اور دوسرا

---

❶ اس کی تشریح و تصریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۃ العنکبوت، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2008، 169 تا 170 کے فٹ نوٹ [1`2 (170)]

❷ وہ پھر ہم سری کی بات ہو جاتی ہے۔

❸ اس کی اُداسی دور کرنے کے لیے، اس کی پسلی سے بیوی پیدا کر دی۔

چوکور ہو تو کیا پھر گاڑی چل سکے گی؟ آج ہمارا سارا معاشرہ یہی ہو چکا ہے۔ عرب ''زوج'' اُس وقت کہتے تھے جب دو چیزیں وہ ہوں اور ان میں سے ہر ایک' ایک دوسرے کے ساتھ اتنی موافقت رکھے ہو کہ ان میں ذرا سا بھی تفاوت نہ ہو۔ یہ تو بات ہی الگ ہے کہ اُس میں سے ایک نہ ہو تو پھر بھی زندگی کی گاڑی چل نہیں سکتی۔ یہاں کہا ہے کہ **خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا (30:21)** تمہارے لیے ازواج پیدا کیے۔ ہمارے ہاں یہ کہہ دیا کہ صاحب! مرد کے لیے ازواج پیدا کیے جبکہ **خَلَقَ لَكُمْ** میں مرد اور عورتیں دونوں آتی ہیں۔ **خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا (30:21)** تمہارے لیے ازواج پیدا کیے اور وہ جوڑا ہم کہیں باہر سے نہیں لائے بلکہ تم میں سے ہی ہے۔ اس کے اندر آپس میں بڑی ہی محبت اور پیار کی بات ہے یعنی تم میں سے۔

عزیزانِ من! قرآن کے ایک ایک لفظ پہ غور کیجیے کہ کتنے اہم مسائل حل ہوتے چلے جاتے ہیں! یہاں **مِنْ اَنْفُسِكُمْ ازواجًا (30:21)** کہا ہے اگر وہ جوڑا **مِنْ اَنْفُسِكُمْ** نہیں ہے تو زوج نہیں ہو سکتا اور اگر یہ زوج نہیں ہے تو زندگی کی گاڑی چل نہیں سکتی۔ آپ اندازہ لگائیے۔ اندازے کی کیا ضرورت ہے اس کا تو نقشہ ہر گھر میں موجود ہے۔

لفظ مودۃ کا قرآنی مفہوم

پھر بات وہی ہوئی کہ کیا اس سے مقصد صرف Procreation (تولید) تھا' افزائشِ نسل تھا؟ حیوانی زندگی میں تو یہیں تک بات ہوتی ہے۔ وہاں بھی یہ نر اور مادہ ہوتے ہیں لیکن وہ ازواج نہیں ہوتے۔ وہ تو صرف Procreation (تولید) کا' افزائشِ نسل کا ایک ذریعہ ہوتے ہیں' مشینیں ہوتے ہیں۔ کہا کہ **اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا (30:21)** انسانی زندگی کے اندر صرف Procreation (تولید) نہیں بلکہ ایک دوسرے سے تسکین حاصل کرو۔ یعنی صرف افزائشِ نسل نہیں ہے بلکہ ایک ایسی زندگی بن رہی ہے جس میں سکون ہو۔ اس لیے کہا کہ **وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً (30:21)**۔

مودۃ کا لفظ عربی زبان میں محبت سے بھی ایک اگلے درجے کا ہوتا ہے۔ ہمیں تو محبت کا بھی پتہ نہیں تو اگلا درجہ کیسے پتہ ہو۔ یہ تو زبان اتنی بڑی وسیع ہے کہ محبت ہی کوئی کم درجے کا لفظ نہیں تھا کہ **مودۃ** کہا۔ یہ کچھ یوں سمجھ لیجیے کہ دو تختیوں کا اس طرح سے آپس میں جڑ جانا کہ وہ جوڑ نظر نہ آئے اور محسوس نہ ہو کہ یہ جڑی ہوئی ہیں' اس کے لیے وہ لفظ **مودۃ** استعمال کرتے تھے۔ یہ جو کیفیت ہے تو یہ **Psychological** (نفسیاتی) ہوتی ہے جسے ہم آہنگی کہتے ہیں۔ وہ نہ خیالات کی ہوتی ہے' نہ جذبات کی ہوتی ہے بلکہ وہ **Personality** (شخصیت) کی ہوتی ہے لیکن اس طرح سے ہوتی ہے کہ اپنی اپنی **Individuality** (انفرادیت) بھی قائم ہوتی ہے اور اُس کا جوڑ **(Joint)** بھی اس قسم کا ہوتا ہے کہ اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اس دور میں آ کر یہ باتیں سامنے آتی ہیں کہ محبت

سے یہ **مودۃ** کیسے بنا۔ محبت میں جڑنا نہیں ہوتا بلکہ الگ الگ ہوتے ہیں۔ **مودۃ** میں اس انداز کی یہ چیز ہوتی ہے کہ دونوں جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور پھر ان کا تشخص الگ الگ رہتا ہے۔

اس مودۃ کے اس مقصد کا اگلا پہلو یہ ہے کہ **وَّ رَحْمَةً (30:21)** تاکہ تمہاری مضمر صلاحیتیں نشوونما پاتی چلی جائیں۔ اگر زوج کی زندگی نہ ہو تو تسکین ومودۃ اور رحمت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہو۔ یہ جو رحمت کہا ہے کہ مضمر صلاحیتیں نشوونما پائیں اور اُس انداز سے وہ نشوونما پائیں کہ جس طرح رحمِ مادر میں بچہ نشوونما پاتا ہے۔ ماں اپنا خونِ جگر پلا پلا کر اُس بچے کی نشوونما کرتی ہے' کبھی اُس کے سر احسان نہیں دھرتی ''کدی اوہنوں میہنڑا نہیں ماردی' کدی اوہنوں طعنہ نہیں دیندی''۔ ❶ احسان تو ایک طرف رہا اگر کہیں ڈاکٹر یہ کہہ دے کہ بچے کا وزن کچھ کم ہو رہا ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ اپنا خون اس کے اندر انڈیلتی ہے۔ کہا کہ کیا پیدا ہونے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا؟ نہیں صاحب! بلکہ وہ یہی خون جو براہِ راست دے رہی تھی اب وہ دودھ کے چشموں کے ذریعے سے اس کو دیتی چلی جاتی ہے۔ دودھ کم ہوتا ہے تو اپنا علاج کراتی پھرتی ہے تاکہ اس کی نشوونما نہ رک جائے۔ کہا کہ یہ چیز جو تم بچے میں دیکھتے ہو' تم دونوں جو زوج بنے ہو تو تمہارے اندر جو انسانی صلاحیتیں ہیں ان کو اس طرح نشوونما پانا چاہیے۔ یہ ایک اندرونی جذبہ ہے جس کی رو سے جی یہ چاہتا ہے کہ یہ سب کچھ بن جائے۔ خدا یہ چاہتا ہے کہ یہ سب کچھ بن جائے۔

قرآنِ حکیم نے اپنی ہر وہ بات جو سمجھانی ہو' وہ اسے اپنی نشانی کہتا ہے

قرآنِ کریم نے کہا کہ **اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ (30:21)** اس کے اندر بھی زندگی کے مقصد تک پہنچنے کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ قرآن جن چیزوں کو سمجھاتا ہے' ان کو نشانیاں کہتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ نشانیاں تو ہیں لیکن **لِقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ (30:21)** یہ اُس قوم کے لیے ہیں جو عقل وفکر سے کام لے۔ کہتا ہے کہ **وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَ اَلْوَانِکُمْ (30:22)** آ' تمہیں اور بتائیں۔ ہماری نشوونما میں تخلیقِ ارض وسما تو تم نے دیکھ لی' انسانوں کی زندگی کے اندر زبانوں کا اور رنگوں کا اختلاف ہے۔ عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے یہ بات کہی جا رہی ہے۔ کسی کے ذہن میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ کوئی اتنا اہم مسئلہ ہے جس کو آیتِ خداوندی قرار دیا گیا ہے۔

---

❶ کبھی اسے طعنے کا شائبہ تک نہیں دیتی۔

قوموں کی ارتقائی کیفیت کو جاننے یا ماپنے کا طریق

ہمارے اس دور میں آ کر اس پہ تحقیق ہوئی ہے۔ڈاکٹر بک ❶ کی ایک کتاب ہے: "Cosmic Consciousness" یہ بڑی اہم کتاب ہے۔ یہ بڑے عجیب لوگ ہیں۔ یہاں یہ **لِقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ** کہا ہے۔ ان میں سے ایک ایک شخص ایک ایک پوائنٹ (نکتے) کے اوپر تحقیق کرتے ہوئے اپنی زندگی بسر کر دیتا ہے۔اُس نے تحقیق یہ کی ہے کہ نوعِ انسانی ارتقائی منازل میں سے گزرتی ہوئی آگے بڑھی ہے، اگر یہ دیکھنا ہو کہ کسی ایک درجے میں مختلف ملکوں کی، مختلف نسلوں کی، قوموں کی، ارتقائی سطح کتنی بڑی تھی یعنی گراف بنانا ہو کہ وہ اُس سطح پہ، یہ اس سطح پہ، یہ اس سطح پہ، یعنی Evolution (ارتقا) کے منازل کے اندر مختلف قوموں کی انسانی صلاحیتوں کی نشو ونما کا گراف بنانا ہو، تو کہا کہ اُس کے لیے السنہ والوان (Languages&Colours) ذریعے (Means) ہیں۔اُن میں ایک تو یہ ہے کہ اُس قوم میں زبان کی وسعت کتنی تھی اور دوسرا یہ ہے کہ اس قوم میں کتنے رنگوں کی پہچان کا مادہ تھا۔

چودہ سو سال قبل بھی عربوں کی زبان دانی دنیا بھر میں بے مثل تھی

زبان کے لیے یہ جو ❷ Perceptual الفاظ ہوتے ہیں یعنی پانی، روٹی، درخت، وہ کہتا ہے کہ یہ نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ Concepts یعنی ایک چیز کا تصور ہوتا ہے وہ دیکھنا چاہیے ❸ -وہ کہتا ہے کہ جب ہم درخت کہتے ہیں تو اُس سے مراد یہ سامنے کا درخت نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک چیز کا تصور (Concept) دیتا ہے جسے درخت کہا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دیکھو کہ کسی قوم کے اندر Concepts (تصورات) کتنے ہیں۔اور آپ حیران ہونگے کہ وہ اپنی تحقیق میں جب عربوں کے اوپر پہنچا ہے تو کہتا ہے کہ اُس دور میں، جس دور میں، میں عربوں کی ہسٹری لے رہا ہوں، ساری دنیا کی قوموں کے اندر ملا کر بھی اتنے Concepts (تصورات) نہیں تھے جتنے اس ایک قوم کے اندر تھے۔گراف کے اعتبار سے وہ کہتا ہے کہ ان کی کیفیت یہ تھی۔جس قوم کی لغتِ زبان کے اندر اونٹ کے لیے پانچ ہزار سات سو چوالیس **(5744)** الفاظ ہوں تو پوچھو نہیں کہ وہ قوم کیا تھی۔

عزیزانِ من! بقول ڈاکٹر ❶ بک عقلی سطح کو جانچنے کی اگلی چیز رنگوں کا اختلاف ہے۔ہم نے تو یہی سمجھ لیا کہ تین رنگوں میں

---

❶ Bucke, Richard Maurice: Cosmic Consciousness

❷ محسوس کی جانے والی اشیا کے لیے الفاظ۔

❸ یعنی تاریخ کے کسی خاص دور میں، کسی قوم کی ذہنی سطح کا اندازہ لگانا ہو تو دیکھنا یہ چاہیے کہ اس دور میں اس قوم کی زبان میں کتنے الفاظ ایسے تھے جو تصورات **(Concepts)** کے مظہر تھے۔

قومیں ❶ تقسیم کی گئی ہیں: White Race (سفید فام) Black Race, (سیاہ فام) اور Red or Yellow Race (سرخ یا زرد فام)۔ قرآن یہ اختلاف نہیں کہتا۔ اُس نے ایک تو یہ کہا ہے کہ اُس قوم کی زبان کے اندر Concept (تصور) کے لیے کتنے الفاظ تھے۔ اور دوسری عجیب چیز ہے شاید آپ پہلی دفعہ سنیں' میں نے بھی جب پڑھا تھا تو پہلی دفعہ ہی یہ سامنے آیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ کسی اسٹیج پر کسی قوم میں کتنے رنگوں کی پہچان کا مادہ ہوتا ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ Basic Colours (بنیادی رنگ) ہیں جو گنے جاتے ہیں تو یہ شروع سے تھے' انسان شروع سے پہچانتا تھا۔ اُس نے یہ تحقیق کی ہے کہ جس طرح حیوان کی زندگی کے اندر رنگ کی پہچان ہی نہیں ہوتی۔ یہاں سے آگے انسان کی زندگی شروع ہوتی ہے تو رنگوں کی پہچان ہوتی ہے۔ جو قوم پست درجے کے اوپر ہوتی ہے' اُس قوم کے اُس دور کے لٹریچر کے اندر صرف ایک رنگ کا نام ملتا ہے۔ نظر آتا ہے کہ وہ دوسرا رنگ پہچانتی ہی نہیں تھی اور وہ اس طرح چلتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس دور میں ہندوؤں جیسی قوم جن کا اتنا بڑا لٹریچر ہے' ان کے سارے لٹریچر میں تین رنگوں کے نام ملتے ہیں۔ عربوں کے ہاں اُس دور میں بھی چھ رنگوں کے نام ملتے ہیں۔ آج پتہ چلا کہ قرآن یہاں کیا کہہ گیا ہے۔ ہماری نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے: **وَ اخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِکُمۡ وَ اَلۡوَانِکُمۡ (30:22)** زبانوں اور رنگوں کا اختلاف۔ عزیزانِ من! بک ❷ سے پوچھیے' مغرب کے مفکرین سے پوچھیے کہ قرآن چودہ سو سال پہلے کیا کہہ گیا ہے۔ قوموں کی ارتقائی کیفیت ماپنے کے لیے یہ معیار اور پیمانے ہیں جنہیں قرآن "**و من اٰیٰتہٖ**" کہتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک لفظ علماء کی تعریف

عزیزانِ من! اس کے لیے آگے وہ پھر شرط لگا دیتا ہے کہ **اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡعٰلِمِیۡنَ (30:22)**۔ اب اگر میں اس کا ترجمہ علماء کردوں تو آپ بھی ہنسیں گے اور میں بھی ہنسوں گا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ بات تو اہلِ علم ہی سمجھیں گے۔ اگر میں ترجمہ علمائے کرام کرونگا تو ان میں تو ایک بھی نظر نہیں آتا اور ان کے متعلق اقبالؒ **(1877-1938)** کہتا ہے کہ

---

❶ علم الاقوام والسنہ کے محققین نے اقوام عالم کو' مختلف مماثلت و مشابہت کی بنا پر' تین شاخوں میں تقسیم کیا ہے: ۱) آریائی (ایرین) مثلاً ہندی اقوام' ایرانی اور فرنگستانی۔ ۲) تورانی (منگولین) مثلاً ترکستانی' چینی' ۳) سامی (سمیٹک) مثلاً عرب' آرامی' عبرانی سریانی' کلدانی وغیرہ۔ بعض علمائے انساب' اقوامِ عالم کی تقسیم اختلاف رنگ کی بنا پر کرتے ہیں یعنی سفید فام **(White Race)** مثلاً امم سامیہ اور فرنگی' سیاہ فام **(Black Race)** یا سرخ فام **(Red Race)** مثلاً باشندگانِ افریقہ' اور زرد فام **(Yellow Race)** مثلاً جاپانی اور چینی وغیرہ۔

❷ اس کے لیے رچرڈ مورس بک کی کتاب **Cosmic Consciousness** (کائناتی شعور) کے صفحات **20-30** کا مطالعہ کیجیے۔

مکتب و مُلاّ و اسرارِ کتاب
کورِ مادر زارد و نورِ آفتاب

(جاوید نامہ)

کہ یہ پیدائشی اندھے ہیں۔اور دوسری طرف وہ کہتا ہے کہ نورِ آفتاب۔

قرآن کہتا ہے کہ **لَاٰیٰتٍ لِّلۡعٰلِمِیۡنَ** [1] **(30:22)**۔آپ آیات گنتے چلے جایئے' دیکھتے چلے جایئے کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ ہم تو جب آیت سمجھتے ہیں تو وہ تو قرآن کی ایک آیت ہی ہمارے ذہن میں ہوتی ہے۔لیکن دیکھیے کہ وہ کن چیزوں کو آیات بتا رہا ہے۔

اس کائنات کا ایک ایک ذرہ الفاظ کی شکل میں ملنے والے قرآن کی ہی ایک تفسیر ہے

او بابا! یہ قرآن تو ایک چھوٹا سا حصہ ہے جو ہمارے پاس ایک جلد کے اندر ہے' یہ ساری کائنات ایک دوسرا قرآن ہے' وہ ان میں بکھری ہوئی آیات کو آیات کہتا ہے۔اس قرآن میں تو ساڑھے چھ ہزار کے قریب آیات ہونگی لیکن وہاں تو ایک ایک پتے میں چھ چھ ہزار آیتیں موجود ہوتی ہیں۔کہتا ہے کہ **وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمۡ بِالَّیۡلِ وَ النَّہَارِ وَ ابۡتِغَآؤُکُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ (30:23)** پھر ہماری آیات میں دیکھو۔کہتا ہے حرکت اور سکون زندگی کے لیے دونوں ضروری ہیں۔حرکت میں جتنی بھی انرجی ہے وہ صرف ہوتی ہے' تو اس کی Generation (پیدا کرنے) کا سامان بڑا ضروری ہے کہ وہ دوبارہ واپس آئے۔اگر اُس میں خرچ ہی ہوتا رہے تو کتنے ہی اچھے ماڈل کی Latest Motor (جدید ترین موٹر) ہی کیوں نہ ہو' اُس میں ایک دفعہ پٹرول ڈال کر آپ چلاتے چلے جایئے اور دوبارہ پٹرول نہ ڈالیے تو وہ موٹر دوبارہ چل ہی نہیں سکتی۔

زندگی کے لیے حرکت اور سکون دونوں ضروری ہیں۔یہ جو دن اور رات کا اختلاف ہے تو کہا ہے کہ یہ بھی ٹھیک ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے تو یہ کہہ لو گے کہ یہ اس طرح سے ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کی گردش ہوتی ہے' یہ ہوتا تو اسی طرح سے ہے۔لیکن جہاں تک تمہارا تعلق ہے اُس میں صورت یہ ہوتی ہے کہ یہ دن ہوتا ہے تو اُس کے اندر تم اپنے تمام کاروبار کرتے ہو' تمہاری انرجی صرف ہوتی چلی جاتی ہے۔اُس کے بعد رات آجاتی ہے' پرند چرند سب اپنے اپنے گھونسلوں میں چلے جاتے ہیں' انسان گھروں کے اندر چلے جاتے ہیں۔اور اُس میں پھر یہ جو نیند ہے تو یہ بھی ہماری آیات میں سے ہے۔ایک چیز محاورۃً ہوتی ہے کہ ''تے او تے کدی جاگدا ای نہیں [2] ہیگا''۔نیند کے اوپر جواب تحقیق ہوئی ہے تو وہ تو پوچھو نہیں کتنا وسیع میدان ہے۔اگر واقعی نیند' جس کو آپ

---

[1] اِس میں اربابِ علم و بصیرت کے لیے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔934)۔

[2] وہ تو کبھی بیدار ہی نہیں ہوتا۔

Sleep Sound (گہری نیند) کہتے ہیں' وہ نیند ہے جوان کے نزدیک اگر دس منٹ کی بھی آ جائے تو وہ پورے دن کی انرجی واپس لے آتی ہے۔ یہ سارا دماغی کنٹرول ہی کا تو نام ہے۔ دماغ کو سکون کا ملنا ہے' اس قسم کا سکون کہ اس صرف ہونے والی انرجی کی دوبارہ Generation (پیدائش) ہو جائے ❶۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جو دونوں حرکت اور سکون ہیں ان کے اجتماع سے زندگی بنتی ہے۔ لیکن یہ آیت تو ہے ہماری کہ **اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ (30:23)** یہ اس قوم کے لیے ہے جو دل کے کانوں سے اس کو سنے۔ یہ جو ہمارے کان ہوتے ہیں' ان کے اندر اِس کان سے اُس کان تک ایک سرنگ ہوتی ہے ''ادھروں گل پیندی اے تے اودھروں نکل جاندی اے''۔ ❷ کہتا ہے کہ وہ کان جو بات کو دل تک پہنچانے کا ذریعہ ہوتے ہیں تو اس کی آیات وہ پہچان سکتے ہیں۔ کہتا ہے کہ **وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖ یُرِیۡکُمُ الۡبَرۡقَ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحۡیٖ بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا (30:24)** کہتا ہے کہ یہ اختلافی چیزوں کا امتزاج دیکھنا ہو کہ بادل کس طرح سے جھوم کر آ رہا ہے' تو سنو:

وہ اٹھی وہ آئی وہ گھٹا چھا گئی ساقی
میخانے پہ اللہ کرے جھوم کے برسے

کائنات میں ہر آن ایک تغیر واقع ہو رہا ہوتا ہے

قرآن کہتا ہے کہ ان میں تمہیں کیا چیز نظر آتی ہے۔ خوشگوار ہوائیں ہوتی ہیں لیکن اُسی کے اندر تم نے سنا ہوگا کہ فلاں جگہ اُس میں سے بجلی گری اور آدمی مر گئے۔ کہنے لگے کہ اختلاف کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ایک ہی چیز ہوتی ہے۔ اُس کے اندر منفعت بھی ایسی ہوتی ہے اور تخریب کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ اب تمہارے لیے یہ چیز ہے کہ منفعت کے پہلو سے فائدہ اٹھاؤ اور تخریب والی چیز سے محتاط رہو۔ یہ کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ **اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ (30:24)** عقل وفکر سے کام لینے والے سمجھیں گے کہ بادلوں کے اندر یہ بجلی کیوں ہوتی ہے۔ اور ابھی تو ابتدا ہوئی ہے۔ ہم تو اس Electricity (بجلی) کو سمجھ ہی نہیں سکتے کہ کیا ہوتی ہے۔ ہم تو Electric Object (برق بردار جسم) ہی جانتے ہیں: جن چیزوں میں بجلی ہوتی ہے۔ اُس تار کو چھونے سے موت واقع ہوتی ہے' اُس تار کو باقاعدہ رکھنے سے پنکھا چلتا ہے۔ یہ جسے آپ Electricity (بجلی) کہتے ہیں وہ تو Pure Energy (خالص توانائی) ہوتی ہے اور ہم تو ابھی وہاں تک پہنچے ہی نہیں۔ جنہوں نے اس کو ذرا Capture (قبضہ) کیا ہے تو پوچھو نہیں کس طرح مریخ تک پہنچ رہے ہیں۔ کہتا ہے کہ اُس میں بھی ہماری آیتیں ہیں۔ **لِقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ (30:24)** لیکن ان کے

---

❶ اس کی تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ العنکبوت' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2008' ص ص 151 تا 262)

❷ اُدھر ایک کان سے بات آتی ہے تو اِدھر دوسرے کان سے باہر نکل جاتی ہے۔

لیے ہیں جو اپنے Mind (دماغ) میں عقل وفکر بھی رکھتے ہیں' صرف بھیجا (مغز) ہی نہیں رکھتے۔ اب اگر اگلی آیت میں نے چھیڑ دی تو اُس میں وقت زیادہ لگے گا۔

کائنات کا حسن اسی تغیر کا ہی رہین منت ہے

میں سمجھتا ہوں کہ جب یہ تغیرات کی بات آئی ہے تو یہ جتنی مادی چیزیں (Material things) ہم نے کہی ہیں اُن میں کچھ تھوڑا سا ذوقِ جمال یا حسِ لطیف کا بھی پہلو آ جانا چاہیے۔ مقطع کا بند ہے' اقبالؒ (1938-1877) کے حسین شعر ہیں' بات تو وہ تغیر کی کر رہا ہے لیکن شعریت اپنے انتہا پر پہنچی ہوئی ہے:

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تُو نے لازوال کیا

اِس لیے کہ اس میں تغیر نہ ہو' یہ ہمیشہ ایک ہی جیسی چیز رہے۔

ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی
کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی' اخترِ سحر نے سنی

(بانگِ درا: حقیقتِ حسن)

''بیڑہ غرق ہووے ایناں امریکا والیاں دا' ایہڑی چن دی فوٹو وکھائی اے تے اووی بھیڑا لگن لگ پیا[1] اے''۔ کیا شعر یاد آ گیا ہے:

کبھی آ جاتے تھے ہنسنے کو مرے رونے پر
تم کو یہ عیش بھی اب میرا گوارا نہ رہا

کم بختو! ہمارے پاس تو ایک ہی چیز تھی کہ جس سے جی بہلاتے تھے اب اُس کی بھی تصویریں لے لیں۔ بہرحال

---

[1] ان امریکیوں کا بیڑا غرق ہو کہ انہوں نے جو چاند کی فوٹو دکھائی ہے تو اب وہ بھی بدشکل لگنے لگا ہے۔

کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی اخترِ سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہوگیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا' سوگوار گیا

(بانگِ درا:حقیقتِ حسن)

یہ ہے شعریت اس شخص کے اندر۔عزیزانِ من ! یہ تغیر اگر نہ ہوتو زندگی بور ہوکر رہ جاتی ہے۔آپ تین چار دن کے لیے پلاؤ اور زردہ تک نہیں کھا سکتے۔''تیسرے چوتھے دن کہندے اوکوئی دال وی ہیگی اے[1]''۔تنوع'یعنی Change (تغیر) ضروری ہے۔ایک جیسی چیز کے لیےتو اقبالؒ (1877-1938) کہتا ہے کہ یہ دنیا تو ایک طرف رہی

دلِ عاشقاں بمیرد بہ بہشتِ جاودانے

اگر جنت کی نعمتیں بھی ایک ہی جیسی ہوئیں اوران میں Change (تغیر) نہ ہوا''تے کہندا اے او تے مرجان دا مقام ہوگیا[2]''۔وہ بہشت کیا کہ جس میں......

نہ نوائے درد مندے' نہ غمے نہ غمگسارے

وہ بہشت کیا کہ جس میں نہ کوئی غم ہواورنہ کوئی غمگسار ہو۔تو Change (تغیر) تو یہ ہوتا ہے۔اب یہاں اگر میں ہیگل[3] کے فلسفے پہ آؤں تو بات اورطرف پھیل جائے گی۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ الروم کی آیت 24 تک آ گئے' 25ویں سے آئندہ لیں گے۔

---

[1] تیسرے چوتھے دن کہنے لگتے ہو کہ کیا کوئی دال بھی ہے۔

[2] کہتا ہے کہ وہ تو پھر مرجانے کا مقام ہوگیا۔

[3] اس کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ الفرقان' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007' ص ص۔221 (فٹ نوٹ 2)

تیسرا باب: سورة الروم (آیات 25 تا27)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اگست **1979**ء کی **21** تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الروم کی آیت **25** سے ہو رہا ہے:**(30-25)**

مذہب اپنے تباہ کن نتائج پر غور وفکر کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتا

سب سے پہلے تو آپ احباب کو گزشتہ عید مبارک ہو۔ رمضان المبارک کا مہینہ گزر گیا ہے۔ دنیا میں قاعدہ ہے اور ہر شخص اس کو جانتا ہے کہ کوئی پروگرام ہو اُس کی تکمیل کے بعد انسان کھڑا ہو کر دیکھتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ اور اُسی سے وہ فیصلہ کرتا ہے کہ جس مقصد کے لیے یہ کچھ کیا گیا تھا وہ پورا ہوا ہے یا نہیں لیکن مذہب کی دنیا ایسی ہے جہاں اس کی قطعاً ضرورت نہیں پڑتی۔ پروگرام کے اعتبار سے آپ دیکھیے تو یہ کتنا مشقت طلب پروگرام ہے! ایک دن دو ن یا دس دن کی بات نہیں بلکہ پورا مہینہ' گرمی کا یہ موسم' پندرہ پندرہ سولہ گھنٹے کا روزہ' اُس میں پھر ہر قسم کی مزدوری' محنت' مشقت ہوتی ہے۔ عام طور پہ اب تو غریب ہی زیادہ روزے رکھتے ہیں کہ جنہیں کوئی آسانیاں میسر نہیں ہوتیں اور محنت و مشقت بھی ساتھ ہی کرنا پڑتی ہے۔ افطاری کے بعد نماز' عشا کی نماز (سترہ رکعت)' پھر تراویح (بیس رکعت) اور وہ بھی اتنی لمبی کہ اُس میں قرآنِ کریم کا پارہ ختم کرنا ہوتا ہے۔ عام طور پہ اس میں بارہ بج جاتے ہیں اور تین بجے پھر سحری کے لیے اٹھنا۔ وہ ختم ہونے کے ساتھ ہی قریباً سات بجے اپنے اپنے کام پہ پہنچنا۔ اور یہ پورے کا پورا Routine (نظام الاوقات) ایک مہینے بھر تک جاری رکھنا کوئی چھوٹا مشقت طلب معاملہ نہیں ہے۔ پھر اُس کے بعد کھڑے ہو کر

دیکھنا چاہیے کہ اس کا نتیجہ کیا مرتب ہوا؟

ذہنی سکون تو ہر مذہب کا پیروکار اپنے اپنے طریق سے حاصل کر لیتا ہے

زیادہ سے زیادہ یہی چیز ہوتی ہے کہ جسے آپ اپنا اپنا ذہنی سکون یا اطمینان کہتے ہیں وہ مل جاتا ہے۔ کوئی Pragmatic (نتائجی و عملیتی)، کوئی Objective (خارجی و معروضی)، کوئی خارج میں نتیجہ تو آپ کے سامنے نہیں آتا۔ صرف ثواب ایک لفظ ہے اور وہ بھی ایک ذہنی سا لفظ ہے۔ وہ بھی کوئی خارج میں محسوس شے نہیں ہوتا صرف یہ بات ذہنی طور پہ ہوتی ہے۔ اگر مقصد انفرادی طور پر ہر فرد کا اپنے اپنے ذہن کو ایک سکون یا تسکین دینا ہے تو معاف رکھیے اسے تو پھر ہر مذہب والا اپنے اپنے طریقے پہ حاصل کر لیتا ہے۔ ہندو کو اپنی پوجا پاٹ سے پرارتھنا سے بڑی شانتی حاصل ہوتی ہے سکون حاصل ہوتا ہے عیسائی اپنے طور طریقے پر گرجے میں سکون حاصل کر لیتا ہے یہودی اپنے اپنے صومعوں میں کر لیتا ہے آتش کدے کے اندر مجوسی کر لیتا ہے۔ ذہنی سکون تو ایسی چیز نہیں ہے جو آپ کے لیے معیار یا پیمانہ یا یہ ماپنے کے لیے ٹیسٹ بن سکے کہ جو کچھ کیا گیا ہے وہ فی الواقعہ صحیح ہے۔ یہ تو آپ کے اپنے ذہن کا ایک فیصلہ ہے۔ اور وہاں تو یہ بتایا گیا تھا کہ ٹیسٹ یہ ہے کہ **وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡكُثُ فِی الۡاَرۡضِ (13:17)** بقا اس عمل کے لیے ہے جو نوعِ انسانی کی منفعت اور فائدے کے لیے کیا جائے۔ کیا بات ہے قرآن کی پروگرام کی اور شقوں کو تو چھوڑ ہی دیجیے!

قرآنِ حکیم دنیا کی وہ واحد کتاب ہے جو بغیر سوچے سمجھے دن رات پڑھی جاتی ہے

یہ قرآنِ کریم اس طرح سے دہرایا جاتا ہے اتنی بار دہرایا جاتا ہے ساری دنیا میں دہرایا جاتا ہے۔ پہلے پورے مہینے میں **25-26** تاریخ تک دہرایا جاتا ہے پھر **شبینے** ہوتے ہیں اور ایک ایک رات میں پورا قرآن دہرایا جاتا ہے۔ کبھی کسی نے کھڑے ہو کر غور کیا ہے کہ جو آگے قرآن پڑھ رہا ہے کیا وہ اس کا ایک لفظ بھی سمجھ رہا ہے اور جو پیچھے سن رہے ہیں کیا وہ بھی اس کا ایک لفظ سمجھ رہے ہیں؟ وہاں تو نہ پڑھنے والا سمجھتا ہے نہ سننے والے۔ دنیا میں کوئی کتاب بھی ایسی ہے جس کے متعلق آپ یہ کہیں کہ آپ اُس کو سمجھ نہ رہے ہوں اور پڑھتے جا رہے ہوں آپ اس کا ایک Sentence (جملہ) بھی اس طرح نہیں پڑھ سکتے۔ اُس زبان کا بالکل نہ سمجھنا تو ایک طرف رہا اگر وہ زبان آپ کے معیار سے زیادہ مشکل ہے تو آپ رکھ دیتے ہیں کہ نہیں صاحب! میری سمجھ میں نہیں آتی، زبان مشکل ہے لیکن یہ آپ کی ایک کتاب ہے جو آپ کے لیے راہنمائی دینے کے لیے ہے **Life** (زندگی) کی Direction (سمت و ہدایت) دینے کے لیے ہے۔ اُس کی کیفیت یہ ہے کہ آپ سینکڑوں ہزاروں لاکھوں مرتبہ اُس کتاب کے

الفاظ دہرائے چلے جاتے ہیں' سنتے چلے جاتے ہیں لیکن نہ دہرانے والا جانتا ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور نہ سننے والا سمجھتا ہے کہ میں کیا سن رہا ہوں۔ کیا یہ ہے جادو جس کی وجہ سے یہ کیا جاتا ہے؟ یہ وہی مذہب کا پیدا کردہ ایک عقیدہ ہے کہ اس سے ثواب ہوتا ہے۔

دین پر عمل پیرائی کا نتیجہ تو ہمیشہ محسوس شکل میں سامنے آتا ہے

ثواب کیا ہوتا ہے؟ ذہن میں آپ سمجھ لیں کہ اس سے ثواب ہوتا ہے تو جو اُسے ثواب نہ سمجھے اُسے نہیں ہوتا۔ لیکن وہ جو اُس نے معیار مقرر کیا تھا کہ **وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (13:17)** ہر عمل کے بعد دیکھیے کہ نوعِ انسانی کو اس سے فائدہ کیا پہنچا۔ وہ یہ بات نہیں کہ آپ اپنے ذہن میں سمجھ لیں کہ پہنچ گیا فائدہ تو پہنچ گیا' نہیں پہنچا تو نہیں پہنچا بلکہ وہ تو محسوس شے ہے۔ جیسا کہ اُس نے حج کے اجتماع میں دوسری جگہ کہا ہے کہ لوگوں کو دعوت دو' وہ یہاں آئیں **لِیَشْھَدُوْا مَنَافِعَ لَھُمْ (22:28)** تا کہ اپنی آنکھوں سے وہ مشاہدہ کریں کہ ان کے فائدے کے لیے تم نے کیا کیا ہے۔ یہ **ما ینفع الناس** تو سارا پروگرام نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے ہے۔ اور اُس کے بعد یہ ٹیسٹ ہو جاتا ہے کہ فائدہ ہوا ہے یا نہیں ہوا۔ یہ دین ہے جس نے یہ کہا ہے۔ وہ مذہب ہے جو عقیدے کا ایک سکون مہیا کر دیتا ہے۔ دوسروں کے ہاں سکون کے جو ذرائع وہ اختیار کرتے ہیں تو ہم اُس کے اوپر ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بالکل باطل کی چیزیں ہیں۔ اور ہر ایک اپنے ہاں کے ذریعے کے مطابق کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے اور دوسرے کا باطل ہے۔ اگر یہ خارجی (Objective) معیار جو قرآن نے بتایا ہے' سامنے رکھا جائے تو یہ بحث مباحثے کی بات ہی نہیں ہے۔ جس کے ذریعے سے نوعِ انسانی کو زیادہ منفعت پہنچتی ہے وہ ثواب کا کام ہے۔ یہ فرق ہوتا ہے مذہب میں اور دین میں جو میں نے عرض کیا ہے۔ یہ پورا پروگرام ہے اور ہر سال ہم اس پروگرام کو دہراتے ہیں' یہ کس قدر مشقت طلب پروگرام ہے۔ پھر اُس کے بعد حج کا پروگرام شروع ہو جاتا ہے۔ ساری دنیا سے دس لاکھ پندرہ لاکھ انسان اکٹھے ہوتے ہیں۔ ماحصل کیا ہوتا ہے؟ یہاں بھی آپ کے ہاں ماہ رمضان کے بعد عید کے موقع پر دعائیں مانگی گئیں۔ وہاں بھی حج کے اجتماع میں' عرفات کے میدان میں' جہاں کہا جاتا ہے کہ وہاں ہر دعا قبول ہوتی ہے' اور دعاؤں کو تو چھوڑ دیجیے' پچیس سال سے تو آپ مستقل یہ دعائیں مانگتے ہیں کہ یا اللہ! اسرائیل کی مملکت کا بیڑہ غرق ہو لیکن وہ بڑھتی چلی جا رہی ہے:

نہ دکھ جائے نہ درماں راس آئے
مگر خبطِ دوا ہے اور میں ہوں

دعا کے قبول ہونے کی عملی شکل

دعا کی قبولیت تو یہ ہے کہ دوسرا نیست و نابود ہوجائے۔ عزیزانِ من! دعائیں قبول ہوئی تھیں کہ پھر نہ ایران کی مملکت باقی رہی نہ بازنطینی باقی رہے، نہ یہاں کے مشرک باقی رہے، نہ وہاں کے مخالف باقی رہے۔ وہ اپنے ہر عمل کو اُس کے نتیجے سے پرکھتے تھے۔ اگر نتیجہ نہیں برآمد ہوتا تھا تو کھڑے ہوجاتے تھے کہ ہمارے اس پروگرام میں، اُس کی تکمیل میں، کہیں کوئی نقص واقع ہوگیا ہے۔ وہ تو دو اور دو چار کی بات کرتا ہے۔

قرآن کا انداز یہ ہے کہ کائنات کا جو محسوس نظام ہے وہ اُس کو اس بات کے ثبوت میں پیش کرتا ہے کہ اگر قانونِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کی جائے تو ایسے محسوس نتائج سامنے آجاتے ہیں۔ صحیح زمین ہو، ٹھیک بیج ہو، وقت پہ ڈالا جائے، سارے قاعدے کے مطابق پانی دیا جائے، روشنی ہو، حرارت ہو تو اُس کے لیے کہہ دیا گیا ہے کہ اس میں سے فصل اُگے گی اور ایک ایک دانے سے سات سات سو دانے ملیں گے۔ وہ مثالیں ایسی دیتا ہے کہ جس میں آپ فریبِ نفس میں مبتلا نہ ہوں۔ کسان یہ نہیں کہتا کہ صاحب! وہ فصل اُگی ہے یا نہیں لیکن کوئی بات نہیں مجھے ثواب تو ہوگیا ہے۔ وہ کہنے والا تو کہتا ہے کہ اُس میں سے سوسو دانے نکلیں۔ آپ پچھلی آیات کو دیکھیے اور پھر قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ ان سب کو وہ آیات کہتا ہے۔ **وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِکُمۡ وَ اَلۡوَانِکُمۡ ...... وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمۡ بِالَّیۡلِ وَ النَّھَارِ ...... وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖ یُرِیۡکُمُ الۡبَرۡقَ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا (30:22-24).** یہ پچھلی آیات چلی آرہی ہیں۔ اور ہماری انسانی زندگی کے متعلق جو اُس نے قانون دیا ہے تو اُسے بھی وہ آیاتِ قرآنی کہتا ہے۔ وہ بھی آیات ہیں، یہ بھی آیات ہیں۔ کیا ان دونوں آیات کے اندر یہ فرق ہوگا کہ وہ تو آیات ایسی ہیں جن کا محسوس نتیجہ سامنے آتا ہے، اگر نہیں آتا تو ہم یہ سوچنے کے لیے کھڑے ہوجاتے ہیں کہ وہ نتیجہ کیوں مرتب نہیں ہوا، اُس نے جب آیت کہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ہونے والے نتیجے کی نشانی ہے، علامت ہے، یہ ہوکر رہے گا، یہ ہونا چاہیے۔

کسان کی اگر فصل نہ اُگے تو پھر ثواب بھی نہیں ہوتا

کبھی کوئی کسان ایسا نہیں کرتا کہ ناقص بیج ڈالے اور اگر کچھ نہیں اُگا تو اگلے سال پھر وہی ناقص بیج ڈال دے، پھر اگر تو کچھ نہیں اُگا، تو وہی ناقص بیج ڈالتا چلا جائے۔ اگر کچھ نہیں اُگتا تو وہ کہے کہ کوئی بات نہیں ثواب تو ہوگا۔ وہ کبھی ایسا نہیں کرتا۔ یہ جو کائناتی مظاہر ہیں، جسے قرآن نے نظامِ فطرت کہا ہے، وہ اُس کو بار بار آیات کہہ کر آپ کے سامنے لاتا ہے تو کوئی اس کا مقصد ہے۔ یہ Biology (حیاتیات) Zoology (حیوانیات)، Histology (نسیجیات) کی کتاب تو نہیں ہے۔ یہ تو انسانوں کی

راہنمائی کے لیے ہے' **ھُدًی** ہے' اس میں کچھ Directives (ہدایات) دیئے ہوئے ہیں۔ تو اُن Directives (ہدایات) والی کتاب کے اندر کائنات کے جتنے بھی مظاہر ہیں' وہ ان کو بار بار آیات قرار دیتا ہے۔

قرآنِ حکیم کا تین چوتھائی حصہ مظاہرِ فطرت کی حقانیت پر مبنی ہے

قرآنِ کریم کا تین چوتھائی حصہ ان مظاہرِ فطرت کی حقانیت سے بھرا ہوا ہے۔ وہ یہ مثالیں یہ بتانے کے لیے پیش کرتا ہے کہ اس کے محسوس نتائج نکلتے ہیں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ جو نتائج وہ بتاتا ہے وہ نتائج نکلتے ہیں۔ اور اُس کے بعد وہ کہتا ہے کہ تمہارے لیے بھی اس قسم کے قوانین ہیں اور انہیں بھی وہ آیات ہی کہتا ہے۔ اور آگے وہ آیت آئے گی کہ یہی طریق جو یہاں ہم نے خارجی کائنات میں اپنی تخلیق کا اختیار کیا ہے' وہی انسان کی صورت میں ہم نے اختیار کیا ہے۔ یہ کوئی ان میں سے الگ مخلوق نہیں ہے کہ اس کے لیے تو صورت یہ ہے کہ یہ کچھ کرتا چلا جائے' چاہے کوئی نتیجہ نکلے یا نہ نکلے' اور وہاں یہ صورت ہو کہ نتیجہ نہیں نکلتا تو اس کے معنی ہیں کہ پروگرام پہ عمل نہیں ہو رہا۔ وہ آیت ان آیات کے بعد آتی ہے وہ بڑی عظیم آیت ہے۔ یعنی وہ اُس میں یہ کہتا ہے کہ اسی طرح جس طرح خارجی کائنات کی تخلیق ہوئی ہے تو جو نظام اُس میں عمل پیرا ہے اُسی طرح انسانوں کی تخلیق ہوئی ہے اور وہی نظام ان کے اوپر کارفرما ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ اپنی مرضی سے یہ نہیں کرتے کہ جیسا جی چاہے بیج ڈال دیں' وہ ہمارے قانون کی پابندی پر مجبور ہیں' اُس کے مطابق کیے چلے جا رہے ہیں اور نتیجے برآمد ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ کائنات ارب ہا ارب سالوں سے جو ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی چلی آ رہی ہے وہ اسی لیے ہے کہ لگے بندھے قوانین ہیں اور ان کی خلاف ورزی کرنے کا ان میں یارا نہیں ہے' مجاز نہیں ہے۔ انسان کو بھی وہی قوانین دیئے ہیں صرف اس فرق کے ساتھ کہ اس سے کہا گیا ہے کہ تمہارا اپنا جی چاہے تو اس کے مطابق تم کھیتی بوؤ اور اگر جی چاہے تو وہ غلط قسم کا بیج ڈالتے چلے جاؤ۔ قانون وہی ہے' قاعدہ وہی ہے' نظام وہی ہے' نتائج پرکھنے کا معیار وہی ہے۔ بس ایک اختیار (Choice and Will) کی بات ہے اور اسی سے انسان انسان ہے۔ اختیار سلب کر دیا جائے تو کوئی انسان اس کو گوارا ہی نہیں کرتا' اختیار ہی کا نام تو آزادی ہے۔ خدا اسے سلب نہیں کرتا لیکن معیار تو وہ ہے۔

قرآنِ حکیم کو پڑھنے کے سلسلہ میں حافظ اسلم جیراجپوریؒ کا ایک سبق آموز طریق

یہ آیات چلی آ رہی ہیں کہ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِهِ

الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ [1] **(30:24)**۔ یہ تمام نشانیاں ہیں ایک بات سمجھنے کے لیے۔لیکن یہ آیات ان کے لیے ہیں جو عقل وفکر سے کام لے گا۔اور جو کتاب کے الفاظ کے معنی ہی نہیں سمجھے گا تو وہ عقل وفکر سے کیا کام لے گا۔ یہ جو قرآن حفظ کیا ہوا ہوتا ہے' یہ جو قرآن کے حافظ ہوتے ہیں' میں نے ان سے یہ کہا کہ آپ تو بڑی آسانی سے اپنی منزل دہرا لیتے ہونگا' وہ روز دو منزل پڑھتے تھے۔ وہ میرے استاد علامہ حافظ اسلم جیراجپوریؒ **(1879-1955)** تھے۔ میں نے دیکھا کہ انہیں علی الصبح اٹھ کر ایک منزل دہرانی پڑتی ہے تب وہ حفظ قائم رہتا ہے۔انہوں نے میری بات کا جواب دیا کہ نہیں بھئی' دشواری ہوتی ہے کیونکہ میں جس وقت پڑھتا ہوں میری توجہ قرآن کے مفہوم کی طرف چلی جاتی ہے اور اگلی آیت ذہن سے نکل جاتی ہے۔ یہ جو اس طرح سے ایک ایک شیپنے میں اتنا پڑھ جاتے ہیں وہ اس لیے ہے کہ وہ ایک لفظ نہیں سمجھتے بلکہ انہوں نے صرف لفظ ہی یاد کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ جو چیز ہے کہ وہ الفاظ کے مفہوم پہ نگاہ جائے تو وہ جس رفتار سے یہ پڑھ رہے ہوتے ہیں تو وہ گاڑی اُس میں اٹک جاتی ہے لیکن پڑھ جائیں' یا نہ پڑھ جائیں بات تو سوچنے کی ہے کہ کیا دنیا میں کوئی کتاب بھی ایسی ہے جس کے ساتھ یہ کیا جاتا ہے؟

قرآن فہمی کے سلسلہ میں اہلِ مغرب کے سائنسدان ہم مسلمانوں کے بالمقابل زیادہ فعال ثابت ہوئے ہیں

قرآن نے **لِقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (30:24)** کہا ہے۔ یہ تو کتاب ایسی ہے جس میں وہ **یَتَفَکَّرُوْنَ' یَتَدَبَّرُوْنَ' یَشْعُرُوْنَ' یَعْلَمُوْنَ' یَعْقِلُوْنَ** کہتا ہے۔سارا قرآن اس سے بھرا ہوا ہے کہ تدبر کرو' فکر کرو' تعقل کرو' غور کرو' بصیرت سے کام لو' علم سے کام لو۔اگر آپ اس کتاب کے صرف الفاظ دہرائے چلے جائیں تو پہلی چیز تو الفاظ کے معنی کے سمجھنے کی ہوتی ہے اس کے بعد غور و فکر تو بعد کی بات ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ **وَ مِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ بِاَمْرِہٖ (30:25)** ارض اور خارجی فضا میں بکھرے ہوئے جس قدر کُرّے ہیں وہ تمام کے تمام **تقوم بامرہ** ہیں۔اس کا عام ترجمہ تو یہ ہوگا کہ وہ خدا کے حکم سے قائم ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ جب قرآن نے یہ کہا ہے کہ جو غور وفکر کرنے والی قوم ہے وہ سمجھ سکے گی کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔تو ان چیزوں پہ غور وفکر تو ہمارے ہاں مغرب کے سائنسدانوں میں ہو رہا ہے۔ مذہب پرست مسلمانوں کی قوم کے اندر تو اکثریت ان کی ہے جو صرف

---

[1] اور اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ ایک ہی گھٹا میں' بادل اور بجلی دونوں موجود ہوتی ہیں. بجلیاں تمہارے لیے وجہ خوف بنتی ہیں اور بادل موجب مسرت **(2:19)**۔ اس لیے کہ بادل سے وہ مینہ برستا ہے جس سے زمینِ مردہ کو زندگی مل جاتی ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے جو عقل وفکر سے کام لیتے ہیں' ہمارے قانونِ حیات کی کارفرمائی کو سمجھنے کی بڑی نشانیاں ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔934)۔

اس کے الفاظ دہراتے ہیں اور الفاظ کے بھی معنی نہیں سمجھتے۔ جو معنی کی طرف جاتے ہیں ان کی صورت یہ ہے کہ ہزار برس پیشتر کسی شخص نے جو معنی سمجھ لیا ہے آج اُسی کے اوپر یہ کھڑے ہوئے ہیں حالانکہ اس ہزار برس کے اندر انسانی علم کہیں کا کہیں جا پہنچا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تمہارے انفس و آفاق میں قرآن کے سمجھنے کے لیے آیات ہیں۔ ''انفس'' کو تو چھوڑیئے' وہ یہ ''آفاق'' کیوں کہتا ہے یعنی خارجی کائنات کے اندر کیوں؟ اس کے لیے تو سائنٹفک طریقہ اختیار کرنا ہوگا' اُس سے بات سمجھ میں آئے گی۔

ارض وسما کی وسعتوں کے پیشِ نظر اس کی ہیئت پر غور وفکر کی تاکید

وہ خود کہتا ہے کہ آفاق کے اندر تمہارے سمجھنے کے لیے آیات ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ کم از کم آفاق کی طرف تو دیکھیے۔ وہ جو آفاق کی طرف دیکھنے والے ہیں وہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ کیا کہا گیا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ **تقوم (30:25)** قائم ہیں ارض وسما اُس کے امر اور حکم کے لیے۔ تو سوال یہ ہے کہ قائم کیا چیز ہوتی ہے' قام کیا چیز ہوتی ہے؟ یہ کھڑا ہونا ہے۔ اب اگر آپ کے پاؤں میں ذرا توازن بگڑ جائے' اونچا نیچا ہو جائے' ایک پاؤں اوپر ہو اور دوسرا ذرا سا نشیب میں یا گڑھے میں اتر جائے یا کسی طرح بھی آپ کے دو پاؤں کا توازن بگڑ جائے تو آپ لڑکھڑا کر گر جاتے ہیں۔ کوئی چیز کھڑی نہیں رہ سکتی اگر اُس کا توازن بگڑ جائے۔ عربوں نے اپنے ہاں یہ لفظ قام اسی لیے استعمال کیا تھا یعنی وہ توازن کے لیے اسے استعمال کرتے تھے۔ اس سے وہ جتنے بھی الفاظ بناتے تھے تو اُن کے اندر صحیح (تناسب) Proportion کا ہونا نہایت ضروری تھا۔ ''قوام'' تو آپ بھی جانتے ہیں۔ یہ وہ ہے جو شیرے کا بنا ہوتا ہے اور اسے پیا جاتا ہے۔ اس کے بنانے میں یہ ہوتا ہے کہ ایک تار میں ذرا سا بھی فرق آ جائے تو سارا حلوہ بگڑ جاتا ہے۔ جسے وہ تقویم کہتے ہیں' جسے قوام کہتے ہیں' جسے قام کہا جاتا ہے تو یہ کیا چیز ہے؟ یہ حسنِ توازن کا نام ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ **وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖۤ اَنۡ تَقُوۡمَ السَّمَآءُ وَ الۡاَرۡضُ بِاَمۡرِہٖ**[1] **(30:25)**۔ اُنہوں نے اس کے اوپر غور کیا' اُنہوں نے اس کے متعلق یہ بات کہی کہ کیا بات قرآن کہہ گیا ہے۔ یہ ارض وسما کھڑے تو نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں ترجمہ کیا گیا کہ یہ کھڑے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ کھڑے تو نہیں ہیں بلکہ یہ تو گردش کر رہے ہیں' یہ تو معلق ہیں۔ تو اس کے اوپر تو یہ فوراً اعتراض آتا ہے کہ یہ ارض وسماوات اور آسمانی کرّے جتنے بھی ہیں وہ کھڑے ہیں جبکہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ ان کے اندر ان کا باہمی توازن ایسا قائم ہے جس سے یہ معلق ہیں۔ اسے وہ کششِ ثقل کہتے ہیں' جس کا نام صحیح توازن کہا جاتا ہے۔ ان کا جو باہمی ربط ہے وہ اس توازن سے قائم رہتا ہے۔

---

[1] خدا کے کائناتی قوانین کی کارفرمائی یہ بھی ہے کہ اس قدر عظیم الجثہ اجرام فلکی (کُرّے) فضا کی پہنائیوں میں معلق قائم ہیں۔ ان میں سے ایک کُرّہ ارض (تمہاری زمین) بھی ہے جس پر تم اس وقت بستے ہو (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔935)۔

اربوں کی تعداد میں پائے جانے والے کُرّوں کا باہمی ربط بڑے ہی غور و فکر کا متقاضی ہے

کائنات کے اندر جتنے بھی کُرّے ہیں' قرآن نے ان کے لیے **السمآء** کا لفظ استعمال کیا ہے' اُس نے گنائے نہیں ہیں کہ یہ کُرّے کتنے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں کروڑوں اربوں کے بعد تو ہندسے ہی ہمارے ہاں ختم ہو جاتے ہیں' اس کائنات کے متعلق اربوں بھی کوئی شے نہیں ہے۔ یہ سارے جتنے بھی ہیں یہ ہے جو آج تک کی فلکیات کے متعلق ان کے انکشافات ہیں' وہ اس پہ پہنچے ہیں کہ ان کا جو ربطِ باہمی ہے وہ جو ایک دوسرے کے ساتھ کشش ہے' اُس میں ایک توازن ہے۔ اگر اُس میں ذرا سی بھی کمی آ جائے تو یہ سارا سلسلہ تہس نہس ہو جائے' کسی دو کا باہمی توازن بگڑے تو وہ دو تک ہی نہیں رہے گا۔ جیمز جینز ❶ نے تو یہ لکھا ہے کہ ان میں ربطِ باہمی کی صورت یہ ہے کہ میں یہاں ایک انگلی ہلاتا ہوں تو کہکشاں بھی اُس سے متاثر ہوتی ہے۔ وہ جو ہمارے ہاں کے قرآنی مفسر ❷ نے کہا کہ

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

یہ شاعری نہیں ہے' یہ تو شاعری کرتا ہی نہیں ہے۔

آسمانی کُرّوں کی طرح عربی زبان کا دامن بھی بڑا ہی وسیع ہے

تو یہ ہے ان آسمانی کُرّوں کے ہاں کا باہمی ربط اور باہمی توازن۔ اس لیے تو یہ **اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ (30:25)** ہے۔ اب ان الفاظ کے آگے **بامرہ** ہے' امر کے متعلق تو آپ کو پہلے ہی معلوم ہوگا جو میں نے کئی دفعہ بتایا ہے بلکہ یہ چیز بھی حضرتِ علامہؒ ❷ نے اپنے خطبات میں ایک فلاسفر ❸ کا قول نقل کر کے کہی ہے' وہ بڑا اہم ہے۔ اُس نے کہا یہ ہے کہ یہ عربی زبان ہم سے بہت آگے ہے اور یہ لوگ بڑے خوش قسمت ہیں کہ ان کو ایسی زبان ملی ہے جس میں یہ کتاب (قرآن کریم) آئی ہے۔ اُس زبان میں Creation (تخلیق) کے لیے دو الفاظ ہیں: امر ہے اور خلق ہے۔ ہمارے ہاں صرف ایک ہی لفظ ہے جو Creation (تخلیق) کے لیے آتا ہے لیکن Creation (تخلیق) کی دو Stages (منازل) ہوتی ہیں۔ پہلی اسٹیج تو سب

---

❶ Jeans, Sir James ان کی اس کتاب کا نام ہے: The Mysterious Universe (پُراسرار کائنات)

❷ یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877) کی طرف ہے۔ ان کے خطبات کا نام **The Reconstruction of Religious Thought in Islam** ہے۔

❸ پرینگل پیٹی سن (1931-1856) (Pringle-Pattison, Andrew Seth)۔ ان نکات اور اس کے اصلی الفاظ کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 30 (مکمل)' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006' ص ص 382 تا 383 (فٹ نوٹ 1)

سے اہم ہوتی ہے وہ اسٹیج نہ ہوتو کوئی چیز تخلیق میں آ ہی نہیں سکتی اور وہ امر کی اسٹیج ہے جس کے اندر' ہمارے الفاظ میں کہیے' خدا کے متعلق یہ الفاظ بھی نہیں کہے جاسکتے' کسی ڈیزائن کا ارادہ' عزم' تصور' ذہن کے اندر آنا یعنی ابھی وہ محسوس شکل میں سامنے نہیں آئی ہوتی۔ کسی آرکیٹکٹ سے آپ پوچھیے کہ یہ کتنا اہم مرحلہ ہے' کسی پینٹر سے پوچھیے کہ یہ کتنا اہم مرحلہ ہے۔ یہ سارا کچھ تو اُس کے اندر ہوتا ہے۔ اور اُس کے بعد جب یہ چیز تکمیل تک پہنچتی ہے تو اُس میں پھر وہ شے ایک محسوس شکل اختیار کرتی ہے۔ وہ محسوس ایک لفظ Creation ہمارے ہاں ہے اور تو ہم کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ جب یہ محسوس شکل اختیار کرتی ہے تو اسے خلق کہا جاتا ہے۔ اور پھر یہ جو ''خلق'' کا لفظ ہے' خود ایک لفظ کے اندر بھی عربی زبان کے اعتبار سے اس کے معنی صحیح Proportion (تناسب) کے ہوتے ہیں۔ یہ جسے آپ اخلاق کہتے ہیں' تو وہ اسی مادے (Root) سے ہے۔ وہ جو صحیح توازن' صحیح تناسب' صحیح Proportion ہے وہ تو ہر جگہ قائم ہے۔ خدا نے اپنے آپ کو احسن الخالقین کہا ہے یعنی تخلیق کرنے والوں میں حسین ترین تخلیق کرنے والا۔ خلق کے اندر خدا نے اپنے آپ کو ہی نہیں رکھا بلکہ وہ اُس سے نیچے کے درجے میں تخلیق کرنے والوں کو مانتا ہے اور یہ انسان ہے۔ حیوانات کی سطح تک جو زندگی ہے وہ تو انسان تخلیق نہیں کر سکتے۔

امیر المومنین اور امر کے لفظ کا قرآنی مفہوم

اب اس کی تخلیق میں بھی جتنا کوئی چیز زیادہ توازن' تناسب' Proportion تک پہنچتی چلی جائے گی' اتنی ہی وہ صحیح ہوتی چلی جائے گی۔ اُس [1] نے کہا ہے کہ یہ قوم بڑی خوش قسمت ہے کہ ان کی زبان میں **Creation** (تخلیق) کے لیے دو الفاظ [2] ہیں: ایک امر ہے اور دوسرا خلق ہے۔ اور یہ جسے ہم نے عالمِ امر کہا ہے' یہ ہے جو خدا کے لیے مختص ہے' اُس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوسکتا۔ خود جو لفظِ امر بھی ہے' اس کے معنی بھی حکم کے نہیں ہیں بلکہ اس کے معنی Direction (راہنمائی) کے ہیں۔ یہ جو لفظ امیر المؤمنین ہمارے ہاں ہے' عام طور پہ تو ہمارے ذہن میں یہی ہے کہ وہ ویسے تو ہیڈ آف دی اسٹیٹ ہوتا ہے' وہ حکم دینے والا ہوتا ہے۔ امر کے معنی حکم ہی ہمارے ہاں کیا جاتا ہے جبکہ اُس کے معنی ہیں راہنمائی کرنے والا۔ آپ کے ہاں کا جو ہیڈ آف دی اسٹیٹ ہوتا ہے وہ امت کی راہنمائی کرتا ہے' حکم نہیں دیتا۔ راہنمائی یہ کرتا ہے کہ خدا نے اس باب میں یہ کہا ہے اور اس کے مطابق ہمیں چلنا ہے۔ کہا ہے کہ یہ جو مختلف کُرّے قائم ہیں' یہ اُس کے عالمِ امر سے قائم ہیں۔

---

[1] یہ اشارہ پرنیگل پیٹی سن (1856-1931) (Pringle-Pattison, Andrew Seth) کی طرف ہے جس کا اقتباس علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) نے اپنے خطبات The Reconstruction of Religious Thought in Islam (تشکیل جدیدِ الٰہیاتِ اسلامیہ) میں دیا ہے۔

[2] قرآنِ کریم میں دنیائے مشہود کے لیے ''خلق'' اور دنیائے نامشہود کے لیے ''امر'' کی اصطلاحات آئی ہیں۔

اب ایک اور چیز ہمارے سامنے آئی۔ ایک تو یہ تھا کہ یہ کُرّے جب ابھی اس طرح محسوس شکل میں تخلیق نہیں ہوئے تھے، وجود میں نہیں آئے تھے، تو ایک تو وہ عالمِ امر ہے۔ اُس میں ابھی خدا کا وہ ارادہ، ڈیزائن، تصور ہوتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ ہمارے الفاظ یہی ہیں اور جب ہم خدا کے لیے الفاظ استعمال کریں گے تو فرق کرنا بڑا ضروری ہے لیکن کیا کریں الفاظ تو ہمارے پاس یہی ہیں۔ تو وہ ایک عالمِ امر ہے جو تخلیق سے پہلے وہاں کا ہوتا ہے۔ یہاں ایک بڑی اہم چیز سامنے آتی ہے کہ اب یہ تخلیق کا مرحلہ آ گیا، یہ ساری خارجی کائنات تخلیق میں آ گئی، وہ مخلوق ہوگئی، محسوس شکل میں آ گئی۔ یہاں یہ بات نہیں ہے کہ وہ جو خدا کا امر والا مرحلہ تھا، وہ ختم ہوگیا۔ یہ جواب اس طرح سے قائم ہیں، یہ **بامرہ** ہے یعنی اُس کا یہ امر یہاں بھی کارفرما ہے۔

اس کائنات میں فطرت یا نیچر کے قوانین کسی انسان کے بنائے ہوئے ہیں ہی نہیں

خدا ایک شے کو تخلیق کرنے کے بعد پھر یہ نہیں ہے کہ بیکار ہو کر بیٹھ گیا کہ میرا کام تو ہوگیا: یہ نہیں ہے۔ اُس کا وہ امر جاری و ساری ہے اور یہ وہ امر ہے جسے ہم اپنے الفاظ میں سمجھنے کے لیے قانونِ فطرت کہتے ہیں، Laws of Nature کہتے ہیں۔ وہ کیا کریں بیچارے کہ ان کے پاس اور الفاظ ہی نہیں ہیں:

تیرا پتہ نہ پائیں تو لاچار کیا کریں

یہی الفاظ انہوں نے استعمال کرنے تھے۔ اس کا نام انہوں نے Nature (فطرت) رکھا۔ ہمارے پاس تو یہ لفظ بھی نہیں تھا، ہم نے اس کو قانونِ فطرت کہا۔ لیکن بہرحال ایک قانون ہے جس کے تابع یہ ساری کائنات جو خدا کی مخلوق ہے، چل رہی ہے۔ تخلیق کے بعد اس کائنات کا جو نظام چل رہا ہے تو یہ ایک قانون کے تابع چل رہا ہے اور وہ قانون نہ تو ان چیزوں کا اپنا پیدا کردہ ہے کہ انہی میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے لیے کوئی قانون وضع کرلیا ہے اور اُس کے تابع چلتی ہیں، اور نہ ان کے لیے یہ انسانوں کا پیدا کردہ ہے۔ یہ قانون ہم نے نہیں بنایا ہے کہ سورج اتنے بجے طلوع ہوگا، یہ ہمارا قانون نہیں ہے کہ پانی نشیب کی طرف جائے گا۔ ہم تو ان قوانین کو صرف Discover (بے نقاب) کرتے ہیں، ان پہ جو پردہ ہماری لاعلمی کی وجہ سے پڑا ہوتا ہے ہم صرف اُس پردے کو اٹھاتے ہیں، حقیقتیں تو پہلے سے موجود ہوتی ہیں۔ ہم صرف Laws of Nature (قوانینِ فطرت) کو معلوم کرلیتے ہیں، اُن کا انکشاف کر لیتے ہیں، اُن سے پردہ اٹھاتے ہیں، Discover (بے نقاب) کرتے ہیں۔ ایک بہت بڑا سائنٹسٹ [1] ہے اُس نے کہا ہے کہ

---

[1] اس سائنسدان کا نام **Sheen, F.J** (شین) ہے اور اس کی اس کتاب کا نام **Philosophy of Religion 1948** (فلسفۂ مذہب) ہے۔ جو قارئین اس موضوع سے دل چسپی رکھتے ہیں وہ اس کتاب کا مطالعہ کریں اور اس سلسلے میں حدود و قیودِ سائنس کے لیے ریڈنگ یونیورسٹی کے طبیعات کے پروفیسر ڈاکٹر جیمز آرنلڈ کروتھر کا **The Great Design 1934** نامی کتاب میں چھپنے والے مضمون کا گہرا مطالعہ کریں۔ یہ کتاب **Mason, Frances** کے زیرِ ادارت طبع ہوکر منظرِ عام پر آئی۔

We only read the Book of Nature we can't write it. ❶

ہم کتابِ فطرت کی تصنیف نہیں کرتے بلکہ اُس لکھی ہوئی کتاب کو صرف پڑھتے ہیں۔ اب ہم جو اپنی کتاب کو اس طرح پڑھتے ہیں کہ اس کا ایک لفظ نہیں سمجھتے اور پڑھتے چلے جاتے ہیں تو ہم نے فطرت ❷ کی کتاب کو کیا پڑھنا ہے۔ یہ ایک بڑی اہم چیز ہے جو یہاں آئی ہے۔

کائنات کا تو ذرہ ذرہ ہر آن خدا تعالیٰ کی نظر میں مصروفِ عمل ہے

خدا کا عالمِ امر تخلیق کے مرحلے سے پہلے تک ہی محدود نہیں ہے کہ وہاں تک اُس کا امر چلتا ہے اور اُس کے بعد پھر آگے امر نہیں چلتا۔ اُس کا جو امر ہے وہ کائنات کے ساتھ اس کے رگ و پے میں جاری و ساری ہے' مسلسل متواتر اُسی طرح سے' دوام کے ساتھ' چلتا جا رہا ہے۔ ہم اپنے سمجھنے کے لیے اُسے قانون کہتے ہیں' اُس کے تابع یہ سارا نظامِ فطرت قائم ہے۔ اگر وہ خدا ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق سو جائے تو آپ سوچیے تو سہی کہ کیا ہو؟ ایک سیکنڈ کے لیے آپ کا یہ بس ڈرائیور سو جاتا ہے تو پھر اُس کے بعد

نہ انجن رہے گا نہ انجینئری

اور اس عظیم کائنات کو چلانے والا جس کا قانون کارفرما ہے' کہتا ہے کہ **لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ (2:255)** نیند تو ایک طرف اُسے تو اونگھ بھی نہیں آتی۔ ''او ساڈا کنا دھیان رکھدا اے''! ❸ یوں اُس کا امر کارفرما ہے۔ نہ وہ مغرب کے سائنٹسٹوں کی طرح سے کہ جنہوں نے گھڑی بنا دی' آٹھ دن کے بعد ایک دفعہ چابی دینی ہوتی ہے' پھر آپ موج کیجیے' وہ اُس چابی کے زور پہ چلتی رہتی ہے۔ وہ یوں نہیں ہے' وہ تو جو امر والا ہے' جو قانون والا ہے تو اُس کی ہر وقت پرداخت پہ نگہ ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ خدائے زندہ ہے' **الحی** ہے' زندہ ہے اور اُس کو اونگھ نہیں آتی' بے خبر نہیں ہے' خبیر ہے' سمیع ہے' علیم ہے۔

قانونِ خداوندی کی محکمیت اور باخبری کے سلسلہ میں چاند پر جانے والوں کی مثال

خدا کی یہ ساری صفات اسی لیے ہیں کہ اُس نے اپنے امر کو اس طرح سے جاری رکھا ہوا ہے ورنہ ایک دفعہ ان چیزوں کو مشین

---

❶ ہم صحیفۂ فطرت کو پڑھ سکتے ہیں' لکھ نہیں سکتے۔

❷ اس کتاب فطرت کے متعلق متداول انسانی نظریات کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر) مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص۔315 (فٹ نوٹ 1)

❸ وہ ہمارا کس قدر دھیان رکھتا ہے!

کی طرح بنا کر پھینک دیتا اور فارغ ہو جاتا۔ یہ تو سوال ہی نہیں ہے۔ اور یہی چیز ہے کہ اُس نے انسانوں کی راہنمائی کے لیے وحی دی ہے تو اُس کا تعلق بھی عالمِ امر سے ہی ہے۔ اس وحی کے اندر انسانی زندگی کے لیے جو قوانین دیئے ہیں قرآن کے اندر ہمیں جو حکم بھی دیا ہے' جو ہدایت بھی ہمارے لیے دی ہے' ہر ایک کے ساتھ لکھا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔ جس طرح سے کائنات کے اندر وہ نتیجے نکلتے ہیں' وہ نتیجے از خود نہیں نکل رہے بلکہ وہ ایک قانون ہے جس کے تابع کائنات چلتی ہے۔ اور قانون کا ایک لفظ بھی ہم استعمال کر رہے ہیں وہ کوئی بھاپ تو نہیں ہے۔ قانون خود ذہن میں نہیں آ سکتا کہ قانون کیا شے ہے' جو نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ وہ اتنا Powerful اتنی بڑی لامتناہی قوتوں کا مالک ہے کہ اس کی ایک مثال دیکھیے کہ زمین پہ بیٹھے ہوئے جو چاند میں پہنچے ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ آپ کا رابطہ قائم ہے' راستے میں کوئی چیز نہیں ہے' نہ کوئی تار ہے' یہاں سے وہاں تک کچھ نہیں ہے اور رابطہ اس انداز کا قائم ہے کہ یہاں والوں نے اُس نگران سے پوچھا' تو اُس نے کہا کہ جی وہ تو نہیں ہے' میں ہوں' تو اِنہوں نے کہا کہ ہمیں پتہ ہے' تو اُس نے کہا کہ آپ کو کیسے پتہ ہے' کہنے لگے کہ ہمیں نہ صرف یہی پتہ ہے کہ وہ اسٹیرنگ پر نہیں بیٹھا بلکہ یہ بھی پتہ ہے کہ وہ سو رہا ہے۔ اُس نے کہا کہ آپ کو یہ کیسے پتہ ہے کہ وہ سو رہا ہے۔ کہنے لگے کہ جاگتے اور سوئے انسان کی جو Heart Beating (دھڑکنِ قلب) ہے اُس میں فرق ہوتا ہے۔ ہمارے پاس تم لوگوں کی Heart Beating (دھڑکنِ قلب) کے لیے بھی گراف موجود ہے کہ اتنے بجے کے بعد اُس کی جو Beating (دھڑکن) تھی وہ سست ہو گئی ہے اور اُس وقت سے وہ سویا ہوا ہے۔ یہ ہے امر۔ یہ ان کا بنایا ہوا قانون تو نہیں ہے کہ جس کی یہ کیفیت ہے: ذرے کا دل چیریں تو لہو خورشید کا ٹپکے۔ یہ اُس کا امر ہے۔

Cause And Effect (علت و معلول) کی بنیاد پر قانون کی اہمیت اور اس کو نافذ کرنے والی قوت کا وجود

انسانوں کی زندگی تو ایک طرف رہی' خارجی کائنات میں بھی یوں اُس خدا کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ ایک قانون اپنا نتیجہ پیدا کرتا ہے' ہر Cause (علت) ایک Effect (معلول) پیدا کرتا ہے تو یہ کوئی مکینکل چیز نہیں ہے۔ اُس کے پیچھے وہ قوت ہے جو ان قوانین سے یہ نتائج مرتب کراتی ہے۔ قانون کسی Physical یعنی طبعی مشینری کا نام نہیں ہے بلکہ جس قاعدے کے مطابق وہ مشین چلتی ہے اُس کا نام وہ قانون ہے اور وہ تو محسوس نہیں ہوتا۔ وہ قانون از خود بھی کیا کام کرے گا' قانون میں یہ قوت پیدا کرنے والی ایک ہستی ہونی چاہیے۔ اُس نے تو ہمارے سمجھانے کے لیے صرف یہ چیز کہدی ہے کہ ایک دانہ بوؤ گے تو سات سو دانے نکلیں گے۔ یہ کس طرح سے نکلتے ہیں' یہ اُس کے قانون کے تابع نکلتے ہیں۔ وہ اپنے قانون کے اوپر گرفت رکھے ہوئے ہے کہ

وہ ایسا کر کے رہے گا۔

میں نے عرض کیا ہے کہ ہم اپنے ہی الفاظ میں باتیں کرتے ہیں ورنہ خدا کا جو نظام ہے وہ تو ان سے بہت اونچا ہے۔ **سُبۡحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ** (23:91) اُس کے متعلق جو کچھ بھی تم کہتے ہو وہ اُس سے بہت ماورا ہے۔ یہ جو اس طرح سے اس کائنات میں اتنے عظیم کُرّے ہیں' تو ان کی عظمت اور وسعت کا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کتنے کتنے بڑے ہیں۔ یہ زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا تو ایک سورج ہی ہے اور یہ سورج اس نظام کے اندر کچھ شے ہی نہیں ہے۔ یہ جسے کہکشاں کہتے ہیں' شاعروں نے کہکشاں کہا ہے' گھاس کا گٹھا لے کر کوئی خشک زمین کے اوپر چلے تو وہ پیچھے سے ایک راستہ سا بن جاتا ہے: ''کہ'' کے معنی گھاس اور ''کشاں'' کے معنی کھینچ کر لے گیا۔ ان خلانوردوں نے اوپر دیکھا تو انہیں سمجھ ہی نہیں آیا کہ اسے کیا کہیں۔ انہوں نے کہا کہ کوئی گھاس کھینچ کر لے گیا۔ ان سے پوچھیے کہ جو عالمِ افلاک میں ماہر افلاکیات ہیں' وہ اس کہکشاں کے ایک اتنے سے ذرے کے اندر بیٹھے ہوئے کیا کچھ دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ یہ **قائم بامرہ** ہے تو گویا خدا کی یہ کیفیت نہیں ہے کہ اُس نے کائنات کو پیدا کر دیا تو اب اُس خدا کی ضرورت نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ تو سارا نظام اُس کے قانون کے تابع چلتا ہے' اُسی کے مطابق نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ پھر وہ قانون بھی سرکش نہیں کہ اُس نے بنا دیا اور وہ اپنے نتائج صحیح صحیح نہ دے۔

زندگی کی مثال ایک جوئے رواں کی سی ہے جو موت سے آشنا نہیں

قرآن کریم نے کہا ہے کہ **ثُمَّ اِذَا دَعَاکُمۡ دَعۡوَۃً ٭ۖ مِّنَ الۡاَرۡضِ ٭ۖ اِذَاۤ اَنۡتُمۡ تَخۡرُجُوۡنَ** (30:25) ۔اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ''پھر جب خدا تمہیں اس زمین سے آواز دے کر پکارے گا تو تم اس سے نکل پڑو گے''۔ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ بھی یہی کیا جاتا ہے اور مفہوم بھی یہی سمجھتے چلے آ رہے ہیں۔ اُس سطح کے اوپر وہ مفہوم لے لینا بھی صحیح ہے۔ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی ہمارے ہاں بنیادی ایمان کا درجہ رکھتی ہے' زندگی یہاں ختم نہیں ہوتی' موت سے انسان کا خاتمہ نہیں ہو جاتا بلکہ زندگی آگے بھی چلتی ہے۔ اُس نے اسے سمجھانے کے لیے یہ کہا ہے۔ یہ عرب بھی مردوں کو دفن کرتے تھے' تو چونکہ مُردے کو زمین میں گڑھا کھود کر دفن کیا جاتا ہے۔ تو سمجھانے کے لیے یہ بات تھی کہ جسے تم نے مُردہ کہہ کر یا سمجھ کر زمین میں دفن کر دیا تو وہ کبھی ان قبروں سے اٹھ کھڑے ہونگے' اس زمین سے اٹھ کھڑے ہونگے۔ یہ اس سطح پہ سمجھانے کی بات ہے۔

قبروں سے اُٹھ کھڑے ہونے کی حقیقت

ان عربوں کے ذہن میں یہ تھا کہ وہ مُردہ اس قبر کے اندر ہے۔ جب اُس انسان کو زندہ کرنے کی بات ان کی سطح پہ کرنی تھی تو

وہ یہی کی جاسکتی تھی کہ ٹھیک ہے تم نے جس کو اس میں دفن کیا تھا وہ یہاں سے اٹھے گا اور حیاتِ تازہ اُس کو مل جائے گی۔ لیکن جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ اُس قوم کو سمجھانے کے لیے تھا جو اپنے مُردوں کو یوں دفن کرتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہندوستان میں یہ قرآن نازل ہوتا اور ان سے اگر کہا جاتا کہ زمین سے یہ مردے اٹھیں گے تو وہ تو جلا کر راکھ بہا دیتے تھے تو ان کی سمجھ میں بات ہی نہ آتی' یہ محاورہ ہی سمجھ میں نہ آتا کہ زمین سے نکلنے کے کیا معنی ہیں کیونکہ وہ تو زمین میں دفن نہیں کرتے تھے۔ قرآن کو سمجھنے کے لیے یہ بات بھی پیشِ نظر رکھیے کہ اُس زمانے کی جو مخاطب قوم تھی اُس قوم کے ہاں جو الفاظ مروج تھے وہ اور جو ان کے ہاں اس قسم کے محسوس تصورات تھے' ان کی رو سے مثالیں دے کر قرآن نے بات سمجھائی ہے۔ یہ حقیقت میں نہیں ہے کہ وہ اسی مٹی سے اٹھیں گے۔ اگر انہوں نے ہی زندہ ہونا ہے' انہی کا حشر ہونا ہے' انہی کی قیامت ہونی ہے تو وہ تو پھر موج میں رہے جو یہیں جلا دیتے ہیں:

ہوئے مر کے ہم جو رسوا' ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا' نہ کہیں مزار ہوتا

(غالب)

تو ان الفاظ کو ان کے اس طرح معنوں کے اوپر نہیں جانا چاہیے کہ سچ مچ قبر کے اندر سے پتلا اٹھے گا۔ زمین کے اندر سے مردے کے اٹھنے کا یہ جو تصور تھا تو اس کے ماتحت اس آیت کا یہ ترجمہ بھی کیا گیا اور یہ مفہوم بھی لیا گیا۔ پھر میں آیت پڑھتا ہوں کہ **ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْاَرْضِ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ (30:25)** جب وہ ایک آواز دے گا تو تم پھر اس سے نکل پڑو گے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اگر اس کا مفہوم یہی ہے کہ پھر مرنے کے بعد زندہ ہو جاؤ گے تو اس پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن یہ جو اُس نے کہا تھا کہ آفاق کے اندر بھی ہماری نشانیاں ہیں اور جوں جوں یہ انسانی علم وسیع و بلند ہوتا جائے گا' ان کے اوپر پڑے ہوئے پردے اٹھتے چلے جائیں گے اور جو حقیقتیں پوشیدہ ہیں وہ بے نقاب ہو جائیں گی تو اپنے دور میں جہاں تک علمِ انسانی پہنچا ہے اگر کوئی ایسی چیز ہمارے سامنے آئی ہے تو اُس کی روشنی میں ان آیتوں کو سمجھا جاتا ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ **مِنَ الْاَرْضِ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ (30:25)** ایک تو یہ ہے کہ جیسے ہم زمین میں یہاں پاکستان سے لندن چلے گئے یا لندن سے امریکہ چلے جائیں تو یہ زمین سے خروج نہیں ہے۔ خروج تو کسی چیز کا کسی جگہ سے باہر جانا ہوتا ہے' اُس میں سے نکل جانا ہوتا ہے۔ یہ جو قرآن نے کہا ہے' یہ ارض و سما کی بات ہو رہی ہے۔

خدا کی طرف سے آواز آنے کا مفہوم

دعـا کے معنی خدا کی طرف سے آواز دینا ہے تو خدا کبھی آواز نہیں دیتا ہے' کبھی خدا کی آواز تو یوں نہیں آتی۔ وہ تو وہ ہے جسے ہم فطرت کے اشارے کہتے ہیں' اُس کے قانون کی بے نقابی کہتے ہیں۔ یہ ہے اُس کی جو دعوت ہوتی ہے' یہ ہے اُس کی جو پکار ہوتی ہے۔ زمین سے خارج ہوجانا' نکل جانا' یہ انسانیت کی تاریخ میں پہلی دفعہ ہوا ہے کہ انسان اس زمین سے نکل کر اوپر گیا ہے' یہ زمین سے خارج ہوگیا ہے۔ داخل کسی چیز کے اندر آنا ہوتا ہے' خارج اُس چیز سے باہر جانا ہوتا ہے۔ یہ ارض کے متعلق ہمیں کہا گیا ہے کہ یہ بھی ہوسکتا ہے۔ باہر کے کُرّوں کے ساتھ بظاہر ہمارا تو کوئی تعلق نہیں' وہ وہاں ہیں ہم یہاں ہیں۔ اُس نے کہا ہے کہ یہ بھی ہوسکتا ہے۔ وہ جو **دعا** ہے وہ وہی فطرت کا اشارہ ہے۔ یہ چیز **غالب** [1] کے انداز میں ہے:

چاک مت کر جیب' بے ایامِ گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیے

بہار کے موسم کے سوا کسی اور موسم میں اپنے دامن کو چاک نہ کر۔ یہ بہار کیا ہے؟ یہ اوپر کا اشارہ ہے جسے قرآن نے **دعاکم دَعْوَةً** کہا ہے۔ یہ ہے کہ فطرت کے حقائق پہ پڑے ہوئے پردے جب اٹھیں تو وہ تو پھر آدمی کو آنکھ مارتے ہیں۔ یہ جو چیز ہے کہ **اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ** تو اس کے لیے میں نے عرض کیا ہے کہ ذہن اس طرف جاتا ہے کہ قرآن میں یہ چیزیں جب موجود ہیں تو پھر کیوں نہ ہم اس پہ کھڑے ہوکر غور کریں۔ اُس نے تو کہا ہے ہم انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں تمہیں دکھاتے چلے جائیں گے۔ **حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)** تآنکہ ایک ایک بات جو انکشافِ حقیقت کے بعد انسان کے سامنے آئے گی وہ اس امر کا ثبوت ہوگی کہ قرآن نے جو کہا ہے وہ حق ہے۔

ارض و سماوات قرآنِ حکیم کی دو اصطلاحات ہیں' ورنہ نہ کوئی چیز نیچے ہے اور نہ کوئی اوپر

قرآن کے دعاوی کے حق ہونے کے ثبوت میں ایک یہ بھی چیز ہے کہ عالمِ آفاق کے اندر جو انکشافات ہونگے وہ قرآن کے کسی نہ کسی دعوے کے سچا ہونے کا ثبوت بن جائیں گے۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ آفاق میں جو بھی نشانیاں ہمارے سامنے آئیں ان کی روشنی میں قرآن کی آیتوں پہ غور کیا جائے۔ کیوں نہ قرآن کی اس آیت کے اوپر غور کیا جائے۔ ایک بڑی اہم آیت ہے اور اس کا مفہوم بھی آج ہی سمجھ میں آسکتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ **وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ**

---

[1] غالب' مرزا اسد اللہ خاں **(1797-1869)**

وَالۡاَرۡضِ (42:29) تخلیقِ ارض وسماوات خدا کی نشانیوں میں سے ہے۔ میں پھر عرض کردوں کہ یہ سماوات یہی نہیں ہے جو یہ چاند سورج ہمیں نظر آتا ہے بلکہ یہ تو قرآن نے دو جامع الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ارض کے معنی ہوتا ہے کہ ''کسی چیز کے نیچے'' اور سما کے معنی ہوتے ہیں ''اُس چیز کے اوپر''۔ یہ جو ارض اور سما ہے' یہ تو دونوں الفاظ ہیں' یہ Terms (اصطلاحات) ہی Relative (اضافی) ہیں۔ یہ میرا ہاتھ (اشارہ کرتے ہوئے) اس ہاتھ سے اوپر ہے اور یہ اس کے نیچے ہے۔ میرا ہاتھ مستقل طور پر نہ اوپر ہے نہ نیچے ہے' یہ (اشارہ کرتے ہوئے) اُس کی نسبت سے اوپر ہے' اِس کی نسبت سے نیچے ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی! اُس نے کہا ہے کہ ہم نے یہ ارض بنائی اور ہر ارض کے مثل ایک سما ہوا۔ تو یہ ٹھیک ہے کہ ہم اوپر والے کُرّے کے ارض ہیں۔ اقبالؒ (1877-1938) نے یہ کہا ہے کہ یہ ہوسکتا ہے کہ نیچے والے کُرّے اگر ہیں' تو تم اُس کے سما ہو۔ ''او ساہنوں آسمان کہن ڈیاے''۔ ❶ یہ جو قرآن کی چیزیں ہیں' وہ اُس کے تو الفاظ عربی زبان کے ایسے ہیں اور پھر اُس کا انتخاب ہے۔ اُس نے چاند سورج وغیرہ کہے ہیں لیکن جہاں یہ چیزیں ہیں وہاں سارے قرآن میں ارض وسماوات ہے تو یہ Relative Terms (اضافی اصطلاحات) ہیں۔

قدرت نے تو فضا کے اندر پھیلے ہوئے کرّوں میں بھی متنفس پھیلا رکھے ہیں

قرآن کریم نے کہا ہے کہ **وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَثَّ فِيۡهِمَا مِنۡ دَآبَّةٍ (42:29)** ان ارض وسماوات کے اندر جاندار مخلوق ہے۔ یہیں سے یہ چیز نظر آ گئی کہ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ جو فضا کے اندر آپ کے ہاں کُرّے ہیں تو ان میں بھی زندگی کا امکان ہے۔ ''دآبہ'' ہر متنفس کو کہتے ہیں۔ صرف ارض میں ہی نہیں بلکہ سماوات میں بھی ہے۔ قرآن نے یہ کہا ہے تو وہ تو اُس کے وجود کی شہادت دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ **بَثَّ فِيۡهِمَا (42:29)** اُس نے ان سماوات وارض دونوں کے اندر ذی حیات متنفس پھیلا دیئے ہیں۔

عزیزانِ من! آیت کا اگلا ٹکڑا یہ ہے کہ آج تو تمہیں یہ نظر آتا ہے کہ وہاں تک تمہارا تصور ہی جاسکتا ہے تم ان کو دیکھ نہیں سکتے۔ کیسے پتہ چلے کہ ان میں سے کس میں جاندار مخلوق ہے اور کیسی ہے۔ کہا کہ **وَهُوَ عَلٰى جَمۡعِهِمۡ اِذَا يَشَآءُ قَدِيۡرٌ (42:29)** اُس کے قانون کے اندر یہ بھی ہے کہ جب اُس کی مشیت کا تقاضا ہوگا تو تم دونوں آپس میں مل بھی جاؤ گے۔ یہ بات چودہ سو سال پیشتر کہی جا رہی ہے۔ اُس نے یہ بھی اپنے قانون میں رکھدیا ہے کہ اس کا بھی امکان ہے۔ جب اُس کے قانون کا تقاضا ہوگا' اُس

---

❶ وہ ہمیں آسمان کہہ رہا ہے۔

کے مطابق تم یہ کچھ کرو گے' تو تم اکٹھے بھی ہو سکتے ہو۔ چاند تک جمع ہونے کی پہلی منزل تو بہرحال ہمارے سامنے آ گئی' مریخ تک کے اُنہوں نے نشانات دیدیئے اور زندگی کے امکانات بتا دیئے۔

یاد رکھیے کہ جہاں کہیں نمی ہوگی وہاں زندگی کا امکان ہوگا۔قرآن نے کہا ہے کہ **وَ جَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ کُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ** **(21:30)** زندگی کی نمود پانی سے ہوتی ہے۔ یہ سائنسدان بھی اسی ٹوہ میں ہیں' چاند پہ بھی گئے تھے تو انہوں نے نیچے تک ٹوہ لگائی تھی کہ نمی والی مٹی بھی کہیں ملتی ہے۔ مریخ کے متعلق ان کا اندازہ ہے کہ اس کے اندر معاشرت ہے۔یعنی میں نے عرض کیا ہے کہ ابھی ہم اُس اندازے کے متعلق بات کر رہے ہیں کہ جس طرف رخ جا رہا ہے۔اور یہ چیز تو ان کے ہاں کا ایک گروہ ہے جس نے کہا ہے کہ ان چیزوں کا جو Analysis (تجزیہ) کیا گیا ہے تو اُس سے نظر آتا ہے کہ اس میں زندگی کی نمود ہے۔لیکن ابھی تو ابتدا ہے' ہم دو ہی کُرّوں تک تو پہنچے ہیں۔اس کی انتہا تو پوچھو ہی نہیں کہ کہاں تک جا کر ہوگی۔لیکن بہرحال ان ارض وسماوات کے اندر ''دآبہ'' کے امکان کی شہادت قرآن کی اس آیت میں موجود ہے۔اور آگے یہ بھی ہے کہ اُس کے قانون میں یہ بات بھی ہے کہ تم ایک دن آپس میں مل بھی جاؤ گے۔مل جانے کی بات تو ابھی معلوم نہیں کہ کب ہو۔ بہرحال یہ تو وہی لوگ جو اُس لائن پہ چل رہے ہیں' بتائیں گے۔ ہم تو آج بھی یہاں سے لندن والوں سے ملنا ہوتا ہے تو ان کے ہوائی جہاز کے محتاج ہوتے ہیں۔''جے اسی اپنے گڈے تے ای چلیے تے اگلے نگر نہیں پہنچا جاندا''۔ [1] یہ وہی جائیں گے۔

کائنات کو مسخر کرنے کے سلسلہ میں ہماری ذہنی پستی کی حالتِ زار اور قرآنِ حکیم کا ارشاد

قرآن نے بار بار کہا ہے کہ جو قوم فکر' تدبر' تعقل سے کام لینے والی ہے وہ قرآن کے اوپر آئے گی' وہ لوگ قرآن کے اوپر آئیں گے' ورنہ ہمارے ہاں تو آپ کو وہ لطیفہ معلوم ہی ہے اور پھر اسے کیوں نہ یہاں دہرا ہی دیں۔ جب پہلی دفعہ یہ بات ہوئی تھی کہ چاند پہ آدمی جا رہا ہے تو ہمارے ہاں' یہاں کئی جلسوں میں یہ وعظ بڑے زور سے ہوئے تھے۔ وہ حسنِ اتفاق تھا کہ سوئے اتفاق' وہ چاند رات کے دن تھے جب وہ پہلی دفعہ چاند کے اوپر گئے ہیں۔مولوی صاحب نے یہ کہا کہ ٹھیک ہے' آج تو وہاں چلے جائیں گے کہ چاند کھلا ہوا ہے اور پہنچ بھی جائیں گے لیکن چودھویں کے بعد جب وہ گھٹنا شروع ہوا تو پھر ٹھیک ہے کھسکتے ہوئے آگے آگے چلے جائیں گے اور اُس کے بعد کہا کہ ''بچے او! 30-29 نوں کتھے جاؤ گے؟'' [2]

---

[1] اگر ہم اپنی بیل گاڑی سے جائیں تو اگلے گاؤں تک بھی نہیں پہنچا جاتا۔

[2] بچّو! 30-29 ویں تاریخوں میں کہاں جاؤ گے؟

جب ہماری حالت یہ ہے تو ہم نے مِنَ الْاَرْضِ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ (30:25) کے معنی کیا سمجھنے تھے کہ اس ارض سے باہر بھی جایا جا سکتا ہے۔ باہر جانے کے متعلق اُس نے پھر کہا کہ یہ جو باہر کے کُرّے ہیں ان کے اندر زندگی کی نمود ہے ان کے اندر بھی متنفس ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے یعنی ہمارے قانون میں یہ بات بھی ہے کہ تم ایک دن آپس میں اکٹھے بھی ہو جاؤ۔ یہ آیتیں تو وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں اور وہ اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ یہ جن کو امام بنایا گیا تھا وہ آج اس قدر ان سے پیچھے (Backward) ہیں ان کے محتاج ہیں ان کے رحم و کرم پر ہیں کہ گداگری کے ٹکڑے ان کے کشکول میں پڑ رہے ہیں انہوں نے نوعِ انسان کی کیا امامت کرنی ہے۔ قرآن نے اس کو اماماً للناس کہا تھا۔ مومن کا تو یہ مقام تھا کہ الناس کی امامت نوعِ انسانی کی امامت کرنا ہے۔ یہی میدان تھے جس میں انہوں نے امامتیں کرنا تھیں۔ اس انداز کی قرآنِ کریم میں بیشتر آیات ہیں کہ جو لوگ بھی فطرت کے قوانین ❶ یعنی قوانینِ الٰہیہ جو فطرت میں کارفرما ہیں ان پہ پڑے ہوئے پردوں کو انکشافات کے ذریعے اٹھاتے چلے جاتے ہیں ان کے سامنے حقائق آ رہے ہیں وہ ان کو دیکھنے کے بعد بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ واقعی ان کے بنانے والی ہستی انسان نہیں ہوسکتی انسان سے بلند ہوسکتی ہے۔

اس قدر عظیم کارگہٗ کائنات کو پیدا کرنے اور اسے اس قدر خوبی سے چلانے کا مقصد کیا ہے؟

اس اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ❷ (30:25) سے آگے اور آیت آ گئی۔ پھر اگلی چیز یہ ہے کہ ٹھیک ہے جی! یہ سلسلۂ کائنات وجود میں آ گیا تو اب یہ مشین کی طرح چل رہا ہے از خود چل رہا ہے قانون کے ذریعے چل رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ یونہی ایک کھیل ہے جو کھیلا جا رہا ہے یا از خود یہ کچھ اب یوں ہو رہا ہے یا اس کے پیچھے کوئی مقصد کوئی نصب العین ہے؟ بات یہ ہے کہ اتنا عظیم کارگہٗ کائنات کو وجود ہی میں نہیں لایا گیا بلکہ اُس کے قوانین کے پیچھے ایک زندہ قوت ہے جو اس کو اس طرح سے چلائے جا رہی ہے۔ اگر اس کا آخری مقصد کچھ نہیں ہے تو پھر یہ کیا ہے؟ کیا یہ کھیل ہے؟ جن کے سامنے علم نہیں تھا اُس قوم نے تو کہا کہ مثلاً ہندوؤں کے ہاں تو ہے ہی یہ کہ یہ تو پرمیشور کی لیلا رچائی ہوئی ہے کھیل ہے ناٹک ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں پرمیشور کا نام ہی نٹ راجن ہے۔ نٹ کے معنی ہوتے ہیں جو اسٹیج کے اوپر ایکٹر (اداکار) ہوتا ہے۔ یعنی خدا کا نام نٹ راجن ہے کہ کھلاڑیوں کا بادشاہ۔ ان کے ہاں

---

❶ فطرت کے قوانین کے لیے انسانی متداول نظریات کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ لاہور 2005 ص۔ 315 (فٹ نوٹ 1)۔

❷ اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ تم مرنے کے بعد خدا کی آواز پر ازسرِ نو زندہ ہو جاؤ۔ اور ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم اس زمین سے اٹھ کر کسی دوسرے کُرّے کی طرف چل نکلو جیسا کہ آج کل نظر آ رہا ہے۔ اس صورت میں ''خدا کے بلاوے'' سے مراد علم الفطرت کے مزید انکشافات ہوں گے۔ فطرت کا ہر اشارہ خدا ہی کا بلاوہ ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص۔ 935 (فٹ نوٹ 1)۔

تصور یہ ہے۔ قرآن نے جہاں جہاں خدا کے متعلق یہ باتیں کی ہیں تو اُس نے کہا ہے کہ ہم نے اس سلسلۂ کائنات کو لٰــعِبِیْــن ❶ (44:38 ;21:16) پیدا نہیں کیا' کھیل کے طور پہ پیدا نہیں کیا ہے۔ جہاں یہ چیز کہی ہے کہ اس کے اندر Seriousness (سنجیدگی) ہے' ایک Purpose (مقصد) ہے' ایک Object (مدّعا) ہے تو وہاں یہ باطل کے جو تصورات تھے ان کی تردید بھی وہ ساتھ کے ساتھ کرتا چلا گیا ہے۔ جہاں اُس نے کہا تھا کہ خدا کو نیند تو ایک طرف اونگھ بھی نہیں آتی' جہاں اس حقیقت کا بیان تھا تو وہاں ہندوؤں کے اس عقیدے کی بھی تردید کی جنہوں نے کہا تھا کہ خدا اس کائنات کو پیدا کرنے کے بعد سو گیا ہے۔ یہودیوں کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ چھ دن محنت کر کے اُس نے کام کیا' پھر تھک گیا اور ساتویں دن وہ سو گیا اور وہ چھٹی کا دن ہے' یہ Holiday ہے کہ جس دن خدا سویا تھا۔ قرآن ان الفاظ میں ان سب کی تردید کرتا چلا جاتا ہے۔

آج کے دور میں تہذیبِ مغرب کی سوچ کا ماحصل

اب صورت یہ ہے کہ وہ تو توہم پرستی کا دور تھا جس میں انہوں نے کہا کہ کھیل کے طور پر ایک چیز پیدا کر دی ہے' اس کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ اس دور کی' یورپ کی جو تہذیب اٹھی ہے تو اُس نے خالصتاً اس کو Physical ❷ یا طبعی کائنات بتایا ہے۔ ان کا بھی تصور یہ ہے کہ

---

❶ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (44:38) ہم نے اس عظیم القدر کارگۂ کائنات کو یونہی ہنسی مذاق کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ یہ اس لیے سرگرمِ عمل ہے کہ ہر کام کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب ہو جائے (45:22 ;21:16) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1116)۔

❷ اس کائنات کو طبیعاتی دنیا (Physical Universe) کہتے ہیں۔ ''طبیعاتی'' کا مطلب عام فہم یوں سمجھیں کہ جو چیزیں انسان کے دائرہ حواس (Senses) میں آ جائیں انہیں ''طبیعاتی'' (Physical) کہتے ہیں۔ انیسویں صدی تک سائنس یہیں تک پہنچی تھی۔ اب سائنس کے مزید انکشافات نے بتایا ہے کہ کائنات کوئی طبیعاتی ہے ہی نہیں' ہر شے ماوراالطبیعاتی (Super-Physical) ہے۔ یعنی جب کوئی ماوراالطبیعاتی عنصر اتنا ہیولیٰ (Mass) اکٹھا کر لے کہ وہ محسوس (Perceptible) ہو جائے تو اسے طبیعاتی (Physical) کہہ دیتے ہیں۔

When super-physical gathers so much mass that it becomes perceptible to our sensory organs, it is called physical.

لہٰذا محسوسات کی دنیا میں کسی شے کے وجود (Being or Existence) کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہیولیٰ (Mass) اکٹھا کر لے اور پھر اسے یک جا (Integrate) رکھے۔

Physical existence means gathering of mass and keeping it integrate.

(حوالہ پرویزؒ: سلیم کے نام (چودھواں خط)' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' ص ص۔195 تا196)

کاروانِ زندگی بے منزل است ❶

اس کاروانِ زندگی کا کوئی نصب العین‘ کوئی Object (مدعا) کوئی Purpose (مقصد)‘ کوئی Goal (منزل) نہیں ہے۔ بس یہ اسی طرح سے بن گئی۔ وہ جب تحقیق کرتے کرتے یہاں تک پہنچتے ہیں کہ یہ Nothing (عدم) سے Being (موجود) کیسے ہوگئی یعنی عدم سے کیسے وجود میں آئی تو ان کے ہاں اس کے لیے ایک ہی لفظ ہے کہ صاحب! یہ ایسا By Chance (اتفاقیہ) ہوگیا۔ جب وہ تصور ہی یہ ہو کہ By Chance (اتفاقیہ) ایسا ہوگیا اور یہ قوانین لگے بندھے ہیں‘ غیر متبدل ہیں‘ ان کے تابع یہ کچھ چل رہا ہے تو پوچھو کہ بھئی! وہ قوانین کیسے کام کر رہے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ بس ٹھیک ہے‘ وہ کر رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔ چلو قصہ ختم!!!

خدا جو اس کائنات کا خالق ہے اس نے اس کو بے سود پیدا نہیں کیا

اگلی آیت ہے کہ **وَ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (30:26)** ۔اس کا ترجمہ تو یہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ اُسی کی ملکیت ہیں لیکن بات ملکیت سے نہیں بنتی کیونکہ وہ تو خالق ہے اور ٹھیک ہے اُس کی ملکیت تو ہیں ہی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔ یہ سارا سلسلۂ کائنات جو سرگرمِ عمل ہے یہ خدا کے متعین کردہ پروگرام کے لیے سرگرمِ عمل ہے اور اس طرح سے سرگرمِ عمل ہے کہ **كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (30:26)** ہر شے اُس پروگرام کی تکمیل کے لیے **قانتون** ہے۔

عربی زبان کو اور قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق

اس لفظ **قانتون** کے عام معنی تو یہ ہیں: فرمانبردار‘ اطاعت گزار۔ ٹھیک ہے یہ مفہوم ہوسکتا ہے لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ عربی زبان میں ایک چیز کے لیے ہی نہیں‘ ایک تصور کے لیے بھی بہت سے الفاظ ہوتے ہیں۔ وہ جو ہمارے ہاں زبان میں مرادفات کا تصور ہے تو مرادف کے معنی لیا جاتا ہے کہ ایک ہی لفظ کے دو معنی۔ یہ زبان کا بڑا نقص ہوتا ہے۔ Exactly (ہُو بہُو) اگر وہی معنی لیے جائیں تو پھر دو لفظوں کی کیا ضرورت ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ شاعری کے لیے الفاظ کی ضرورت پڑتی ہے کہ مصرعے میں ایک لفظ جو ہے وہ آتا ہے تو وزن پڑتا ہے تو اُس کی جگہ دوسرا لفظ لے آتے ہیں کہ وہ شعر درست رہے۔ یہ چیز جو ہے یہ فارسی زبان میں تو ہوسکتا

---

❶ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877ء) کا یہ مکمل شعر یوں ہے:

کاروانِ زندگی بے منزل است — درنگاہش آدمی آب و گِل است

یہ شعر میکانکی تصورِ حیات کی عکاسی کرتا ہے۔

ہے کہ وہاں شہد اور انگبیں دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ عربی زبان میں یہ نقص نہیں ہے۔ وہاں ایک چیز کے لیے سینکڑوں الفاظ ہیں لیکن کوئی دو لفظ ایسے نہیں ہیں جو Exactly (ہُو بہُو) ایک ہی معنی دیتے ہوں اور یہی اُس زبان کی وسعت کا کمال ہے۔ وہ ایسے ہی نہیں کہ اُس نے کہا کہ ہم نے عربی مبین میں اس کو نازل کر دیا' یہ اس کی آخری کتاب ہے' خدا کی مکمل کتاب ہے۔ اُس کے لیے وہ کیوں کہتا ہے کہ ہم نے اسے عربی مبین میں نازل کیا ہے۔

عزیزانِ من! یہی زبان تھی جو اس کی متحمل ہو سکتی تھی۔ اور پھر اس زبان کی یہ خوبی ہے کہ ایک چیز کے لیے اتنے الفاظ ہیں۔ میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ وہ ❶ اپنی کتاب Cosmic Consciousness کے اندر لکھتا ہے کہ ایک دور کے اندر Concepts (تصورات) کے لیے عربی زبان میں جتنے الفاظ ملتے ہیں دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملتے۔ وہ اسلام کی بات نہیں کر رہا بلکہ عربی زبان کی بات کر رہا ہے۔ تو اتنے الفاظ جو ہیں ان میں سے خاص مقام پہ قرآن ایک خاص لفظ چنتا ہے۔ قرآن کو سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ یہاں ان تمام میں سے یہ لفظ کیوں چنا ہے۔ یہ شاعری تو ہے نہیں کہ وہ جو شعر کا وزن تھا اُس کے لیے یہی لفظ Fit in کرتا تھا۔ قرآن نے جو کہا ہے کہ یہ شاعری نہیں ہے تو اُس کے معنی یہی ہیں کہ اس میں کوئی لفظ اس لیے نہیں لایا گیا کہ وزن درست رہے۔ ہر لفظ اپنی جگہ پہاڑ ہے' ہمالیہ ہے۔ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ قرآن میں ان اتنے الفاظ میں سے یہی لفظ کیوں لایا گیا ہے۔

لفظ قانت کے مفہوم کے تحت انسان کی عملی زندگی پر پڑنے والے لازوال اثرات

یہاں کہا ہے کہ **كُلٌّ لَّهُ قٰنِتُوْنَ (30:26)**۔ اب تو ہمارے ہاں چھڑکاؤ کرنے کے لیے میونسپل کمیٹی کی گاڑیاں ہوتی ہیں' ان کے پیچھے ایک نال ہوتی ہے۔ پانی بھرا ہوا ہوتا ہے' جہاں ضرورت نہیں ہوتی وہ اُس کا نل بند کر دیتا ہے' گاڑی چلتی جاتی ہے' پانی بھرا ہوا ہے اور ایک قطرہ نہیں ٹپکتا۔ جہاں اُس نے چھڑکاؤ کرنا ہوتا ہے وہاں وہ کھول دیتا ہے اور وہاں وہ پانی نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ ان کے ہاں اس قسم کے مشکیزے ہوتے تھے جن کے منہ کی صورت یہ ہوتی تھی کہ جہاں ضرورت ہو' جتنی ضرورت ہو' اتنا اس میں سے وہ نکل آئے' جہاں ضرورت نہ ہو وہ اس طرح مہر بہ لب ہو جائے کہ اس میں سے پانی کا ایک قطرہ بھی ضائع نہ جائے۔ یعنی بے مقصد' بے مطلب' بے جا ایک قطرہ بھی اُس میں سے ضائع نہ جائے۔ اور جہاں اُس کی ضرورت ہے تو وہاں وہ اپنا منہ کھول دے' بخل بھی نہ کرے کہ وہاں وہ دے نہیں۔ یہ جو ان کے ہاں کا مشکیزہ ہوتا تھا اور اس کی جو اس قسم کی صفت ہوتی تھی اُسے وہ ''قانت'' کہتے تھے۔ قنوت ان کے ہاں اس صفت کا نام تھا کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو' اپنی توانائیوں کو' جہاں خدا کے پروگرام کا تقاضا ہو کہ

---

❶ اس مصنف کا نام رچرڈ مورس بک Richard Maurice Bucke ہے۔ اس کی اس کتاب کے صفحات 30 تا 31 ملاحظہ کیجیے۔

صرف کرے، وہاں صرف کرو، جتنا تقاضا ہو صرف کرے تو اتنا ہی صرف کرو اور جہاں اُس کی ضرورت نہ ہو، وہاں اُس کو محفوظ رکھے اور بند کر لے۔ یہ کیفیت جب کسی توانائی کی ہو جائے گی تو اُسے **قانتون** کہا جائے گا۔

کائنات کا ذرہ ذرہ قانت ہونے کے باعث اسی سنہری اصول پر کاربند ہے

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **وَ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** **(30:26)** تمام کائنات کی ہر شے اُس کے پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل ہے اور وہ اس طرح سے کارفرما ہے کہ **كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ** **(30:26)** ہر شے اُس پروگرام کے تقاضے کے مطابق اپنی توانائی کو صرف کرتی ہے، جہاں تقاضا نہیں ہوتا وہاں وہ اس کو سنبھال کر رکھ لیتی ہے، ضائع نہیں کرتی۔ نہ اُس میں اسراف ہوتا ہے، نہ تبذیر ہوتی ہے۔ یہ سارا کچھ جو بیان کرتا جا رہا ہے آخر میں آپ دیکھیں گے کہ وہ کہتا یہ ہے وہی جو میں پنجابی میں کہا کرتا ہوں کہ ''دھیے نی توں گل سن، نونہے نی توں کن کر''۔ ❶ یعنی وہ بات تو یوں بظاہر بیٹی سے کہہ رہی ہوتی ہے لیکن اُس نے وہ بات بہو کے کان میں ڈالنی ہوتی ہے۔ یہ سارا کچھ جو خارجی کائنات کے متعلق کہا جا رہا ہے اُس کے آخر میں جا کر وہ آیتیں ہیں کہ وہ انسانوں سے یہ کہہ رہا ہے کہ تم خود دیکھ رہے ہو کہ یہ کارگہِ کائنات کس حسن و خوبی سے چل رہا ہے، کیسے چل رہا ہے، کیوں چل رہا ہے۔ وہ خود کہیں گے کہ قانون کی رو سے چل رہا ہے۔ اُس کے بعد وہ کہتا ہے کہ تم بھی اپنی زندگی کے اندر، اپنے معاشرے کے اندر، اُس قانون کی پابندی کرو تو وہ بھی اسی طرح حسن و خوبی سے چلنے لگ جائے گی جہاں اُس نے پہنچانا ہے۔ پھر یہ کہنا ہے کہ جس طرح یہ جو کائنات ہے، بے مقصد و بے منزل نہیں ہے اسی طرح انسانوں کی زندگی بھی بے مقصد نہیں ہے۔

عزیزانِ من! اگر زندگی یہی طبعی زندگی ہے اور اُس کے بعد موت سے خاتمہ ہو جانا ہے تو یہ تو بے مقصد ہے۔ وہ ان تمام تصریحات و تفصیلات و تشریحات سے اس نتیجے پہ پہنچاتا ہے کہ جو کچھ کائناتی آیات کے تابع بیان کرتا چلا جاتا ہے، یہ یوں نہیں ہے کہ یہ سائنس کی کتاب ہے اور وہ آپ کو پڑھا رہا ہے۔ اُس نے تو یہاں آپ کو پہنچانا ہے۔ قرآن کا مقصد انسان کو یہ بتانا ہے کہ تم بھی وہ قوانین جو امرِ الٰہی سے ملیں گے، ان پر عمل کرو۔ اور وحی کے متعلق اُس نے کہا ہے کہ یہ امر ہے۔

وحی خداوندی کی روشنی میں انسانی معاشرے میں ایک ایسی بہارِ نو آئے گی کہ اس کا کونہ کونہ نغموں کی آواز سے گونج اٹھے گا اور پھر فرشتے تم پر درود بھیجیں گے

وہ جو ہمارے ہاں اس ایک آیت کا غلط مفہوم لیا جاتا ہے وہ ہے کہ **قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ** **(17:85)**۔ اس میں وہ ''روح'' کے معنی وہ روح **(Soul)** ہی لیتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ یہاں روح کے معنی وحی خداوندی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جو

---

❶ اے بیٹی! تُو بات سُن اور اے بہو! تو دھیان دے۔

امرِ خداوندی ہے کہ جب تم دیکھتے ہو کہ کس طرح خارجی کائنات کے اندر کارفرما ہے تو اُسی امر کے مطابق تم اگر اپنی زندگی بسر کرو گے تو جیسے وہاں بہار آنے پہ عش عش کر اٹھو گے تو تمہاری زندگی بھی ایسا نغمۂ نو بہار بن جائے گی کہ کائنات عش عش کر اٹھے گی۔ خدا اور اُس کے فرشتے **يُصَلِّىْ عَلَيْكُمْ** (33:43) ہوں گے۔ یہ بھی شاید آپ کے لیے نئی بات ہو کیونکہ ہم تو نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہی یہ بات جانتے ہیں کہ **اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ** (33:56)۔ لیکن اُس کے ساتھ ہی یہ ہے کہ خدا اور اُس کے فرشتے **يُصَلِّىْ عَلَيْكُمْ** (33:43) تم پر بھی درود بھیجتے ہیں۔ حضور ﷺ اور ان کے صحابہ ﷺ مومنین سے کہ خدا اور اُس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں۔ ہم درود ہی کہیں گے۔

یہ درود عربی زبان کا لفظ ہی نہیں ہے۔ اسے یوں کہیے کہ شاباش، تحسین و آفریں کے پھول برساتے ہیں، کیا بات ہے تمہاری! واہ واہ!۔ یہ وجد آفریں الفاظ ہونگے۔ یہ اس طرح ہونگے کہ اُس کے قانون کے مطابق جب وہ المدثر اٹھے گا جس کے معنی یہ ہیں کہ کائنات کے خزاں دیدہ صحن میں بہار لانے والے اٹھ، تو جب وہ اٹھے گا تو پوری جماعت کو ساتھ لے کر اٹھے گا۔ یہ جو خزاں دیدہ شجرِ کائنات تھا، اُس پہ جب نئی بہاریں آئیں گی، شگوفے چٹخیں گے، رنگ اور خوشبو کے کارواں مہکیں گے، اس کو دیکھ کر یہ صورت ہوگی کہ خدا اور فرشتے یہ کہیں گے کہ کیا بات ہے تمہاری!

خدا بھی فرشتوں کے سامنے سر اٹھا کر بات کرے گا

معاف رکھیے! محاورے کے طور پہ کہونگا کہ وہ وقت ہے کہ جب خدا بھی سر اٹھا کر بات کرے گا، ورنہ بات تو وہ چلی تھی کہ جب آدم کو تمثیلی انداز میں خدا نے بیان کیا ہے کہ جب آدم کو پیدا کیا ہے تو ملائکہ نے کہا کہ کیا تم اُس کو پیدا کر رہے ہو جو زمین کے اندر **مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ** (2:30) فساد پیدا کرے گا، خونریزیاں پیدا کرے گا۔ اُس وقت تو اس کا جواب اس سے زیادہ کچھ نہیں دیا گیا کہ **اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ** (2:30) ہم جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔ وہاں تو اتنی ہی بات کہی تھی اور وہ بھی خاموش ہو گئے۔ لیکن یہ جتنی بھی انسان کی تاریخ ہے اس میں چند لمحات کو چھوڑ کر باقی تو فرشتوں کا جو اعتراض ہے یہ اُسی کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے کہ **مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ** (2:30)۔ انسان کی ساری تاریخ فساد، خونریزی، شعلہ فرمائی سے بھری پڑی ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ سارا کچھ جب ہوتا ہو تو اُس وقت تو پھر، میں محاورے کے طور پہ عرض کر رہا ہوں، فرشتے آپس میں سرگوشیاں کرتے ہونگے کہ ''دیکھیا اسی جو کہیا سی''۔ ❶ لیکن جب اسی کائنات کے اندر وہ جماعتیں جنہیں محمد رسول اللہ ﷺ

---

❶ دیکھا جو ہم نے کہا تھا (وہی ہوا)۔

والذین معہؑ کے نام سے پکاریں، کھڑی ہونگی تو پھر اُس وقت خدا ان سے سر اٹھا کر کہے گا کہ میں نے جو کہا تھا کہ **اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَالَا تَعۡلَمُوۡنَ (2:30)** ٹھیک ہے یا نہیں جو میں نے کہا تھا۔ اسی لیے کہا ہے کہ **اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ (33:56)** خدا نے تو شاباش دینی ہی تھی وہ فرشتے کہ جنہوں نے اعتراض کیا تھا کہ تم یہ پیدا کر رہے ہو، وہ بھی اُس کے ساتھ کہیں گے کہ کیا بات ہے تمہارے اس شاہکار کی! واقعی یہ اس قابل تھا کہ اس کے اوپر ہم پھول نچھاور کرتے۔ لیکن یہ تو اُس وقت کریں گے جب آپ کائناتی قوتوں کو مسخر کر کے خدا کی Values (اقدار) کے مطابق صرف کریں اور صحنِ چمنِ کائنات میں ایک نئی بہار آئے۔ کہا کہ **کُلٌّ لَّہٗ قٰنِتُوۡنَ** ❶ **(30:26)**۔ یہ سارا کچھ جو ہو رہا ہے یہ نہیں تھا کہ ہم نے پہلی دفعہ یہ سارا کچھ یونہی گھڑ گھڑا کر یوں رکھ دیا۔ اس میں تو ہر شے خدا کے پروگرام کے لیے وقف ہے۔

تخلیق کے بالمقابل خدا کا عالمِ امر ارتقا کا رہینِ منت نہیں ہوتا

اب امر کے بعد کی زندگی یعنی دنیا آ گئی۔ وہ جو اُس کا عالمِ امر تھا اُس کے اندر کسی ارتقا کی ضرورت نہیں تھی کہ آہستہ آہستہ پہلے خدا یہ سوچے، پھر یہ سوچے۔ وہاں یہ بات نہیں تھی۔ خلق کے اندر کہا کہ ہمارا تخلیق کا طریقہ یہ نہیں کہ پہلے ہی دن ایک چیز ہم نے مکمل شکل کے اندر رکھ دی۔ کہا کہ **ھُوَ الَّذِیۡ یَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ (30:27)** پہلے وہ اُس کی ابتدا کرتا ہے۔

تخلیق کے مختلف مراحل

عربی زبان میں ایک لفظ **فطر** ہے۔ **فطر** کے معنی ہوتے ہیں کہ "کسی شے کو پہلی بار عدم سے وجود میں لانا"۔ اب یہاں خلق کی ابتدا کہی گئی ہے۔ خلق کے لیے پہلا جو کسی قسم کا جرثومہ ہے، وہ وجود میں آ گیا ہے۔ اُس کی ابتدا کرنے کے بعد یہ نہیں ہے کہ وہ پہلی ہی دفعہ مکمل شکل کے اندر بنا دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہے کہ **ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ (30:27)** پھر وہ اُس کو گردشیں دیتا ہے۔ "اومٹی دے تھوبے نوں چک تے چڑھوندا اے" ❷۔ پھر وہ کمہار مٹی کے تھوبڑے سے کہیں وہ پیالہ بناتا ہے، کہیں وہ صراحی بناتا ہے۔ یہ سارا راز اُس گردش میں ہوتا ہے جو چاک پہ ہوتی ہے۔ یہاں **یعیدہ** ہے یعنی وہ زندگی کے پیکروں کو گردشیں دیتا ہوا آگے لے جاتا ہے۔ کمہار کو آپ نے کبھی دیکھا ہوگا کہ وہ کمہار جب مٹی کو چاک پر چڑھاتا ہے تو گردش کے وقت اُس میں جو فالتو مٹی ہوتی ہے وہ ساتھ کے ساتھ کاٹتا چلا جاتا ہے۔ المصور ہے، اُس کے ذہن میں ہے کہ آخر میں، میں نے اس کو کیا بنانا ہے۔ اس کے لیے اس نے

---

❶ کائنات کی ہر شے اپنی تمام صلاحیتوں کو اُس کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے وقف کیے ہوئے ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔935)۔

❷ وہ مٹی کے تودے کو چاک پہ چڑھاتا ہے۔

میٹریل (مواد) لیا ہے پھر **یعیدہ** سے یعنی اُس نے چاک پہ چڑھایا۔ اب اُس کے بعد **الباری** ہے۔ **الباری** کے معنی ہیں ''حشو و زوائد کو الگ کرنے والا''۔ **هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (59:24)**۔ ساری صفات ہی اُس کی بڑی حسین ہیں۔ یہ جو مٹی کو الگ کرنا ہے تو بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ وہ ضائع کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ بھی اُس کے حسن کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ اس کو ضائع بھی کر دیا جائے۔ سارے پتے اگر جھڑ نہ جائیں تو نئی کونپلیں پھوٹتی نہیں ہیں۔ کہا ہے کہ **ثُمَّ يُعِيْدُهٗ (30:27)** پھر وہ گردشیں دیتا ہوا ارتقائی منازل طے کراتا ہوا ان کو آگے کے لیے چلا جا رہا ہے۔ اور کہیں اُس نے بھی یہ کہا ہے کہ اب اُس گردش کی آخری منزل یہاں آ گئی ہے جس کو ہم انسان کہتے ہیں۔

ذاتِ خداوندی کو اس عظیم، تحیر انگیز کارگہ کائنات کو بنانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی

یہاں **یعیدہ** کہا ہے۔ اتنا عظیم، تحیر انگیز، کارگہ کائنات اور اُس سب کو ایک ذرّے سے شروع کر کے اس انتہا تک پہنچاتے چلے جانا بڑا ہی مشکل ہوگا۔ کہا کہ **وَ هُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ (30:27)** کچھ مشکل نہیں، ہمارے لیے یہ بہت آسان تھا، کچھ مشقت نہیں اٹھانی پڑی، نہ ہی یہ چیز تھی کہ ہم تجربے کر رہے تھے کہ ایک تجربہ ناکام ہوا، پھر دوسرا کیا، پھر تیسرا کیا۔ سب کچھ پہلے سے ہمارے ڈیزائن کے اندر تھا اور یہ سب کچھ نہایت آسانی سے ہوتا آ رہا تھا۔ اور پھر جو بنا ہے کہ **وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (30:27)** یہ جس طرح سے پیکر بنے ہیں، یہ بڑے ہی اعلیٰ درجے کے پیکر ہیں۔ سورۃ النحل میں انسانوں کے متعلق بھی یہ کہا ہے کہ اگر تم خدا کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو گے تو **الْمَثَلُ الْاَعْلٰى (30:27)** ہو گے، نہایت حسین قالب کے اندر تمہاری زندگی ڈھل جائے گی اور یہ نہ کرو گے تو تمہارے قالب میں ناہمواریاں پیدا ہو جائیں گی۔

قوت اور غلبے کے ساتھ حکمت کا ہونا بھی ضروری ہے

اُس نے **ولَهُ المثل الاعلٰى (30:27)** کہا ہے کیونکہ اُس نے اپنا قالب آپ نہیں ڈھالنا، انہوں نے اپنے آپ کو خود اپنے وضع کردہ قالبوں میں نہیں ڈھالنا بلکہ اُس نے ان کے لیے جو قالب تیار کیے ہیں، ان کے اندر اُنہوں نے اپنے آپ کو ڈھالنا ہے۔ اسی لیے کہا کہ **وَ لَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** [1] **(30:27)**۔ اب کہا کہ یہ کیسے ہوتا ہے؟ جواب دیا کہ **وَ هُوَ الْعَزِيْزُ**

---

[1] اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے سب ڈھانچے قانونِ خداوندی کے قالب میں ڈھالے ہوئے ہیں، اس لیے وہ نہایت اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ (اگر انسان بھی سیرت و کردار کو قوانین خداوندی کے قالب میں ڈھال لے تو اس میں بھی ایسا ہی حسن پیدا ہو جائے)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔935)۔

الْحَكِيْمُ (30:27)۔اس کا غلبہ ہے' حکمت ہے۔ اُس مٹی کے تھوبے پہ کمہار کا غلبہ ہوتا ہے' وہ اُس کے تابع چلتا ہے' اُس کے انگوٹھے کے تابع چلتا ہے' وہ اُس کے تاگے کے تابع چلتا ہے۔ عزیز کے معنی ''غلبہ'' ہوتا ہے۔ کہا کہ دو چیزوں کی ضرورت ہے: غلبے کی ضرورت ہے اور قوت کی ضرورت ہے۔ اگر اُس کمہار کے اندر قوت ہی قوت ہو تو وہ ساری مٹی کو تہس نہس کر کے رکھ دے۔ کہا کہ **هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (30:27)** غلبے اور قوت کے ساتھ حکمت کی بھی ضرورت ہے۔ غلبہ اُس کمہار کا اُس تھوبے پر اور حکمت اُس کی یہ کہ اس کو گھمانا ہے' اوپر لے جانا ہے یا نیچے۔ جہاں بھی قرآنِ کریم نے زندگی کی یا کائنات کی یہ ارتقائی منازل گنائی ہیں' وہاں **عزیز وحکیم** کہا ہے۔ اور یہی چیز انسانی زندگی کے اندر بھی ہے کہ قوت اور اُس کے ساتھ صحیح رائے۔ قوت کے Rationally (پُرحکمت) استعمال سے صحیح نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ اگرچہ علامہؒ ❶ کے الفاظ میں یہ ہے کہ

قوتِ بے رائے جہل است و جنوں

خالی قوت جس کے ساتھ رائے شامل نہیں ہے' Reason (حکمت) شامل نہیں ہے' وہ جہالت ہے۔ اور آگے دو ہی آیات کے بعد قرآن' **فَطَرَ النَّاس** اور **فِطْرَتَ اللهِ** کی بات کرتا ہے۔ علمی سطح پر دنیا بھر میں' صدیوں سے فطرتِ انسانی کے متعلق پایا جانے والا تصور غلط ہے۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ الروم کی آیت 27 تک آ گئے۔ 28 آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

---

❶ یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877) کی طرف ہے۔

چوتھا باب: سورة الروم (آیت 30: انسانی فطرت)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج ستمبر 1979ء کی 7 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الروم کی آیت 28 سے ہونا چاہیے تھا لیکن جیسا کہ میں نے سابقہ درس کے آخر میں مختصر الفاظ میں کہا تھا اور مجھے بعد میں یہ افسوس ہوا کہ میں نے مختصر الفاظ میں کیوں کہا' مجھے ذرا وضاحت سے کہنا چاہیے تھا۔

علمی سطح پر صدیوں سے دنیا بھر میں فطرت کے متعلق پائے جانے والے غلط تصور کی وضاحت

دو آیات (30:28-29) کے بعد ایک آیت آتی ہے' اُس کا موضوع اتنا اہم ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر پورے ایک درس میں بھی آ جائے تو غنیمت ہے اور شاید اس سے بھی زیادہ وقت لگے۔ وہ آیت ہے کہ **فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا** (30:30)۔ اس سے مقصود انسانی فطرت لیا جاتا ہے۔ میں نے مناسب سمجھا ہے کہ درمیان کی دو آیات سرِ دست چھوڑ دوں' وہ بعد میں آ جائیں گی اور درس کا آغاز تیسویں آیت سے کیا جائے بلکہ آج کے درس کو اُسی کے لیے مختص کر دیا جائے۔ ویسے تو ہر درس میں بھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ قرآنِ کریم کے حقائق اور رموز آپ کے سامنے آتے ہیں اور میں دیکھتا ہوں کہ آپ احباب انہیں بڑی توجہ سے سنتے ہیں لیکن یہ موضوع کچھ تھوڑا مشکل سا ہے اس لیے میں خاص طور پہ عرض کرونگا کہ اس کے ایک ایک ٹکڑے پر گہری توجہ کی ضرورت ہوگی۔

میں ابھی عرض کرونگا کہ وہ کیوں ضرورت ہے۔ انسانی فطرت یعنی Human Nature کے الفاظ یہی نہیں کہ آج کی دنیا میں' ہر قوم میں' ہر ملک میں' اور پھر عام طبقے میں نہیں بلکہ بلند پایۂ سائنٹسٹ' فلاسفرز' دانشوران جتنے بھی Intellectuals (دانشوران) ہیں' ان سب کے ہاں یہ چیز ہے کہ Human Nature (انسانی فطرت) ہے اور ہمارے ہاں بھی انسانی فطرت

ہے۔ ہم اسی طرح سے دہرائے چلے آ رہے ہیں۔ اس چیز کے اوپر حیرت ہوتی ہے کہ اڑھائی ہزار سال سے یہ تصور مسلسل اور متواتر چلا آ رہا ہے۔ تاریخ میں یہ ہے کہ یونان کے فلاسفرز نے اس کی ابتدا کی' یونان کے فلاسفر نے Human Nature (انسانی فطرت) کا تصور دیا۔ اس سے غلط یا صحیح نتائج تو اخذ کیے چلے جا رہے ہیں لیکن اس کے متعلق کبھی دو آ راء ہی نہیں ہوئیں' کبھی کسی نے یہ کہا ہی نہیں ہے کہ ذرا بیٹھ کر' سوچ سمجھ کر' دیکھیں تو سہی کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا یہ کوئی چیز ہے بھی یا نہیں؟ ہر ایک نے اس Presumption پہ' اس مفروضے پہ' بات کا آغاز کیا کہ یہ تو ہے' اب اس سے آگے بات چلایئے۔ اب آپ سوچ لیجیے کہ اس کے بعد جب میں یہ کہوں کہ یہ کچھ ہے ہی نہیں تو کتنا اہم موضوع ہو گیا اور ان لوگوں کو تو چھوڑیئے کہ انہوں نے تو فلسفے کے اعتبار سے یہ بات کہی ہو گی۔

نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کردہ ایک روایت کہ ہر بچہ فطرت پہ پیدا ہوتا ہے

ہمارے ہاں تو آپ نے یہ الفاظ بار بار سنے ہونگے کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ کیا کبھی کسی نے آپ کو بتایا بھی ہے کہ اس کے معنی کیا ہیں کہ اسلام دینِ فطرت ہے؟ پھر آگے وہ ایک روایت ہے جسے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور یہی چیز وجہ تاسف ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ کسی ہمارے ہاں کے عام فلاسفر یا محقق یا محدث کے ذہن کی اختراع ہے تو کوئی بات نہیں' قابلِ عفو ہے لیکن اگر کہا یہ جائے کہ یہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا جو اس کائنات کے اندر عالم الناس تھے' تو تاسف ہے۔ جو روایت آپ ﷺ کی طرف منسوب کی ہے' وہ یہ ہے کہ ہر بچہ فطرت پہ پیدا ہوتا ہے اور فطرت اسلام ہے اس لیے ہر بچہ اسلام پہ پیدا ہوتا ہے اور یہ اُس کے ماں باپ ہیں جو اُسے یہودی' نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں' اگر اُسے اُس کی حالت پہ چھوڑ دیا جائے تو جو کچھ وہ کرے گا' جو کچھ وہ بنے گا' وہ اسلام ہو گا۔ یہ ایک حدیث بیان کی جاتی ہے۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ یہ اتنا عام ہے کہ ہر جگہ آپ یہ الفاظ سنتے ہونگے اور آج تک کبھی کسی نے یہ نہیں بتایا ہو گا کہ یہ درحقیقت ہے کیا' اس کے معنی کیا ہیں' اس کا مطلب کیا ہے؟ آیئے پہلے ہم دیکھیں کہ لوگ جسے فطرت کہتے ہیں وہ ہوتی کیا ہے؟

خارجی کائنات میں فطرت کا مفہوم بڑا واضح' ٹھوس اور غیر متبدل ہے

خارجی کائنات کے اندر اُسے کہا ہی فطرت کہا جاتا ہے' وہاں کی اشیا کے اندر یہ چیز ہے۔ پانی کی فطرت ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہتا ہے یعنی اُس کو علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا جائے تو وہ نشیب کی طرف بہتا ہے' خاص درجۂ حرارت پر پہنچ کر بھاپ بن جاتا ہے' نیچے کی طرف آ یئے تو انجماد کے درجۂ حرارت پہ وہ ٹھوس ہو جاتا ہے۔ پانی جہاں بھی ہے وہاں اُس کی یہ فطرت ہے۔ ہر مقام پہ جسے پانی

کہتے ہیں وہاں اُس کی یہ فطرت ہے۔ میں اُس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ اگر تھوڑا سا Height (بلندی) پہ پہنچیں تو ڈگری میں فرق آتا ہے ورنہ یہ چیز پانی کی فطرت ہے جہاں کہیں بھی ہے۔ بکری کی فطرت ہے کہ وہ گھاس کھاتی ہے' وہ گوشت نہیں کھاتی۔ دس ہزار سال پہلے کی بکری کے متعلق بھی معلوم ہوا تو وہ یہی تھی' ہمیشہ یہی رہی' آج بھی یہی ہے اور ہر بکری کی یہ کیفیت ہے۔ شیر کی فطرت ہے کہ وہ گوشت کھاتا ہے' سبزی نہیں کھاتا' پہلے زمانے کا شیر بھی یہی تھا' اس دوران میں ہر شیر کی یہی کیفیت ہے' آج بھی جہاں شیر ہے' اُس کی یہ کیفیت ہے۔ آگ کی فطرت ہے کہ وہ حرارت پہنچاتی ہے۔ ان چیزوں کے متعلق تو فطرت کا لفظ سمجھ میں آیا۔ یعنی اسے سمجھ لیجیے کہ فطرت کسی شے کی اُس خصوصیت کو کہتے ہیں جو غیر متبدل ہوتی ہے' اُس میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ پانی کو تو چھوڑ دیجیے کہ آپ کہیں گے کہ ذی حیات نہیں ہے۔ بکری اور شیر وغیرہ کو تو لیجیے' وہ تو ذی حیات ہیں' وہ بھی اپنی فطرت کو نہیں بدل سکتے۔ فطرت اُس خصوصیت کا نام ہے جو غیر متبدل ہے اور جس کے بدلنے کا اختیار کسی شے کو نہیں ہوتا۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ہر نوع کی' ہر شے کی' وہی فطرت ہے مثلاً ہر بکری کی ایک ہی خصوصیت ہے' اُس کے اندر یکسانیت ہے' الگ الگ نہیں ہے کہ اس بکری کی یہ فطرت ہے اور اُس بکری کی وہ فطرت ہے۔ جہاں تک اس کائنات کی چیزوں کا تعلق ہے ان خصوصیات کو ان کی فطرت کہا جاتا ہے۔

فطرت کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ کسی شکل میں بدلتی ہی نہیں

سوال یہ ہے کہ کیا انسان کی بھی کوئی اس قسم کی فطرت ہے؟ کہا جائے گا کہ انسان کے اوپر تو خارجی اثرات ہوتے ہیں اس لیے خارجی اثرات سے اُس کی فطرت بدل جاتی ہے۔ جو بدل جاتی ہے وہ فطرت کیسے ہوئی؟ فطرت تو بنیادی طور پہ وہ چیز ہے جو بدل ہی نہیں سکتی۔ پہلے ہی قدم کے اوپر ان کا جو مسلمہ تھا وہ ختم ہوجاتا ہے۔ پھر فطرت وہ ہے جو اُس نوع کے ہر فرد کے اندر یکساں ہے۔ یہاں دو انسان یکساں نہیں ہوتے۔ تو یہ انسانی فطرت پھر کیا ہوئی؟ وہ تو ہر انسان میں یکساں ہونی چاہیے۔ یہی نہیں ہے کہ انگوٹھے کے جو نشان ہیں کہ وہ دو افراد میں ایک جیسے نہیں ملتے اور آج تک تو انگوٹھے کے نشانوں سے ہی جرائم کی تحقیق و تفتیش ہوتی تھی' اس چیز کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اُس خالقِ فطرت کی حکمت کے متعلق عجیب شے ہے کہ اس ایک نکتے کے اوپر عقل محوِ حیرت رہ جاتی ہے خواہ اُس کو دس ہزار سال یا پچاس ہزار سال ہوئے اُس وقت سے آج تک کوئی دو انسان ایسے نہیں ہیں جن کے انگوٹھے کی لکیریں ایک جیسی ہوں۔ یا اللہ! یہ کس قدر حیرت انگیز ہے!

عزیزانِ من! اس مظہر سے تصور کا دائرہ بٹ جاتا ہے کہ اُس کے پاس اتنے ڈیزائن ہیں۔ اور آپ حیران ہونگے کہ اب تو

تفتیش کی لائن اور طرف جا رہی ہے۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ کوئی دو انسان ایسے نہیں کہ جن کی ناک ایک جیسی ہو۔ اور آگے پتہ نہیں کیا کیا چیزیں آئیں گی۔ لیکن یہ تو بہرحال اس کے طبعی اعضا وغیرہ ہیں جن کے متعلق بات ہو رہی ہے کہ دو کے ناک بھی ایک جیسے ہوتے ہی نہیں۔ کبھی کبھار اگر جڑواں بچوں کے ہوتے ہیں تو ماں کے لیے مصیبت آ جاتی ہے۔ وہ ایک کے گلے میں یہ کچھ ڈالتی ہے اور دوسرے کے گلے میں منکا ڈالتی ہے کہ پہچانے جائیں۔ آپ سوچیے کہ سارے انسان اسی قسم کے ہوتے کہ جن کے چہرے یکساں ہوتے تو انسانیت کے اوپر کیا بیتتی۔ میں نے کہا ہے کہ یہ بہرحال انسان کی جو طبعی ہیئت ہے' میں اس کے متعلق ابھی یہ عرض کر رہا ہوں۔ فطرت طبعی ہیئت کو نہیں کہتے۔ کیا کوئی دو فرد ایسے ہیں جن کی خصوصیات بالکل یکساں ہوں: بکریوں کی طرح' شیروں کی طرح' پانی کی طرح؟ دو انسان بھی اس قسم کے یکساں نہیں ہوتے۔

وہ انسانی فطرت پھر کیا ہے؟ فطرت تو ہم نے پہلے دیکھا تھا کہ غیر متبدل خصوصیت کو کہتے ہیں اور پہلا ہی قدم یہ کہ خارجی اثرات اُس کی فطرت کو بدل دیتے ہیں تو یہ تو یہیں ختم ہوگئی۔ فطرت کی دوسری Definition (تعریف) یہ تھی کہ وہ اُس نوع کے ہر فرد میں یکساں ہوتی ہے' ہر بکری کے اندر دوسری بکری جیسی فطرت ہوتی ہے' ہمیں تو کوئی دو انسان بھی ایسے نظر نہیں آتے جن کے اندر کی خصوصیات' صلاحیتیں' ذہنیتیں' نفسیات ایک جیسی ہوں۔ انسانی فطرت کیا ہوئی؟ کہا کہ جی! اگر انسان کو پیدا ہوتے ہی چھوڑ دیا جائے اور خارجی اثرات اُس پہ نہ ہوں تو وہ فطرت پہ پلتا ہے۔

انسانی فطرت کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے ایک تجربہ

پہلے تو معلوم نہیں کہ ایسا تجربہ ہوا تھا یا نہیں' اگرچہ تاریخ میں یہ ہے کہ اکبر (1542-1605ء) نے اس کا تجربہ کیا تھا لیکن ہمارے زمانے میں تو ہمارے سامنے یہ ہوا۔ یہ تقسیم پاک و ہند سے پہلے کی بات ہے اور آج بھی غالبًا وہ لڑکا زندہ ہوگا۔ وہاں ہندوستان میں اس کا بڑا چرچا ہوا تھا' یو پی (اپر پردیش انڈیا) میں انہیں ایک لڑکا جنگل میں ملا تھا جسے شاید پہلے ہی دن بھیڑیئے اٹھا کر لے گئے تھے۔ وہ عجیب چیز تھی کہ اُس بچے کو ان بھیڑیوں نے اپنے دودھ پر پالا۔ وہ بچہ ملا' وہ چھ سات سال کا تھا' وہاں کے بہت بڑے ڈاکٹر تھے اُنہوں نے اُسے لیا تو گویا یہ ایسا انسان تھا جس پہ انسانوں کے کوئی خارجی اثرات نہیں ہوئے تھے' اُسے انسانی فطرت پہ ہونا چاہیے تھا لیکن وہ بالکل بھیڑیا تھا۔ وہ ہاتھوں پاؤں پہ چلتا تھا جسے چاروں ٹانگوں پہ چلنا کہتے ہیں' بول نہیں سکتا تھا' ہاتھوں سے نہیں کھاتا تھا اُسی طرح سے منہ سے کچھ کھاتا تھا' وہی کچھ کھاتا تھا جو بھیڑیئے کھاتے تھے۔ انسانی بچہ جس کے اوپر خارجی انسانوں کے اثرات نہیں ہوئے وہ یہ بن گیا۔ چنانچہ اُس کی وہاں بڑی تحقیق ہوئی' اُس زمانے میں انڈیا میں اس کے متعلق بڑا شہرہ

تھا' آئے دن اُس کے متعلق اخبارات میں یہ خبریں چھپتی تھیں' اُس نے بڑا Interest (دل چسپی) پیدا کیا اور بات ہے بھی Interest (دل چسپی) کی کہ انسانی بچہ جس پہ انسانوں کے اثرات مرتب نہ ہوں اُس کی فطرت کیا ہوتی ہے۔ اُس نے دیکھا کہ وہ انسانی بچہ ہی نہیں رہتا۔ اُس کے متعلق مجھے بھی Interest (دل چسپی) تھا کیونکہ یہ میرا موضوع تھا تو اُس کے متعلق معلومات ہوتی رہتی تھیں۔

انسانی فطرت کا تصور پیدا کرنے میں فلاسفروں کا کردار

پہلے تو یہ لیجیے کہ یہ جو فطرت کا تصور تھا' یہ وہاں خطۂ یونان کے فلاسفرز میں کیسے پیدا ہوا؟ اسے تو چھوڑ دیجیے کہ یہ کیسے پیدا ہوا' اسے دیکھیے کہ ارسطو (384 BC.-322 B.C.) کے ہاں یہ چیز ملتی ہے' وہ غلامی کے جواز میں کہا کرتا تھا کہ بعض انسان فطرتاً غلام پیدا ہوتے ہیں اس لیے ان کو اگر آزاد کر دیا جائے تو ان کی فطرت کے خلاف ہوتا ہے' وہ اسی طرح سے تکلیف میں رہتے ہیں جیسے ٹیڑھے پاؤں والے کو سیدھی جوتی پہنا دی جائے۔ اس لیے جس کی فطرت غلامی کی ہے اور اُسے آزاد انسان بنا دیا جائے تو وہ اُس میں خوش نہیں رہ سکتا جیسے مچھلی پانی کے باہر خوش نہیں رہ سکتی۔ اُس کے پاس بیس غلام تھے اور وہ بیس دلیلیں دیا کرتا تھا۔ اور وہ دلیلیں اُس پر تھیں کہ بعض انسانوں کی فطرت یہ ہوتی ہے۔ یعنی اُس نے بعض انسانوں کی فطرت کہہ کر گروہ بنا دیا۔ نظر آیا کہ جو استحصال کرنے والے لوگ تھے' جو متغلب لوگ تھے' جو اپنا غلبہ چاہتے تھے' دوسروں کے اوپر اقتدار چاہتے تھے اُنہوں نے اپنے استبداد کے جواز کے لیے ایک دلیل پیدا کی کہ بابا! ہم نے انہیں غلام نہیں بنایا' یہ فطرتاً غلام ہیں۔ ان کو تو اگر غلام نہ رکھا جائے' آزاد کر دیا جائے تو ان پہ ظلم ہوگا۔ یہ چیز تو تاریخ نہیں بتاتی کہ اُنہوں نے یہ تصور کیسے دیا لیکن جس مقصد کے لیے اس تصور کو استعمال کیا' اُس سے نظر آیا کہ وہی جذبہ جو انسان کا دوسرے انسان کو اپنا مفتوح' ماتحت' محتاج رکھنے کا ہے' اُس کے لیے ایک فلسفیانہ دلیل دی گئی کہ ان کی تو فطرت ہی یہ ہے۔

ہندوستان میں انسانی فطرت کا یہ غلط تصور یونان سے آیا اور گہرے مضمرات رکھتا ہے

وہیں یونان سے یہ تصور ہندوستان میں آیا اور یہاں انہوں نے انسانوں کو ورنوں میں تقسیم کیا جسے یہ ذاتیں کہتے ہیں: شودر' ویش' کھشتری' برہمن۔ شودر کا کام ہی یہ ہے کہ باقی ورنوں کی خدمت سرانجام دے اور معاشرے میں جتنے ذلیل و پست درجے کے کام ہیں وہ انہیں سرانجام دے۔ ان کے اوپر جب کبھی اعتراض کیا گیا کہ صاحب! یہ تو ظلم ہے کہ تمہارے ہی جیسے انسان ہیں' برہمن جیسا انسان ہے' کھشتری جیسا انسان ہے اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اُس سڑک پہ نہیں چل سکتے جس سڑک کے اوپر یہ بڑے ورنوں والے چل سکتے ہیں۔

مدراس میں یہ شودر زیادہ ہیں' وہاں شودر وہ چاول نہیں کھا سکتے جو برہمن کھاتے ہیں' اُس کنویں سے پانی نہیں بھر کر پی سکتے جو بڑی اونچی ذات والوں کے لیے ہے۔ آپس میں شادی بیاہ کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ اب بھی انہوں نے اس کو آئینی طور پر جرم قرار دے رکھا ہے۔ اب بھی یہ کیفیت ہے کہ اخبارات اور ریڈیو میں ان کے ہاں خبریں آتی ہیں کہ فلاں گاؤں کے اندر کسی شودر نے ان کے کنویں سے پانی پی لیا تو اُنہوں نے اُس کا پورا گھر جلا دیا' جھونپڑی بمعہ انسانوں کے جلا دی۔ ان سے جب پوچھا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ ہم نے نہیں کیا' دھرم کے اعتبار سے ان کو برہما نے پیدا ہی اس طرح سے کیا ہے۔ یہ برہما کے پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں' ویش' جن کو بنیے کہتے ہیں' اُس کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے' کھشتری اُس کے بازو سے پیدا ہوئے تھے اور برہمن اُس کے سر سے پیدا ہوئے تھے۔

آپ کو معلوم ہے کہ آج کل وہاں کی سیاست میں یہ مسئلہ ہے کہ جگ جیون رام کو وزیرِ اعظم بنا دیا جائے یا نہ بنایا جائے؟ اس بنا پر مخالفت ہو رہی ہے کہ یہ تو شودر ہے اور شودر کو حکومت کا اقتدار کیسے دیا جا سکتا ہے' یہ تو اُس کی فطرت کے خلاف ہے۔ سیاست میں جس کو جو بھی دلیل ملے اور پھر وہ مقدس دلیل ہو کہ وہ تو برہما نے بنایا ہی خدمت کے لیے ہے تو معاشرے پر اس کے کس قدر گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔

انسانی فطرت کا تصور قرآنِ حکیم کی تعلیم ہی کے خلاف ہے

آپ نے دیکھا کہ فطرت کے نظریہ کا تصور اور بنیاد کس جذبے سے ہے؟ وہی انسانوں کا جذبہ کہ دوسرے انسانوں کو اپنا مغلوب اور محتاج رکھا جائے۔ اُس کے لیے دھرم کی بنا پہ ورنوں کا تصور آیا' فکری بنا پہ فطرتِ انسانی کا تصور آیا کہ ان کی فطرت یہ ہے۔ آپ سوچیے کہ قرآنِ کریم جو انقلاب لے کر آیا تھا' کیا اُس کی رو سے وہ کبھی اس قسم کے تصور یا نظریئے کو درست قرار دے سکتا ہے؟ سارے انسانوں کے متعلق تو اُس نے کہا کہ **وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70)** تمام انسانی بچے انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہیں۔ پہلی چیز تو یہ آ گئی۔ اگلی چیز کہ فطرت بدلی نہیں جا سکتی' قرآن نے کہا کہ **اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا** [1] **(76:3)** ہم نے تو اس کو دونوں راستے دکھا دیئے ہیں۔ اب یہ اس کی اپنی مرضی پہ' اس کے اپنے اختیار و ارادے پہ ہے کہ وہ یہ راستہ اختیار کرے یا وہ راستہ اختیار کرے۔ اس کی اگر کوئی غیر متبدل فطرت ہے جو بدل ہی نہیں سکتی تو یہ دو میں سے ایک راستہ کیسے اختیار کرے گا۔ بکری کے سامنے اگر Two Possibilities (دو امکانات) رکھ دی جائیں یعنی ایک

---

[1] اس کی مکمل تشریح و توضیح کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن دروس الفرقان پارہ 29 (مکمل)' سورۃ الدھر' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006' ص ص۔ 451 تا 456۔

طرف گھاس رکھ دی جائے اور ایک طرف گوشت رکھ دیا جائے تو یہ نہیں ہے کہ اُس کا جی چاہے تو وہ گوشت کھا لے' اُس کا جی چاہے تو وہ گھاس کھا لے۔ بکری کے لیے دو Possibilities (امکانات) نہیں ہیں۔

جہاں فطرت ہوتی ہے وہاں اختیار و ارادہ نہیں ہوتا

اس بات کو یاد رکھیے کہ جس کو اختیار کہتے ہیں اُس کے لیے دو Possibilities (امکانات) کا ہونا ضروری ہے۔ جس معاشرے میں' جس سیاست کے اندر' جس نظم کے اندر' انسانوں کے سامنے دو Possibilities (امکانات) نہ رہیں' ایک ہی رہے تو وہ استبداد ہے۔ انسان کے خالق نے کہا یہ ہے کہ اس کے اندر جو اختیار اور ارادہ (Choice and Will) رکھ دیا گیا ہے یہ خارجی کائنات میں کسی شے کو نہیں دیا گیا۔ وہاں فطرت ہے' یہاں اختیار ہے۔ صاحبِ اختیار و ارادہ کی فطرت ہے ہی نہیں۔ فطرت تو مجبور کی ہوتی ہے جو بدلی ہی نہیں جاسکتی اور جو ہر ایک میں یکساں ہوتی ہے۔ اب یہاں وہ یہ کہہ رہا ہے کہ اسے ہم نے پیدا کیا ہے' اس کے اندر کچھ صلاحیتیں رکھ دی ہیں اور وہ بڑی لامنتہٰی صلاحیتیں ہیں۔ لامنتہٰی اس دنیا کے اعتبار سے میں کہہ رہا ہوں' آگے چل کر تو پتہ نہیں کیا صورت ہو۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ **سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً** [1] (31:20) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر شے اس کے تابع تسخیر کر دی گئی ہے۔ کہا کہ ہم نے اس کو صلاحیتیں دیں اور پھر اُس کے بعد یہ ہے کہ **فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ** (18:29) جس کا جی چاہے ان صلاحیتوں کو تخریبی طور پہ استعمال کرے اور جس کا جی چاہے تعمیری طور پہ ان کا استعمال کرے۔ یہ اس کے اختیار و ارادہ میں ہے کہ جیسے جی چاہے ان صلاحیتوں کو وہ استعمال کرے۔ فطرت تو یہ نہیں ہوسکتی۔

فطرت کی ایک اور چیز بھی ہے کہ فطرت ہر نوع کے ہر فرد کے اندر رکھی ہوئی ہوتی ہے' وہ اُس کو باہر سے نہیں ملتی۔ وہ جو میں اکثر مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک مرغی کے نیچے بطخ کے اور مرغی کے انڈے سینے کے لیے اکٹھے رکھ دیئے جائیں اور جب بیس اکیس دن کے بعد اُن میں سے چوزے نکلیں گے تو بطخ کے چوزے انڈے سے باہر آنے کے ساتھ ہی پانی کی طرف دوڑیں گے اور مرغی کے چوزے پانی سے بھاگ کر خشکی کی طرف آئیں گے۔ یہ اُس انڈے کے اندر کونسا کالج تھا جو اُس کو بیس دن تک یہ سبق دیتا رہا۔ چیل

---

[1] خدا نے کائنات کی ہر شے کو تمہارے فائدے کے لیے' قوانین کی زنجیروں میں جکڑ کر مختلف کاموں میں لگا رکھا ہے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ تمہاری نشوونما کے لیے جس قدر ساز و سامان کی ضرورت ہے خواہ وہ محسوس اور مرئی اشیاء ہوں' یا کائنات کے پردوں میں چھپی ہوئی قوتیں' اسے نہایت کشادگی اور فراوانی سے بہم پہنچائے اور اس طرح تمہاری نشوونما کی تکمیل ہو جائے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔950)۔

کبھی اُنہوں نے دیکھی نہیں ہوتی ہے لیکن اُس کا سایہ پڑتا ہے تو بھاگ کر مرغی کے نیچے آجاتے ہیں۔ کس نے بطخ کے بچوں کو کہا کہ تم پانی کی طرف جاؤ' کس نے مرغی کے بچوں کو کہا کہ اُدھر نہ جانا اُدھر تمہارے لیے ہلاکت ہے' کس نے ان دونوں کو کہہ دیا کہ دیکھو! یہ جوتم پہ چیل کا سایہ پڑ رہا ہے یہ شکاری ہے' بلی کی میاؤں سننے کے ساتھ ہی وہ چوزے کیسے بھاگتے ہیں۔

فطرت رکھنے والی کسی شے کی طرف کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا

جو فطرت کی شے کسی کے اندر ہوتی ہے تو اُس کے لیے کسی خارجی تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ کسی بکریوں کے گروہ یا شیر کے گروہ کی طرف کوئی رسول نہیں آیا جو آ کر ان کو بتائے کہ یہ تمہارے لیے سیدھا راستہ ہے اور یہ غلط راستہ ہے۔ جو مجبور ہے اُس راستے پہ چلنے کے لیے کہ جو اُس کے لیے خالقِ فطرت نے متعین کر دیا ہے تو اُس کی طرف کسی نبوت اور وحی اور رسالت کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو صاحبِ اختیار کے اختیار کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی تعلیم ہے جس کے لیے کسی معلم کی ضرورت ہے۔ اور اس مقصد کے لیے جو تمام انسان ہیں ان کے لیے یکساں تعلیم ہوتا کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے اختیار کو اُس طرح سے استعمال کریں۔ اس کے لیے وحی کی ضرورت پڑی۔ یوں انسانوں کے اندر وہ گروہ پیدا ہو جائے گا جو اس تعلیم کی بنیاد پر ہم آہنگ ہوگا اور وہ اپنے اختیارات کو اسی طرح سے صرف میں لائے گا جیسے اُس تعلیم میں دیئے ہیں۔ یہ ایک امت اور ایک جماعت بنے گی: ایک مقصد رکھنے والی' ایک نصب العین رکھنے والی۔ مجبوراً نہیں بلکہ اپنی مرضی سے یہ کچھ کرے گی۔

انسانوں کو غلام بنانے کے تصور کے بعد نظامِ سرمایہ داری کا حربہ اور اس کے اثرات

آپ کسی کو مجبوراً مسلمان یا مومن نہیں بنا سکتے اور نہ ہی کوئی مسلمان یا مومن پیدا ہوتا ہے۔ ان کے ہاں جو یہ Human Nature (انسانی فطرت) کا تصور تھا وہ غلامی کا جواز لیے ہوئے' ورنوں کا جواز لیے ہوئے' یونان سے چلا' وہ ایک گروہ کا تصور تھا۔ ان کے ہاں آگے آئے تو کیپٹل ازم کا تصور یعنی سرمایہ داری کا نظام آیا۔ اب اُس سرمایہ داری کے نظام میں آپ دیکھتے ہیں کہ جو صاحبِ قوت ہے وہ چھینتا ہے' جھپٹتا ہے' لوٹتا ہے' کھسوٹتا ہے' استحصال کرتا ہے اور یہ چیز ذاتی ملکیت میں رکھتا ہے۔ یہ بڑی مذموم چیزیں ہیں' ان چیزوں کو جرائم ہونا چاہیے۔ ان سے تباہی اور فساد برپا ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ نظامِ سرمایہ داری کے لیے جواز یہ ہے کہ کسی چیز کو اپنی ملکیت میں رکھنا' یہ انسان کی فطرت ہے اور جب فطرت ہے تو فطرت کی تسکین کے لیے زیادہ سے زیادہ رکھ سکتا ہے' اس کو کوئی نہیں روک سکتا' اس کو روکنا ایسے ہی ہوگا کہ جیسے پانی کے آگے بند لگا دیتے ہیں تو سیلاب بن جاتا ہے۔ یہ نظامِ سرمایہ داری کے دلائل ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ فطرت کا جو تصور ہے وہ استحصال کرنے والوں کے لیے کیسا خوش آیا' انہیں کیسا سوٹ کیا! اور اسی بنا پہ سارے یورپ کے اندر وہ قوتیں جو Capitalistic (سرمایہ دارانہ) تھیں اُنہوں نے اس کو اتنا پھیلایا کہ صاحب! دوسرے کی چیز کو جھپٹ لینا چھین لینا یہ انسان کی فطرت ہے' تم دیکھتے نہیں ہو کہ شیر ہر ایک سے چھین لیتا ہے۔ کہا کہ یہ جو Self Possession (ذاتی ملکیت) ہے یعنی زیادہ سے زیادہ ذاتی ملکیت میں یہ چیزیں رکھنا' یہ انسان کی فطرت ہے۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ کیا قرآن اس قسم کے نظریئے کی تائید کرے گا کہ جو کسی شے پہ کسی کی ملکیت کو جائز ہی قرار نہیں دیتا۔ جو اس شخص کو جو محنت کی' کام کرنے کی استعداد رکھتے ہوئے کام نہیں کرتا' کہتا ہے کہ اُس کو روٹی بھی نہیں مل سکتی۔ اُسے **لیس للانسان الا ما سعی (53:39)** ملے گا کہ جو کام سے کچھ پیدا کرے۔ اُس نے اس سرمایہ داری اور لوٹ کھسوٹ کے تصور کو ختم کر دیا۔ لیکن آپ کے ہاں کیا ہوا؟

آپ حیران ہونگے کہ قرآنِ کریم تو ایک طرف رہا' زمانۂ نزولِ قرآن کی عربی زبان میں بھی فطرت کا لفظ ان معنی میں کہیں آیا ہی نہیں ہے۔ عرب اس قدر حریت پسند' آزاد منش قوم تھی۔ اب پتہ چلا کہ اسلام کے لیئے دین کے لیئے وہ قوم کیوں منتخب کی گئی تھی۔ وہ اپنی پوری تاریخ میں کبھی کسی کی محکوم ہی نہیں رہی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ آزاد منشی اگر کسی قاعدے قانون کے مطابق نہ ہو تو بعض اوقات سرکشی اختیار کر لیتی ہے' لیکن بہرحال اُس قوم کے اندر آزادی تھی۔ اور جس قوم نے اس قدر حریت اور آزادی کی فضا میں شروع سے آخر تک پرورش پائی ہو تو فطرتِ مجبور کا تصور اُس کے ہاں کیسے آ سکتا ہے۔ اُس زبان میں یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہی نہیں ہوتا تھا۔

لفظ ''فطر'' کا قرآنی مفہوم

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں قرآنِ کریم نے پیدائش کے لیے دو الفاظ استعمال کیے ہیں: ایک **فطر** ہے اور دوسرا خلق۔ **فطر** کے معنی ہوتے ہیں کہ کسی شے کو عدم سے وجود میں لانا یعنی وہ پہلے بالکل نہیں ہے Nothingness (عدم) سے Being (وجود) میں لے آنا' یہ ہے اصطلاح۔ یعنی جو شے کہیں بھی نہیں ہے اُس کو موجود کر دینا۔ اس کے لیے لفظ **فطر** آتا ہے۔ قرآن میں **فاطر السمٰوٰت والارض** خدا کے لیے ہے کہ یہ سلسلۂ کائنات یہ نہیں ہے کہ یہ شروع سے ایسا تھا بلکہ اس کو خدا عدم سے وجود میں لایا۔ اس کو **فطر** کہتے ہیں' اس کرنے والے کو **فاطر** کہتے ہیں۔ اور اس کے بعد جب وہ اشیا کو وجود میں لے آیا تو وہ اپنی ابتدائی شکل کے اندر تھیں پھر اُس Material (مواد) سے جو وجود میں وہ یوں لایا ہے' اُس میٹریل (مواد) میں مختلف نسبتیں

(Proportion) پیدا کرتے ہوئے نئی نئی چیزیں پیدا کرتے چلے جانا' اس کو تخلیق کہتے ہیں اور ایسا کرنے والے کو خالق کہتے ہیں۔ یہ اس زبان کی وسعتیں ہیں۔

انسانی کاوش کا تعلق ''فطر'' سے نہیں' خلق سے ہے

میں نے اگلی دفعہ عرض کیا تھا کہ عالمِ امر اور عالمِ خلق سے تو مغرب کا مفکر [1] یہ کہتا ہے کہ یہ قوم کتنی خوش بخت ہے کہ جس کی زبان میں Creation (تخلیق) کے لیے دو الفاظ موجود ہیں۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ ہمارے ہاں ایک ہی لفظ ہے اور ہم امتیاز نہیں کر سکتے۔ قرآن نے یہ فطر اور خلق کا امتیاز کیا ہے کہ ''فطر'' کسی شے کو عدم سے وجود میں لانا۔ کہا کہ انسان یہ نہیں کر سکتا۔ لیکن موجود اشیا میں مختلف Proportion (تناسب) پیدا کر کے' صحیح تناسب پیدا کر کے' اُس سے ایک نئی چیز بنا لینا' یہ تخلیق ہے اور اس اعتبار سے خدا نے اپنے آپ کو خالق کہنے کے بعد اور خالقوں کے وجود کو تسلیم کیا۔

ذاتِ خداوندی نے خود کو احسن الخالقین تو کہا ہے لیکن احسن الفاطرین نہیں کہا۔ کیوں؟

ذاتِ خداوندی نے اپنے آپ کو احسن الخالقین کہا' احسن الفاطرین نہیں کہا۔ موجود اشیا میں سے نئی نئی چیزیں پیدا کرنا جسے اُس نے تخلیق کہا ہے اس کے لیے کہا کہ اور بھی خالق ہیں۔ اور خالق، حیوان تو ہو ہی نہیں سکتے' یہ تو انسان ہیں۔ اس اعتبار سے انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ

تُو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم

(پیام مشرق: انسان)

تُو نے رات بنائی' میں نے اُس کو دِیا بخشا۔ تُو نے مٹی بنائی' میں نے اُس سے کتنا خوبصورت پیالہ بنالیا۔ یہ ہے خالق۔ فطر کے معنی ہیں کہ یہ خدا کا عملِ تخلیق کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانے کے لیے ہے' فطرت کے معنی ہیں خدا کا یہ قانون جس کی رو سے کسی شے کو عدم (Nothingness) سے وجود (Being) میں لانا ہے۔ جس طرح فطرت کے معنی Nature کیا جاتا ہے اس

---

[1] Pringle Pettison (1856-1931)

کے لیے یہ ذہن میں رکھیے کہ قرآن میں تو ایک طرف' عربی زبان میں بھی یہ لفظ اس طرح استعمال نہیں ہوا۔ سوال یہ ہے کہ یہ ہمارے ہاں کیسے ہوا؟ عباسیوں کے زمانے (750-1258 AD) میں جب یونانی فلسفے کا ترجمہ' عربی زبان میں ہوا ہے تو ان کے ہاں تو Nature (نیچر) کا یہ لفظ عام چلا آ رہا تھا' ادھر اِن عربوں کے ہاں یہ اُس معنی میں تھا نہیں۔ معلوم نہیں کس طرح سے اُس کا ترجمہ فطرت کر دیا گیا۔ چنانچہ یہ لفظ ہمارے ہاں صرف ان کتابوں میں پہلی دفعہ ملتا ہے جو یونانی فلسفے کے عربی میں ترجمے پر آئی ہیں۔ اُنہوں نے اس کے لیے یہ لفظ استعمال کر لیا۔

انسانی فطرت کے مروجہ تصور سے قرآنِ حکیم کی ساری تعلیم بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے

جب یہاں اِس یونانی فلسفے کے عربی میں ترجمے کا استعمال ہو گیا تو پھر اس کو مذہبی سند دیدی گئی۔ کسی نے کچھ نہ سمجھا کہ انسان کا یہ تصور جو خدا نے دیا ہے' وہ تو ان مفکرین (یونان) کے تصور کے بالکل خلاف ہے۔ اگر اس کے لیے ہم نے فطرت کا لفظ استعمال کیا تو قرآن کی بنیادی تعلیم ختم ہو جائے گی۔ لیکن سوچنا تو آپ کے لیے حرام قرار دیدیا گیا ہے۔ کہا کہ اسلام دینِ فطرت ہے' ہر انسان فطرت پہ پیدا ہوتا ہے اس لیے اسلام پہ پیدا ہوتا ہے' انسانی بچے پر اگر انسانی اثرات اثر انداز نہ ہوں تو وہ جس حالت میں ہوتا ہے وہ اسلام کی حالت ہوتی ہے۔ ابھی میں نے آپ کو اُس بھیڑیئے والے بچے کے بارے میں بتایا ہے۔ یہاں کسی بچے کو اگر آپ ''تھرموس'' میں رکھ دیجیے کہ نہ اُس کو کوئی تعلیم ملے' نہ کوئی تربیت ملے' نہ گھر کی آواز اُس کے کان میں پڑے تو پھر دیکھیے کہ وہ کیا بنتا ہے۔ اُس کے متعلق یہ کہہ دیا کہ ہر بچہ اسلام پہ پیدا ہوا۔ کسی نے یہ ابتدا کی اور بات چل پڑی۔ ہم یونان اور یورپ کے مفکرین کو ہی دوش دیتے تھے کہ اُنہوں نے کھڑے ہو کر سوچا ہی نہیں ہے۔ اگر اُنہوں نے نہیں سوچا ہے تو بہر حال یہ انسانی فکر کی ایک غلطی ہے لیکن آپ کے ہاں یہ ہوا کہ آپ نے اِس کو عینِ دین بنا دیا کہ چونکہ اسلام دینِ فطرت ہے' اس لیے ہر بچہ فطرت پہ پیدا ہوتا ہے' اگر انسان کی فطرت کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے تو جو کچھ وہ بچہ بنتا ہے وہ اسلام کی صحیح تصویر ہو گی' وہ بے آمیزش ہے اُس میں ملاوٹ نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں اس ہزار برس کے اندر یہ چیز مسلمہ کی حیثیت سے مانی جاتی ہے اور چلی آ رہی ہے۔ اتنی بات ہی نہیں بلکہ ایک قدم آگے بھی ہے۔ جب بنیاد میں ایک چیز پہلے سے کج رکھ دی جائے تو

تا　ثریا　می　رود　دیوار　کج

آسمان تک وہ دیوار لے جائیں تو ٹیڑھی اٹھے گی کیونکہ خشتِ اول غلط رکھ دی گئی۔

انسان کی فطرت کے مطابق خدا کی فطرت کا تصور

اب یہ خشتِ اول غلط رکھی گئی یعنی اسلام کو دینِ فطرت کہا' انسان فطرت پہ پیدا ہوتا ہے کہا اور یہ کہا کہ انسان کو خدا نے اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے تو ہوا یہ کہ خدا کی بھی فطرت ہوتی ہے کہ جو بن گیا سو بن گیا۔ ہم انسانوں سے بھی آگے بڑھے اور خدا کی بھی فطرت کہہ دیا اور کہا کہ خدا نے انسانوں کو اپنی فطرت پہ پیدا کیا ہے۔ یعنی انسان کو اگر ویسے ہی چھوڑ دیا جائے جیسا وہ بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اسلام پہ ہے اور جب اُسی طرح سے وہ بڑا ہو تو جو عادات' جو خصوصیات' اُس سے آئیں گی وہ اللہ کی فطرت ہوگی یعنی اللہ ویسا ہوگا۔

عزیزانِ من! ذرا اس چیز کو سوچیے کہ اس بات کو میں نے آدھا گھنٹہ پہلے سے ہی آپ کے سامنے شروع کیا ہے اور یہ بات آپ کے سامنے پہلی دفعہ ہی آئی ہے تو میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کے لبوں میں ایک تبسمِ زیرِ لبی ہے لیکن آپ اس کو کیا کہیں گے کہ ہزار برس سے آپ کے ہاں کے سارے فلاسفر' سارے محدث' تمام علما اس کو پکارتے چلے آ رہے ہیں کہ اللہ کی فطرت کے اوپر انسان کو پیدا کیا۔

وحی کی تعلیم کے بغیر انسان کی حالتِ زار

یہودیوں نے کہا تھا کہ خدا نے انسان کو اپنی شکل پہ پیدا کیا۔ اِنہوں نے یہ تو نہ کہا' اِنہوں نے کہا کہ اُس نے انسان کو اپنی فطرت پہ پیدا کیا' یہ تو اُس سے بھی آگے بڑھ گئے۔ آپ کو پتہ ہے کہ خدا نے کیا کہا۔ اُس نے کہا کہ اگر انسان کو علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا جائے تو وہ کیا بنتا ہے یعنی اگر اُس کو وحی کی کوئی تعلیم نہ دی جائے تو وہ کیا بنے گا؟ **اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ** (14:34) بڑا ہی ظالم' ہر شے کو دبا کر بیٹھ جانے والا' **وَ كَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا** (17:67) ناشکر گزار' **هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ** (16:4) جھگڑالو' بالکل واضح جھگڑالو۔ یعنی نظر آتا ہے کہ بات جو کہہ رہا ہے بڑی غیر معقول ہے۔ **وَ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا** (18:54) اکثر چیزیں جو اس کے مفاد کے خلاف جاتی ہیں جھگڑا پیدا کر دیتا ہے **وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا** (17:11) بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے' جلد بازی سے کچھ کرتا ہے اور اُس کے بعد پھر اُس کو ندامت ہوتی ہے۔ **وَ كَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا** (17:100) خود غرض' بخیل' تنگ نظر۔ یہ ہوتی ہے اس کی کیفیت۔ **اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا**[1] (70:19) ایسا لالچی کہ اس کا پیٹ ہی نہیں

---

[1] ان نکات کی تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 29 (مکمل) سورۃ المعارج' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006' ص ص۔ 196 تا 198۔

بھرتا' ہروقت بھوکا۔ یہ اُس کی کیفیت۔ **اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (100:6)** سب کچھ اپنے لیے لوٹ کر' سمیٹ کر اپنے خدا کا بھی ناشکر گزار ہوتا [2] ہے۔ **اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (33:72)** ظالم بھی ہے' جاہل بھی ہے۔ خدا الانسان کے متعلق یہ کچھ بتا رہا ہے۔ اور اگر الانسان خدا کی فطرت پہ پیدا ہوتا ہے تو خدا تو الانسان کے متعلق یہ کہہ رہا ہے اور یہ ہمارا روز کا بھی مشاہدہ ہے۔ نہ بھی ہو وہ تو خود اس کے متعلق کہہ رہا ہے کہ وہ تو یہ ہے۔

اب آیئے اس عقیدے کے اوپر کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پہ پیدا کیا ہے جبکہ اُس کے متعلق وہ خود یہ بتا رہا ہے کہ اگر اُسے علٰی حالہٖ چھوڑ دیا جائے تو یہ تو یہ کچھ بنے گا۔ عزیزانِ من! میرا خیال ہے کہ آپ کو ان چیزوں کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آ رہی لیکن دقت اس میں پیش آئے گی کہ ہزار برس سے یہ سارے جتنے بھی اتنے بڑے' جن کے ناموں کے ساتھ کیا کیا الفاظ ہیں اور کیا کیا ہمارے ذہن میں تصورات ہیں' وہ یہ اتنی بات نہیں سمجھ سکے۔ تقلید تو سمجھنے سوچنے کے دیئے بجھا دیتی ہے۔ اُس نے انسانوں کے متعلق یہ کچھ کہا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اُس نے کہا کہ انسان میں 9/10 حصہ حیوان کا ہے' قرآن نے بتایا ہے کہ پہلے جرثومے سے لے کر آخری منزل سے ایک قدم پیچھے تک اس میں اور حیوانی بچے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ بچہ رحمِ مادر ہی نہیں بلکہ اولیں جرثومہ' جو لائف سیل بنا تھا' وہ فطر سے اللہ نے پیدا کیا تھا' وہاں سے جن مراحل سے زندگی گزری ہے اُس میں سارے ذی حیات انہی مراحل میں سے گزرتے چلے آئے ہیں اور Evolution (ارتقا) سے' آہستہ آہستہ خدا کی صفت الباری سے' ارتقائی منازل طے کرتا ہوا' انسان یہاں تک پہنچا۔

آج انسانی زندگی نے اپنی ارتقائی منزل کے لیے اس مادی جسم کا سہارا حاصل کر رکھا ہے

وہ جو میں نے کہا تھا کہ جیسے وہ کمہار چاک کے اوپر مٹی کا تھوبہ رکھتا ہے اور اگر اُس میں سے اُس نے پیالہ بنانا ہوتا ہے تو جو زائد مٹی ہوتی ہے وہ اُس میں سے الگ کرتا چلا جاتا ہے۔ کہا کہ ارتقائی منازل میں سے جو زندگی گزری تو ہم نے ہر منزل کو پچھلی منزل کے مقابل میں زیادہ حسین یعنی زیادہ متناسب بنایا اور اس کے لیے جتنا کچھ زائد تھا وہ الگ کرتے گئے۔ ''باری'' اُس کو کہتے ہیں جو زائد چیزوں کو الگ کرتا چلا جائے۔ اور اُس کے بعد المصور ہے اس لیے کہ ہم نے ایک خاص شکل میں کسی چیز کو پیدا کرنا تھا۔ خاص شکل میں پیدا کرنے کے لیے' مصور تک آنے کے لیے' الباری کی ضرورت ہوتی ہے اور ترتیب بھی یہ ہے کہ **هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ**

---

[2] کنود کی تشریح و توضیح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 30 (مکمل)' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006' ص ص۔ 525 تا 527۔

الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی (59:24) [1]۔ اُس نے کہا کہ یہ ارتقائی منازل طے کرتا ہوا یہاں تک پہنچا' اس میں اور حیوان میں کوئی فرق نہیں' اس کی طبعی زندگی اور حیوان کی طبعی زندگی میں کوئی فرق نہیں۔

انسان کے لیے خدا کی طرف سے ارادہ واختیار کا عظیم تحفہ

یہاں اس منزل پہ پہنچنے کے بعد اُس نے کہا کہ ہم نے اپنی توانائی کا ایک شمہ اس کے اندر پھونک دیا: **وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ** (32:9)۔ یہ جوالوہیاتی توانائی تھی جسے خدا نے اپنی کہا ہے' یہ کیا چیز ہے؟ یہ اختیار وارادہ ہے جو اس کائنات میں' اوپر خدا کو حاصل ہے' نیچے اُس کا دیا ہوا انسان کو حاصل ہے' کسی اور کو حاصل ہی نہیں ہے۔ ''روح'' کے معنی توانائی (Energy) ہوتی ہے۔ کسی اور شے کے متعلق نہیں کہا کہ ہم نے اُس کو یہ دیا۔ اور یہاں پہنچنے کے بعد کہا کہ یہ **خَلْقٍ جَدِيْدٍ** (34:7) ہے۔ اب یہ باقی مخلوق سے الگ ہو گیا۔ اختیار اور ارادے کو صحیح طور پہ Exercise (مشق) کرنے کے لیے اس کو Guidance (ہدایت) کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے کہ اگر باہر سے Guidance (ہدایت) نہ ملے تو وہ تو وہی حیوان کا حیوان ہے۔ اب قرآن نے یہ کہا کہ باہر کی Guidance (ہدایت) سے اس کو جو اقدار (Values) دی جاتی ہیں یہ ان کے مطابق زندگی بسر نہ کرے تو یہ حیوان کا حیوان ہوتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ حیوان کی قوتیں' اُس کی وسعتیں' اُس کا جو دائرہ ہے' وہ بڑا محدود ہوتا ہے۔ یعنی شیر جیسا اتنا بڑا قوی' اتنی تیزی سے بھاگ سکتا ہے لیکن اگر اُس کی حد سے ذرا اونچا بکرا کھڑا ہوا اور یہ بھوکا مر رہا ہو تو یہ اُس تک نہیں پہنچ سکتا۔ اُس کی توانائی کو **Exercise** (نافذ) کرنے کے لیے ایک حد مقرر ہے۔ کائنات کی ہر شے کی صلاحیتوں کی ایک حد مقرر ہے۔ اُس حد سے وہ شے آگے نہیں جاسکتی اس لیے کہ وہ اوزار نہیں بناسکتی۔

انسان کے بالمقابل کائنات کی ہر شے کی صلاحیت محدود ہے

یونان کے مفکروں نے انسان کی جو Definitions (حدود و قیود' حد بندیاں) دی ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ حیوانِ ناطق ہے' بولنے والا حیوان ہے' اب یہ بھی غلط ہوئی کیونکہ طوطا بھی بولتا ہے' اُنہوں نے اس کو Cooking Animal (پکانے والا حیوان)

---

[1] وہ خدا ہر شے کا خالق ہے۔ اس کے عملِ تخلیق کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ہر چیز کی پیدائش' اس کے نقطۂ آغاز سے کرتا ہے۔ پھر اسے مختلف ارتقائی مراحل سے اس طرح گزارتا ہے کہ غیر ضروری عناصر' اس سے چھٹ کر الگ ہوتے جاتے ہیں تا آنکہ وہ' ایک خاص صورت **(Form)** اختیار کر لیتی ہے جو اسے دیگر اشیا سے متمیز کر دیتی ہے (اس مرحلہ پر تم کہتے ہو کہ وہ شے وجود میں آ گئی)۔ یہ چند ایک صفات ہیں ذاتِ خداوندی کی جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے' ورنہ تمام صفات اپنی حسین ترین اور مکمل ترین شکل میں' اس کی ذات میں مجتمع ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ **1301**)۔

بھی کہا۔ ایک Definition (تعریف) یہ ہے کہ یہ Instruments (اوزار) بنا سکتا ہے۔ یہ بڑی خصوصیت ہے۔ بندر اوپر دیکھے کہ بڑا اچھا اخروٹ لگا ہوا ہے' اگر وہ چھلانگ لگا کر اوپر نہیں پہنچ سکتا تو بیکار ہے۔ اگر انسان کا چھوٹا سا بچہ بھی اُس اخروٹ کو دیکھے "تے او جھانگا اٹھا کے لے اوندا اے۔ جے کتھے بندر نوں جھانگے بنڑانے آ جاندے تے پوچھو نہیں کہ تہانوں کتھے کتھے ٹنگ دیندا"۔ ❶ یہ جو انسان کے اندر تخلیق کی قوت ہے یہ اُس کی ان صلاحیتوں کے استعمال کے دائرے کو بڑا لامنتہٰی بنا دیتی ہے کہ وہ چاند تک پہنچ گیا ہے۔ اور یہ جس قدر بھی Instruments (اوزار) ہیں اور یہ جسے آپ اسلحہ کہہ لیجیے' یہ سارے کا سارا یہی بنا سکتا ہے۔ آپ سوچیے کہ حیوان ہو اور حیوانیت کی جو اُس کے اندر صلاحیتیں ہیں وہ لامنتہا ہو جائیں تو پھر **ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ (30:41)** خشکی اور تری سب میں فساد ہی فساد رونما ہو جائے گا۔ وہ تو باہر کی مخلوق میں اس لیے فساد نہیں ہوتا کہ ان کا دائرہ محدود ہے' وہ اُس سے آگے نہیں جا سکتے۔

وحی کی روشنی کے بغیر انسانی صلاحیتوں کا استعمال سراپا جہنم کو جنم دیتا ہے

عزیزانِ من! سوچیے کہ صلاحیتیں وہ دی ہوئی ہوں اور ہو حیوانی سطح کے اوپر' اور وسعتیں اتنی زیادہ لا انتہا ہو چکی ہوئی ہوں تو پھر وہ کیا ہوتا ہے؟ وہ مولانا رومی (1207-1273AD) نے ٹھیک کہا تھا:

حرکت　از　ما　کمتر　از　فرعون　نیست
ہم میں سے کوئی بھی فرعون سے کم نہیں ہے لیکن
لیک　اورا　عون　مارا　عون　نیست

اُس کے پاس ساز و سامان تھا اور ہمارے پاس ساز و سامان نہیں ہوتا' ورنہ ہم میں سے ہر ایک فرعون ہوتا۔ ہم میں سے ہر ایک حیوان ہو اور حیوانات کی وسعتیں اتنی زیادہ ہوں کہ شیر کیا چیر پھاڑ کرے گا جو آپ کا ایک ایٹم بم کرتا ہے۔

انسان کے اندر حیوانی جبلتوں کی تفصیل اور ان کے اثرات

قرآن نے کہا کہ وہ جو حیوانات کی جبلتیں (Instincts) ہیں' ان کی طبعی زندگی کے اندر وہ ساری موجود ہیں۔ یہ جو مفکرین ہیں یا جو سائیکولوجسٹ ہیں' انہوں نے بھی اُنہیں تین حصوں میں تقسیم کیا ہے: **(1** Self Preservation یعنی تحفظِ خویش' اپنے آپ کو محفوظ رکھنا' **(2** Self Aggression یعنی دوسرے پر غالب آ جانے کا جذبہ' یہ اصل میں پہلے ہی جذبے کے لیے ہے

---

❶ وہ (درختوں سے پتے اور پھل وغیرہ) جھاڑنے والا ایک ڈنڈا اٹھا کر لے آتا ہے۔ اگر بندر کو بھی کہیں یہ جھاڑنے والے ڈنڈے بنانے آ جاتے تو پوچھو نہیں کہ وہ کہاں کہاں آپ کو لٹکا دیتا۔

اور 3) Self Procreation یعنی اپنی نسل بڑھانے کا جذبہ۔ یہ تین Basic Instincts (بنیادی جبلتیں) ہیں' جو حیوانات کے اندر ہوتی ہیں۔ ہر حیوان میں یہ ہوتی ہیں۔ وہ جو مرغی کا چوزہ ماں کے نیچے پناہ لینے کو بھاگتا ہے تو وہ Self Preservation [1] ہے۔ وہ جو بلی چوزے کے اوپر جھپٹتی ہے تو وہ Self Aggression [2] ہے۔ اور Self Procreation [3] تو پھر سارے حیوانات کے اندر ہے۔

انسان کے لیے حیوانی جبلتوں کو کنٹرول کرنے کی خاطر وحی کے کنٹرول کی ضرورت

قرآن نے کہا کہ انسان کی جو طبیعی زندگی ہے' وہ حیوان کی زندگی ہے۔ اس کے اندر بھی یہ Instincts (جبلتیں) ہیں لیکن اس کی کیونکہ قوتیں لامنتہا ہیں اس لیے اس کو اگر علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے تو پھر یہ جس قسم کا حیوان بنتا ہے وہ تو تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔ جس قسم کا یہ درندہ بنتا ہے شیر کیا بنتا ہوگا' جس قسم کا یہ اژدھا بنتا ہے اژدھا کیا بنے گا۔ اُس نے کہا کہ اس لیے ضرورت تھی کہ اس کے اوپر کوئی حد باندھ دی جائے' اس کی کوئی Limit (حد) مقرر کر دی جائے تا کہ اس حد سے آگے اس کو Exercise (نافذ) نہ کرے یا اس حد کے مخالف کچھ Exercise (نافذ) نہ کرے۔ یہ ہے جس کو وحی کہتے ہیں' جس کو آپ Values (اقدار) کہتے ہیں۔ اس لیے انسانوں کی طرف وحی کی ضرورت پڑی کیونکہ یہ اقدار اس کے اندر فطرت کی صورت میں داخل نہیں ہیں۔ حیوان تھا' Exercise (مشق) کرنے کی قوتیں لامحدود تھیں۔ اس لیے اگر یہ اپنے آپ کو وحی کی اقدار کا پابند نہ بنائے تو انسان یہ کچھ کرے گا جو ابھی میں نے بتایا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ وہ کیا کہہ گیا ہے؟ یہ تصور کہ انسانی فطرت ہے' یہ تصور کہ اسلام دینِ فطرت ہے' یہ تصور کہ انسان کو خدا نے اپنی فطرت پہ پیدا کیا ہے' یہ بالکل باطل ہے اور اسلام کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے لیکن پھر بھی یہ عقیدہ چلا آ رہا ہے۔

نوعِ انسانی کے متعلق خدا کی مشیّت

فطرت کا تقاضا تو یہ بھی ہے کہ ہر نوع ایک جیسی ہوتی ہے مثلاً بکری ایک نوع ہے اور انسان بھی ایک نوع ہے۔ انسان کے متعلق تو قرآن نے کہہ دیا کہ **وَ لَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّ لَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ (11:118)** ہماری مشیت ہوتی تو ہم انسانوں کے اندر بھی فطرت رکھ دیتے کہ وہ ساری نوع بکریوں کی طرح ایک جیسی ہوتی۔ کہا کہ اگر ہماری

---

1. تحفظِ خویش
2. تغلبِ خویش
3. تولیدِ خویش

مشیت ہوتی تو ہمارے لیے ایسا کرنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ حیوانات کی زنجیر چلی آ رہی تھی' وہ ارتقائی منزل سے یہاں تک پہنچا تھا تو یہ بیچ میں ہم نہ لیتے اور اسی طرح سے اس کو پیدا کر دیتے تو یہ ایک نوع اسی طرح سے ہوتی جیسے یہ بھیڑ یئے یا بکریاں یا شیر وغیرہ ہوتے ہیں لیکن ہماری مشیت یہ نہیں تھی۔ اسی لیے اور تو اور نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے کہا گیا کہ تم جو زبردستی ان کو ایک جیسا بنانا چاہتے ہو' کہا کہ یہ ایک جیسے اگر بنیں تو اپنی رضا مندی سے۔ اختیار و ارادہ کا جذبہ جو اندر ہے اُس کی تسکین بھی ہو جائے اور ایک جیسے بھی بن جائیں۔ یہ تو ایک ہے کہ یہ سارے کے سارے ایک نصب العین سامنے رکھیں' ہم نے جو Values (اقدار) دی ہیں ان کے مطابق زندگی بسر کریں تو یہ امتِ واحدہ بن جائیں گے۔ لیکن اگر آپ چاہیں کہ ان کو مار مار کر مسلمان بنایا جائے تو رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا ہے کہ **وَ لَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ کُلُّھُمْ جَمِیْعًا (10:99)** ہماری مشیت ہوتی تو انسان کو ہم پیدا ہی ایسا کرتے جسے تم مسلمان کہتے ہو۔ **اَفَاَنْتَ تُکْرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (10:99)** تو وہ تو سارے مومن نہیں ہیں تو کیا تو ڈنڈے کے زور پہ ان کو مومن بنانا چاہتا ہے؟ اگر ایسا زبردستی کرنا ہوتا تو زبردستی تو ہمارے جیسی کوئی بھی نہ کر سکتا اور ہم ان کو پیدا ہی ایسا کرتے۔ خواہ آپ اس کو مومن ہی کیوں نہ کہہ لیں لیکن وہ حیوان کے درجے پہ ہوتے' انسان نہیں ہوتے' ہر حیوان مومن ہوتا ہے ان میں کوئی کافر نہیں ہوتا لیکن خدا نے ان کو کیوں مومن نہیں کہا؟ اس لیے کہ وہ اپنی مرضی سے ایمان نہیں لائے ہوئے ہوتے' وہ ایمان کے اوپر مجبور ہوتے ہیں۔

خدا تعالیٰ نے انسان کے اندر فطرت نہیں رکھی' اسے خود ہی مومن یا کافر بننا ہوتا ہے

عزیزانِ من! قرآن ہے اور خدا بول رہا ہے' رسول سے کہا جا رہا ہے۔ مومن وہ ہے کہ **فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ** [1] **(18:29)**۔ مومن تو ایک طرف' وہ کہتے ہیں کہ کافر بھی کوئی نہیں ہوتا جب تک اپنی مرضی سے کافر نہ بنے۔ پیدائش کے اعتبار سے نہ تو کوئی مومن پیدا ہوتا ہے نہ کافر پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی انسانیت کی خصوصیت ہو گئی جو حیوان کو حاصل نہیں ہے۔ اور یہیں سے یہ وحی کا' ارشادِ خداوندی کا' رشد و ہدایت کا' غلط اور صحیح کا' کفر اور ایمان کا سارا سلسلہ ہے۔ یہ دو راستے ہیں: **ھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ (90:10)** ہم نے دونوں راستے دکھا دیئے ہیں۔ دکھانے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ اس کو اختیار تھا کہ جس طرح جی چاہے یہ حیوانی Instinct (جبلت) کو استعمال کرے۔ اختیار کو زبردستی دبایا نہیں جا سکتا کہ اس کو مجبور کر دیا جائے کہ اسی راستے کے اوپر چلو۔ ایسا ہوتا تو پھر یہ حیوان کے درجے پر ہوتا' یہ مومن نہ ہوتا۔ اس کو حیوان کی سطح کے اوپر پیدا کیا' اور صلاحیتوں کے استعمال

---

[1] جس کا جی چاہے اِس (الحق: ضابطہ حق و صداقت) پر ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔665)۔

کا دائرہ بے حد وسیع قرار دیا۔ اس سے فساد کا اندیشہ تھا' اسی لیے کہ انسان خود اپنے طور پر صحیح اور غلط راستے تجویز نہیں کرسکتا' یہ اپنے طور پر تو حیوانی سطح پر ہوتا ہے اور وہ جو حیوانات کی جبلتیں ہیں وہ ساری اس کے اندر ہوتی ہیں اور انہی کو وہ Exercise (نافذ) کرتا ہے یعنی Self Preservation (تحفظِ خویش) ہوتا ہے' افراد میں جو زیادہ طاقت والا ہوتا ہے وہ دوسرے کا گلا گھونٹتا ہے' یہ Self Aggession (جذبہ تغلب) ہے۔ قوموں کے اندر یہ جتنی بھی بڑی بڑی جنگیں ہو رہی ہیں' یہ تحفظِ خویش ہے۔ یہ چیونٹی کو بھی ہوتی ہے' اُس کے سامنے ذرا سا تنکا رکھیے تو آپ دیکھیے کہ وہ اس سے کیا کچھ جنگ کرتی ہے اور راستہ موڑ کر چلی جاتی ہے۔ وحی نے آ کر بتایا کہ اگرچہ تحفظِ خویش بڑا ضروری ہے' لیکن جو شخص کسی ایک جان کو بھی ناجائز طور پر ہلاک کر دے گا تو یوں سمجھو کہ جیسے اس نے ساری نوعِ انسانی کو ہلاک کر دیا۔

انسان کے لیے شرفِ انسانیت کا معیار

اسی انسان کو کہا کہ جب انسانیت کا تحفظ خطرے میں پڑ جائے تو اپنی جان اور زندگی کو محفوظ رکھنا شرفِ انسانیت نہیں ہے بلکہ انسانیت کے تحفظ کے لیے جو جان دیدینا ہے' یہ حیاتِ جاوید عطا کر دیتا ہے اور اسے شہید کہتے ہیں۔ یہ شہادت کسی حیوان کو نصیب نہیں ہوسکتی۔ اُسے شہادت کیا نصیب ہوگی حیوان تو خودکشی بھی نہیں کرسکتا' اسے تحفظِ خویش کے خلاف جانے کا اختیار ہی نہیں ہے۔ لیکن انسان کو اختیار ہے۔ یہ جذبۂ تحفظِ خویش پورا ہوتا چلا جاتا ہے جب تک یہ انسانیت کے نقصان میں نہ رہے۔ اور جب یہ مرحلہ آ جائے تو اقبالؒ **(1877-1938)** کے الفاظ میں

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

قرآن کہتا ہے کہ **وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ (2:154)** جو ان مقاصد کے لیے اپنی جان دیدیتے ہیں ان کو مردہ مت کہو۔ مردہ تو وہ ہوتا ہے جو طبعی طور پہ مر جاتا ہے۔ یہ ایک مقصد کے حصول کی خاطر اختیار وارادہ سے اپنی جان دے رہا ہے' اس کو مردہ نہیں کہتے۔ مردہ تو بلا اختیار مر جانے والے کو کہتے ہیں' آخری سانس تک وہ بھی اور اُس کے لواحقین بھی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ کسی طرح زندہ رہے۔ یہ جو Struggle for Life (جدوجہد برائے زندگی) ہو رہی ہے وہ بھی ٹھیک ہے لیکن یہ تو حیوانیت کا مقام ہے۔ انسانیت کا مقام یہ ہے کہ جب غلط اور صحیح کے اندر **Tie** (تصادم) پڑ جائے تو وہ غلط اور صحیح کا معیار ہی وہ قرار دے جو قرآن نے دیا ہے کہ **وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (13:17)** بقا اُس عمل کے لیے ہے جو نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش ہو۔ اپنا تحفظ تو ہر ایک چاہتا ہے' اپنے گروہ کا تحفظ بھی ہر

ایک چاہتا ہے' اپنی قوم کا تحفظ بھی ہر ایک چاہتا ہے۔ اُس نے کہا کہ اگر یہ تحفظات ہونے ہیں تو تم میں ٹکراؤ ہو جائے گا۔ کوئی حیوان اس مقصد کے لیے اپنی توانائی' اپنی خصوصیت' اپنی Instinct (جبلت) کو استعمال نہیں کرتا۔ اگر انسان کو بھی جیسا کہ اُس نے کہا ہے' اسی کے حال پہ چھوڑ دیا جائے تو اس کی بھی یہی کیفیت ہے کہ شیر کی طرح ہر ایک کو چیر پھاڑتا ہے' اس فرق کے ساتھ کہ جب شیر کی بھوک مٹ جاتی ہے تو وہ باقی چھوڑ دیتا ہے اور وہ دوسرے بھوکے کھا لیتے ہیں لیکن اس کو **ھلوعاً (70:19)** کہا ہے کہ اس کمبخت کا پیٹ بھرتا ہی نہیں ہے۔

انسانوں کی دنیا میں جنگ وجدل کی وجہ جواز

دنیا میں یہ قیامت کیوں برپا ہے' یہ اس قدر جہنم کیوں برپا ہے؟ اس لیے کہ انسان نما حیوانوں کو ان کے Instinct (جبلت) کے اوپر' ان کی فطرت کی اوپر' چھوڑ دیا گیا ہے اور ان کی جو وسعتیں ہیں وہ لامنتہا ہو چکی ہوئی ہیں۔ جیسا میں نے عرض کیا کہ حیوان کے اوپر پھر بھی وہ کچھ پابندیاں عائد ہوئی ہوتی ہیں کہ جب پیٹ بھر جاتا ہے تو باقی چھوڑ دیتا ہے۔ ہمارے ہاں کے جو بیل ہوتے ہیں وہ چارہ کتنا ہی کیوں نہ ہو لیکن کھانے کے بعد جب ان کا پیٹ بھر جاتا ہے تو وہ سارا وہیں پڑا ہوا ہوتا ہے اور وہ بیل بیٹھ جاتا ہے اور بڑے مزے سے جگالی کرتا ہے' اُسے اس کی فکر ہی نہیں ہوتی کہ وہ چارہ کوئی دوسرا کھا رہا ہے۔ یہ انسان ہے کہ **جَـمَـعَ مَـالًا وَّ عَدَّدَهٗ (104:2)** ضرورت پوری ہوتی ہے تو پھر جمع کرنا شروع کر دیتا ہے پھر ننانوے کے پھیر میں پڑتا ہے' بینک بیلنس گنتا ہے اور اس کی کوئی انتہا ہی نہیں ہوتی۔ ہر حیوان کو پتہ ہے کہ میرے لیے کیا مفید ہے اور کیا نقصان دہ ہے۔ بطخ کے چوزوں کو معلوم ہے کہ میرے لیے پانی حلال ہے اور مرغی کے چوزوں کو پتہ ہے کہ ہمارے لیے خشکی پہ رہنا حلال ہے۔ ان کے اندر خیر وشر کی تمیز رکھ دی گئی ہے۔

خیر وشر کے تصور کی حقیقت اور انسان کے نزدیک اس کا مختلف تصور

جب آپ یہ تصور کر لیں کہ انسان کی بھی ایک فطرت ہے اور فطرت بھی وہ جو خدا کی خصوصیت ہے تو اس کا اگلا قدم تو لازمی یہ ہو گیا کہ پھر خیر اور شر کی تمیز تو ان کے اندر ہونی چاہیے۔ ہمارے ہاں یہ بھی عقیدہ ہے کہ خیر اور شر کی تمیز انسان کے اندر ہے' یہ خیر اور شر کو فطرتاً پہچانتا ہے۔ ان کو تو چھوڑ دیجیے جو خیر کو مانتے ہی نہیں ہیں' جو دنیا میں خیر (Good) کو ماننے والے ہیں' ذرا دیکھیے تو سہی کہ ان کا خیر کا وہ تصور کیا ہے' وہ کیا ہے جسے Good & Evil (خیر وشر) کہتے ہیں۔ اگر یہ تصور انسان کے اندر ہے اور کوئی شے

Absolute (مطلق) خیر (Good) ہے تو ہر انسان کا وہی تصور ہونا چاہیے لیکن ایک انسان وہ ہے جو کیڑے مکوڑے کو مارنا بھی شر سمجھتا ہے، مسلمان کا بچہ اتنا سا ہی ہوتا ہے اور مزہ لے لے کر ہڈی کو چباتا ہے۔ اگر خیر اور شر کی تمیز اس کے اندر ہے تو دونوں جگہ ایک ہی چیز خیر ہونی چاہیے۔ یوں نہ کرنا خیر ہے تو ہر انسانی بچے میں یہ خیر ہونا چاہیے، اگر یہ شر ہے تو ہر ایک کو شر سمجھنا چاہیے۔ ٹھگوں کے ہاں جب تک ان کا جوان بیٹا کسی کو مار کر نہیں آتا تھا اُس کی شادی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اُس کو خیر سے تعبیر کرتے تھے۔ ان کے ہاں جو کالی دیوی تھی، وہ جس کے گلے میں انسانی کھوپڑیوں کا ہار پڑا ہوا ہوتا ہے، ہاتھوں میں بھالے نیزے اور یہ کچھ پکڑا ہوا ہوتا ہے، وہ اُس دیوی کی پرستش کرتے تھے کہ ہمیں اس جیسا بننا ہے۔ یہ ان کے ہاں خیر کا مجسمہ ہوتا ہے [1]۔ انسان تو خیر اور شر کے اندر تمیز ہی نہیں کر سکتا۔ یہ اضافی (Relative) ہوتا ہے۔ ان کے ہاں یہ خیر، ان کے ہاں کے اُس خیر سے مختلف ہوتا ہے۔ تو یہ جسے آپ مطلق خیر کہتے ہیں کہ خیر ہی ہو، وہ کسی جگہ بھی شر نہ ہو، بلکہ ہر جگہ خیر ہی ہو، تو انسان کا خود وضع کردہ تو ایک طرف، وہ اُسے پہچان بھی نہیں سکتا۔ اس کے ہاں تو وہ Relative (اضافی) ہوتا ہے جیسے کہ My Country, right or wrong جذبۂ حب الوطنی کے ماتحت ان کے ہاں یہ خالص خیر (Absolute Good) ہے۔ اور یہ اتنا شر پیدا کرتا ہے کہ جب My Country, right or wrong ہو جائے تو پھر دوسری Country (ملک) کے خلاف جو کچھ کیا جائے وہ خیر ہو جائے گا۔

انسانی جذبات کی مختلف شاخیں

قرآن یہ کہتا ہے کہ تمہاری تو اپنی کیفیت یہ ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز درحقیقت شر (Evil) ہوتی ہے لیکن تم اُس کو خیر (Good) سمجھ کر اُس کے پیچھے لپکتے چلے جاتے ہو، نقصان اٹھاتے ہو تو پھر مایوس ہو کر بیٹھ جاتے ہو۔ ایک چیز واقعی خیر (Absolute Good) ہوتی ہے لیکن تم اُس کو دھتکار کر الگ ہو جاتے ہو۔ اندر کی پہچان تو ایک طرف، وہ تو کہتا ہے کہ انسان کی کیفیت یہ ہے کہ جو جذبات اس کے اوپر غالب آتے ہیں تو اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اُس نے کہا یہ ہے کہ جو انسانی جذبات ہیں وہ دراصل حیوانی زندگی کی جو جبلتیں ہیں انہیں انسانی جذبات کہا جاتا ہے مثلاً

---

[1] جو قارئین ان نکات کی مزید معلومات سے دل چسپی رکھتے ہیں ان کے لیے درج ذیل تین کتب بڑی ہی پر از معلومات ہیں

(i) Rashdall, Hastings: The Theory of Good and Evil Vol.1 (1907)

(ii) Benedict, Ruth: Patterns of Culture (1935).

(iii) پرویزؒ: انسان نے کیا سوچا؟ (زندگی کے اہم حقائق کے متعلق انسانی فکر کی کاوشیں)، (1956)۔ باب سوم: اخلاقیات۔

جذبہ تحفظِ خویش، جذبہ تغلبِ خویش، جذبہ افزائشِ نسل۔ ان کی شاخیں بہت سی ہونگی لیکن بنیادی طور پہ یہی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہی ہیں انسانی جذبات۔

تصوف کی دنیا میں انسانی جذبات کی تحقیر

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ ہمارے ہاں یہ جو تصوف سے تصور آیا کہ ساری برائیوں کی جو جڑ ہے وہ انسانی جذبات ہوتے ہیں، ان کو فنا کر دیا جائے تو یہ حقیقی مقصد ٹھہرا۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ فنا ہو ہی نہیں سکتے، وہ جو اتنے متوکل علی اللہ بن کر بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں کہ ہم میں Preservation of Self [1] کا جذبہ ہی نہیں ہے۔ فرق اتنا ہوتا ہے کہ وہ خود کما کر نہیں کھاتے ''دو دن مرید نہ لان تے میاں صاحب نوں پتہ لگ جائے، جیہڑا بیٹھا ہویا کہندا رہندا اے کہ سانوں خدا کھلاندا ہیگا''۔ [2] یہ اس طرح سے آپ کی طبعی زندگی ہے کہ آپ سانس لیتے ہیں، پانی پیتے ہیں۔ آپ ان تقاضوں کو ختم ہی نہیں کر سکتے، البتہ مرنے کے بعد پھر اس کی ضرورت نہیں رہتی۔ جب تک زندگی ہے آپ ان جذبات کو مار نہیں سکتے۔ لہٰذا وہ جو روحانیت کی طرف لے جانے والے اتنے دلکش تصورات ہیں وہ حقیقت میں سارے باطل ہیں۔

دوسری چیز سیکولرازم کی آ گئی کہ یہ اقدار اور حدود (Limits) کچھ ہیں ہی نہیں، انسان کے جو جذبات ہیں ان کی تسکین مقصدِ انسانی ہے، جس طرح سے جی چاہے تسکین کرتے چلے جائیں، جس طرح سے جی چاہے لوٹو، کھسوٹو، مارو۔ تغلبِ خویش ہے: بڑے بڑے ایٹم بم بنا لو۔ یہ افزائشِ نسل جنسی تسکین کا ایک ذریعہ ہے جس طرح سے جی چاہے اس کو پورا کر لو۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ سب باطل ہے۔ **بَلِ اتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوٓا اَهۡوَآءَهُمۡ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ** (30:29) یہ جو فساد برپا ہوتا ہے وہ اس لیے ہوتا ہے کہ ہر انسان اپنے جذبات کو اپنی مرضی، اپنے مفاد، اپنی خواہش کے مطابق Satisfy (تسکین) کرنا چاہتا ہے، اس سے ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔ اُس نے یہ نہیں کہا کہ یہ **اھــوآء** بڑی خراب چیز ہیں، یہ جذبات بڑی بُری چیز ہیں اور ان کو مار دو یا فنا کر دو بلکہ اُس نے کہا کہ **بِغَيۡرِ عِلۡمٍ** (30:29) اللہ کی طرف سے آئے ہوئے علم کے بغیر اگر ان کی تسکین کرتا ہے تو فساد ہوتا ہے، اُس کے مطابق کرتا ہے تو نفع ہی نفع ہوتا ہے۔ جذبات کی تسکین بھی ہوئی اور فساد بھی نہ پیدا ہوا۔

---

1. تحفظ خویش
2. جو بیٹھا رہے یا یہ کہتا رہے کہ ہمیں خدا کھلاتا ہے، اگر ان میاں صاحب کو ان کے مرید دو دن بھی نہ لا کر دیں تو انہیں آٹے دال کے بھاؤ کا پتہ چل جائے۔

عزیزانِ من! یہ ہے قرآن' ورنہ آپ کسی روحانیت والے سے پوچھیے' وہاں یہی چیز آپ کو ملے گی کہ سب سے پہلے نفس کشی ہو۔ یہ مرنے سے پہلے مرنے والی بات ہے۔قرآن نہ تو ان جذبات کو بیباک سمجھ لیتا ہے اور نہ نفس کشی کی تعلیم دیتا ہے۔کہتا ہے کہ ان کی تسکین ضروری ہے لیکن **بِغَیْرِ عِلْمٍ** نہ ہو۔ان انسانی Instincts (جبلتوں) کو ہدایتِ خداوندی کے تابع رکھو اور اس طرح سے پورا کرو تو اس سے فساد برپا نہیں ہوتا اور مقاصدِ حیات پورے ہوتے چلے جائیں گے۔

اب عزیزانِ من! اس تمہید کے بعد **فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا** (30:30) آیت آئے گی لیکن میں نے عرض کیا تھا کہ ایک درس میں بات نہیں ہوسکتی۔اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

پانچواں باب: سورة الروم (آیات 28 تا 32)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج ستمبر 1979ء کی 14 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز یوں کہیے کہ سورۃ الروم کی آیت 28 سے ہو رہا ہے: (30:28)۔

آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے درس میں ایک بنیادی نکتے کی تشریح کی گئی تھی اور وہ تھا اسی سورۃ کی آیت 30 کے حوالے سے' جس میں کہا گیا ہے کہ **فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا** (30:30)۔ جو کچھ کہا گیا تھا اُس کا ملخص یہ تھا کہ جو تصورات اور نظریات ہمارے ہاں رائج ہیں' وہ یہ ہیں کہ انسان کی فطرت ہے یا Human Nature ہے اور پھر اس سے آگے یہ کہ انسان کو اللہ نے اپنی فطرت پہ پیدا کیا اور اس سے اگلا قدم یہ کہ اسلام دینِ فطرت ہے اور پھر آگے یہ کہ اگر انسانی بچے کو اس کے حال پہ چھوڑ دیا جائے تو جیسا کچھ وہ بنے گا وہ اسلام کا مجسمہ ہوگا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ تمام تصورات انسانی ذہن کی تخلیق ہیں اور اسلام میں یہ دوسروں سے مستعار لیے گئے ہیں' یہ قرآن کی تعلیم کے بنیادی طور پر خلاف ہیں۔ یہ بات پچھلے درس میں آ چکی تھی اور میرا خیال ہے کہ آپ نے جس جذب وانہاک سے اسے سنا تھا اس سے یہ آپ کے ذہن میں محفوظ ہونا چاہیے۔ آج بات اسی سے آگے چلتی

ہے۔ اصل میں اس آیت تک پہنچنے کے لیے یہ تمہید ضروری تھی۔ اُس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ **فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ** [1] **(30:30)**۔ یہ سارا کچھ وہی ہے جو پہلے کہا گیا ہے کہ **ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ**: یہ ہے دینِ قیم' یہ ہے نظامِ زندگی۔

لفظ 'قائم' کا قرآنی مفہوم: اس طرح کھڑے ہو جانا کہ اس میں کسی قسم کی لڑکھڑاہٹ پیدا نہ ہو

اب لفظ **قَيِّمُ** آیا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ان عربوں کی خصوصیتِ کبریٰ یہ ہے کہ ان کی زبان کا تو پوچھو نہیں کہ وہ شہنشاہ واقع ہوئے تھے۔ **قام** کے ویسے تو معنی کھڑے ہونا ہیں لیکن ان کی نگاہ دیکھیے کہاں جاتی تھی۔ اُنھوں نے کہا کہ وہی چیز کھڑی رہ سکتی ہے جس کا توازن برقرار رہے۔ اگر ذرا سا توازن بگڑے تو کوئی شے تو رہی ایک طرف' انسان بھی کھڑا نہیں رہ سکتا۔ اس لیے انہوں نے اس کے اندر یہ چیز رکھی کہ جس چیز کا صحیح توازن ہو' اُسے قیم یا قائم کہا جا سکتا ہے: متوازن' متناسب' معتدل' صحیح Proportion کو لیے ہوئے' اس طرح کا صحیح Proportion (تناسب) کہ وہ اُس کو کھڑا کر دے۔ اب یہیں سے آگے وہ بڑھے تو میں نے کہا ہے کہ ان کے ہاں زبان میں ''باب'' ہیں۔ اب اُس میں خدا کے لیے قیوم کا لفظ ہے۔ اب اس ''باب'' کے اوپر جو لفظ آئے گا تو اس میں اس ''باب'' کی خصوصیات آئیں گی۔ اس ''باب'' کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ ''وہ جو اپنی ذات میں کھڑا ہو' قائم ہو اور کسی کا محتاج نہ ہو اور ہر شے اُس کی وجہ سے قائم رہ سکے''۔ اب اس ایک لفظ میں دونوں چیزیں آ گئیں۔ **قیم** کے معنی متوازن' متناسب' اپنے آپ میں قائم رہنے والا لیکن خدا کے سہارے کے ساتھ: **ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ (30:30)** یہ ہے دینِ قیم۔ اب **قیم** کے تو معنی آپ سمجھ گئے۔ اب اسی مادے سے **فَاَقِمۡ** ہے کہ نہایت اعتدال کے ساتھ جم کر کھڑے ہو جاؤ' لغزش نہ ہو' آپ کے اندر لڑکھڑاہٹ نہ پیدا ہو۔ **فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ (30:30)** اپنی تمام توجہات کو مرکوز رکھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ توجہات کو مرکوز رکھنا تو کھڑے ہونے کے لیے ضروری ہے' ذرا سا دھیان آپ کا بٹے تو آپ لڑکھڑا جاتے ہیں: **ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ (30:30)** یہ ہے دینِ قیم۔ وہ دین کیا ہے جس کے متعلق یہاں یہ کہا؟ یہ وہ ہے جو پیچھے سے چلا آ رہا تھا۔ پچھلی آٹھ دس پندرہ آیات سے یہ بات چلی آ رہی تھی۔ کہا یہ جا رہا تھا کہ **وَمِنۡ اٰيٰتِهٖۤ** اُس کی آیات میں سے یہ چیزیں نشانیاں ہیں۔ کسی حقیقت تک پہنچنے کے لیے جو علامات یا نشانیاں Symbols ہوتی ہیں انہیں آیات کہا جاتا ہے۔ یہ نشانیاں ہیں' یہ Symbols ہیں' سنگِ میل ہیں' نشاناتِ راہ ہیں۔ کیا بات ہے لفظِ آیات کی!

---

[1] صحیح روش زندگی یہ ہے کہ تُو ان تمام غلط راہوں سے منہ موڑ کر' اپنی تمام توجہات کو اُس نظامِ زندگی پر مرکوز کر دے جو خدا کے تخلیقی قانون کا تقاضا ہے...... یہی وہ نظام زندگی ہے جو نہایت محکم اور تمام نوعِ انسان میں صحیح توازن قائم رکھنے کا موجب ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 37-936)۔

کائنات کے اندر قدم قدم پر بکھری ہوئی نشانیاں دعوتِ غور وفکر دیتی ہیں

وہ سنگِ میل کیا ہیں اور کس چیز تک پہنچنے کے لیے ہیں؟ کہا کہ وہ **الدین القیم** تک پہنچنے کے لیے ہیں۔ وہ نشانیاں تسخیرِ ارض وسما' تکویرِ شمس وقمر' اختلافِ لیل ونہار' تصریفِ خزاں و بہار ہیں۔ یہ سب کچھ ایک محکم قیم نظام تک پہنچنے کے لیے نشانیاں ہیں۔ ان میں ایک ہی چیز قدرِ مشترک ہے کہ یہ سب قوانین کے تابع زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ یونہی وجود میں نہیں آ گئے یا یونہی یہ کارگہٗ کائنات نہیں چل رہا۔ نہ تو یہ بائی چانس وجود میں آیا ہے اور نہ ہی یہ یونہی الل ٹپ چل رہا ہے۔ یہ ایک نظم کے تابع ہے' ایک قاعدے قانون کے تابع ہے۔ یہ جو کائنات میں اس قدر نظم ونسق دیکھ رہے ہو تو یہ قانون کے اتباع کا نتیجہ ہے۔ پہلی چیز تو یہ بتائی گئی کہ جسے ہم نے کائنات کا نظام کہا ہے' اس میں ایک حقیقت تک پہنچنے کی نشانیاں ہیں۔ پہلی چیز اُس میں یہ ہے کہ ہر شے قانون کے تابع زندگی بسر کر رہی ہے' کسی میں مجالِ انکار نہیں' یارۂ سرکشی نہیں۔ اور اسی سے یہ سارا سلسلۂ کائنات اس حسن وخوبی کے ساتھ رواں دواں ہے۔ دوسری چیز اُس نے یہ کہی تھی کہ **هُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ** ❶ **(30:27)**۔ یہ کوئی جامد شے نہیں ہے کہ ایک دفعہ وجود میں آ گئی اور پھر وہ وہیں ٹکی ہوئی ہے۔ کائنات میں Evolution یعنی ارتقا کا سلسلہ جاری ہے۔ ابتدا میں کوئی شے بھی ہو' اُس کا جو ابتدائی ہیولیٰ ہوتا ہے وہ غیر نشوونما یافتہ شکل میں ہوتا ہے' ابتدائی فارم میں ہوتا ہے پھر وہ گردشیں دلاتا ہوا' اُسے ارتقا کی منازل سے گزارتا ہوا' حشو وزوائد کو الگ کرتا ہوا' ایک فارم میں لاتا ہوا' اُس شکل تک لے آتا ہے۔ اس دینِ قیم کی دوسری چیز یہ بتائی کہ یہ کائنات قانون کے تابع ہے اور ارتقائی منازل طے کر رہی ہے۔

یہ ارض وسما قانونِ خداوندی کے تابع ایک پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہیں

اگلی بات اُس نے یہ کہی کہ **لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (30:26)**۔ یہ بڑی چیز ہے۔ یہ اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے سب ڈھانچے جو کچھ کر رہے ہیں' جس طرح سے یہ چل رہے ہیں' یہ اپنے کسی مقصد کی تکمیل یا حصول کے لیے نہیں کر رہے بلکہ یہ خدا کے متعین فرمودہ پروگرام کی تکمیل کے لیے ایسا کر رہے ہیں۔ یہ **قــــانتــون** ہیں یعنی یہ اپنی توانائیاں بے جا صرف نہیں کرتے' سنبھال کر رکھتے ہیں' Preserve (محفوظ) رکھتے ہیں' جہاں کہا جاتا ہے وہاں صرف کرتے

---

❶ خدا اپنے قانون کی رو سے' ہر شے کی تخلیق (پیدائش) کی ابتدا کرتا ہے۔ پھر اسے مختلف گردشیں دیتا ہوا' اس منزل کی طرف لے جاتا ہے جو اس کے لیے مقرر کر دی گئی ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔935)۔

ہیں' جتنا صرف کرنے کو کہتے ہیں اتنی ہی صرف کرتے ہیں' باقی یہ سنبھال کر رکھ لیتے ہیں۔ یہ تیسری چیز آ گئی۔ ذہن میں رکھیے گا کہ یہ ہے دینِ قیم۔

اب درمیان میں ایک آیت' جو ہم نے چھوڑ دی تھی' میں اُسے لیتا ہوں۔ کہا کہ **ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ** ❶ **(30:28)**۔ یہ ابتدائی دور کے تصورات کہ کائنات کے یہ جو عناصر ہیں' بجلی ہے' بادل ہیں' دریا ہیں' پہاڑ ہیں' سمندر ہیں' درخت ہیں' یہ دیوی دیوتا ہیں' یہ بڑی بڑی قوتوں کے مالک ہیں' ان کے سامنے جھکنا چاہیئے' انہیں معبود بنالینا چاہیئے' یعنی یہ کائنات کہ جس کو تمہارے لیے **سخر لکم** مسخر کر رکھا ہے اُس کے متعلق یہ تصور کہ ہم ان کے سامنے جھکنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں یہ ہمارے معبود ہیں۔ قرآن نے کہا کہ بنیادی طور پر یہ تصور غلط ہے۔ یہ خدا کی دی ہوئی طاقتیں ہیں۔

دورِ جہالت میں انسانی سوچ کی کیفیت

اُس زمانے میں تو ان لوگوں نے جہالت کی بنا پر ان چیزوں کے متعلق کہا تھا' وہ اپنے دیوی دیوتاؤں کے متعلق یہ نہیں کہتے تھے کہ یہ خود خدا ہیں' کہتے یہ تھے کہ خدا نے اپنے اقتدارات اور اختیارات کو انہیں سونپ رکھا ہے' انہیں تفویض کر رکھا ہے' Delegate (تفویض) کر رکھا ہے۔ آج کے دور کا انسان جو بڑا خدا پرست کہلاتا ہے' اسلامی مملکت بنانے کے دعوے کر رہا ہے اور اُس کا جو منشور ہے' اُس کا جو آئین ہے اُس کے اندر یہ لکھا ہوا ہے کہ خدا نے جو Powers (اختیارات) ہمیں Delegate (تفویض) کی ہیں' ہم ان کو Exercise (استعمال) کرتے ہیں۔ Delegate (تفویض) کا یہ لفظ تو انگریزی جاننے والے جانتے ہی ہیں کہ کوئی **Powers** (اختیارات) جو کوئی افسر' کسی دوسرے کو Delegate (تفویض) کر دیتا ہے تو وہ اُس وقت کے لیے اُس کے پاس تو نہیں رہتیں۔ وہ افسر اپنے آپ کو ان Powers (اختیارات) سے مبرا کر لیتا ہے' دوسرے کو دیدیتا

---

❶ ہم اس کے لیے خود تمہاری اپنی مثال پیش کرتے ہیں۔ تمہارے ہاں وہ لوگ بھی ہیں جو تمہارے ماتحت کام کرتے ہیں۔ تمہارے ملازم وغیرہ۔ کیا تم ایسا کرتے ہو کہ جو کچھ ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے انہیں اس طرح شریک کرلو کہ وہ اور تم ہر طرح سے برابر برابر ہو جاؤ اور پھر تم ان سے اس طرح ڈرنے لگ جاؤ جس طرح تم اپنے برابر کے لوگوں سے ڈرتے ہو۔ (سو جب یہ لوگ تمہارے زیرِ فرمان کام کرتے ہیں' تمہارے جیسے انسان ہونے کے باوجود' تمہارے ہمسر نہیں ہو سکتے اور تم ان سے کبھی خائف نہیں ہوتے تو کائنات کی مخلوق' خواہ وہ کتنی ہی عظیم کیوں نہ ہو' اس خدا کے برابر کس طرح ہو سکتی ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے اور وہ اس کے قوانین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے)۔ ہم اس طرح اپنے قوانین و حقائق کھول کر بیان کرتے ہیں اس سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو عقل و فکر سے کام لیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 936)۔

ہے۔ یہ کیا چیز ہے کہ یہ Powers Delegated (تفویض کردہ اختیارات) کا تصور آ گیا؟

مذہبی پیشوائیت کی سیاست وملوکیت کے ساتھ گٹھ جوڑ کی داستان روزِ اول سے چلی آ رہی ہے

عزیزانِ من! یہ چیزیں بڑے گہرے تسلسل کی محتاج ہوتی ہیں کہ یہ بات چلی کہاں سے تھی؟ وہ جو انگلینڈ کا چرچ تھا اس نے اپنا بادشاہ بنایا' وہ تو مذہبی پیشوائیت کا اور سیاست وملوکیت کا گٹھ جوڑ ہوتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت نے یہ کہا کہ یہ بادشاہ جو کچھ کرتے ہیں' جو احکام نافذ کرتے ہیں' کسی کو قتل کرتے ہیں' تو یہ خود نہیں کرتے بلکہ خدا نے اپنے جو Divine Rights (خدائی اختیارات) ان کو دے رکھے ہیں' یہ تو صرف ان اختیارات کو نافذ کرتے ہیں۔ آپ کے ہاں السلطان ظل اللہ علی الارض کا تصور آیا کہ سلطان اس زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ زمانے کی گردشوں نے ان تصورات کو مٹایا۔ یورپ نے ان کے خلاف کروٹ لی تو چونکہ جو Extreme (انتہا) ہے وہ متشدد ہوتی ہے' اس کا ردِعمل بھی متشدد ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ خدا کے اختیارات ہیں۔ ہم تو خدا کے وجود کو ہی نہیں مانتے۔ یعنی جو کمشنر کو نہیں مانتا تو ڈپٹی کمشنر کو کیا مانے گا۔ یہ جو یورپ کی سیکولرازم ہے یہ وہ چیز ہے۔ یہ اُس کے خلاف ردِعمل ہے۔ وہ جو السلطان ظل اللہ علی الارض والی بات تھی تو انہوں نے کہا کہ اس سے بھی کچھ شرم سی آتی ہے۔ انہوں نے الفاظ بدل دیئے۔ اِنْ هِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ (53:23) [1] کچھ الفاظ ہیں جو تم بدل دیتے ہو۔ اِنہوں نے کہا کہ یہ The Powers Delegated by God. [2] ہے۔ یہ Divine Rights (خدائی اختیارات) نہیں تو اور کیا ہے۔ وہ جو خدا کا سایہ کہا تھا تو چلو یہ تھا کہ خدا تو موجود ہے' یہ اُس کا سایہ ہیں لیکن انہوں نے کہا کہ یہ تو بغیر اختیارات کے بیٹھا ہے' سارے اختیارات تو اُس نے ہمیں Delegate (تفویض) کردیئے ہیں۔ تو یہ اس موجودہ دورِ مہذب میں آپ کے ہاں وہی تصور چلا آتا ہے:

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدمؑ جواں ہیں لات و منات

(اقبالؒ: ضربِ کلیم)

کبھی کسی کا ذہن اس طرف نہیں گیا۔

---

[1] یاد رکھو! ان دیوی دیوتاؤں اور بتوں کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے اسلاف نے رکھ چھوڑے ہیں (7:71) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1241)۔

[2] یہ خدا کے تفویض کردہ اختیارات ہیں۔

مملکت اسلامیہ کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کی ایک گہری سازش

عزیزانِ من ! میں کبھی ''میں'' درمیان میں نہیں لایا کرتا لیکن بعض اوقات ناگزیر ہو جاتا ہے۔ آپ طلوعِ اسلام اٹھا کر دیکھیے۔ پہلی دفعہ جب انہوں نے یہاں یہ آئین بنایا ہے' اُس کے اندر ان لوگوں نے خدائی اختیارات کے تفویض کرنے کا یہ تصور داخل کیا ہے اور میں جانتا تھا کہ یہ کون کرا رہا ہے۔ آگے یہ بات آنی تھی کہ صاحب! اسلام ان لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے جنہیں آپ حاکم بنا رہے ہیں' یہ تو ہم ہیں جو اسلام کو جانتے ہیں۔ یہ ہے مذہبی پیشوائیت۔ یعنی انہوں نے یہاں پہنچنا تھا کہ یہ خدائی اختیارات ہیں جو اس مملکت کو حاصل ہیں اور مملکت اسلام کے لیے بنائی گئی ہے اور اسلام کے اجارہ دار و مدعیٔ دین ہم ہیں' اس لیے یہ ہمیں دیجیے۔ یہ اپنے قوانین کو خدا کے قوانین بنا کر نافذ کرنا تھا۔ تو وہیں بات چلی گئی۔ بڑی دور رس سازشیں ہوتی ہیں۔ جونہی انہوں نے آئین کا پہلا ڈرافٹ کیا اور اُس میں یہ چیز آئی تو آپ اُس دور کا پہلا یا دوسرا طلوعِ اسلام اٹھا کر دیکھ [1] لیجیے۔ میں نے اس کی بھرپور مخالفت کی اور ان سے کہا کہ یہ سارے مشرکانہ اور کافرانہ تصورات ہیں جو آپ کے ہاں آئے ہوئے ہیں۔ خدا اپنے کسی اختیار کو کسی کو Delegate (تفویض) نہیں کرتا اس لیے کہ **هو الحی (2:255)** وہ خدائے زندہ ہے۔

خدا تعالیٰ کی ذات قادر بھی ہے اور قدیر بھی

خدا تعالیٰ وہ قادر ہی نہیں' قدیر بھی ہے۔ عزیزانِ من ! قادر تو ہوتا ہے کہ کسی ایک وقت میں کسی چیز پہ قدرت رکھنے والا۔ وہی لفظ ہے لیکن جب ''باب'' [2] بدلتا ہے تو اُس ''باب'' میں لفظ قدیر آئے گا۔ اُس کے معنی ہوتا ہے ''مستقل طور پر ہمیشہ یہ کچھ کرنے والا''۔ اگر وہ اپنی قدرت یا اقتدار کو کسی وقت میں تفویض کر دے تو وہ پھر قدیر نہیں رہتا۔ کم از کم اتنے وقت کے لیے تو نہیں رہتا۔ تو یہ سارا کچھ کیا ہی غنیمت ہے کہ Delegate والی وہ بات ختم ہوئی' اُس نے کوئی اور رنگ اختیار کیا۔ یہ آیت ہے۔ کہا کہ تم یہ تصور کر رہے ہو کہ ہم اپنی Powers (اختیارات) کو دوسروں کو Delegate (تفویض) کر دیتے ہیں یا اُس میں دوسروں کو شریک کر لیتے ہیں۔ (تم) ہماری بات تو چھوڑو' ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے کاروبار میں' کچھ تمہارے ماتحت ہوتے ہیں' تو کیا تم کبھی ایسا

---

[1] نیز پرویزؒ: مسودہ آئینِ پاکستان اور علماء کرام' طلوع اسلام' مارچ 1973ء ص ص۔ 9 تا 16

[2] مادہ (Root)' اوزان افعال' اشتقاقات اور ابواب کے ان نکات کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الانبیاء' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص۔ 20 تا 21 مع انہی 2 صفحات کے فٹ نوٹ۔

کرتے ہو کہ اُس کاروبار کا سرمایہ بھی آدھا ان کو دیدو اور اپنے اختیارات بھی آدھے ان کو دیدو اور اُس کے بعد ان کو کہو کہ ہماری ماتحتی کرو تو کیا وہ کبھی تمہاری ماتحتی کریں گے؟ وہ تو تمہارے برابر بیٹھیں گے' برابر کے شیئر ہولڈر ہوئے' نظم ونسق میں برابر کے حصہ دار بنیں گے۔ کہا کہ اس برابری سے تو تم خائف ہو گے۔ سوچو تو سہی کہ تم جب اپنے اس محدود سے کاروبار میں اسے برداشت نہیں کرتے' ڈرتے ہو کہ وہ تمہارے برابر بیٹھ جائیں گے اور تمہاری پوری قوت نہیں رہے گی تو کیا خیال ہے آپ کا کہ ہم میں تمہارے جتنی بھی سمجھ نہیں ہے۔ کہنے لگے کہ تم اپنی چھوٹی سی دنیا کے اندر یہ نہیں کرتے تو ہم اتنی بڑی کائنات کے اندر یہ کریں گے کہ اپنی Powers Delegate (انتقالِ اختیارات) کریں۔

صرف خدا کی ذات ہی اقتدار کا سرچشمہ ہے لہٰذا کوئی اور ظل اللہ علی الارض نہیں ہے

اب دینِ قیم میں تیسری چیز یہ ہوئی کہ اس میں کسی شے کو خدائی اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ عزیزانِ من! کتنے سال سے جھگڑا ہے کہ نظامِ مصطفیٰ کیا ہے' نظامِ خداوندی کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ **ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (30:30)** ۔ کیا بات ہے ذٰلک کے لفظ کی! یہ دینِ قیم ہے۔ یہ تیسری شق آ گئی۔ گویا اقتدار و اختیار کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے اور اُس نے اپنے اقتدار و اختیار کو کسی کو تفویض نہیں کیا بلکہ اُسی کے پاس ہیں' کوئی ظل اللہ علی الارض نہیں ہے' اختیارات کسی کو تفویض نہیں کیے گئے۔ جس طرح سے یہ کائنات کا سلسلہ ہے کہ ہر شے اُس کے اوپر کاربند ہے' اُس کے مطابق چل رہی ہے تو تمہارے لیے بھی ہم نے اسی قسم کے قوانین بنائے ہیں۔ ہم نے تمہیں پاور (اقتدار) Delegate (تفویض) نہیں کر دی کہ جس طرح سے تم جی چاہے ان کو Exercise (استعمال) کرو' وہ پاور (اقتدار) ہمارے ہی پاس ہے۔ قوانین دیئے ہیں کہ جس طرح سے نظامِ کائنات چل رہا ہے اسی طرح سے تم بھی چلو۔

اب اگلی بات ایک اور آ گئی۔ یہ باہر کی جتنی بھی اشیائے کائنات گنائی گئی ہیں میں نے بتایا تھا کہ فرق یہ ہے کہ ان میں اختیار و ارادہ نہیں ہے' Choice (انتخاب) نہیں ہے' Two Possibilities (دو امکانات) نہیں ہیں' دو امکانات یا دو راستے نہیں ہیں۔ ہر نوع کے سامنے ایک ہی راستہ ہے' یہ نہیں ہے کہ بکری دوراہے پہ کھڑی ہے اور اس سے کہا گیا ہے کہ یہ راستہ گھاس کھانے کا ہے' جی چاہے تو اسے اختیار کر لو اور یہ گوشت کھانے کا ہے' جی چاہے تو یہ اختیار کر لو۔ بکری تو بیچاری پھر بھی کمزور سی ہوتی ہے وہ شیر جو اتنی قوتوں کا مالک ہے وہ بھی اُس کے قانون کی اطاعت پہ مجبور ہوتا ہے' اسے اختیار نہیں' ارادہ نہیں' Choice (اختیار و انتخاب) نہیں' دو Possibilities (امکانات) نہیں۔ صرف انسان کے معاملے میں آ کر اس کو چیز دی گئی ہے کہ تم

حیوان سے اونچے چلے گئے' یہ ارتقا کی اگلی منزل آ گئی کہ تمہیں یہ Choice (انتخاب) دی گئی ہے' دو راستے بتائے گئے ہیں۔ **وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (90:10)** دو راستے ہم نے بتا دیئے ہیں۔ تمہارا جی چاہے یہ اختیار کرو' تمہارا جی چاہے وہ اختیار کرو۔ بس اتنی سی بات ہے۔

ارتقا کے مرحلہ میں انسانیت کی دنیا کا ایک جہانِ نو کی طرف سفر کا آغاز

یہاں ارتقا کی اس منزل پہ پہنچنے کے بعد ایک بالکل نئی چیز آئی۔ یہ ہے **خَلْقًا آخَرَ (23:14)** یہ جدید قسم کی مخلوق جو حیوانات سے یکسر مختلف ہے' انسان ہے۔ اسے ارتقائی مراحل طے کر کے اگلی دنیا میں جانا ہے۔ زندگی کے اس حصے کو **خَلْقٍ جَدِيْدٍ (32:10)** کہا ہے۔ یہ جو انسان کی تخلیق کا پچھلا حصہ ہے اس میں یہ اور حیوانی بچہ دونوں برابر ہوتے ہیں' وہ انہی منزلوں میں سے گزرتے چلے آئے ہیں۔ عزیزانِ من! کیا عرض کروں' میں نے کہا ہے کہ یہ نظام کی باتیں ہیں' کلاس روم میں کرنے کی باتیں ہیں!

انسان کی موجودہ ہیئت کروڑ در کروڑ' ارب در ارب سال کی رہینِ منت ہے

اس تحقیق پہ آپ حیران ہونگے کہ لائف کا جو اولیں جرثومہ ہے جسے لائف کا پہلا سیل کہتے ہیں' جو نظر بھی نہیں آتا' وہاں سے لے کر انسان کی ہیئت تک یہ لائف یا زندگی جن منازل سے گزری ہے وہ کروڑ در کروڑ' ارب در ارب سال بنتے ہیں' ان کا حساب ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اتنے دور و دراز راستوں سے گزر کر لائف (زندگی) اس شکلِ انسانی میں آئی ہے۔ آپ حیران ہونگے کہ رحمِ مادر کے اندر پہلا جرثومہ جب آتا ہے تو نو مہینے کے عرصے میں یہ ساری کروڑوں منزلیں پوری کر لیتا ہے۔ قرآن نے یہ اُس زمانے میں شہادت دی تھی جب اولیں جرثومے کو دیکھنے کے لیے مائیکروسکوپ (خوردبین) بھی وجود میں نہیں آئی تھی۔ قرآن میں یہ جو جنین کی مختلف منازل دی ہیں' اُس زمانے کے اندر جنین کو تو دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ بتایا ہے کہ یہ جاندار مخلوق جن راستوں سے' جو بن کر گزری ہے وہ کچھ قرآن نے گنایا ہے اور آج گائنا کولوجی کی تحقیق بتا رہی ہے کہ وہ اولیں جرثومے سے لے کر انسان کے بچے کی شکل بننے تک زندگی جن راہوں سے گزری ہے وہ رحمِ مادر میں ان تمام سے گزر کر جاتی ہے لیکن یہاں پہنچ کر ایک فرق پڑتا ہے کہ حیوان کا بچہ اپنی جبلت پہ پیدا ہوتا ہے' اس کو Choice (اختیار) نہیں ہوتی۔ انسان کا یہ بچہ جو پیدا ہوتا ہے تو پیدا ہوتے ہی عجیب مصیبت شروع ہو جاتی ہے کہ یہ سنکھیے کی ڈلی بھی اسی طرح سے منہ میں ڈال لیتا ہے جیسا کہ مصری کی ڈلی ڈال لیتا ہے' آگ میں بھی ہاتھ اُسی طرح ڈال دیتا ہے جیسے ماں کے کندھے پہ ہاتھ رکھتا ہے۔ مرغی کا چوزہ کبھی یہ کچھ نہیں کرتا' بکری کا بچہ کبھی یہ کچھ نہیں کرتا۔

زندگی بھر کے لیے بچے کی تربیت کا ایک اہم سنہری اصول: اس کے سامنے متبادل راستہ کھلا رکھو

میں ضمناً ایک بات کہدوں کہ یہ جو بچے ہیں اگر ان کو کسی چیز سے روکنا ہو تو صرف روکو نہیں، وہ Choice (انتخاب) چاہتا ہے، اسے وہ Choice (انتخاب) دو۔ اس کے انسان ہونے کی شرط یہ ہے کہ اس کے سامنے دو راستے کھلے ہوں اور وہ اپنے اختیار سے ایک راستہ اختیار کرے۔ جسے آپ تربیت کہتے ہیں وہ تربیت نہیں ہوتی وہ Repression (ضبط) ہوتی ہے، اُس کے اندر کا تقاضا ہوتا ہے، اُس کے سامنے متبادل راستہ کھلا ہونا چاہیے۔ غلط بات سے روکتے ہیں تو اُس کو سامنے دوسری چیز دیجیے۔ ایک کھلونا اگر اس کے لیے مضر ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ وہ نہ دیں تو آپ اُس کو دوسرا کھلونا دیجیے جو صحت مند ہو۔ اگر آپ نے وہ کھلونا چھین لیا اور دوسرا نہ دیا تو وہ دوسرا اپنی مرضی سے خود تخلیق کرلے گا۔

بچہ ہو یا کوئی قوم، یہ اس وقت سرکش ہوتی ہے جب اس کے سامنے کوئی متبادل راستہ نہیں ہوتا

عزیزانِ من! بچے کی بات ہی نہیں ہے بلکہ انسان کی انسانیت کو برقرار رکھنا ہے تو اُس کے سامنے بند گلی (Cul de sac) نہ لایئے کہ آگے اُس کو راستہ نظر نہ آئے ورنہ وہ سرکشی اختیار کرلے گا۔ اُس کے تو انسان ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ اُس کے سامنے دو راستے کھلے ہوں اور اپنے (Choice) (انتخاب) سے وہ ایک راستہ اختیار کرے۔ بس یہ بتا دو کہ بھئی! اس میں یہ نقصان ہوگا، یہ تباہی ہوگی، اس میں خیریت رہے گی۔ قومیں جب سرکشی پہ اترتی ہیں جس طرح میں نے بچے کے متعلق کہا ہے تو وہ اُس وقت اترتی ہیں جب ان کے سامنے کوئی (Choice) (انتخاب) نہیں رہتی، اسی کو استبداد کہتے ہیں۔ اب Healthy Choice (صحت مند انتخاب) کی بات کرنے کی رہ گئی۔ ایسی تعلیم و تربیت کیجیے کہ وہ چُنے تو اپنی مرضی سے خیر کا راستہ چُنے۔ یہ بڑی بنیادی چیز ہے۔ میں اپنی بیٹیوں اور بہنوں سے پھر کہونگا کہ بچوں کی تربیت کے لیے اس کو ذہن میں رکھیے گا اور کبھی بھی ان میں ڈر نہ ڈالیے گا۔ یہ جو اندر والی چیز ہے وہ یہ ہے یا تو پھر جو Choice (انتخاب) کی بات ہے آپ اُس کو مار ہی دیں گے، ختم کر کے رکھ دیں گے تو وہ انسانیت کی سطح سے گر جائے گا۔ اور اگر وہ چیز زندہ رہی ہے اور آپ نے اُس کو خیر کا متبادل راستہ نہیں بتایا تو پھر اُس کے جو جی میں آئے گا وہ راستہ اختیار کرلے گا۔ یہ جتنے شر کے راستے اختیار کیے ہوئے آپ کو نظر آتے ہیں تو اس کو سائیکولوجی میں آپ دیکھیے تو نظر آجائے گا کہ بچپن میں ان کے سامنے خیر کے متبادل راستے نہیں رکھے گئے۔ آپ نے دیکھا کہ کتنی اہم بات آئی۔ **ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (30:30)** ۔ سنیے اس کے متعلق! کہا کہ انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے۔ وہی جو حیوانی جبلتیں ہیں، Instincts ہیں، وہ اس کے اندر ہیں۔ ان Instincts (جبلتوں) کو استعمال کرنے کے، Exercise (استعمال) کرنے

کے، دو راستے ہیں۔ حیوان کے سامنے ایک ہی راستہ ہوتا ہے۔ انسان کے سامنے دو راستے ہیں، انہی کو جذبات کہتے ہیں۔

لفظ ھویٰ کا قرآنی مفہوم

ان عربوں کے ہاں عجیب بات ہے کہ اس کے لیے انہوں نے جو لفظ چنا ہے وہ **ھویٰ** کا لفظ ہے جس کی جمع **اھوآء** ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کہ پہاڑ کی چوٹی پہ پتھر کو آپ تھامیں رکھیں تو وہاں وہ قائم ❶ رہتا ہے اور اگر اُس کو چھوڑ دیا جائے تو وہ جس تیزی سے نیچے کو گرتا ❷ ہے اس کو **ھوآء** کہتے ہیں۔ وہ انسانی جذبات کہ جن کو علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا جائے عرب اسے وہ پتھر کہتے تھے جو پہاڑ کی چوٹی سے چھوڑ دیا جائے۔ وہ پتھر جتنی تیزی سے آتا ہے اور جو کچھ اپنے ساتھ بھی اور جو سامنے آتا ہے ان کے ساتھ بھی کرتا ہے، وہ آپ کو معلوم ہے۔ یہ ہے جس کو آپ **جذبات** کہتے ہیں اور وہ عرب اسے **اھوآء** کہتے تھے اور قرآن نے بھی ان کو **اھوآء** کہا ہے۔

وہ جو میں نے کہا تھا کہ ہمارے ہاں جو مستعار لیا ہوا تصوف کا تصور ہے اُس میں تو آپ کے ہاں **نفس کشی** ہے:

ساز سامان سفر دا کریئے
مرنے توں پھر پہلاں مریئے
عالم کی فضا پوچھو محرومِ تمنا سے
بیٹھا ہوا دنیا میں اٹھ جائے جو دنیا سے

وحی انسانی جذبات کے استعمال کا طریق وضع کرتی ہے

عزیزانِ من! یہ بڑے غلط راستے ہیں جو آپ کے ہاں آئے ہوئے ہیں اور اس کا نام تقربِ بارگاہِ الٰہی ہے، روحانیت کا بلند ترین مقام ہے۔ یعنی خدا نے یہ جذبات دیئے تو عمداً یہ کہنا ہے کہ تم نے جذبات بنائے تھے تو لو ہم نے فنا کر کے رکھ دیئے ہیں۔ یہ خدا کو چیلنج ہے۔ وہ کہتا ہے **بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ** ❸ **(30:29)**۔ ظلم کے معنی ہیں ''جس شے کو جس جگہ ہونا چاہیے وہ وہاں نہ ہو، کسی اور جگہ ہو''۔ قرآن کہتا ہے کہ جو جذبات ہیں یہ نہ تو مارے جاسکتے ہیں اور نہ مر سکتے ہیں، یہ تو رہتے

---

❶ طبیعات کی اصطلاح میں کہتے ہیں کہ اس میں **Potential Energy** (مخفی توانائی) بھر جاتی ہے۔

❷ اس میں وہ **Potential** (مخفی) توانائی **Kinetic** (حرکی) توانائی میں بدل جاتی ہے۔

❸ ان واضح حقائق کے بعد، ان لوگوں کی حالت پہ غور کرو جو وحی (علم) کی روشنی کے بغیر، اپنے جذبات کے تابع چلنا چاہتے ہیں، (اور اس طرح اپنے جذبات ہی کو اپنا خدا بنا لیتے ہیں۔ حالانکہ صحیح روش یہ ہے کہ انسانی جذبات کو وحی خداوندی کے تابع رکھا جائے **(28:50)** ان کی اس غلط روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان پر سعادتوں اور کامرانیوں کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ **936**)۔

ہیں۔سوال یہ ہے کہ ان کو غلط جگہ رکھتے ہو تو یہ تخریب پیدا کرتے ہیں۔غلط جگہ کے معنی یہ ہیں کہ ان کو اگر تم اپنی ہی مرضی سے' اپنے ہی مفاد کی خاطر' استعمال کرو تو یہ تخریب پیدا کرتے ہیں۔ **جذبات** کو خدا کی وحی کے بغیر جو استعمال کرنا ہے' یہ ظلم ہے۔ **جذبات کا** استعمال ظلم نہیں ہے بلکہ **بغیر علم** ان کا استعمال ظلم ہے' دوسری جگہ **بغیر ھدًی (28:50)** کہا ہے۔اور اس علم کو دوسری جگہ العلم کہا ہے کہ وہ علم جو خدا کی طرف سے ملتا ہے۔یعنی انسانی جذبات کو اپنے Choice (اختیار) سے ہماری طرف سے دی ہوئی ہدایت کے مطابق استعمال کرو تو جذبات کی تسکین بھی ہو جائے گی' تخریب بھی نہیں ہوگی۔ وہاں حیوانات میں Choice (انتخاب و اختیار) نہیں تھا' وہ خدا کے قانون کے مطابق صرف کرنے کے لیے مجبور تھے۔ یہاں انسانی دنیا میں Choice (اختیار) دینے کے بعد کہا کہ یہ ہے ہمارا قانون۔اس کے مطابق صرف کرو گے تو تم پستیوں کی طرف نہیں جاؤ گے' یہ دیکھیے **ھـــویٰ** کا لفظ ہے۔اور اگر تم نے انہیں تخریب کے لیے اپنی ہی منشا کے مطابق صرف کیا تو یہ **اھـــو آء** ہو جائیں گے' وہ پتھر ہو جائے گا جو پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گرا کرتا ہے۔تو اگلی چیز یہ آئی کہ اپنے جذبات کو وحی کے تابع رکھ کر اُس کی دی ہوئی Directions (ہدایات) کے مطابق صرف میں لاؤ۔ آیئے ایک نظر پھر دہرا لیں کیونکہ ہم پھر دینِ قیم کی طرف آ گئے ہیں۔

خدا کی ذات اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کرتی

کائنات کی ہر شے خدا کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق چل رہی ہے' وہ اپنی کسی قوت کو' اپنے کسی منشا کے مطابق نہیں صرف کر رہی بلکہ خدا کے بتائے ہوئے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے صرف میں لا رہی ہے' خدا نے اپنے اختیار و اقتدار کو کسی کو Delegate (تفویض) نہیں کیا یا سونپا نہیں ہے' اقتدار کا سرچشمہ صرف خدا کی ذات ہی ہے' اس میں اُس نے کسی کو شریک نہیں کیا' وہ جذبات جو انسان کو دیئے گئے ہیں ان کو صرف وحی کے تابع صرف کرنا چاہیے۔ یہ عناصر گنائے اور اب آگے کہا ہے کہ **ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (30:30)** دیکھا آپ نے کہ وہ نظامِ خداوندی ہے کیا؟ **فَاَقِمْ وَجْھَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا (30:30)** اپنی تمام توجہات کو مرتکز کرو' قائم کرو' اُس میں کسی قسم کی جھول نہ پیدا ہو' لڑکھڑاہٹ نہ پیدا ہو' لرزشِ خفی تک نہ پیدا ہو کیونکہ توازن برقرار رکھنے کا نتیجہ یہ **فـاقـم** ہوگا۔ یہ وہی قام کا لفظ ہے: جم کر کھڑے ہو جاؤ' توازن برقرار رکھتے ہوئے' اپنے آپ کو مرکوز کرو اس دین کی طرف۔ **حـنیفًا** کے معنی ہوتا ہے کہ ہر طرف سے اپنی توجہات کو ہٹا کر' اسے ہی توحید کہتے ہیں۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کی بات نہیں ہے۔ کائنات کی کوئی شے کسی دوسری طرف نہیں دیکھتی' اُس کے لیے جو منزل مقرر ہے وہ اُس کے اوپر چلی جاتی ہے۔ کسی دوسری طرف نگاہ نہ اٹھے' صرف اُس کی طرف دیکھو' اپنے آپ کو مرکوز کرو۔ اب یہاں آئی وہ آیت۔ **فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ**

النَّاسَ عَلَيۡهَا (30:30) یہ سارے دینِ قیم کے اجزاء بتائے تھے۔

فطرت اللہ کا اور دین قیم کا مفہوم

میں نے عرض کیا تھا کہ عربی زبان میں اور قرآنِ کریم میں **فطر** کے معنی ہیں کہ کسی چیز کو پہلی دفعہ پیدا کرنا۔**فطرت الله** کے معنی اللہ کی فطرت نہیں‘ Nature of God نہیں‘ خدا کی فطرت کا تو تصور ہی باطل ہے۔**فطـرت الله** کے معنی ہیں خدا کا قانونِ تخلیق۔ کہا کہ خدا کا قانونِ تخلیق جو اس ساری کائنات میں کارفرما ہے‘ **فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا (30:30)** انسانوں کو بھی اسی کے مطابق ہم نے پیدا کیا ہے‘ یہ کوئی الگ مخلوق نہیں ہے کہ اس کے لیے کچھ اور قوانین ہیں بلکہ اُسی قانون کے مطابق ان کو پیدا کیا ہے۔**لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ (30:30)** اس کے لیے ہم نے اپنے قانونِ تخلیق کے اندر تبدیلی نہیں کی کہ اس کے لیے کوئی الگ نظام ہو بلکہ وہی نظام ہے جو باقی کائنات کے لیے ہے۔عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا کہ **فِطۡـرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَـلَيۡهَـا (30:30)** کا مفہوم کیا نکلا۔اور ہمارے ہاں اس کا مفہوم یہ لیا گیا کہ اللہ کی فطرت جس کے مطابق انسان کی فطرت بنائی اور اسلام دینِ فطرت ہے۔ یہ سارا کچھ ہے۔فطرت کے یہ معنی نہ عربی زبان میں ہیں نہ قرآنِ کریم میں ہیں۔ بات اوپر سے چلی آ رہی ہے کہ اس ساری کائنات کو ہم نے ان قوانین کے تابع‘ اس نظام کے تابع پیدا کیا ہوا ہے اور یہ ہے **فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا (30:30)** انسانوں کے لیے بھی یہی قانونِ تخلیق ہے۔**لَا تَبۡـدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ(30:30)** اس کے لیے کوئی الگ قانون نہیں ہے۔**ذٰلِکَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ (30:30)** یہ ہے دینِ قیم۔

عزیزانِ من! اب آپ کو بھی معلوم ہو گیا‘ جب دیکھنا ہو کہ نظامِ خداوندی یا دینِ خداوندی کیا ہے یا اسلام کیا ہے تو یہ ہیں دس آیات اس سورۃ الروم کی‘ ان کو دیکھیے۔اور جہاں بھی الدین آئے گا آپ دیکھیں گے کہ وہ انہی عناصر کا مجموعہ ہوگا یا ان میں سے ہی کوئی نہ کوئی عنصر ہوگا۔قرآن کا انداز یہ ہے کہ کہیں وہ ایک چیز بیان کرتا ہے‘ کہیں دوسری چیز بیان کرتا ہے‘ کہیں جامع طور پہ ان کو لے آتا ہے۔ وہ بکھری ہوئی پتیاں ہوتی ہیں‘ یہ اُس کا گلدستہ ہوتا ہے۔**ذٰلِکَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ (30:30)** یہ ہے دینِ قیم۔

دینِ قیم کے برعکس ہمارے ہاں تقلید پرستی کا مروجہ اسلام جو صدیوں سے رائج ہے

مُلّا کہتا ہے کہ سینے پر ہاتھ باندھنا اسلام ہے‘ دوسرا کہتا ہے ہاتھ کانوں تک اٹھانا اسلام ہے‘ تیسرا کہتا ہے ہاتھ زیرِ ناف باندھنا اسلام ہے‘ یہ ہمارے ہاں چلا ہوا ہے۔آپ اندازہ لگائیے۔قرآن کہتا ہے کہ **ذٰلِکَ الـدِّيۡنُ (30:30)** وہ تو الدین ہے‘ دو ہو ہی نہیں سکتے۔فطرت میں کہیں ایک نوع کے لیے دو نظام رکھ دیجیے تو پھر دیکھیے کہ کیا فساد برپا ہوتا ہے۔**ذٰلِکَ الـــدِّيۡـــنُ**

الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (30:30) یہ علم کی بات ہے' تقلید اور جہالت کی بات نہیں ہے۔ انسانوں کی اکثریت ابھی تک آنکھیں بند کیے ہوئے تقلید کی روش کے اوپر چلے جاتی ہے اور یہ جو بات ہم کہہ رہے ہیں یہ تو علم کی بات ہے۔ علم کے بغیر تو ایمان آ ہی نہیں سکتا۔ الدین سمجھ میں ہی نہیں آ سکتا جب تک کہ علم کی بارگاہ سے اس کی سند نہ لی جائے۔ اور پھر علم بھی انسانی علم جو علم ہی کہلائے گا لیکن وہ العلم ہوگا جو وحی خداوندی نے عطا کیا ہے۔ **لَا يَعْلَمُوْنَ (30:30)** میں دونوں علم آ جاتے ہیں۔

اب اگلی آیت میں کہا کہ **مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ (30:31)**۔ یہاں **(30:30)** میں حنیف کہا تھا کہ ہر طرف سے توجہ ہٹا دو' تو یہ تو پھر Negative Aspect (منفی پہلو) ہوا کہ ہر طرف سے توجہ ہٹا لی۔ Positive (مثبت) بھی تو کوئی چیز ہونی چاہیے۔ اس کے لیے کہا کہ **مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ (30:31)** اور توجہ کو اُس کے بتائے ہوئے نصب العین کی طرف مرکوز کر دینا' یہ **اِلی الله** ہے۔ پہلی چیز تو لا الہ ہے کہ یہ بھی نہیں' یہ بھی نہیں' یہ بھی نہیں۔ یہ حنیفًا کی منزلیں ہیں۔ **اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ** [1] **(6:79)** یہ تھا اعلانِ ابراہیمؑ۔ یہ حنیف ہے کہ ہر چیز کو کاٹتا ہوا چلا جاتا ہے کہ یہ بھی نہیں' یہ بھی نہیں۔ پھر اس کے بعد جو **مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ** ہے' وہ **اِلٰی الله** ہے کہ جو نصب العین' جو منزل' جو راستہ اُس نے مقرر کیا ہے کہ جو الدین ہے' اُس کی طرف' خالص اُس کی طرف' توجہ دو۔

دینِ قیم پر پوری اترنے والی قوم کی نظریں ہمیشہ اپنے آشیانہ پر ہوتی ہیں: امتِ مسلمہ کا مقام اقبالؒ کی نظر میں

ٹھیک ہے تمہارے لیے کائنات کے اندر Choices (انتخابات) ہیں' زندگی کے مختلف راستے' مختلف گوشے ہیں' سب میں جاؤ لیکن تمہاری نگاہوں سے وہ منزل نہ اوجھل ہو جائے' وہ نصب العین نہ اوجھل ہو جائے' جو وحی خداوندی نے متعین و مقرر کیا ہے۔ تمہاری نگاہ ہمیشہ اس آشیانے پر رہے۔

کیا بات ہے اقبالؒ (1938-1877) کی! وہ امت کے متعلق کہتا ہے:

---

[1] میں اپنی تمام توجہات کا مرکز صرف اس ذات بے ہمتا کو سمجھتا ہوں جو تمام کائنات کو عدم سے وجود میں لائی (اور جس کا قانون یہاں اس طرح نافذ العمل ہے کہ اس سے نہ ستاروں کو مفر ہے' نہ چاند اور سورج کو مجالِ سرتابی) اس لیے میں اس کے اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کر سکتا۔ یہ میرا دوٹوک فیصلہ ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔305)۔

پرد　در　وسعتِ　گردوں　یگانہ ❶

اس فضائے سماوی کے اندر یہ امت اڑتی رہتی ہے۔ ''یگانہ'' بڑی چیز ہے۔ قرآن نے اس امت کے متعلق کہا ہے کہ **اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ** **(3:139)** تمہارا ہمسر کوئی نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے اقبالؒ نے مومن کے متعلق کہا:

مومنِ　بالائے　ہر　بالا　ترے

جتنی بلندی پہ کوئی ہے یہ اُس سے بھی بالا ہے۔ اور آگے اقبالؒ کہتا ہے کہ

غیرتِ　اُو　برنتابد　ہمسرے

یہ کہ کوئی اُس سے اونچا نکل جائے' اس کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے' اس کی غیرت تو اسے بھی برداشت نہیں کرسکتی کہ کوئی اور انسان اس کے متوازی و ہمدوش بھی چلے کیونکہ یہ اعلون **(3:139)** ہے۔

پَرد　در　وسعتِ　گردوں　یگانہ

وہ وسعتِ گردوں کے اندر سینکڑوں ہزاروں میل پھرتا ہے لیکن

نگاہِ　اُو　بہ　شاخِ　آشیانہ

اس کی اپنی نگاہ آشیانے کی شاخ پہ ہمیشہ رہتی ہے۔ یہ ہے **مُنِيۡبِيۡنَ اِلَيۡهِ (30:31)**. یہ نظام کیا ہے؟ یہ کہ سفرِ زندگی میں تمہارا ہر قدم اُس منزل کی طرف اُٹھے جو خدا نے تمہارے لیے تجویز کیا ہے۔

عزیزانِ من! ایک تشبیہہ ہمارے ہاں کے پرانے شاعر نے بھی دی ہے۔ وہ ایسی تو جامع نہیں ہے جیسی اقبالؒ **(1877-1938)**

---

❶ پَرَدَ در وسعتِ گردوں یگانہ　　نگاہِ اُو بہ شاخِ آشیانہ

(وہ کائنات کی پہنائیوں میں آزادانہ بال کشا ہوتی ہے اور اس کی تگ و تاز اور تلاش و جستجو میں کوئی اور قوم اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی لیکن اس پرواز میں اس کی نگاہ ہمیشہ ''شاخِ آشیانہ'' پر رہتی ہے۔ وہ اپنے تصورات کے نقطۂ ماسکہ (وحی۔ توحید) اور اپنے مرکزِ ملت کو ایک ثانیہ کے لیے بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ اقبالؒ نے ان دو مصرعوں میں اسلام اور مسلمان کی زندگی کا صحیح صحیح نقشہ پیش کیا ہے۔ مسلمان کی زندگی یہ ہے کہ غیر متبدل قوانینِ خداوندی (مستقل اقدارِ حیات) کا پابند رہے اور ان حدود کے اندر زمانے کے تقاضوں کے مطابق' اپنے معاملات کا حل خود دریافت کرتا جائے۔ جو قوم مستقل اقدار کی پابند نہیں رہتی وہ جہانِ فکر و عمل میں (اقوامِ یورپ کی طرح) یکسر آوارہ ہوجاتی ہے اور جو قوم زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ اپنے احوال و کوائف میں تبدیلی نہیں کرتی وہ (مسلمانوں کی طرح) پابند قفس پرندے کی طرح نشو و نما سے محروم رہ جاتی ہے۔ حقیقی زندگی ثبات و تغیر (Permanence and Change) کے صحیح امتزاج میں ہے (پرویزؒ: مجلس اقبال' طلوع اسلام ٹرسٹ' لاہور' 1996' ص۔ 254 نیز 140)

کی تشبیہ ہے:

ہم چوں پرکار ایم پائے درشریعت مستقیم

ہماری مثال تو پرکار (Compass) کی ہے کہ ایک قدم تو ہم نقطے پہ (شریعت پہ) جم کے رکھتے ہیں

پائے دیگر سیرِ ہفتاد و دو ملت کردہ ایم

اور پرکار کا جو دوسرا پاؤں ہے اُس سے ہم افتاد و دوملت کی سیر کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ تشبیہہ ناقص ہے۔ پرکار کا جو دوسرا پاؤں بھی ہوتا ہے وہ محدود دائرے کے اندر رہتا ہے۔ اقبالؒ کی یہ تشبیہہ زیادہ موزوں ہے کہ اس کائنات کے اندر جدھر جی چاہے نکل جائے لیکن شرط ایک ہی ہے کہ ''نگاہ او بشاخِ آشیانہ'' ❶۔ اس لیے کہ کہ **مُنِيبِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ (30:31)** اس بات کی نگہداشت رکھو کہ جہاں جی چاہے چلو پھرو لیکن یہ شاخِ آشیانہ، یہ نصب العین، تمہاری نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔

وہی صلوٰۃ جو ہماری اجتماعیت کا نشاں تھا آج فرقہ پرستی کا نشان بن چکا ہے

عزیزانِ من! اس کے فوراً بعد کہا کہ **وَ اَقِيمُوا الصَّلٰوةَ** ❷ **(30:31)**۔ اب صلوٰۃ ہمارے ہاں نماز بن گئی حالانکہ یہ ایک نصب العین ہے اور کہا ہے کہ اُس کی طرف نگاہ رکھو کسی دوسری طرف نہیں دیکھنا، کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں، کوئی تفرقہ نہیں۔ اس کے لیے صلوٰۃ کہا۔ اور آپ کے ہاں جب یہ نماز بنی تو ایک جگہ دس ہزار آدمی کا مجمع بیٹھا ہوا ہو، مقرر تقریر کر رہا ہو، سب نہایت جذب وانہماک سے سن رہے ہوں اور ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ جونہی مؤذن کی اذان کی آواز کان میں پڑی تو ایک ٹولہ اِدھر، ایک ٹولہ اُدھر، کچھ وہی پنڈال کے اندر نماز پڑھتے ہیں۔ اُس نے الصلوٰۃ کہا تھا کہ تمہارا تفرقہ نہ رہے، **حنیفًا** ہو۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ جب وہ صلوٰۃ نماز بنی ہے تو ویسے کاروبار کے اندر یا جلسے کے اندر کوئی اختلاف کا پتہ نہیں چلتا لیکن جونہی صلوٰۃ کی آواز کان میں پڑی تو ماتھے پہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ یہ وہابی ہے، یہ حنفی ہے، یہ شیعہ ہے، یہ سُنّی ہے، یہ بریلوی ہے۔ اور پھر سب الدین القیم کے مدعی ہیں۔

---

❶ پرواز میں اس کی نگاہ ہمیشہ ''شاخِ آشیانہ'' پر رہتی ہے۔ وہ اپنے تصورات کے نقطۂ ماسکہ (وحی۔ توحید) اور اپنے مرکزِ ملت کو ایک ثانیہ کے لیے بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی (پرویزؒ: مجلس اقبال، طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، 1996، ص۔ 254)۔

❷ اس کے لیے نظامِ صلوٰۃ قائم کرو جس میں ہر فرد بطیبِ خاطر قوانینِ خداوندی کا اتباع کیے چلا جاتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 937)۔

نظامِ صلوٰۃ کے لیے سَبَّح کا قرآنی مفہوم ایک بنیادی حیثیت کا حامل ہے

قرآن کریم نے **اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃ** کہا ہے۔ یہ جو یکسو ہونا ہے یعنی یک نگاہ ہونا' ایک نصب العین کی طرف جانا' ایک منزل کی طرف چلنا' اس کو ایک لفظ سے سمجھا دیا۔ بات تشبیہ کے اعتبار سے اقبالؒ کے الفاظ میں' پرندوں کی چلی آ رہی تھی' بات کائنات کی اشیا کی چلی آ رہی تھی اور اُس کے بعد اُس نے یہ کہا کہ یہ **اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃ** ہے یعنی **ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ** کو سمجھاتا چلا آ رہا ہے اور سمجھاتے سمجھاتے درمیان میں **اقیموا الصلوٰۃ** لے آیا ہے۔ اس سے پہلے جتنی مثالیں اُس نے دی ہیں' وہ کائنات کی اشیا کی دی ہیں۔ **اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُسَبِّحُ لَهٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالطَّیۡرُ صٰٓفّٰتٍ (24:41)**۔**سبح** کے معنی ہوتا ہے کہ ''اپنی منزل یا متعین پروگرام کی طرف' پوری توانائی کے ساتھ' بھاگ کر جانا جیسے گھوڑا سرپٹ دوڑتا ہے یا جیسے وہ تیراکی (Swimming) جو پورا ہاتھ یوں کر کے کی جاتی ہے''۔ اُسے عربی زبان میں **تسبیح** کہتے ہیں۔ کہا کہ کائنات کی ہر شے اُس منزل تک پہنچنے کے لیے' جو اس کے لیے متعین ہے' پوری توانائیاں صرف کرتی ہے اور اُس میں جذب رہتی ہے۔ **(کل)** کائنات کی ہر شے **(قد علم)** جانتی ہے' اچھی طرح سے **(صلاته)** اپنی صلوٰۃ کو جانتی ہے۔ اب بات سمجھ میں آئی کہ پیچھے سے یہ **مُنِیۡبِیۡنَ اِلَیۡهِ وَاتَّقُوۡهُ** بیان کرنے کے بعد **وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃ** کہا تھا۔ اُس نے کہا کہ کائنات کی باتیں ہم کر رہے تھے' دین القیم کی ساری باتیں اس کی مثالوں سے ہم نے سمجھائی ہیں اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ **کُلٌّ قَدۡ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسۡبِیۡحَهٗ (24:41)** ان میں سے ہر شے اپنی صلوٰۃ کو جانتی ہے۔ صلوٰۃ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ''کسی کے پیچھے اس طرح سے چلنا کہ اُس میں اور اس کے درمیان میں فاصلہ نہ رہے لیکن یہ اُس سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اتباع اس قسم کا کہ درمیان میں فصل نہ رہے' احتیاج یہ کہ اُس سے آگے نہ نکلے''۔ اسے عربی زبان میں صلوٰۃ کہتے ہیں اور اس طرح سے ریس کورس میں جو گھوڑا دوسرے نمبر پر جا رہا ہوتا ہے اُسے مصلی کہتے ہیں۔ یہ ملتان اور جھنگ کے لوگ مصلی ''چوہڑے'' (بھنگی) کو کہتے ہیں۔ یہاں قرآن نے کہا ہے کہ **وَاتَّقُوۡهُ وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ (30:31)** وہ الدین القیم جو کائنات کی پہنائیوں میں کارفرما ہے' وہ الصلوٰۃ کی بنیادوں کے اوپر استوار ہے۔ اور اگلے ہی لفظ میں تشریح کر دی کہ **وَلَا تَکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ (30:31)** مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ قوم نے گھڑ کے اس کا ترجمہ بت پرست کیا تو بت پرستی تو ہم کرتے نہیں۔ اگرچہ جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں کہ وہ تو پھر بھی کسی بیٹھے ہوئے یا کھڑے ہوئے بت کی پرستش کرتے تھے لیکن ہم تو لیٹے ہوؤں یعنی مردوں کی بت پرستی کرتے ہیں۔ انہوں نے تو پھر بھی سامنے کوئی شکل وغیرہ بنائی ہوئی ہوتی تھی لیکن یہاں تو چونے مٹی کی قبریں ہی ہیں جن کی ہم پرستش کرتے ہیں۔

کائنات کی کوئی شے بھی خدا کے قانون سے سرتابی اختیار نہیں کرتی یعنی وہ مشرک نہیں

قرآن کریم کہتا ہے کہ **وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ** [1] (30:31)۔ عزیزانِ من! کائنات میں کوئی شے مشرک نہیں ہے۔ وہاں ایک ہی قانون ہے اور اُسی کا اتباع ہے اور اس طرح اتباع ہے کہ **حَنِیۡفًا** ہے کہ نظر اِدھر اُدھر نہ اٹھے۔ اور اُس کے بعد یہ ہے کہ اُس میں اور اس میں کوئی فاصلہ نہ ہو' اُسی راستے کے اوپر چلتا ہوا چلا جائے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ شرک کہتے کس کو ہے؟ یہ ایک مملکت ہے' اس مملکت کا ایک قانون ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ اگر کبھی اُس قانون کی خلاف ورزی ہوجائے' اُسے جرم کہتے ہیں' اُس کی ایک سزا ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ یہاں یہ کہیں کہ میں اس مملکت میں رہتے ہوئے آپ کے قانون کا اتباع نہیں کرونگا' مثلاً میں افغانستان کے قانون کا اتباع کرونگا تو آج کی اصطلاح میں اسے بغاوت کہتے ہیں' قرآن کی اصطلاح میں اسے شرک کہتے ہیں۔ کائنات کی کوئی شے مشرک نہیں ہے' وہ نہ اپنے بنائے ہوئے کسی قانون کے تابع چلتی ہے' نہ اُس کے ہاں یہ ہے کہ خدا کے قانون کو چھوڑ کر کسی اور خدا کے قانون کے اوپر وہ چلنا شروع کردے۔ وہ واحد ہے' وہ توحید پہ ہے۔ آپ دیکھ لیجیے کہ کائنات کی مثالوں سے **ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ** کہاں لیے آ رہا ہے اور اس میں یہ ہے کہ **وَلَا تَکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ** (30:31) اس اتباع واطاعت میں کسی دور کے قانون اور فیصلے کو شریک نہ کرو۔ وہ تو خدائے علیم ہے' ہمارے سینے کے رازوں کا واقف ہے۔ ہمارے سے مراد قیامت تک آنے والے انسانوں کے ہیں۔ اُسے پتہ تھا کہ انہوں نے اس طرح سے فریبِ نفس میں مبتلا ہوجانا ہے کہ مشرک کے معنی انہوں نے بت پرست کر لینا ہے۔

مشرک وہ ہیں جو امتِ واحدہ کے تصور کے برعکس فرقہ واریت کے پیروکار بن جائیں

کہا کہ بتائیں تمہیں کہ مشرکین کون ہوتے ہیں؟ یہ کہ **مِنَ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ وَ کَانُوۡا شِیَعًا** (30:32) یعنی امتِ واحدہ جو ہے' یہ دینِ قیم ہے' اس میں فرقے نہ پیدا کر لینا۔ یعنی ان میں سے نہ ہوجانا جنہوں نے فرقے پیدا کر لیے۔ فرقے پیدا کر لیے اور **کَانُوۡا شِیَعًا** ان میں سے ایک خود بھی بن گئے۔ ساری امت فرقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ یہ **مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ** قرآن نے کہا ہے۔ یہ آیت انہوں نے کبھی آپ کے سامنے نہیں پڑھی' پڑھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ جی' یہ دوسروں کے متعلق ہے۔ اوتمہارے متعلق

---

[1] نظامِ صلوٰۃ قائم کرو جس میں ہر فرد بطیبِ خاطر قوانینِ خداوندی کا اتباع کیے چلا جاتا ہے۔ اس اتباع و اطاعت میں کسی اور کے قانون اور فیصلے کو شریک نہ کرو۔ اس سے' پہلے خود تمہارے اندر وحدتِ فکر و عمل پیدا ہوجائے گی' اور اس کے بعد پوری نوعِ انسانی' اپنے اختلافات کو چھوڑ کر امتِ واحدہ بن جائے گی (2:213)۔ یہی دین کا مقصود ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 937)۔

کیا ہے؟ ''جی او جنت دے وعدے ساڈے متعلق نیں''۔ [1]

دنیا کے تمام جانور اپنی اپنی نوع میں امتِ واحدہ ہیں

قرآن مجید کہتا ہے کہ **مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا** [2] **(30:32)**۔کائنات میں کوئی فرقے نہیں ہوتے: بکریوں میں کوئی فرقہ نہیں ہے کہ ایک فرقہ گھاس کھائے اور دوسرا گوشت کھائے' مرغی کے بچوں میں کوئی فرقہ نہیں ہوتا کہ چند ایک پانی میں چلے جائیں اور چند خشکی کی طرف چلے جائیں' شیروں جتنی قوت رکھنے والوں میں بھی فرقہ نہیں ہوتا' وہ امتِ واحدہ ہوتے ہیں اس لیے کہ وہ ایک کے قانون پہ چلتے ہیں۔

فرقوں کا وجود مختلف فقہوں کا رہین منت ہے

یہ جسے آپ فرقہ کہتے ہیں ان میں سے کسی فرقے کے کسی عقیدے یا مسلک کو لے لیجیے اور اُس کی سند پوچھیے تو کسی نہ کسی شخصیت کے اوپر جا کر وہ رک جائے گی۔ یہ جو باقی فرقے ہیں وہ تو بہرحال فقہ کے اوپر ہوتے ہیں۔فقہ تو ہوتی ہی انسانوں کی بنائی ہوئی ہے۔ وہ تو کہتے ہی ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ [3] کی فقہ' امام مالکؒ [4] کی فقہ' امام احمد بن حنبلؒ [5] کی فقہ ہے' امام شافعیؒ [6] کی فقہ ہے۔ یہ جو اپنے آپ کو کہتے ہیں کہ ہم سنتِ رسول اللہ ﷺ کے متبع ہیں وہ بھی امام بخاریؒ [7] کی فقہ ہے' یہ بھی اُس سے آگے نہیں جاتے۔کوئی اپنے کسی عقیدے اور کسی مسلک کے لیے قرآن کی سند نہیں لاتا۔ جونہی آپ نے قرآن کی سند دی تو آپ منکرِ حدیث ہوگئے' کافر ہوگئے' دائرہ اسلام سے خارج ہوگئے۔قرآن کا نام لینا آج کفر ہے' اس لیے کہ یہ شرک کو مٹاتا ہے۔قرآن نے کہا ہے کہ **مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا (30:32)** ۔عزیزانِ من! سوچیے تو سہی کہ یہ جو **ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ** تھا تو کیا کوئی بھی آپ کو آج اس پر ملتا ہے؟ یہ جو خدا کے دین کے مدعی ہونے کے بعد انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے اوپر

---

1. جی' وہ جنت کے وعدے ہمارے متعلق ہیں۔
2. تم بڑی احتیاط برتنا کہ اس طرح توحید کے پیرو بن کر' پھر سے مشرک نہ ہو جاؤ' یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا' اور اس طرح امتِ واحدہ رہنے کے بجائے مختلف فرقوں میں بٹ گئے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 937)۔
3. امام اعظمؒ (کوفی) (80-150 ھ)
4. امام مالکؒ (یمنی' مدنی) (93-179 ھ)
5. امام احمد بن حنبلؒ (بغدادی) (164-241 ھ)
6. امام شافعیؒ (عسقلانی' مکی) (150-204 ھ)
7. امام محمد اسمٰعیل بخاریؒ (بخارا) (194-254/260 ھ)

چلتے ہیں تو کیا یہ کبھی دینِ قیم ہوسکتا ہے؟ امتِ واحدہ میں فرقے کیوں ہیں؟ وہ اس لیے کہ مختلف انسانوں کے قوانین پہ چل رہے ہیں۔

یہ فقہ بندی مملکتِ خداوندی میں بغاوت کے مترادف ہے

عزیزانِ من! یہ مملکتِ خداوندی میں بغاوت ہے' یہ خدا کی مملکت میں خدا کے علی الرغم انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے تابع عمل کر رہے ہیں۔ شرک کا لفظ تو چھوڑ دیجیے' یہ خدا کے خلاف بغاوت ہے کہ ہم تمہیں حاکمِ مطلق نہیں مانتے بلکہ فلاں امام کو مانتے ہیں۔ یہ بغاوت ہے۔ شرک کے معنی ہی بغاوت کے ہیں۔ **مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا (30:32)** انہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور خود بھی پھر ایک گروہ بن گئے۔

آخر فرقہ واریت کے اس شرک کو مٹانے کا کیوں خیال پیدا نہیں ہوتا؟

کہا کہ پھر یہ کیسے ہوتا ہے؟ مختلف عقائد' مختلف مسالک کے بارے میں کیوں تجسس پیدا نہیں ہوتا کہ پرکھ کر دیکھ لیں کہ کونسا ٹھیک ہے اور کونسا غلط ہے؟ اس کے لیے کہا کہ انسان کی نفسیاتی کیفیت ایسی ہے کہ جب یہ کسی ایک مسلک کو' عقیدے کو' اختیار کر لیتا ہے تو پھر **كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (30:32)** ہر ایک اس میں مگن ہو جاتا ہے کہ ہم جس مسلک کے اوپر ہیں' یہی ایک سچا ہے اور باقی جھوٹے ہیں۔

فرقہ واریت کی اس مہلک بیماری سے نجات حاصل کرنے کا طریق

یہ جو **بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ** ہے' یہ ہے بنیاد فرقوں کے مستحکم رہنے کی کہ یہ ٹوٹنے نہیں پاتے۔ اگر کبھی یہ تجسس پیدا ہو جائے کہ بھئی! اس پہ تو سرِ دست میں پابند رہتا ہوں لیکن کچھ دیکھ تو لوں' تحقیق تو کر لوں کہ یہ ٹھیک ہے یا کوئی دوسرا بھی ٹھیک ہے۔ کبھی یہ تجسس پیدا ہو جائے تو ہوسکتا ہے کہ انسان کسی دوسرے کو بھی دیکھ لے کہ وہ زیادہ سچا ہے یا ہم۔ تو پھر ہوسکتا ہے کہ اس پہ انسان پہنچ جائے کہ صاحب! بغیر فرقوں کے دینِ قیم کی زندگی بسر کرنا اسلام ہے۔ پھر میں ''میں'' کو بیچ میں لے آؤنگا۔ یہ جو فقیر آپ کے سامنے ❶ کھڑا ہے' یہ اسی راستے سے یہاں پہنچا ہوا ہے۔ میرا تعلق کسی فرقے سے نہیں ہے' میرا اپنا کوئی فرقہ نہیں ہے لیکن چونکہ ان کے ذہن میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی اس لیے آپ نے ان کی زبانوں سے ایک فرقۂ پرویزی بھی سنا ہوگا۔ فرقہ پرویزی کا تو کوئی وجود نہیں البتہ فرقۂ پروازی ہے' کوئی ہوائی سی بات ہے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ جس شخص کی عمر یہ کہتے ہوئے گزر گئی کہ دین میں تفرقہ شرک ہے کیا وہ فرقہ پیدا کر لے گا؟ نہیں' قطعاً نہیں۔

---

❶ یہ اشارہ پرویزؒ کا اپنی طرف ہے۔

فرقہ پیدا کرنا خدا کے ساتھ بغاوت ہے

عزیزانِ من! یہ کپکپا دینے والی بات ہے کہ یہ جو فرقے کی طرف نسبت ہے' یہ خدا کے ساتھ بغاوت ہے۔ آپ میں یا مجھ میں یہ توفیق تو نہیں کہ ہم ایسا معاشرہ یا ایسی مملکت قائم کرلیں کہ جس میں فرقے کا وجود نہ ہو' دینِ حنیف ہو' منیبین الیہ ہو' و اتقوا ہو' اقیموا الصلوٰۃ ہواور امتِ واحدہ ہو لیکن کم از کم اتنا تو ہو کہ اپنی ذات تک تو یہ کرے کہ میں اس شرک سے مبرا ہوں۔ عزیزانِ من! اتنا تو کر لیجیے۔ سوال تو یہاں یہ ہوتا ہے کہ آپ کون ہیں؟ جی میں مسلمان ہوں۔ ''کیہڑے مسلمان ہو''۔ [1] جی سنی مسلمان ہوں۔ ''کیہڑا سنی مسلمان''۔ [2] جی وہ اہلِ فقہ مسلمان ہوں۔ ''کیہڑی فقہ دا مسلمان''۔ [3] جی وہ فقہ حنفی کا مسلمان۔ ''فقہ حنفی وی تے دو ہیگے نیں' دیوبندی ہو یا بریلوی''؟ [4]

شرک تو کسی ایک جگہ رہتا ہی نہیں

عزیزانِ من! انسان رکتا ہے تو توحید کے اوپر کہ دوسرا نام آتا ہے تو شرک ہوتا ہے اور جب آپ شرک میں آ جائیں تو آپ کے ہزاروں معبود ہوتے ہیں' پھر آدمی کسی جگہ پہ نہیں رکتا۔ جب شرک ہی اختیار کرلیا تو پھر چل سو چل والی بات ہوگئی۔ قرآن کہتا ہے کہ **كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ** [5] (30:32) یہ ہے اس کا حال کہ تجسس' تحقیق' تنقید کا مادہ نہیں رہا۔

بٹالہ شہر میں مذہبی مناظراتی ماحول اور ذاتی تحقیق و تجسس کا نتیجہ: پرویزؒ

عزیزانِ من! زندگی کے آخری دن ہیں' یہ چیزیں جو اپنے ذاتی تجربے کی کہہ دینے کی ہیں' کہہ دوں۔ صرف یہ ایک تحقیق اور تجسس کی بات میرے اندر تھی جو مجھے اس مقام تک لے آئی ہے ورنہ ایک ٹھیٹھ قدامت پرست گھرانے کے اندر پیدا ہوا تھا۔ تصوف میں ڈوبا ہوا گھرانہ' میرے دادا کی آغوش میں میری تربیت ہوئی اور میری عمر کا آدھا حصہ اس طرح سے گزرا۔ بٹالہ میرا شہر تھا اور وہاں ہر فرقہ تھا۔ وہ عجیب قسم کا شہر تھا اور قادیانیوں کے لیے تو کہا کرتے تھے کہ یہ جدہ ہے۔ وہ جدہ اس لیے تھا کہ اُس

---

1. کونسے مسلمان؟
2. کونسا سُنّی مسلمان؟
3. کس فقہ کا مسلمان؟
4. فقہ حنفی بھی تو دو ہیں۔ دیوبندی ہو یا بریلوی؟
5. فرقوں میں بٹ جانے کے بعد حالت یہ ہوجاتی ہے کہ ہر فرقہ سمجھتا ہے کہ جس طریق پر ہم چل رہے ہیں' وہی حق و صداقت کی راہ ہے اس لیے وہ اپنے آپ میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 937)۔

زمانے میں ریل قادیان نہیں جایا کرتی تھی بلکہ بٹالہ تک ہی رہتی تھی۔ اور ہماری کیفیت یہ تھی کہ اسکول سے چھٹی ملی ہم نے بستے وغیرہ ادھر رکھے اور اسٹیشن پہنچ گئے۔ اسٹیشن پہ ایک ہی گاڑی آیا کرتی تھی اور ہمیں پتہ تھا کہ کب آتی تھی۔ یہ جب بھی اُس میں سے اترے اور ہم کراماً کاتبین کی طرح دائیں بائیں ہو لیتے تھے۔ وہاں سے قادیان کے لیے جو تانگہ ملتا تھا اُس کا ایک میل کا فاصلہ تھا اور مجبوراً ان کو پیدل چلنا پڑتا تھا۔ وہ چل رہے ہیں اور ہم ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ مناظرے کی کیفیت یہ تھی۔ ہم قادیان میں جا کر جلسے کیا کرتے تھے' ہم نے یونین بنائی تھی جو قادیان میں جا کر جلسے کیا کرتی تھی۔ پھر شیعوں کے ساتھ مناظرہ' وہابیوں کے ساتھ مناظرہ' دوسرے مسلک کے ساتھ مناظرہ۔ اس طرح سے جو شخص مذہب پرستی کے تقدس کے اندر ڈوبا ہوا ہو تو اُس میں سے نکل آنا کس قدر مشکل تھا۔ مجھ میں صرف ایک چیز تھی کہ تنقید کا مادہ تھا کہ جب تک میں خود مطمئن نہ ہو جاؤں' میں اُسے تسلیم نہیں کرتا تھا۔ جو ابتدائی دور تھا' اُس میں تو دادا وغیرہ کا' سب کا' سایہ سر پہ تھا اس لیے زبان پہ نہیں لاتا تھا لیکن اندر یہ ایک خلش کی سی چیز تھی۔

انسانی سوچ کی نشو ونما کے لیے غور وفکر کی آبیاری کرنا ضروری ہے

یاد رکھیے' ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے تنقید کا مادہ' تجسس کا مادہ۔ اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس چیز سے نوازا ہے تو اسے مرنے نہ دیجیے' اسے زندہ رکھیے' اجاگر کیجیے اور آگے بڑھائیے۔ لیکن پھر آگے چل کر تنقید و تجسس کی اس کشتی کے لیے کوئی ایک لنگر ہونا چاہیے۔ اُس نے کہا ہے کہ **كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (30:32)** جو بھی اُن کے پاس ہے وہ اُس پہ مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ معلوم کیسے ہو کہ ان میں سے کونسی چیز سچی ہے اور کونسی غلط ہے۔ ہر ایک تو اپنے آپ کو سچا کہتا ہے۔ مناظروں سے یہ بات ہزار برس سے طے نہیں ہو سکی۔ عزیزانِ من! مناظروں سے یہ طے نہیں ہو سکا کہ رمضان میں آٹھ تراویح پڑھنی ہیں یا بیس پڑھنی ہیں۔ وہ اس لیے نہیں طے ہو سکا کہ **كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ** بھی ہے ہر ایک اُس پہ مگن ہے۔ عزیزانِ من! پہلی شرط یہ ہے کہ اُس میں مگن نہ رہے۔ قرآن ساری دنیا کو چیلنج دیتا ہے کہ **هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (2:111)** اگر اپنے دعوے میں سچے ہو تو دلیل لاؤ' میں بھی دلیل پیش کرونگا۔ عزیزانِ من! **بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ** سے نکلنے کے بعد وہ کونسی چیز ہے جس کو آپ دلیل کہیں گے۔ یعنی اس کے لیے انسانوں کے پاس جو کچھ ہے وہ تو معیار ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ تو ہر انسان اپنے آپ کو کہتا ہے کہ میں سچا ہوں۔ انسانوں سے باہر کوئی چیز ہونی چاہیے' Objective Standard (خارجی معیار) ہونا چاہیے' کہ جس پہ سارے جا کر اپنے اپنے مسلک پہ پہنچیں۔ بازار میں دوکانداروں کے جو یہ باٹ ہوتے ہیں' وہ جو انسپکٹر آتا ہے وہ کہتا ہے کہ یہ غلط ہے' یہ جھوٹا ہے تو وہ کیسے ثابت کرتا ہے؟

جھوٹے اور سچے کو پرکھنے کے لیے ایک معیار کا ہونا ضروری ہے

اُس کے پاس ایک Standard Weight (معیاری وزن/باٹ) ہوتا ہے' وہ دوکانداروں کے باٹوں میں سے نہیں ہوتا بلکہ خارج میں ہوتا ہے وہ اُس کے ساتھ تول کر ایک ایک باٹ کو بتا دیتا ہے کہ یہ ٹھیک یا غلط ہے۔ وحی کی ضرورت اس لیے ہے کہ انسانی فکر کی پیدا کی ہوئی جو شے ہوگی وہ جو اُس فکر کا خالق ہوگا' جو اُسے مانے گا وہ اسی کو سچا مانے اور وہ جذباتی چیز ہوگی' وہ تنقید نہیں کرے گا۔ ایک خارجی اسٹینڈرڈ (معیار) ہونا چاہیئے' یہ وحی Objective Standard (معروضی معیار) ہے۔

قرآنِ حکیم کو اپنا امام تسلیم کیے بغیر فرقے ختم نہیں ہو سکتے

وحی کی خصوصیت یہ ہے کہ **مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (53:3)** یہ رسول کی اپنی فکر کی تخلیق نہیں ہے بلکہ یہ **منزل من الله** ہے۔ یہ ہے ایک اسٹینڈرڈ' فرقے مٹنے کا طریقہ' یہ ایک اسٹینڈرڈ ہے۔ سچ اور جھوٹ کے پرکھنے کا جو معیار ہے' وہ اپنا اپنا مسلک نہ رکھا جائے بلکہ قرآن کو رکھا جائے۔ جو اس کے مطابق صحیح نکلتا ہے اُس کو سچا مانا جائے' جو اس کے خلاف جاتا ہے اُس کو غلط قرار دے دیا جائے۔ اور چونکہ اس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ مجھ میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے اس لیے یہ دو متضاد چیزوں کو سچا قرار نہیں دے سکتا۔ جسے یہ سچا قرار دے گا وہ واحد ہوگی اور جو اُس کے پیروکار ہو جائیں گے وہ امتِ واحدہ بن جائیں گے۔ لیکن جب تک ہم مشرکین میں سے رہیں گے تو اس طرف آ ہی نہیں سکتے۔

عزیزانِ من! **ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّم** یعنی ایک امت جس میں کوئی تفرقہ نہیں' ایک نظریۂ زندگی جس میں کوئی تفریق اور اختلاف نہیں' کوئی فرقہ نہیں' کوئی الگ الگ قوانین نہیں' ایک مملکتِ خداوندی اور اُس کے اندر ایک ہی خدا کا قانون ہے جو جاری و ساری ہے۔ تمام وہاں کے رہنے والے وہ ہیں جنہوں نے اُس مملکت کو مملکت تسلیم کیا ہے۔ اُس قانون کے ماننے والے' اتباع کرنے والے ایک امت امتِ واحدہ ہیں۔ یہ ہے **ذلک الدین القیم**.

خدائے رحمٰن کی تخلیق کردہ کائنات میں اختلاف تو کیا اس میں تو کہیں دراڑ نہیں' درز بھی نہیں

عزیزانِ من! خدائے رحمٰن کی تخلیق کردہ کائنات اور اس کے کائناتی قانون کے اندر اختلاف نہیں ہے۔ بڑی چیز جو قرآن نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ **تَبٰرَكَ الَّذِىْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ** [1] **(67:1)**۔ پھر اگلی ہی آیات میں کہا

---

[1] وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں تمام کائنات کا اقتدار ہے کس قدر فراوانیوں اور خوشگواریوں کی مالک اور ثبات و استحکام اور نشو و ارتقا عطا کرنے کی ضامن ہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ہر شے کے اندازے' اور پیمانے (قوانین) مقرر کر رکھے ہیں جن پر اسے پورا پورا کنٹرول ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1338)

کہ **الَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ** (67:3) خدا کی جو تخلیق ہے اس میں خدا کا قانون کارفرما ہے؛ جاؤ اور اُس میں دیکھو۔ اختلاف تو ایک طرف اس میں تفاوت بھی تمہیں کہیں نظر نہیں آئے گا۔ اختلاف تو بڑی چیز ہوتی ہے وہ تو بیّن نظر آتا ہے۔ تفاوت ہوتا ہے کہ ملتی جلتی ہوئی چیز ہوتی ہے اُس میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے۔ اس کے لیے کہا کہ **مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ** [1] (67:3)۔ یہ بات نہیں کہ ہم نے کہہ دیا اور تم نے مان لیا۔

انسان کی نگاہ اس کارخانہ قدرت میں کہیں کوئی کمزوری یا کمی محسوس نہیں کر سکے گی

اس کا طریقہ یہ ہے کہ **فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ هَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ** (67:3) اپنی نگاہ کے پرندے کو کاشانۂ چشم سے باہر نکال کر اس فضا میں پھینکو؛ نگاہ سے کہو کہ ایک ایک چیز کو جاؤ؛ دیکھو؛ بھالو؛ پرکھو؛ **هَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ** (67:3) اور اس سے پوچھو کہ کہیں تمہیں اس کے اندر کوئی سلوٹ بھی نظر آئی ہے۔ **ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ کَرَّتَیۡنِ** (67:4) پھر اس کو بھیجو کہ شاید پہلے غلطی لگ گئی ہو۔ دیکھا کہ سچے کی جرأت کتنی ہوتی ہے کہ پھر اس کو بھیجو۔ **یَنۡقَلِبۡ اِلَیۡکَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِیۡرٌ** (67:4) بار بار بھیجو؛ ہزار بار بھیجو؛ نگاہ تھک جائے گی لیکن کائنات میں کوئی اختلاف نظر نہیں آئے گا۔ واماندہ و درماندہ نگاہ واپس آ جائے گی لیکن اس میں کوئی اختلاف نظر نہیں آئے گا۔ [2] یہ ہے **ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ** (30:30) ۔عزیزانِ من! یہ ہے دینِ قیم جو قرآن نے دیا ہے۔ یہ ہے تو آپ اُسے اسلام کہیں گے۔ اگر یہ نہیں ہے؛ تفرقہ ہے؛ اختلاف ہے؛ تفاوت ہے تو اسلام نہیں ہے؛ شرک ہے۔

سورۃ الروم کی آیت 32 تک ہم آ گئے؛ 33 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ؕ

❀❀............❀❀............❀❀

---

[1] تم یہاں سے وہاں تک دیکھ جاؤ۔ تمہیں خدائے رحمان کی تخلیق کردہ کائنات میں کہیں بے ترتیبی یا عدم تناسب نظر نہیں آئے گا (پرویزؒ: مفہوم القرآن؛ ص۔1339)۔

[2] ان آیات کی مکمل تشریح و توضیح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 29 (مکمل)؛ ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ؛ لاہور؛ 2006؛ ص ص۔33 تا 43۔

چھٹا باب : سورۃ الروم (آیات 33 تا 39)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج ستمبر 1979ء کی 21 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الروم کی آیت 33 سے ہو رہا ہے:

(30:33)

نوعِ انسانی کے لیے دینِ خداوندی خارجی کائنات کی مانند متوازن و متناسب بھی ہے اور محکم بھی

موضوع مسلسل چلا آ رہا ہے۔ تجدیدِ یادداشت کے لیے یہ عرض کردوں کہ قرآن نے یہ کہا تھا کہ **ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ** (30:30) یہ ہے انسانوں کے لیے محکم نظامِ زندگی جسے الدین کہا گیا ہے۔ وہ الدین کیا تھا جسے کہا گیا ہے کہ وہ خود قائم ہے اور تمہیں قائم رکھنے کا ذریعہ ہے' متوازن ہے' متناسب ہے' اُس میں اعتدال ہے' لغزش نہیں' لرزش نہیں' لڑکھڑاہٹ نہیں۔ بات یہاں سے شروع ہوئی۔ کہا کہ اس خارجی کائنات میں دیکھیے۔ سما میں تیرنے والے یہ بڑے عظیم الشان کُرّے ہیں' یہ اختلافِ لیل و نہار ہے' یہ تکویرِ شمس و قمر ہے' یہ خزاں اور بہار کے موسم ہیں' اِس تمام کائنات کا ایک ایک ذرہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ یہ سب

قانون کے تابع زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اسی لیے اس میں کوئی اختلاف نہیں، تفاوت نہیں، جھول نہیں، سلوٹ نہیں کیونکہ یہ قانون کی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں، قانون کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ الدین القیم میں پہلی بات تو یہ آ گئی کہ یہ قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا ہے۔ اگلی بات یہ کہی کہ یہ قوانین ان کے اپنے بنائے ہوئے نہیں ہیں بلکہ منزل من اللہ ہیں، خدا کی طرف سے دیئے گئے ہیں۔ تم دیکھو کہ اس کائنات کا سلسلہ کس حسن وخوبی اور نظم ونسق سے چل رہا ہے۔

مادی کائنات کا ایک ایک ذرہ انسانی زندگی کی ارتقائی منزل کی شہادت ہے

پھر اگلی چیز یہ ہے کہ اس کائنات کے اندر سلسلۂ ارتقا جاری ہے۔ ہر شے پہلے دن سے بنی بنائی ہوئی، تکمیل تک پہنچی ہوئی نہیں ہوتی، ایک لائف سیل جو Naked Eye (صرف خالی آنکھ) سے نظر بھی نہیں آتا، وہ کروڑ در کروڑ، ارب در ارب سالوں سے ارتقائی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے اور بالآخر جا کر ان شکلوں پہ آ جاتا ہے جس کو انسان کہتے ہیں۔ یہ ہے الدین القیم۔ پھر اگلی آیت میں یہ کہا تھا کہ خدا نے اپنے اختیارات کسی کو تفویض (Delegate) نہیں کیے، انہیں سونپ نہیں دیئے کہ لو بھئی! تم اب ان قوانین کو چلاؤ، ہم آرام سے بیٹھتے ہیں۔ الدین القیم کو دیکھتے چلے جایئے۔ اور اُس کے بعد کہا کہ انسان بھی اُسی طریقۂ تخلیق کے مطابق پیدا کیا گیا ہے جس کے مطابق کائنات کی تمام اشیا ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ کائنات کی اشیا کو اختیار اور ارادہ نہیں دیا گیا، ان کے سامنے Two Possibilities (دوممکنات) نہیں ہوتیں، ایک ہی قانون ہوتا ہے اور اُس پہ چلنے کے لیے وہ مجبور ہوتے ہیں، اُس قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے کو ان کی فطرت کہتے ہیں۔

خدا تعالیٰ نے انسان کو فطرت کی قید سے آزاد کرتے ہوئے اختیار وارادہ کی نعمت سے نوازا ہے

انسان کی کوئی فطرت نہیں ہے، اسے اختیار دیا گیا ہے، دو راستے دکھا دیئے گئے ہیں۔ یاد رکھیے! جب بھی Two Possibilities (دوممکنات) سامنے آئیں گی تو وہ انسان ہوگا۔ اس کے نظام کے اندر بھی جب اس کے سامنے کوئی Possibility (امکان) نہیں رہے گی ایک ہی بات اس سے منوائی جائے گی تو یہ حیوان کی سطح کے اوپر آ جائے گا۔ لیکن کہا کہ یہ چوائس (اختیار) ہی کی تو بات ہے کہ جس سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر اپنے جذبات، اپنی مفاد پرستی، اپنی اغراض کے مطابق یہ اپنا چوائس (اختیار) Exercise (اختیار) کرے گا تو تباہی ہے۔ اور اگر ہر فرد، ہر گروہ، ہر ملک یہ کرنے لگ جائے تو تباہی ہے، ٹکراؤ ہے، بربادی ہے۔ اس کا علاج کیا ہے؟ اس کا علاج وہی ہے جو کائنات میں ہے کہ خدا کے بنائے ہوئے قوانین کے تابع اپنے اختیار کے ماتحت زندگی بسر کرنا۔ اور یوں فرق آ گیا۔ اس راستے کو خود انتخاب کرنا کہ خدا کے بنائے ہوئے قوانین کے تابع

میں زندگی بسر کرونگا۔ یہ ہے الدین القیم۔

خارجی کائنات نے اپنے ہاں خودساختہ فقہی نظام سے آزادی حاصل کر رکھی ہے

اگلی چیز نظامِ کائنات میں یہ ہے کہ یہ نہیں ہے کہ اُن میں کسی نے کسی ایک کا قانون اختیار کیا ہو' دوسرے نے کسی دوسرے کا اختیار کیا ہو' یہ فقہ حنفی پہ چل رہا ہو اور وہ فقہ مالکی پہ چل رہا ہو۔ وہاں تو تمہیں یہ چیز نظر نہیں آئے گی' وہاں تو تمہیں صرف قوانینِ خداوندی نظر آئیں گے۔ کہا کہ دیکھنا اگر تم نے اپنے لیے یہ طے کیا ہے کہ ہم نے ان قوانین کے تابع چلنا ہے تو پھر کسی دوسرے کے قانون کو اس کے ساتھ شریک نہیں کرنا۔ جونہی تم نے یہ شرک کیا تو ٹکراؤ پیدا ہوگا اور فساد ہی فساد برپا ہوگا: **وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ (30:31-32)**۔ عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں کہ دینِ قیم کس طرح سے بیان کیا جا رہا ہے۔ نظامِ مصطفیٰ' دینِ خداوندی' شریعتِ الٰہیہ تو یہ **اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ (53:23)** یہ کچھ نام ہیں' کچھ اصطلاحات ہیں جو تم نے اور تمہارے بڑوں نے وضع کر رکھی ہیں۔ یہ نہیں بلکہ الدین القیم یہ ہے جو اس نے بتایا ہے۔ کہتا ہے کہ اس کو اختیار کرنا ہے تو پھر یہ بھی یاد رکھو۔ جو ارتقا کا نظریہ ہے اور اب تو نظریہ نہیں ہے بلکہ حقیقت کے طور پہ سامنے آ گیا ہے' اُس کی ایک بنیادی چیز Struggle for Existense ہے جہد للبقا یعنی زندہ رہنے کے لیے جدوجہد ہے۔

لفظ ''ابتلا'' کا قرآنی مفہوم

قرآن اس کے لیے ایک عجیب لفظ استعمال کرتا ہے جسے **ابتلاء** کہا جاتا ہے اور ہم نے اُس کا ترجمہ آزمائش کیا اور اُس کے بعد پھر اُسی راستے کے اوپر پڑ گئے۔ دین مذہب میں بدلا اور ہم نے کہا کہ اللہ کی طرف سے آزمائش ہوتی ہے۔ یعنی وہ دیکھتا ہے کہ تم کیسے ہو۔ یعنی اُسے پتہ نہیں ہے۔ **ابتلاء** یہ نہیں ہے بلکہ **ابتلاء** کے معنی ہوتے ہیں ''اپنے آپ کو ٹیسٹ کرنے کے لیے مواقع بہم پہنچانا''۔ بیماری اس بات کے لیے ہوتی ہے کہ ٹیسٹ کیا جائے کہ اس مریض کے اندر قوتِ مدافعت کتنی ہے' یہ اُس کی قوتِ مدافعت کا ٹیسٹ ہوتا ہے۔

خواہ کوئی قوم ہو یا کوئی Species (انواع) ہوں' آگے وہی بڑھتی ہے جس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہو

یہ ابتلاء مقابلے میں' ٹکراؤ میں' اپنے آپ کو ٹیسٹ کرنا ہے' یہ آزمائش خدا نہیں کرتا بلکہ وہ تمہیں موقعہ بہم پہنچاتا ہے کہ تم اپنی آزمائش کر کے دیکھ لو کہ تمہارے اندر قوتِ مدافعت کتنی ہے۔ جو بھی راستے میں رکاوٹ آئے گی اگر اُس ٹکراؤ میں غالب آنے کی بات ہے تو زندہ بھی رہو گے اور آگے بھی بڑھو گے۔ یہ قانون ہے' یہ دینِ قیم ہے۔ فطرت میں یہ چیزیں جو آج نظر آ رہی ہیں' یہ

وہی ہیں جو مختلف مراحل پر جب ٹکراؤ آیا تو اُس ٹکراؤ میں ان کی اپنی قوتِ مدافعت غالب آ گئی' وہ جو راستے کی رکاوٹ تھی وہ ہٹ گئی' وہ زندہ رہا اور اُس کے بعد ایک قدم آگے بڑھا۔ یوں بڑھتے ہوئے یہ جو اشیا آج نظر آتی ہیں' یہ اس طرح سے ہیں۔ اس دوران میں اس راستے میں لاکھوں کروڑوں اربوں ایسی Species (انواع) تھیں جن کا آج پتہ بھی نہیں چلتا۔ وہ جو ان کے پنجر اور ڈھانچے ملتے ہیں تو وہ نشان دیتے ہیں کہ یہ بھی کبھی Exist (زندہ رہا) کرتی تھیں۔ یہ کونسی چیزیں تھیں؟ یہ وہ تھیں جو ٹکراؤ میں پوری نہ اتریں۔ کہا کہ انسانوں کی بھی یہ کیفیت ہے کہ یہ کبھی کبھی ہمارے قوانین کے اوپر آ تو جاتے ہیں لیکن کیفیت یہ ہوتی ہے کہ **وَ اِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ** [1] (30:33) جب ان کے اوپر کوئی کسی قسم کی نامساعد چیز آتی ہے' مصیبت آتی ہے' تو اُس وقت تو ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ خدا یاد آتا ہے:

جب کیا تنگ بتوں نے تو خدا یاد آیا

انسانی سوچ کی کم ظرفی

جب اُس کی طرف سے کوئی آسائشیں مل جاتی ہیں تو پھر وہ کہتے ہیں کہ جناب! میں نے یہ کیا' میں ان کے پاس گیا اور انہوں نے میری مدد کی۔ یعنی اب جو سارا کریڈٹ ہے یا تو خود لیے چلا جا رہا ہے یا وہ جو ساتھ والے ہیں' ان کو دیئے چلا جا رہا ہے۔ وہ جو قانون کی بات تھی' وہ ختم ہوگئی۔ وہ یہ کیوں کرتا ہے؟ یہ کیوں نہیں کہتا کہ **بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ** (30:34) ہم نے انہیں دیا تھا۔ یہ ہے اصل میں اس کیوں کا جواب۔ ہم نے جو کچھ دیا تھا بجائے اس کے کہ یہ کہے کہ یہ بات ٹھیک ہے کہ یہ خدا کا دیا ہوا ہے' اُس کے قانون کے مطابق میسر آیا ہے۔ یہاں کہا کہ اگر وہ کہے کہ خدا نے دیا ہے تو پھر خدا کے کہنے کے مطابق اُسے صرف کرنا پڑے گا۔ اب قرآنِ کریم کہتا ہے کہ **لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ** [2] (30:34)۔ کفر کے معنی ہوتا ہے کہ ''کسی چیز کو چھپا کے رکھنا''۔ کفرانِ نعمت کرنا جس کا ترجمہ ہم نے ناشکری کر دیا تو اس سے بات ہی سمجھ میں نہیں آتی۔ کہا کہ اُس وقت کیفیت یہ ہوتی ہے کہ **لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ** (30:34) جب ہماری طرف سے ملتا ہے اُس کو چھپا کر رکھ رہا ہے۔ کہا کہ کوئی بات نہیں۔ **فَتَمَتَّعُوْا** (30:34)

---

[1] جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنی تمام توجہات کو خدا کی طرف مرکوز کر کے اُس سے دعائیں مانگتے ہیں' اور جب اس کی طرف سے سامانِ کشائش مل جاتا ہے' تو ان میں سے ایک گروہ اپنے نشو ونما دینے والے (خدا) کے اقتدار واختیار میں دوسروں کو بھی شریک کرنے لگ جاتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 937 تا 938)۔

[2] اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اسے دبا اور ڈھانپ کر' اپنے لیے مختص کرلیں اور اس طرح کفرانِ نعمت کریں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 938)۔

ٹھیک ہے چھپا کر رکھو' اپنی ذات کے لیے رکھو' اپنے آپ کے لیے رکھو' اپنے اوپر خرچ کرو اور یہ سمجھو ہی نہیں کہ اس میں کسی اور کا حق بھی ہے۔ اُس نے تو یہ اس طرح سے صرف کرنے کے لیے دیا تھا۔ یہ تو یوں سمجھو کہ میں تو پوسٹ مین تھا جو منی آرڈر کے روپے لے کر وہاں سے چلا تھا کہ ہر ایک کو اُس منی آرڈر کے مطابق بانٹتا چلا جاؤں' میرا حصہ تو اُس میں وہ تنخواہ ہے جو اُس نے مقرر کی تھی۔ یہ ہے قانون۔ اب تم نے یہ نہیں کیا اس لیے ایسے لوگوں سے کہہ دو کہ تم اس سال سامانِ زندگی سے کچھ وقت کے لیے فائدہ اٹھا لو **فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ** [1] (30:34)۔ یہ بات نہیں ہے کہ کوئی اوپر چیک کرنے والا نہیں ہے۔ یہاں **سوف** کا لفظ آیا ہے۔ مُلّا کے نزدیک تو سوف آتا ہی نہیں ہے' ان کے ہاں عربی زبان میں ہی نہیں ہے۔ **سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ** (30:34) کے معنی ہوتا ہے کہ ابھی معلوم ہو جائے گا' جلدی معلوم ہو جائے گا' ابھی یہ بات سامنے آ جائے گی' بات یہیں سامنے آ جائے گی۔ بس تم **فَتَمَتَّعُوۡا** (30:34) ٹھیک ہے چار دن کے لیے عیش اڑاؤ' پھر دیکھو کہ بات کیسے سامنے آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ **لِیَکۡفُرُوۡا بِمَاۤ اٰتَیۡنٰهُمۡ** (30:34) ہمارا جو دیا ہوا ہے یہ اُس کو چھپا چھپا کر رکھتا ہے۔

انسان ضرورت سے زیادہ جو کچھ چھپاتا ہے اس کی سند قرآنِ حکیم میں نہیں ملتی

یاد رکھو! جو لوگ ہمارے قانون اور اقتدار میں دوسروں کو بھی شریک سمجھتے ہیں' وہ یہ کچھ اپنے خود ساختہ تصورات کے مطابق کرتے ہیں! ان سے صرف یہ پوچھو کہ **اَمۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡهِمۡ سُلۡطٰنًا فَهُوَ یَتَکَلَّمُ بِمَا کَانُوۡا بِهٖ یُشۡرِکُوۡنَ** (30:35) یہ جو تمہاری روش ہے کہ جسے ہم نے ربوبیتِ عالمینی کے لیے دیا تھا' اُسے جو تم سمیٹ کر اپنے لیے رکھتے ہو' اور پھر اُس کو ڈھانپتے ہو' چھپاتے ہو' تو کیا اس کے لیے ہماری طرف سے تمہارے پاس کوئی سند ہے؟ اُس کی طرف سے سند ہونی چاہیے' فقہ کے قوانین نہیں ہونے چاہئیں' وہ تو تمہارے اپنے بنائے ہوئے ہیں۔ دین قیم میں پہلی چیز ہم نے یہ دیکھی ہے کہ کائنات کی کسی شے نے خود وہ قانون نہیں بنائے جن کے اوپر وہ چل رہی ہے۔ جونہی خود ساختہ قوانین کی بات آ گئی تو وہ جو نظام اور دینِ قیم ہے' وہ ختم ہو گیا۔ اب اُس تقلید کے لیے جو جی میں آئے نام رکھ لیجیے۔ یہ تو بس **اَسۡمَآءٌ سَمَّیۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُکُمۡ** [2] (53:23) ہے۔ کائنات میں ہمارا نظام اور قانونِ فطرت ہے۔ کائنات کی کسی چیز سے پوچھو کہ کیا یہ قانون تم نے خود بنایا ہے جس کے اوپر چل رہے ہو؟ کہا کہ ان سے پوچھو تو سہی کہ یہ جو روش یوں اختیار کر رہے ہو کیا اس کے لیے تمہارے پاس ہماری طرف سے دی ہوئی کوئی سند ہے؟

---

[1] اس کے بعد تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ تمہاری اس غلط روش کا انجام کیا ہوتا ہے! (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 938)۔

[2] یاد رکھو! ......(یہ) اس کے سوا کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے اسلاف نے رکھ چھوڑے ہیں (7:71) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1241)۔

آخر میں قولِ فیصل یہ ہوا کہ جس چیز کو اب دین کے نام سے پیش کرتے ہیں اُس کے لیے خدا کی سند ہونی چاہیے۔ وہ ایک سائنٹسٹ [1] ہے اُس کا بڑا عمدہ فقرہ ہے:

We only read the Book of Nature, we can't write it.

''ہم صحیفۂ فطرت کو تصنیف نہیں کرتے بلکہ ہم تو صرف اُسے پڑھ سکتے ہیں۔''

قرآن تو ہمارا تصنیف کردہ نہیں ہے' ہم صرف اسے پڑھتے ہیں۔ اور جونہی ہم نے کچھ اپنے جو تخلیق کردہ قوانین ہیں ان کو خدا کے قوانین بنا کر نافذ کرنے کی کوشش کی' تو یہ شرک ہو گیا۔

خداتعالیٰ اپنے احکام خود ہی تحریر کرتا ہے' کوئی انسان اسے تحریر نہیں کر کے دیتا

انسان کیا کرتا ہے؟ کہتا ہے کہ ہم نے اس کتاب کو لکھنا شروع کر دیا ہے۔ یہ چیز قرآن نے کہی ہے کہ **يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ** (2:79) یہ خود قوانین وضع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔ کہا کہ اوتمہارا ستیاناس ہو' تمہیں اتنی جرأت ہوگئی ہے کہ خود لکھتے ہو اور کہتے ہو کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ قوانین جو آپ کے ہاں ''حدود'' کے نام سے نافذ ہوئے ہیں اور ''حافظ صاحب'' رو رہے ہیں کہ چل ہی نہیں رہے تو یہ انسانوں کے کسی دور کے بنائے ہوئے قوانین ہیں' نافذ کیے تھے تو ''صوفی صاحب'' کی طرف سے اعلان ہوا تھا کہ یہ جو مملکت کے عام قوانین بنتے تھے تو ان کی خلاف ورزی کرنے سے تو صرف مملکت کی سزا ملے گی لیکن یہ جو قوانین نافذ کیے گئے ہیں' یہ خدا اور رسول کے قوانین ہیں' ان کی یہاں بھی سزا ملے گی اور جہنم میں بھی جاؤ گے۔ اب اگلی چیز یہ آئی

نظامِ ربوبیت کے خدوخال اور اس کا عملی طریق تو پھر یہ بھوک کیوں؟

حقیقت یہ ہے کہ جب لوگ وحی کا دامن چھوڑ دیں تو ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ **وَ اِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَاهُمْ يَقْنَطُوْنَ** [2] (30:36) جب ہماری طرف سے یہ آسائشیں' سامانِ رزق اور ربوبیت کی ساری نعمتیں جو کائنات میں بکھری ہوئی ہیں' ملتی ہیں تو وہ ان پر اتراتے ہیں۔ یہ جسے آپ فضا کہتے ہیں'

---

[1] اس سائنسدان کا نام F.J. Sheen (شین) ہے اور اس کی اس کتاب کا نام Philosophy of Religion(1948) (فلسفۂ مذہب) ہے۔

[2] جب انہیں سامانِ زندگی کی کشود حاصل ہوتی ہے تو وہ پھولے نہیں سماتے۔ اس پر اتراتے ہیں۔ لیکن جب انہیں' خود اُن کے اپنے اعمال کی بدولت کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو خود زندگی کی طرف سے ہی' مایوس ہو جاتے ہیں (یعنی ان کی طبیعت میں توازن اور اعتدال رہتا ہی نہیں)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔938)۔

یہ آپ کا سب سے بڑا ذریعہ رزق ہے۔ آپ زمین میں سے خدا کے قانون کے مطابق کھود کھود کر خزانے نکالتے ہیں۔ زندگی کے لیے جتنی چیزیں لائیفک ہیں' Indispensable (ناگزیر) ہیں' وہ اُس نے از خود دی ہوئی ہیں' مفت دی ہوئی ہیں۔ یہ روشنی' یہ ہوا' یہ پانی' یہ حرارت' یہ زمین سے سارا رزق' یہ حیوانات' ان کے گوشت' ان کا دودھ' یہ نہریں' یہ سارا کچھ' جتنا بھی ہے' یہ سب آپ لوگوں نے کہاں سے خریدا ہے' کس نے یہ پیدا کر کے دیا ہے' کاہے کے لیے یہ دیا ہے؟ قرآن حکیم نے بتایا کہ **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (1:1)** یہ ربوبیتِ عالمینی کے لیے ہے' پوری نوعِ انسانی کی نشوونما کے لیے ہے۔ کہا کہ یہ چیز ہماری دی ہوئی ہے۔ اس پہ اعتراض آ جاتا ہے کہ صاحب! پھر یہ لوگ بھوکے کیوں مرتے ہیں اور آج تو **WHO** [1] بتا رہی ہے کہ دنیا کی کم از کم آدھی آبادی رات کو بھوکا سوتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ اگر ربوبیتِ عالمینی کی یہ ذمہ داری اُس نے لے رکھی ہے تو اُس کی یہ آدھی مخلوق بھوکی کیوں سوتی ہے؟

تمام مصائب انسان کے اپنے پیدا کردہ ہیں' خدا کی طرف سے تو شر نہیں آیا

عزیزانِ من! یہ بڑا ہی اہم مقام آیا ہے۔ کہا ہے کہ یہ تو ہمارا دیا ہوا ہے جو کائنات میں بکھرا ہوا ہے اور یہ جو تمہارے ہاں اس قسم کی مصیبتیں آ جاتی ہیں تو یاد رکھو! کہ **وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ (30:36)** ہر مصیبت جو تمہیں آتی ہے' وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔

عزیزانِ من! وہ مسئلہ خیر و شر (Good & Evil) جو یونان کے حکما سے لے کر آج تک' تین ہزار سال سے' اربابِ فکر و نظر اور ساری دنیا کے لیے وجہ پریشانی بنا آ رہا ہے' حتٰی کہ ایران میں مجوسیوں نے تو خیر اور شر کے لیے دو الگ الگ خدا بنا دیئے' ان کی سمجھ میں بات ہی نہیں آئی' قرآن نے آ کر پہلی بار اس کو حل کیا ہے۔ کہا ہے کہ **بِیَدِكَ الْخَیْرُ (3:26)** خدا کی طرف سے شر نہیں آیا' تخریب اُس کی طرف سے نہیں آئی' مصائب اُس کی طرف سے نہیں آئے بلکہ **بِیَدِكَ الْخَیْرُ (3:26)** خدا تو ہے ہی خیر بھیجنے والا۔ یہ جو شر ہے اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ **بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ (30:36)** یہ انسانوں کا اپنا لایا ہوا ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم کا نظامِ حیات اجتماعیت کی شکل میں نافذ ہوتا ہے

اب اس اپنے لائے ہوئے نظام میں ایک چیز ہے جہاں انسان پریشان ہوتا ہے۔ ایک فرد یہ سوچتا ہے کہ میں نے تو کچھ نہیں کیا

---

[1] World Health Organization (عالمی صحت کا ادارہ)

تھا' مجھ پہ کیوں مصیبت آ پڑی ہے۔ قرآن فرد کی بات نہیں کر رہا بلکہ وہ اُس نظام کی بات کر رہا ہے جس کے اندر یہ فرد زندگی بسر کرتا ہے۔ کہا کہ تم نے اپنے ہاں غلط نظام قائم کیا ہوا ہے' وہ نظام قائم کیا ہے جس میں **لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ (30:34)** ہے۔ یعنی جو کچھ ہم نے ربوبیتِ عالمینی کے لیے دیا تھا تو جن کے پاس اقتدار ہے اور قوت ہے' وہ اسے سمیٹ لیتے ہیں' چھپا لیتے ہیں اور دبا لیتے ہیں' دوسروں کو نہیں دیتے۔ وہ دوسرا اس لیے بھوکا مر رہا ہوتا ہے۔ یہ اُس نظام کا قصور ہے۔ اور انسان نے تو معاشرے کے اندر زندگی بسر کرنا ہے۔ اگر نظام بہتر ہے تو اُس میں بھی ہر فرد کو آسائشیں ملتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ایک فرد وہ سب کچھ کرے کہ جس کی وجہ سے اُسے یہ کچھ مل رہا ہے۔ یہ نظام کی برکات ہوتی ہیں۔

عزیزانِ من! الدین کی بات ہو رہی ہے۔ الدین تم قائم کرو جیسا کہ کائنات میں ہمارے قوانین کے تابع ہے تو خیر ہی خیر ہے۔ اور اگر تم اپنا وضع کردہ نظام قائم کرو تو اُس کے اندر تو یہ طبقات ہونگے' تفاوات ہونگے' فرد اور فرد میں' قوم اور قوم میں' ملک اور ملک میں' یہ سب کچھ ہوگا:

ہر گُرگ کو ہے بَرّۂ معصوم کی تلاش! ❶

وہاں یہ کیفیت ہوگی۔

جب خدا کے نظام میں ناہمواری کے لیے انسان کا ہاتھ دخل انداز ہوتا ہے تو......

اگر وہاں افراد پہ یہ مصیبتیں آتی ہیں تو یہ بات نہیں ہے کہ اُس کے بعد وہ وہاں بیٹھ کر رونے لگ جائے کہ او خدا نے یہ کیا کر دیا' بڑا ظلم ہو گیا۔ ارے خدا نے تو یہ نہیں کیا' یہ تو تم نے جو اپنے ہاتھوں سے نظام بنایا ہے' اُس کی وجہ سے یہ کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ یہ کتنا بڑا بنیادی اصول ہے کہ **سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ (30:36)** ہر ناہمواری جو پیدا ہوتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں سے لائی ہوئی ہوتی ہے۔ جب ہم تک معاملہ ہوتا ہے جس میں ابھی یہ نظام نہیں آتا تو ہم تو بچے کو اُس کی پیدائش سے پہلے رحمِ مادر کے اندر سامانِ ربوبیت دیتے چلے جاتے ہیں۔ یہ نظام تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا۔ وہ بچہ جو باہر آتا ہے تو ہوا پہلے سے موجود ہے جس میں وہ سانس لیتا ہے۔ زندگی کے سارے لوازمات ہمارے پہلے سے تیار کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور اُس کے بعد جب اُسے بھوک لگتی ہے تو ماں کی چھاتی میں ایک دن پہلے تک ایک قطرہ نہیں ہوتا لیکن بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی اُس میں دودھ اتر آتا

---

❶ غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گُرگ کو ہے بَرّۂ معصوم کی تلاش (اقبالؒ: ضربِ کلیم: ابی سینیا)

ہے۔ کہا کہ جب تم اس کے اندر دخل اندازی کرتے ہو تو پھر وہ بھوکا مرنے لگ جاتا ہے۔ اس طرح **سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ** (30:36) ہے۔ ہر ناہمواری جو اس نظام کے اندر لائی ہوئی ہوتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں سے لائی ہوئی ہوتی ہے۔ **بِيَدِكَ الْخَيْرُ** (3:26) ہمارے ہاتھ سے تو خیر ہی خیر ہے' ہم خدائے شر نہیں ہیں۔

شروع شروع میں خرابیوں کی وجوہات اکثر نظروں سے اوجھل رہتی ہیں

اس میں ایک اور بڑی چیز ہے۔ نمایاں طور پر اسے بتانے کی ضرورت کیا تھی؟ خرابیاں' تخریبات ہوتی ہیں لیکن انسان متعین نہیں کر سکتا کہ یہ کس وجہ سے آئی ہیں۔ ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں کہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ان کی اپنی کارستانیاں ہیں' ان کی اپنی کرتوت ہیں۔ یہ مقام جب آتا ہے تو پھر یہ جو کارستانیوں والے ہوتے ہیں وہ معاشرے کے اندر ننگے اور برہنہ ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں اس سے پیشتر بھی معاشرے کے اندر بڑی خرابیاں تھیں لیکن متعین طور پر نہیں بتایا جاتا تھا کہ کن کی وجہ سے آئی ہیں۔ چند مہینوں کے لیے یہ لوگ اقتدار میں آئے اور جو کچھ انہوں نے کیا' اُس کے بعد باہر نکلے تو ایک ایک شخص کہہ رہا ہے کہ صاحب! یہ چور ہیں' انہوں نے یہ کیا' انہوں نے یوں بانٹا' انہوں نے یہ غلط کیا۔ یہ ہے **بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ** (30:36)۔ بات نکھر کر سامنے آ گئی ہے: پہلے یہ چیز متعین نہیں ہوتی۔

برائی کے ذرائع کو فوری طور پر متعین شکل میں سامنے لانے کی ضرورت ہوتی ہے

ایسے مواقع آتے ہیں جس میں **بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ** (30:36) سامنے آتا ہے اور جب متعین طور پہ آتا ہے تو پھر کہتے ہیں کہ انہوں نے یہ کچھ کیا ہے اور پھر ان کے خلاف معاشرے میں نفرت پیدا ہوتی ہے۔ معاشرے میں اصلاح پیدا کرنے کی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ جس کے ہاتھوں سے تخریب یا ناہمواری کی کوئی چیز پیدا ہوا اُس کے متعلق معاشرے میں متعین ہو جائے کہ یہ اس کی وجہ سے ہوا ہے' ورنہ ہر شخص اپنے آپ کو فریب میں رکھتا ہے کہ صاحب! یہ اللہ کی طرف سے دی ہوئی ہے' قسمت کا لکھا تھا۔ یعنی اُس کے اندر خود ذمہ داری نہیں لی بہرحال دوسروں کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں کہ معاشرہ ہی ایسا ہے۔ یعنی وہ معاشرہ جیسے کہیں باہر سے آیا ہوا ہوتا ہے اور یہ اُس کے فرد نہیں ہیں۔ ان کو پتہ نہیں ہے۔ معاشرہ تو عشر سے ہے۔ وہ جب تک ایک ہوتا ہے عشر یا دس کہلاتا ہی نہیں ہے' جونہی اُس کے ساتھ آپ نے کچھ اور ملایا' وہ بنتا ہے عشر اور وہاں سے معاشرہ بنتا ہے۔ ہم معاشرے کو کوستے چلے جاتے ہیں۔ نہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس معاشرے میں ہم ایک ہیں یا ہم وہ زیرو ہیں تو ہمارے اوپر بھی تو ذمہ داری ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ **بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ** (30:36)۔ جب بھی کوئی ناہمواری اور ناسازگار بات آئے تو کھڑے ہو کر یہ سوچو کہ ہمارے

ہاتھوں نے اس میں کیا کیا' ہم خود اس کے کس حد تک ذمہ دار ہیں۔ اور اس کے لیے تو بڑی جرأت کی ضرورت ہے' اس کا اعتراف کرنے کی کہ ہم ذمہ دار ہیں۔

قصہ ابلیس و آدم کو ایک تمثیلی انداز میں بیان کرنے کا مقصد اور مدعا

درس میں کئی دفعہ یہ بات آ چکی ہے کہ یہ جو قصۂ آدم ہے' وہ بات کیا ہے۔ ایک تصور ہے' ایک نظریہ ہے جسے آدم کہہ کر پکارا ہے۔ اُس کے مقابل میں ایک اور ہے جسے ابلیس یا شیطان کہہ کر پکارا ہے۔ بات اتنی سی تھی کہ معصیت (قانون کی خلاف ورزی) آدم سے بھی ہوئی' معصیت شیطان یا ابلیس سے بھی ہوئی۔ یہ کوئی فرد نہیں ہے' نہ آدم کوئی پتلا ہے' نہ ابلیس کوئی بندہ کھلوتا اے ❶۔ یہ بتائی ہوئی بات اتنی ہے کہ قانون کی خلاف ورزی آدم سے ہوئی تو اُس سے پوچھا کہ تم نے یہ کیوں کیا۔ اُس نے کہا کہ **رَبَّنَا ظَلَمْنَا** (7:23) میں ذمہ دار ہوں' مجھ سے بھول ہوئی' سہو ہوگئی' غلطی ہوگئی۔ کہا کہ ٹھیک ہے تم نے ذمہ داری قبول ہے اس لیے تمہاری اصلاح کا امکان ہے' لو یہ ایک ہدایت نامہ ہے' یہ ایک قانون ہے' اس کے مطابق زندگی بسر کرو گے تو یہ جو نقصان ہے' اس کی تلافی بھی ہو جائے گی اور اس سے زیادہ بھی مل جائے گا۔ ابلیس کو جب کہا کہ تم نے یہ معصیت کیوں کی۔ کہنے لگا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں کون ہوں کرنے والا' سب کچھ تُو کرانے والا ہے' تیرے حکم کے بغیر پتہ نہیں ہلتا۔ کہنے لگے کہ اے کمبخت! خود کرتا ہے اور ذمہ داری قبول نہیں کرتا' اس لیے قیامت تک تیری اصلاح نہیں ہو سکتی۔ عزیزانِ من! یہ ہے قصۂ آدم و ابلیس۔

اگر آپ ذمہ داری قبول نہیں کرتے تو کبھی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ کہا ہے کہ **بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ** (30:36)۔ یہ ناہمواریاں اُن کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس پر کہا ہے کہ کیفیت پھر یہ ہو جاتی ہے کہ **اِذَاهُمْ يَقْنَطُوْنَ** (30:36) خود زندگی کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ یہ جس کو مایوسی کہتے ہیں' میں پھر اس چیز کو دہرا دوں' درس کہتے ہی اُس کو ہیں جس میں بار بار دہرانا پڑتا ہے۔ میں ہر بار یہ کہتا ہوں کہ یہ قرآن جو عربی زبان کے اندر ہے تو اس زبان میں بڑی خصوصیت ہے۔ جب یہ گیہوں پک جاتا ہے' کاٹ لیتے ہیں۔ اب تو یہ ٹریکٹر آ گئے ہیں' ورنہ پہلے بیلوں کو اس کے اوپر سارا دن چلاتے رہتے تھے تاکہ وہ جو خوشوں کے اندر دانے تھے اُن میں سے چھلکا الگ ہو جائے اور دانے الگ ہو جائیں۔ یہ جو پروسیس تھا' یہ چھلکوں میں سے دانوں کو الگ کرنے کا جو طریق تھا اُس کے لیے یہ سارا دن بار بار اس پکے ہوئے گیہوں پر پھرتے رہنا تھا۔ اسے عربی زبان میں درس کہتے ہیں۔ تو یہ جو چیز ہے کہ اس طرح سے چھلکوں میں سے دانہ الگ ہوتا ہے تو قرآن کا طریق ہی یہ ہے۔ یہ شیطان اور ابلیس آپ

---

❶ بندہ بنا کھڑا ہے۔

قرآن میں دیکھیں گے کہ وہ شرکی ایک ہی قوت ہے' یہ دو الگ الگ نہیں ہیں بلکہ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں لیکن ایک دوسرے سے بالکل متضاد ہیں۔ ابلیس عربی زبان کے اعتبار سے مایوس کو کہتے ہیں' اور شیطان سرکش کو کہتے ہیں۔

آج کی سائیکولوجی کے تحت قصہ ابلیس و آدم کو دیکھنا نہایت ہی ضروری ہے

یہ بات شاید بارہ سو سال تک سمجھ نہ آتی اگر آج کی سائیکولوجی (علمِ نفسیات) یہ نہ کہتی۔ آج کی سائیکولوجی (علمِ نفسیات) یہ بات کہتی ہے کہ جب کوئی انتہائی طور پہ مایوس ہوجاتا ہے تو مایوسی کا اگلا ردِ عمل سرکشی ہوتا ہے' Aggression (جارحانہ رویہ) ہوتا ہے۔ وہ Aggression (جارحانہ رویہ) ہوجاتا ہے کہ جب اُس کے اوپر سارے راستے بند ہوجائیں۔ بلی کو کمرے کے اندر بند کردیں اگر تھوڑی سی کھڑکی کھلی ہے تو وہ بھاگنے کا راستہ ڈھونڈتی ہے' لیکن اگر وہ کھڑکی بھی بند ہوجائے تو اُس کے بعد پھر Aggressive (جارح) ہوجاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ باہر نکلنے کی طرف سے مایوس ہوگئی ہے اور Aggression (حملے) پہ اتر آئی [1] ہے' اس کو شیطان کہتے ہیں۔

مایوسی کا نتیجہ ہمیشہ سرکشی کی شکل میں نکلتا [1] ہے

کہا کہ جسے یہ **یَقۡنَطُوۡنَ** کہتے ہیں' یہ مایوسی ہے۔ مایوسی اُس وقت ہوتی ہے جب کوئی راستہ نظر نہ آئے۔ قرآن کہتا ہے کہ راستہ ہو چاہے غلط ہی ہو' تو انسان مایوس نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے کہ چلنے دو' تھوڑی دور جانے کے بعد خود ہی اس کو احتمال ہوجائے گا کہ یہ وہ راہ نہیں ہے جس پہ مجھے جانا ہے لیکن جب Blind Valley (بندوادی) میں آدمی پہنچتا ہے کہ سامنے راستہ ہی کوئی نہ ہو تو سوائے اس کے کہ وہ ٹکر مارے وہ کیا کرے گا۔ پھر وہ راستہ بنانے کے لیے توڑ پھوڑ کرے گا۔ پھر یہ ابلیس شیطان بنے گا۔ آدمی کے اندر کبھی یہ کیفیت پیدا نہیں ہونے دینی چاہیے کہ کسی کو کوئی راستہ ہی نہیں ملے۔ راستے بند کردیے جائیں تو پھر وہ اپنے لیے توڑ پھوڑ کرکے راستہ بناتا ہے۔ **یَقۡنَطُوۡنَ** مایوس ہوا۔ کس کی طرف سے ہوا؟ **بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡهِمۡ (30:36)**۔ کیا تو اپنے ہاتھوں نے تھا لیکن مایوس یوں ہوگیا کہ یہ جو آپ قانون لیے پھرتے ہیں' یہ خدا وغیرہ لیے پھرتے ہیں' یہ کچھ نہیں ہے' اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہمارا آج کا نوجوان یہاں پہنچا ہوا ہے۔ راستہ بند ہوا' تو مایوس ہوا۔

---

[1] جو قارئین اس موضوع سے دل چسپی رکھتے ہیں' ان کے لیے یہ کتاب بڑی ہی پرازمعلومات ہے:

Shaffer, Laurrance Frederic and Shoben, Edward Joseph, Jr: The Psychology of Adjustment, Houghton Mifflin company Boston, 1956, pp.98-154.

نوجوان نسل کے مایوس ہونے کی وجہ

بہرحال یہ چیز چلی آ رہی تھی کہ مسلمان گھرانے میں تو پیدا ہوا تھا' یہ آوازیں کان میں آ رہی تھیں کہ اسلام میں ہر مشکل کا حل موجود ہوتا ہے' وہ بڑا صحیح ترین نظام ہے اور اس میں کبھی مایوسی نہیں آتی۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ اسلام کا اتنا چرچا ہے' اتنا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا تھا' آج تک سنتے چلے آ رہے تھے' جب ان سے پوچھتے تھے کہ پھر وہ اپنے نتائج کیوں نہیں برپا کرتا' تو کہا جاتا تھا کہ اُس کے نفاذ کی کوئی شکل ہی نہیں ہے۔ وہ عملاً نافذ نہیں ہو رہا' اس وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔ یعنی فطرت کا یہ عجیب طریق ہے۔ متعین طور پہ نتیجے پہ پہنچانے کے لیے' اُس نے حالات ایسے پیدا کر دیئے کہ ان کو اسلام نافذ کرنے کے لیے مواقع میسر آ گئے اور انھوں نے اسلام نافذ بھی کر دیا۔ ڈھنڈورا پیٹ دیا' شرعی قوانین نافذ ہوئے۔ اُس نافذ ہونے کے بعد جو نتائج نکلے' اس سے یہ نوجوان اسلام کی طرف سے مایوس ہوا ہے کہ یہ تھا اسلام

واعظ! نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہُور کی

(غالب)

اسلامی نظام کے نفاذ پر 11 فروری 1979ء کو صدر ضیاء الحق کا انٹرویو

عزیزانِ من! پاکستان میں قوانین نافذ ہو رہے ہیں [1]' یہ 9 فروری 1979 کو نافذ ہوئے تھے' 11 فروری 1979 کو صدرِ محترم [2] نے امریکہ کے ٹی وی کو جو انٹرویو دیا تھا' وہ آیا تھا۔ انٹرویو کرنے والے نے اعتراض کیا تھا کہ آپ نے یہ جو سزائیں اس دور کے اندر نافذ کی ہیں یہ سزائیں ناممکن العمل ہیں آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ تو اُنہوں نے اسے جواب میں کہا تھا کہ تم خوامخواہ ان سزاؤں کو دیکھ کر ڈر گئے ہو' تم نے وہ شرائط نہیں دیکھیں جو عائد کی گئی ہیں' ان کی رو سے تو ایک ہزار میں سے شاید کسی ایک کو بھی سزا نہ ملے۔ یعنی اس انٹرویو میں اعتراض ہوا تھا کہ یہ ناممکن العمل ہیں۔ یعنی وہ اسلام جو نافذ ہوا وہ خدا کا اسلام نہیں ہے۔

یہ چیز ہے کہ نوجوان طبقہ کچھ مایوس ہو کر میرے پاس آ جاتا ہے۔ ان پہ اسلام کی طرف سے مایوسی طاری ہوئی تھی کہ یہی تھا وہ اسلام حتٰی کہ وہ یہاں تک آ گئے کہ چیخنے لگے اور یہ سوال پوچھنے لگے کہ کیا یہ مملکت تم نے اس کے لیے بنائی تھی؟ کیا اس کے لیے

---

[1] یاد رہے کہ بات ستمبر 1979ء کی 21 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

[2] جنرل ضیاء الحق (1924-1988 AD)

علیحدگی اختیار کی تھی؟ کیا اس کے لیے ملک تقسیم کیا تھا؟ کیا اس کے لیے لاکھوں جانیں گنوائی تھیں؟ یہ مایوس اس لیے ہیں کہ انہیں کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آتا۔ ہم نے اُس نسل کو بتایا ہی نہیں ہے کہ بابا! یہ خدا کا اسلام نہیں ہے' یہ خدا کے قانون نہیں ہیں جو نافذ ہو رہے ہیں بلکہ یہ تو انسانوں کے بنائے ہوئے قانون ہیں۔ کسی دور میں ٹھیک ہے انہوں نے بنائے تھے اور اپنے دور کے مطابق بنائے ہونگے۔ ٹھیک ہے دس سال کا بچہ تھا اُس کو جوتا بنوا کر دیا ہے اب وہ بیس سال کا ہو گیا ہے تو کیا اُس کو زبردستی وہی جوتا پہننا پڑے گا؟ نہیں' قطعاً نہیں۔

سب سے بڑی مایوسی یہ ہے کہ انسان قانونِ خداوندی سے ہی مایوس ہو جائے

یہ بات تو اس نوجوان کی سمجھ میں تب آئے جب ہم اسے بتائیں کہ یہ جو نافذ کیا جا رہا ہے یہ دینِ خداوندی نہیں ہے مگر دشواری یہ ہے کہ یہاں دینِ خداوندی بتانے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں ہے کیونکہ ان لوگوں نے اس بات کا انتظام کر رکھا ہے کہ دینِ خداوندی سامنے ہی نہ آنے پائے۔ اگر دینِ خداوندی بتا دیا تو پھر اُس تفاوت سے' Comparison (تقابل) سے' نظر آ جائے گا کہ یہ جو نافذ کیا جا رہا ہے یہ انسانوں کا بنایا ہوا ہے۔ خدا نے یہ کہا تھا کہ تم کائنات میں نگاہ دوڑا کر دیکھ لو کہ کیا کہیں اس کائنات میں ان کا اپنا بنایا ہوا قانون یا تمہارا بنایا ہوا قانون کارفرما ہے؟ اگر دینِ خداوندی کا نفاذ ہوتا تو ہماری وہ نوجوان نسل کبھی مایوس نہیں ہوتی۔ یاد رکھیے! انسان پر حوادث آتے ہیں' مصائب آتے ہیں' ٹکراؤ ہوتا ہے' مشکلات ہوتی ہیں' پریشانیاں ہوتی ہیں' مایوسی ہوتی ہے۔ ایک تو مایوسی ہوتی ہے کہ اس بات میں مجھ سے یہ غلطی ہوئی یا فلاں نے میرے ساتھ یہ کیا تو میں یہاں تک پہنچا لیکن مایوسی میں اگر انسان یہ کہے کہ صاحب! یہ نظام ہی غلط ہے یہ قانون ہی باطل ہے تو یہ ہے جسے قرآن **یقنطون** (سخت مایوس ہونا) کہتا ہے۔ کیا ہوا؟ یہ اپنے ہاتھوں کا لایا ہوا ہوتا ہے جب اُس کے نتائج سامنے آتے ہیں تو پھر وہ قانونِ خداوندی کی محکمیت کی طرف سے مایوس ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ ادھر سے مایوس ہوا تو پھر تو اس کی اصلاح کی شکل ہی کوئی نہیں ہے۔ کیا بات ہے اقبالؒ **(1877-1938)** کی وہ کس طرح سے بات سمجھاتا ہے کہ ناموافق حالات کا پیدا ہو جانا اور بات ہے' ان حالات کی بنا پر قانون کی محکمیت سے انکار کر دینا یا مایوس ہو جانا یہ دوسری بات ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے۔

سوچنا یہی چاہیے کہ اس میں میری غلطی کیا ہے۔ یہ ہے **بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ (30:36)** کیسے عجیب انداز میں قرآن نے یہ بتایا ہے کہ کھڑے ہو کر سوچو کہ ہماری کونسی غلطی تھی جس کی وجہ سے یہ ہوا۔ اِس ''ہماری'' میں اکیلا وہ فرد نہیں ہے' اُسے وہ نظامِ اجتماعی دیکھنا ہوگا' وہ معاشرتی نظام دیکھنا ہوگا جس کے ایک جزو کی حیثیت سے یہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہ اپنے معاشرے کے احوال

کے تابع ہے' اُس سے نکل نہیں سکتا۔ اسی لیے اُس نے یہ کہا ہے کہ ایسے مقام پہ جہاں ایک فرد یہ دیکھے کہ حالات اس قدر مایوس کن ہوگئے ہیں تو اُسے کھڑے ہوکر یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کی ذمہ داری کس پہ عائد ہوتی ہے' میں کس قدر ذمہ دار ہوں' معاشرہ کس قدر ذمہ دار ہے' غلط نظام کس قدر ذمہ دار ہے؟ اُسے خدا کے قانون کی طرف سے مایوسی نہیں ہونی چاہیے اس لیے کہ وہ تو خیر ہے اُس کا نتیجہ تو شر نکل ہی نہیں سکتا۔

جو قانون اپنے اندر سدا بہار پھولوں کی مہک لیے ہوئے ہو' اس سے مایوسی کیسی اور کیوں؟

اس سلسلے میں اقبالؒ (1877-1938) کی تشبیہہ بڑی خوبصورت ہے:

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ

خزاں تو آتی ہے لیکن اگر خزاں میں یہ فیصلہ کرلیا جائے کہ اس درخت کے ساتھ جو اس ڈالی کی پیوستگی ہے' پھر اس کے لیے جو قانونِ نشوونما' ہمیں بتایا گیا' یہ سب غلط ہے؟ کیا ہوگا؟ کہا کہ

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے

جب انسان قانونِ خداوندی کی طرف سے مایوس ہوجاتا ہے تو پھر دنیا میں کوئی اور قانون ایسا نہیں ہے جو اس کی خزاں کو بہار میں تبدیل کردے۔ کہتا ہے کہ یہ جو ڈالی ٹوٹ گئی' مایوس ہوگئی:

ہے لازوال عہدِ خزاں اُس کے واسطے

یہ اُس کے واسطے جو لازوال ہے' یہ ہے مایوسی۔ وہ ابدی طور پہ سمجھ لیتا ہے کہ صاحب! ان قوانین کے اندر مجھے سرسبز کرنے کی یہ صلاحیت ہی نہیں ہے:

ہے لازوال عہدِ خزاں اُس کے واسطے
کچھ واسطہ نہیں ہے اُسے برگ و بار سے

انسان کی بربادی کی اصل وجہ اپنی ذات کا انکار ہے

سب سے پہلے انسان اپنی طرف سے مایوس ہوتا ہے کہ میں کچھ نہیں کرسکتا۔ یہ جو سب سے پہلی چیز ہے تو یہ کفر بالذات' اپنی ذات سے انکار' ہے۔ اگلی چیز جو اُس کے بعد ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دوسروں کے سامنے اس کا اعتراف نہیں کرتا کہ میں ذمہ دار ہوں'

پھر وہ دوسروں کے اوپر ذمہ داری عائد کرتا ہے: کبھی گرد ونواح کی طرف‘ کبھی کسی دوست کی طرف‘ کہیں حالات ومعاشرے کی طرف۔ یہ جو چیز ہے اس کے متعلق جو اقبالؒ نے کہا ہے کہ

شاخِ نہالِ سدرہٗ خار و خسِ چمن مشو!

تیرا مقام تو انسان ہونے کی حیثیت سے بہت اونچا ہے‘ یہ باغ کے اندر جو جھاڑ جھنکار ہیں تُو یہ مقام کیوں حاصل کرتا ہے۔

منکرِ او اگر شدی منکرِ خویشتن مشو ❶

تُو اگر خدا کا منکر ہوگیا تو کوئی بات نہیں لیکن اپنے آپ سے انکار نہ کر‘ اپنی ذات کی صلاحیتوں سے‘ ممکنات سے‘ Potentialities سے‘ انکار نہ کر۔ اپنے آپ سے مایوس ہونے والا وہ ہے جو حقیقت میں مایوس ہے۔ خزاں میں اُس درخت سے یہ کہہ کر رشتہ نہ توڑ کہ یہ قانون‘ قانون سے وابستگی‘ یہ سب کوئی شے ہی نہیں ہے۔

پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ ❷

رزق کے معاملے میں قرآن حکیم کی آیات کا غلط ترجمہ اور تفاسیر

قرآن حکیم نے **یَقۡنَطُوۡنَ** (30:36) کہا ہے۔ یعنی خود زندگی کی طرف سے ہی مایوس ہوجاتے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ یہ وہ ہیں جنہیں خود اپنے اعمال کی بدولت لائی ہوئی تکلیف پہنچتی ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ تمہاری یہ تکلیف تمہارے اپنے ہاتھوں سے لائی ہوئی ہے۔ اگلی ہی آیت میں کہا کہ **اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّ اللّٰہَ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَقۡدِرُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ** ❸ (30:37)۔ ایک قوم وہ ہے جس نے قرآن کی طرف سے مایوسی اختیار کی‘ ایک وہ ہیں جنہیں قانون کی محکمیت کے اوپر یقینِ کامل ہے۔ یہ ایک ہی آیت نہیں بلکہ قرآن میں متعدد آیات آتی ہیں۔ یہ ہمارے خلاف سازش ہوئی ہے کہ قرآنِ کریم کی ان آیات کا غلط ترجمہ اور غلط مفہوم کیا گیا۔ اس آیت کا ترجمہ کہیں سے آپ دیکھ لیجیے تو وہ یہ کہے گا کہ تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ تعالیٰ جس کا رزق چاہے کشادہ کر دیتا ہے‘ جس کا رزق چاہے تنگ کر دیتا ہے جبکہ قرآن اس سے پہلی آیت میں کہتا ہے کہ **بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡهِمۡ** (30:36) یہ تمہارا اپنا کیا ہوا ہے۔ ساتھ ہی آیت ہے جس کا یہ غلط ترجمہ کر دیا تو پھر سوال یہ ہے کہ یہ

---

❶ اقبالؒ: زبورِ عجم

❷ اقبالؒ (1996)۔ بانگ درا۔ اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن‘ ص۔259۔

❸ کیا یہ لوگ کبھی اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ رزق کی کشائش اور تنگی خدا کے قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ جو اپنے لیے جس قسم کی راہ اختیار کرتا ہے‘ اسے اسی قسم کا نتیجہ مل جاتا ہے۔ اس حقیقت میں ان لوگوں کے لیے‘ جو قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں‘ صحیح توازن بدوش راستے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن‘ ص۔938)۔

بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ کون کرتا ہے؟ عزیزانِ من! قرآن نے تو کہا تھا کہ اس کے منزل من اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں اختلاف نہیں ہے۔ اب یہاں پہلی آیت میں **بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ (30:36)** آیا ہے کہ یہ تمہارا اپنے ہاتھ سے کیا ہوا ہے۔ اور ساتھ ہی دوسری آیت کا غلط ترجمہ کر کے کہا کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے یعنی غریبی آئی ہے' مفلسی آئی ہے' تو اللہ کی طرف سے' مر رہے ہو تو گویا ہم مار رہے ہیں۔ آپ کوئی ترجمہ اٹھا کر دیکھیے' کوئی تفسیر اٹھا کر دیکھیے' یہی کچھ آپ کو ملے گا۔

خدا کی طرف سے عطا کردہ نظامِ ربوبیت کے خدوخال

قرآن تو ایمان' قانون کی محکمیت کے اوپر بتا رہا ہے اور وہ قانون کی محکمیت یہ ہے کہ وہ سب کے لیے ربوبیت کا انتظام کر رہا ہے۔ اس پہ ایمان ہونا چاہیے اس لیے کہا کہ قانون کی محکمیت پہ ایمان رکھو۔ قرآن نے جو اس آیت کو بیان کیا ہے تو اُس کے صحیح مفہوم سے بات صاف ہو جاتی ہے۔ اس آیت کے الفاظ میں **لِمَنْ یَّشَآءُ (30:37)** آیا ہے یعنی جو قوم' جو معاشرہ' جو نظام چاہتا ہے کہ رزق کی فراوانیاں ہوں تو ان کو ہمارے قانون کے مطابق رزق کی فراوانیاں ملتی ہیں۔ جو یہ چاہتا ہی نہیں ہے اور کہتا ہے کہ ہم پہ تنگی آنی شروع ہو جائے اور ہمارے قانون سے سرکشی برتتا ہے تو تنگی آ جاتی ہے۔ یہ تنگی تمہارے اوپر آ گئی کیونکہ تم نے ہمارے قانون سے انحراف برتا۔ خوشحالی کا طریق یہ ہے کہ اُس قانون کے مطابق تم اپنا نظام قائم کرو۔ **اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (30:37)** اگر تمہیں اُس قانون کی محکمیت پہ اب بھی ایمان باقی ہے تو پھر یاد رکھو! ہم جو کہہ رہے ہیں یہ ہو کر رہے گا۔ اٹھو اور یہ کرو' کرو اس کی ابتدا۔

نظامِ ربوبیت کے تمام پہلو انسان کی نفسیاتی تبدیلی پر اثر انداز ہوتے ہیں

قرآن جو نظام دیتا ہے وہ بتدریج اپنی تکمیل تک پہنچاتا ہے' بتدریج آہستہ آہستہ پھیلاتا ہے۔ پہلی چیز یہ **لِمَنْ یَّشَآءُ** ہے کہ وہ یہ نظام چاہتا ہے۔ رزق کی کشائش اور تنگی کا قانون یہ ہے کہ جس معاشرہ میں رزق کی تقسیم اس طرح ہوگی کہ اس سے ہر ضرورتمند کی ضرورت پوری ہوتی رہے' اس معاشرہ میں رزق کی فراوانی رہے گی اور جہاں اس کے خلاف ہوگا' وہاں رزق کی تنگی ہوگی۔ اس لیے کہا کہ **فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ (30:38)** پہلے جہاں تم ہو' اپنے گردونواح سے بات شروع کرو' اُس میں یہ دیکھو کہ کوئی رات کو بھوکا تو نہیں سو رہا۔ یہ جو تمہارے پاس فالتو پڑا ہوا ہے' یہ اُس کا حق ہے جس کے پاس نہیں ہے۔ غلط نظام میں' جسے مذہب کہتے ہیں' اگر کسی کو دیا بھی جاتا ہے تو خیرات کے طور پہ دیا جاتا ہے۔ جسے خیرات کہتے ہیں اُس سے دینے والے کے اندر ایک **Complex** (گرہٗ احساس) پیدا ہوتا ہے جو غرور و فخر کا ہوتا ہے' لینے والے میں ذلت کا **Complex** (گرہٗ احساس) پیدا ہوتا ہے۔ قرآن

حقه' کہتا ہے' وہ جس کی اپنی محنت سے اُس کا پورا نہیں ہوا تو یہ جو تمہارے پاس تمہاری ضرورت سے زائد ہے' یہ اُس کا حق ہے' جاؤ جا کر اُسے اُس کا حق پہنچاؤ۔ **حقــه** کہہ کر قرآن حکیم شرفِ انسانیت کو کہاں لے گیا ہے۔ اس میں وہ بھوکا لیتا ہوا نہ شرماتا ہے' نہ یہ دینے والا اس پہ فخر اور غرور کرتا ہے۔ قرآن حکیم نے یہ تمام جذبات کاٹ کر رکھ دیئے۔ یہ **حقه** ہے' یہ اس کا حق ہے۔

مسکین کا قرآنی مفہوم

کہا ہے کہ اس سے آگے بڑھو' دیکھو کہ **وَ الْمِسْكِيْنَ (30:38)** کس کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہے۔ مسکین اُس کو کہتے ہیں جس کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہو پھر کہا کہ دیکھو کہ **وَ ابْنَ السَّبِيْلِ (30:38)** تمہارے ملک کے اندر اگر باہر سے بھی کوئی آ گیا ہے اور اُس پہ کوئی افتاد آ پڑی ہے تو اُس کا بھی تمہارے اوپر حق ہے۔ کہا کہ اس نظام کی ابتدا یہاں سے کرو اور پھر دیکھو کہ کشادٔ فضیلت کس طرح سے نہیں ہوتی۔ **لِمَنْ يَّشَآءُ** کے معنی ہیں کہ جو چاہتا ہے کہ اُس کے معاشرے کے اندر یہ کیفیت پیدا نہ ہو کہ کوئی کفر کرے' چھپا کر رکھے اور دوسرے بھوکے مریں' تو جو چاہتا ہے کہ ایسا نہ ہو تو وہ ہمارے قانون کی طرف آ جائے۔ جو اپنی ضرورت سے زائد ہے وہ ان کا حق ہے' جا کر ان کو پہنچائے۔ وہ **As of right** (بطورحق) ڈیمانڈ کر سکتے ہیں اور تمہیں دینا پڑتا ہے۔ کہا کہ یہ شروع کرو پھر دیکھو تو سہی کہ یہ ناہمواریاں کس طرح سے ختم ہو جاتی ہیں۔ پھر کہا کہ **ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ** [1] **(30:38)** یہ ہے خیر۔ دیکھا آپ نے کہ شر کے مقابلے میں خیر کیسے آیا۔ ابھی ابھی تم کہہ رہے تھے کہ اللہ نے بڑا ظلم کیا تھا' بھوک آ گئی' تنگی آ گئی' مصیبت آ رہی ہے۔ یہ سارا کچھ خدا کی طرف منسوب کیے چلے جا رہے تھے اور اُسے مجسمۂ شر بنا رہے تھے جبکہ اُس نے تو کہا تھا کہ **بِيَدِكَ الْخَيْرِ (3:25)** ہمارا نظام تو خیر ہی خیر ہوتا ہے۔ اب یہاں کہا ہے کہ **ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ (30:38)** جو لوگ بھی یہ کچھ کرتے ہیں' کوئی اور جذبہ نہیں رکھتے' صرف یہ جذبہ رکھتے ہیں کہ ہم نے قانونِ خداوندی کی اطاعت کرنی ہے' اُن کے لیے خیر ہی خیر ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کی ابتدا' اس کی انتہا کا پیش خیمہ ہے

کائنات کی کسی شے کے اندر کوئی اور جذبہ نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ اُس نے اُس قانون کی پیروی کرنی ہے۔ یہ ہے **يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ (30:38)**۔ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اس کی ''وجه'' یہ ہے جو یہ ایسا کرتے ہیں۔ یہ ہے جیسے

---

[1] یہ روش ان لوگوں کے لیے بہترین نتائج کی حامل ہوگی جو اس راستے پر چلنا چاہتے ہیں جو انہیں خدا کی مقرر کردہ منزل کی طرف لے جائے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔939)۔

ہم عام لفظوں میں کہتے ہیں۔ اور ''**وجه**'' اُس طریق کو کہتے ہیں جو کسی منزل تک پہنچائے۔ کہا کہ اگر تم نے نظامِ خداوندی کی منزل تک پہنچنا ہے تو اُس کا یہ راستہ ہے جو ہم کہتے ہیں کہ یہاں سے ابتدا کرو' انتہا خود ہو جائے گی کہ کائنات میں کوئی انسان بھوکا سوئے گا ہی نہیں۔

قرآنِ حکیم کے اصولوں کی پیروی کی مثال کھیتی کی مانند ہے

کہا کہ **اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (33:38)** یہ ہیں وہ لوگ جن کی کھیتیاں پکتی ہیں۔ یعنی یہ جو انہوں نے ترجمہ کیا کہ ہم جسے چاہتے ہیں کشادہ سے رزق دیتے ہیں' قرآنِ کریم نے کھیتی کا لفظ کہہ کر ساری بات واضح کر دی کہ وہ کیسے ہوتا ہے۔ زمین میں پہلے اگانے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے' اُس کے بعد زراعت کا قانون دیا کہ اچھا بیج تلاش کر کے لاؤ' زمین کو اس قابل بناؤ کہ اُس میں بیج بویا جائے' پھر وقت کے اوپر پانی دو' پھر اُس کی حفاظت کرو' حرارت اور روشنی وغیرہ پہنچنے کے انتظامات کرو۔ یہ سارا کچھ تو تم نے کرنا ہے لیکن اس قانون کی محکمیت یہ کرنا ہے کہ ایک دانہ جو بویا ہے یہ خاک میں مل کر ضائع نہیں ہوا بلکہ سات سات سو بنا' یہ گنتی نہیں ہے بلکہ عربی زبان کا محاورہ ہے کہ اس ایک دانے میں سے سات سات سو دانے نکلیں گے۔ کہا کہ پھر تم نے دیکھا کہ اُس کے مطابق تم چلے تو کس طرح سے تمہاری کھیتی پکی۔

عزیزانِ من! **مفلحون** کہہ کر ساری بات کہہ دی۔ خدا تمہیں ان چیزوں کا صرف قانون دیتا ہے اور کرتے تم خود ہو۔ اگر زمین بھی موجود ہے' دانہ بھی رکھا ہوا ہے لیکن وہ کسان گھر میں بیٹھا ہوا حقہ پیتا رہتا ہے تو اُس کی کھیتی تو نہیں پنپ سکتی' پک ہی نہیں سکتی۔ قرآنِ کریم نے جہاں بھی ایمان اور مومنین کا ذکر کیا ہے' ان کو **مفلحون** کہا ہے' مثال ہی کھیتی سے دی ہے۔ اس ایک مثال سے پتہ چل جاتا ہے کہ خدا اس میں کتنا کرتا ہے اور انسان نے کتنا کرنا ہوتا ہے۔ اُسی کسان کی کھیتی پکتی ہے جو محنت کر کے کھیتی اگاتا ہے۔ اگانے کی صلاحیتیں خدا کی دی ہوئی ہوتی ہیں۔

نظامِ ربوبیت کا ایک اہم جز

ارشادِ خداوندی کی ایک تو یہ چیز ہے کہ تمہارے پاس جو فاضلہ ہے' وہ اُنہیں دیدو جن کو اس کی احتیاج ہے۔ **یَسْـَٔلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ط قُلِ الْعَفْوَ (2:219)** اے رسول! یہ تم سے پوچھتے ہیں کہ اس نظام میں ہمارے پاس جتنا کچھ ہے اُس میں سے ہم کتنا دیں؟ کہا کہ تمہیں تو اپنی ضرورت کے لیے چاہیے اور وہ ضرورت تمہاری پوری ہوگئی تو یہ جو باقی بچا ہوا ہے' یہ رکھتے کا ہے کے لیے ہو' یہ ان کے لیے دیدو جن کی ضرورت پوری نہیں ہو رہی ہے۔ یہ نظام تھا جس کی ابتدا اُس نے کی تھی کہ **ذا القربٰی (30:38)** قریب بسنے والوں یا رشتے داروں سے شروع کرو۔ یعنی یہ **ذا القربٰی** رشتے دار کی بات نہیں ہے کہ اپنے رشتے داروں

کو دو۔ بات یہ ہے جو بھی تمہارے قریب ہیں' اُس میں رشتے دار تو آ ہی جاتے ہیں اگر وہ قریب ہیں۔ ابتدا جو اُس نظام کی کرو تو جو تمہارے گرد و نواح میں ہیں' قریب ہیں' وہاں سے یہ شروع کرو اور پھر اس کو پھیلاتے چلے جاؤ۔

دو لفظوں میں قرآن حکیم کا معاشی نظام: ''نہ ضرورت سے زیادہ' نہ ضرورت سے کم''

یہ ہیں وہ لوگ جن کی کھیتیاں پکتی ہیں۔ سارے قرآن میں مومنین کے متعلق یہی ہے کہ **اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ** **(30:38)**۔ آپ نے دیکھا کہ وہ جو اوپر آیت تھی اس کا یہ ترجمہ غلط کیا کہ جس کا ہم چاہتے ہیں رزق تنگ کر دیتے ہیں' جس کا چاہتے ہیں کشادہ کر دیتے ہیں۔ پہلے **بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْھِمْ** **(30:36)** کہا کہ یہ کچھ تمہارے اپنے ہاتھوں کا لایا ہوا ہے۔ اُس کے بعد یہ چیز کہی کہ **الْمُفْلِحُوْنَ** **(30:38)** ہمارا کھیتی باڑی کا قانون ہے۔ تو **من یشآء** کا ترجمہ تو خود یہ آیات کر رہی ہیں لیکن وہاں جب خدا کے قانون کی جگہ انسانوں کے یہ قوانین آئے تو پہلا نظریہ یہ آیا کہ یہ جو بھوکے مر رہے ہیں' مہنگائی ہو رہی ہے' اس کے متعلق کوئی شکایت نہ کرو' ملوکیت' شہنشاہیت کی طرف نگاہ نہ دوڑاؤ کہ ان کی ذمہ داری تھی جس کے وجہ سے یہ کچھ ہوا بلکہ یہ تو خدا کی طرف سے ہے۔ اور جو خدا کا فیصلہ ہو اُس کے خلاف لبِ شکایت وا کرنا خدا کے خلاف چیلنج ہے۔ لوگوں کو یہ تھپکیاں دے کر سلا دیا کہ غلط نظام کی طرف تمہاری نگاہ ہی نہ اٹھنے پائے' صرف یہی ہو کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہے۔ وہ جو ابلیس نے کہا تھا کہ میں کہاں ذمہ دار ہوں' تیرے حکم کے بغیر تو پتہ بھی نہیں ہل سکتا' اس لیے یہ جو اتنے بھوکے مر رہے ہیں تو اس میں کوئی انسان ذمہ دار ہو ہی نہیں سکتا' یہ تو تیری منشا اور مشیّت کے مطابق سب کچھ ہو رہا ہے' یہ وہی ابلیسیت ہے:

مست رکھّو ذکر و فکرِ صُبحگاہی میں اسے
پُختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

(اقبالؒ: ارمغانِ حجاز)

زکوٰۃ کا اڑھائی فی صد کا تصور قرآنی تعلیم قل العفو کے بالکل برعکس ہے

ظالم کی طرف نگاہ اٹھنے ہی نہ پائے اور کہیں کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہو رہا ہے۔ اور جب ان سے کہا کہ اُس نے کچھ دینے کے لیے کہا ہے تو کہنے لگے کہ ہاں ٹھیک ہے' یہ اڑھائی فیصد ہے۔ ''اڑھائی روپے دی تے پایا دال نئیں اوندی''۔ [1] کہنے لگے

---

[1] اڑھائی روپے کی تو ایک پاؤ دال بھی نہیں ملتی۔

کہ اس کی ذمہ داری ہم نے تھوڑی لی ہے' جب خدا نے کہا اڑھائی فیصد ہے تو پھر اور کوئی کیا کرسکتا ہے جبکہ خدا **قُلِ الْعَفْوَ (2:219)** کہتا ہے کہ تمہاری ضرورت سے زائد جتنا بھی ہے تم دوسروں کو دیدو۔ یہ کہتے ہیں کہ صرف اڑھائی فیصد دیدو اور باقی جتنی دولت ہے' وہ رکھ لو۔ وہ جو دولت بچتی ہے وہ خواہ آپ لاکر **(Locker)** میں رکھیے یا اکاؤنٹ میں رکھیے' یا اپنے گھر میں رکھیے' بہرحال کہیں بھی رکھیے تو وہ بچے نہیں دیتی۔ ہزار روپیہ آپ نے کسی بھی جگہ محفوظ رکھا ہے تو سال کے بعد نکالیے تو وہ ہزار ہی ہوگا۔ یہ ہوا کہ یہ تو ہزار کا ہزار ہی ہے اس کے اوپر کچھ زیادہ ملنا چاہیے۔ یہاں سے ہمارے سامنے **ربٰــــــــــو** کا سوال آگیا جسے سود' **(Interest)** کہا گیا۔ اور آج کل تو اس کے اوپر مسائل کے مسائل چل رہے ہیں۔ اِن مسائل کے چلنے میں ہماری آپ کی کسی کوشش کا دخل نہیں ہے' یہ تو زمانے کے تقاضے ہیں جن کے تحت کیپٹل ازم یا نظامِ سرمایہ داری کے خلاف ردِّعمل ابھرا۔ اور وہ نظام سرمایہ داری تو سارا سود پر چلتا ہے۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ سرمایہ دار اگر اپنا سرمایہ کسی جگہ بھی بند کر کے رکھ دے تو وہ سو سال کے بعد بھی نکالے گا تو اتنے کا اتنا ہی ہوگا۔ وہ چلتا اس لیے ہے کہ یہ جو اُس کے پاس زائد ہے یہ بچے دے یعنی اس میں بڑھوتی ہو۔

ربٰو نظامِ سرمایہ داری کا حصہ ہی نہیں بلکہ اس کی بنیاد ہے

عزیزانِ من! اندازہ لگائیے اور جھوم جائیے قرآن پہ! کہا کہ **وَ مَـآ اٰتَيْتُـمْ مِّـنْ رِّبًـا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّـاسِ فَلَا يَـرْبُوْا عِنْدَاللّٰهِ (30:39)** ایک تو یہ دینا تھا کہ ضرورت مند تھا اُس کی ضرورت پوری ہونی چاہیے اور ایک دینا وہ ہے کہ دوسرے کو اس لیے دو کہ یہ اُس کے مال میں مل کر اس سے زیادہ مجھے واپس ملے۔ اب ربٰو کی بات آگئی۔ پہلے تو یہ کہا کہ یہ جو کہتا ہے کہ یہ ایک ذہنیت ہے کہ اس لیے دوں کہ جتنا دیا ہے اس سے زائد ملے۔ **وَ مَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَـاُولٰٓئِکَ هُمُ الْـمُـضْـعِفُوْنَ (30:39)**۔ اس آیت کا ترجمہ یہ کردیا کہ جو تم زکوٰۃ دیدیتے ہو وہ یہ ہے ہمارا اصل مقصد۔ **فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (30:39)** ان کا مال بڑھتا ہے۔ پوچھا کہ صاحب! وہ تم نے اڑھائی پرسنٹ دیدیا تو تمہارا مال تو بڑھا نہیں وہ تو ویسے کا ویسا ہی ہے۔ زکوٰۃ کا ترجمہ اڑھائی پرسنٹ کیا۔

قرآنِ حکیم اور فقہ کے معاشی نظام کی پیدا کردہ ذہنوں میں بنیادی فرق کا ظہور

عزیزانِ من! نہ ہی عربی زبان میں زکوٰۃ کے یہ معنی ہیں اور نہ قرآن میں اس کے یہ معنی ہیں۔ اس کے معنی ہیں ''سامانِ نشوونما بہم پہنچانا''۔ ایک ذہنیت تو یہ ہے کہ ضرورت مند کو کچھ دے کر اپنا ہی واپس نہیں لینا بلکہ اُس کی محنت کا جو ماحصل ہے اُس میں سے بھی کچھ لے لینا۔ ایک ذہنیت یہ ہے کہ جس کی کوئی کمی ہے اُس کی کمی کو اپنے ماحصل میں سے جو زائد ہے اُس کو دیدینا کہ اُس کی

نشوونما ہو۔ یہ دو متضاد ذہنیتیں ہیں‘ ایک دوسرے کے بالکل برعکس ذہنیتیں ہیں۔ جو نظامِ خداوندی ہے وہ ربوبیت یا زکوٰۃ کے اوپر مبنی ہے یعنی نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانا۔ ربو‘ جس کو کہا گیا ہے وہ ان کے بالکل برعکس ہے کہ دوسرے کے احتیاج اور ضرورت سے فائدہ اٹھا کر Exploit (لوٹ کھسوٹ) کرنا‘ زائد لینا ہے‘ یہ اپنا بھی لے لینا اور اُس کا بھی لے لینا ہے۔ یہ اصل میں ربٰو سود وغیرہ کی بات نہیں ہے۔ یہ دو معاشی نظام ہیں جو ایک دوسرے کے بالکل برعکس ہیں۔

ربٰو جیسے بغاوتی معاشی نظام کے خلاف خدا‘ رسولؐ کا اعلانِ جنگ

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے کسی قانون شکنی کو خدا اور رسول کے خلاف جنگ قرار نہیں دیا لیکن ربو کے متعلق کہا ہے کہ ان سے کہو کہ اگر یہ اس سے باز نہیں آتے تو خدا اور رسول ان کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہے۔ گویا یہ اتنی بڑی چیز تھی۔ اگر یہ ایک قانون شکنی ہی ہوتی تو جرم ہوتا اور جرم کی سزا ہوتی۔ یہ جرم والی بات نہیں بلکہ یہ بغاوت ہے۔ ایک پورا نظام ہے: نظامِ ربوبیت اور نظامِ زکوٰۃ‘ دوسروں کی نشوونما کے لیے دینا ہے۔ ایک اس کے بالکل برعکس دوسرا معاشی نظام ہے کہ دوسروں کی محنت میں سے لینا ہے‘ یہ نظامِ خداوندی کے خلاف ایک باغیانہ نظام ہے۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس نظام کے خلاف خدا اور رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ یہ سودی کاروبار کی بات نہیں ہے بلکہ یہ ایک معاشی نظام ہے۔ اور اس سے آپ دیکھ لیجیے گا کہ قرآن کی رو سے معاش کی کتنی اہمیت ہے۔ وہ کفار کے خلاف بھی جب تک کہ وہ مملکت کے خلاف سرکشی نہ برتیں اعلانِ جنگ نہیں کرتا۔ وہ ان میں سے جو نظامِ ربٰو قائم کرتے ہیں یعنی دوسروں کی محنت کا ماحصل خود لے جاتے ہیں تو وہ ان کے خلاف اعلانِ جنگ کہتا ہے اور اسے بغاوت قرار دیتا ہے۔

مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ربٰو کے مفہوم کو الجھا دینے کی ایک فریب انگیز کوشش

میں نے کہا ہے کہ اس دور میں چونکہ نظامِ سرمایہ داری کے خلاف یہ بات عام چلی ہے کہ اُس کا سارا دارومدار سود پہ ہے تو ہمارے ہاں بھی یہ بحثیں چلیں کہ جی! قرآن نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔ اب بات آگے چلی کہ جی سود سے مطلب کیا ہے جو حرام قرار دیا ہے۔

مری قرآن دانی پہ خفا کیوں ہوگئے صاحب!
مجھے تفسیر بھی آتی ہے، اپنا مدعا کہیے

’’گل کر جا ہندا کی ایں؟ جی چاہندا اے کہ دیواں کسے ضرورت مندنوں چار پیسے کہ سو دیواں تے ڈیڑھ سو لواں تے گناہ وی

نہ ہووے۔ کہن لگے ٹھیک ہے اسی دسنے آں"۔ ❶ بحثیں چلیں کہ سود حرام ہے۔

تجھ پہ قابو نہیں، دل پہ تو ہے قابو اپنا

قرآن کے ان الفاظ پہ ہمارا قابو نہیں لیکن سود کی Definition (حدود و قیود کو متعین) کرنا تو ہمارے بس کی بات ہے۔ اب بات چلی کہ بینک کا سود حلال ہے یا حرام؟ سود کے سلسلے میں جو آپ کے فقہ کے یہ قوانین چلے آ رہے ہیں تو پہلے ہی سے ان کے ہاں یہ چیز کر رکھی تھی۔ ایک کاشتکار آتا ہے اور کہتا ہے کہ میاں صاحب! ایک ٹکڑا زمین کا مجھے مل رہا ہے اور وہ ہزار روپیہ مانگ رہا ہے لیکن میرے پاس پیسے نہیں ہیں، اگر مجھے زمین کا وہ ٹکڑا مل جائے تو میرے بچے پل جائیں گے، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی، میں دو سال کے اندر اندر اپنی فصل سے ادا کر دونگا۔ انہوں نے کہا کہ تمہیں یہ مصیبت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے کہ تم اس سے زمین خریدتے پھرو اور پھر ادا کرتے پھرو۔ یہ کچھ نہ کرو بلکہ وہ زمین ہم تمہیں خرید دیتے ہیں اور جو پیداوار ہو وہ آدھی تمہاری آدھی ہماری۔ وہ ہزار روپیہ تو تمہارے ذمہ رہے گا کیونکہ وہ ہم نے خرید کر دی ہے لیکن پیداوار میں سے آدھا ہمارا آدھا تمہارا۔ اگر یہ اُس کاشتکار کو دیتا تو شاید اس کے اوپر پانچ دس روپے ہی زائد آتے۔ لیکن اس حساب سے آدھی بٹائی ان کی ہوئی اور اسے مزارعت کا نام دیا۔ کہا کہ جی، یہ سود نہیں ہے، یہ مزارعت ہے اور یہ حلال وطیّب ہے۔ آج کل کے دور میں بزنس آیا۔ اُس نے کہا کہ میں کاروبار تو کرتا ہوں لیکن کچھ سرمائے کی ضرورت پڑتی ہے، بینک سے لیتے ہیں تو وہاں سود دینا پڑتا ہے اور سود دینا تو عذاب ہے۔ کہنے لگے کہ آپ ہمارے سرمائے کے اندر روپیہ انوسٹ (لگا) کر دیجیے تو آدھا منافع آپ کا۔ یہ سود نہیں منافع ہے اور یہ حلال وطیّب ہے۔

سود کے متعلق قرآنِ مبین کی واضح Definition (تعریف)

آپ ذرا قرآن کے الفاظ دیکھیے۔ کہا کہ **وَ مَآ اٰتَيۡتُمۡ مِّنۡ رِّبًا لِّيَرۡبُوَا۟ فِىۡۤ اَمۡوَالِ النَّاسِ (30:39)** اس خیال سے روپیہ دوسرے کو دینا کہ دوسرے کے مال میں پہنچ کر یہ مجھے زیادہ دے گا، قرآنِ کریم نے دو الفاظ کہہ کر ساری بات صاف کر دی۔ وہ جو قرآنی نظام ہے اُس میں کسی ضرورت مند کو قرض لینے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی بلکہ یہ نظام ہر ایک کی ضروریات پوری کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ جب تک یہ نظام قائم نہیں ہوتا یہ چیزیں اُس دور میں انفرادی طور پر ہوتی ہیں۔ اب یہ دیکھیے کہ قرآن نے یہ Definition (تعریف) کس طرح سے دی ہے کہ کیا چیز ربٰو ہے اور کیا چیز ربٰو نہیں ہوتی۔ ربٰو کے متعلق کہا کہ تم نے لوگوں کو

---

❶ بات کرو کہ کیا چاہتے ہو؟ جی، یہ چاہتا ہے کہ کسی ضرورت مند کو چار پیسے دوں کہ مثلاً سو روپے دوں تو سوا سو اس طرح واپس لوں کہ گناہ بھی نہ ہو۔ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے ہم بتاتے ہیں۔

قرض دیا ہوا ہے اور اپنے اصل سے زائد ان سے لیتے ہو۔ **فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (2:279)** اگر تم اس سے باز نہیں آتے تو ہماری طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ **وَ اِنْ تُبْتُمْ (2:279)** اور اگر تم اس سے باز آ جاؤ۔ **فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ (2:279)** تم صرف اپنا Capital Money (راس المال) لے سکتے ہو۔ اس کی اس لیے اجازت دی کہ **لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ (2:279)** اگر تمہارا اصل بھی ہم نہ کہتے تو تم پہ زیادتی ہوتی اور اگر اس سے زائد ایک پیسہ بھی لو گے تو اُس پہ ظلم ہوگا۔

ہم نے جو کہا ہے کہ اصل تم لے سکتے ہو' زائد نہیں لے سکتے تو یہ نہ تم پہ ظلم ہے اور نہ اُس پہ ظلم ہے۔ اپنے اصل کے اوپر ایک پائی بھی جو زائد لینا ہے وہ ربٰو ہے خواہ اس کی کوئی شکل ہو: مضاربت ہو' مزارعت ہو' بینک کا سود ہو' یا ویسے انوسٹمنٹ ہو۔ سوال یہ ہے کہ **فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ (2:279)** تم صرف اپنے اصلِ زر کے حقدار ہو' وہی تمہیں ملے گا۔ ربٰو کے معنی ہی زائد کے ہیں۔ اس سے زائد کا نام کچھ رکھو' وہ قرآن کی رو سے حرام ہے۔ قرآن نے اتنی صاف اور کھلی ہوئی بات کی ہے کہ سرمایہ داری کا نظام ختم ہوگیا۔ اس زائد کا نام سود رکھو یا کچھ رکھو جب یہ ختم ہو جاتا ہے تو نظامِ سرمایہ داری ہی قائم نہیں رہتا۔ ضرورت سے زائد جو تمہارے پاس ہے وہ ضرورت مندوں کا حصہ ہے۔ زائد از ضرورت کسی کے پاس رہتا ہی نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم نے کاہے کے لیے رکھا ہوا ہے؟ جاؤ اور نظام کو دو کہ سب کی ضروریات پوری کرے۔ کہا کہ جی' کل کو مجھے ضرورت پڑے گی تو کیا کروں گا؟ کہا کہ **نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (6:151)** ہم تمہارے اور ان کی اولاد کے رزق کے ذمہ دار ہیں۔ اسلامی مملکت یہ کہتی ہے۔ جب یہ چیز ہو جائے' وہ ذمہ دار ہو جائے تو پھر تم نے یہ زائد از ضرورت یا فاضلہ کاہے کے لیے رکھنا ہے۔ اب یہ جو آپ کے ہاں موجودہ مذہب کا نظام بنا ہے یہ ملوکیت کے زمانے کا بنا ہوا ہے۔ اس سرمایہ داری کے نظام میں نہ زمین کی ملکیت پہ کوئی حد ہے' نہ دولت کے جمع کرنے کے اوپر کوئی حد ہے' اس میں زمین کو بٹائی پہ دینا ہے' انوسٹ کر دینا ہے۔ اس میں پہلی چیز تو جو بلا سود بینکاری کا مسئلہ تھا' یہ چلا۔

بلاسود بنکاری کے سلسلہ میں مودودیؒ کا جاری کردہ فتویٰ

میں عرض کروں کہ اکنامکس (معاشیات) ایک مشکل اور پیچیدہ فن ہے۔ دنیا میں بہت کم لوگ ہیں جو اس کو سمجھ پاتے ہیں۔ ''تے ساڈے اتھے بھاویں ایناں وی نہ پتہ ہووے کہ روپے دے پیسے کنے ہوندے ہیگے'' [1] لیکن معاشیات کے اوپر ایک مستند حیثیت سے فتوی جاری کر دیتے ہیں۔ بلاسود بینکاری کے سلسلے میں مودودی [2] صاحب نے فتویٰ دے کر یہ تدبیر بتائی ہے' یہ ان کے

---

[1] ہمارے ہاں تو اتنا بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ایک روپے میں کتنے پیسے ہوتے ہیں۔

[2] مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1979-1903)۔

اخبار ایشیاء کے اندر ہے کہ بنکوں میں روپیہ جمع کراؤ اور روپیہ جمع کرانے والوں کو بینک سود دینے کی بجائے ایسے اقتصادی منصوبے تیار کرے جن کے منافع میں روپیہ جمع کرانے والے برابر کے حصہ دار ہوں۔

سود کے عذاب سے بچنے کے لیے کتاب الحیل ملاحظہ فرمائیں

یہ تو وہ ہوا جو بنکوں میں ہوتا ہے اور یہ جو افراد سے لیتے ہیں وہی زیادہ ضرورت مند ہیں کہ ضرورت میں مرتا کیا نہ کرتا۔ اب بات یہ ہے کہ یہ سود حرام ہے' خدا کے ہاں باز پرس ہوگی' کہنے لگے او بھولے بادشاہو! اس میں ڈرنے کی بات ہی کوئی نہیں ہے۔ آپ حضرات کو شاید معلوم نہیں کہ فقہ کی جتنی کتابیں ہوتی ہیں اُن میں شروع میں تو احکام دیئے ہوئے ہوتے ہیں' آخر میں ایک باب ہوتا ہے اُسے کتاب الحیل کہتے ہیں' حیل حیلہ کی جمع ہے۔ اُس کتاب الحیل میں لکھا ہوتا ہے کہ یہ جو قانون ہم نے دیئے ہیں' اُن نے بچ نکلنے کی تدبیر کیا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ آپ لوگوں کے لیے انہوں نے کتنی محنت جانفشانی کی ہے کہ کہیں آپ کو نہ ڈھونڈنا پڑے' تلاش نہ کرنا پڑے۔ میرے سامنے ایک کتاب ہے ''معاشیات نظام مصطفیٰ''۔ مفتی محمد ابو سعید غلام سرور قادری صاحب اس کے مصنف ہیں۔ بات سود کے اوپر یا ربٰو کے اوپر پہلے چلی ہوئی ہے' کتنے ہی صفحوں میں پہلے یہ بتایا ہے کہ یہ کتنا سنگین جرم ہے اور قرآن نے کس قدر حرام قرار دیا ہے' یہ خدا اور رسول کے خلاف بغاوت ہے۔ اُس کے بعد جہاں وہ ختم ہوتا ہے کہا ہے کہ ہمارے ہاں کے تو فقہائے کرام نے امت کی حالت کے اوپر شفقت رکھتے ہوئے ایسی تدابیر بتائی ہیں کہ جن سے آپ کو یہ ملتا بھی جائے اور آپ گنہگار بھی نہ ہوں۔ اس میں انہوں نے اپنے فقہائے کرام کے حوالے دیئے ہیں جنہوں نے آپ کی اس حالت کے اوپر یہ کرم کیا ہے' آپ کو بچا لیا ہے۔

کتاب الحیل کی چند ایک مثالیں

پہلی تدبیر: ایک شخص کسی کو دس روپے قرض دے کر اُس سے دو روپے زائد لینا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ دو روپے سود ہونگے لیکن اس جرم اور گناہ سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ قرض دینے والا قرض لینے والے کی کوئی چیز دس روپے میں نقد خرید لے اور اُس قرض لینے والے کے ہاتھ مدتِ معینہ کے لیے بارہ روپے میں ادھار بیچ دے۔ مدتِ معینہ کے بعد وہ آپ کو بارہ روپے دے گا تو کہا کہ یہ ربٰو نہیں ہے جس کا خدا کے ہاں مواخذہ ہوتا ہے بلکہ یہ تو اُس چیز کی تجارت کا منافع ہے۔

دوسری تدبیر: قرض دینے والا اپنی کوئی چیز **110** روپے میں قرض لینے والے کے ہاتھ ادھار بیچ دے' قرض لینے والا وہی چیز **100** روپے میں قرض دینے والے کے ہاتھ ادھار بیچ دے۔ اس طرح وہ چیز بھی اس کو واپس مل گئی اور منافع بھی مل گیا۔

تیسری تدبیر: قرض دینے والا قرض لینے والے کے ہاتھ ایک چیز 200 روپے میں ادھار بیچ دے' پھر اُس سے وہی چیز 100 روپے میں نقد خرید لے' قرض لینے والا اُس شے کی وہ قیمت جو اُس نے 200 روپے ادھار لی تھی وہ اس چیز کی قیمت ادا کر دے۔ یہ سود نہیں ہے یہ اُس چیز کی تجارت ہے۔

چوتھی تدبیر: قرض دینے والا کوئی چیز ایک مدتِ معینہ کے لیے 20 روپے میں ادھار دے' قرض لینے والا کسی اور کے پاس 15 روپے میں اُسے نقد بیچ دے۔ مدتِ معینہ کے بعد قرض لینے والا اُسے 20 روپے ادا کرے گا۔ اس طرح

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

اس کتاب میں یہ لکھا ہے کہ امام ابو یوسفؒ ایسے کاروبار کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس سے منافع بھی ہوگا اور ثواب بھی ملے گا۔ کہا حضور! یہ ثواب کس چیز کا ملے گا؟ کہا کہ اس لیے ملے گا کہ اسے اُس نے سود کے حرام سے بچنے کے لیے اختیار کیا تھا تو حرام سے بچنے کے لیے کوئی چیز اختیار کرے تو اُس کا ثواب ملتا ہے۔ یہ اُس نے بحوالہٗ فتاویٰ قاضی خان مع عالمگیری جلد دوم وغیرہ میں لکھا ہے۔ ان تدابیر کو درج کرنے کے بعد اس کتاب کے مصنف فرماتے ہیں کہ ان تدابیر کی رو سے منافع بھی ملتا ہے اور سود کا گناہ بھی نہیں ہوتا لیکن افسوس کہ مسلمان دینِ فطرت کی ایسی تدابیر سے غافل رہ کر سود جیسی لعنت میں مبتلا رہے' آگے شعر بھی ہے:

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تُو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات

عزیزانِ من! اب آپ نے یہ سوچ لیا کہ جب ان کے سامنے قرآن لایا جاتا ہے تو یہ قرآن سے کیوں ڈر کر بھاگتے ہیں جیسے گدھا شیر سے بھاگتا ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں کتاب الحیل نہیں ہے۔ یہ ایک کتاب میں نے کہا ہے ان کے ہاں تو کئی کتابیں ایسی ہیں اور ان میں تو ایسے ایسے حیلے ہیں کہ آپ پہ کوئی جرم ہی صادر نہیں ہوتا۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ الروم کی آیت 39 تک آ گئے' 40 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

ساتواں باب: سورة الروم (آیات 40 تا 47)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من ! آج ستمبر 1979ء کی 28 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الروم کی آیت 40 سے ہو رہا ہے:(30:40)

ربٰو کی بنیاد پر قائم کردہ معاشی نظام' قرآنی نظام کے خلاف اعلانِ جنگ متصور ہوگا

سابقہ درس کی آخری آیت ربٰو کے متعلق تھی جس کا ترجمہ سود کیا جاتا ہے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے وہ بحث کچھ تشنہ رہ گئی تھی۔ اصل یہ ہے کہ جسے ربٰو کہا جاتا ہے یہ کوئی الگ مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلے تو ان کے ہاں یہ ہیں کہ کوا حلال ہے یا حرام' پاؤں دھونے چاہئیں یا مسح کرنا چاہیے؟ ربٰو کے متعلق قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ اگر تم اس سے باز نہ آئے' مثلاً شراب پینے والے کے متعلق کہا کہ

اگر تم باز نہ آئے تو تمہیں اس کی سزا ملے گی' گناہ ہوگا' مگر سارے قرآن میں ربٰو ایک ایسی چیز ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ اگر تم اس سے باز نہ آئے تو خدا اور رسول یعنی اسلامی نظام کی طرف سے اسے اعلانِ جنگ سمجھو۔ یعنی یہ کوئی مسئلہ نہیں رہا ہے' یہ کوئی جرم نہیں ہے کہ جس کی سزا ملے گی' یہ کوئی معصیت نہیں ہے کہ جس سے گناہ ہوگا' یہ کوئی ایسی چیز ہے جو اسلامی نظام کے خلاف بغاوت ہے اور بغاوت پہ ہی اعلانِ جنگ ہوتا ہے۔ بغاوت سے کم درجے کی جتنی بھی قانون شکنیاں ہوتی ہیں' جنہیں معصیت کہا جاتا ہے' اُن کی سزا مقرر ہوتی ہے۔ البتہ اگر کوئی ملک کے اندر سیاسی طور پہ بغاوت کرے تو ٹھیک ہے اُس کے خلاف اعلانِ جنگ ہوتا ہے۔ یہاں یہ صورت ہے۔

عزیزانِ من! جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ کسی مسئلے کی' کسی حکم کی' کسی قانون کی بات نہیں ہے۔ اور یہیں سے یہ بھی پتہ چلے گا کہ قرآن کی رو سے معاشی نظام کی اہمیت کیا ہے۔ عام طور پہ تو جو سیاسی نظام اس ملک کے نظام کے علی الرغم قائم کیا جائے تو اسے ہی بغاوت کہتے ہیں لیکن آپ دیکھیے کہ قرآن کی رو سے معاشی نظام کی اہمیت اس قدر ہے کہ اُس نے کہا ہے کہ اسلام یا قرآن کے معاشی نظام کے علی الرغم اگر آپ کوئی دوسرا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں تو یہ بغاوت ہے اور مملکت کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جی' یہ روٹی کا مسئلہ لیے پھرتے ہیں' روٹی کا مسئلہ ہے۔ جہاں کسی نے کہا کہ بھوکے کی روٹی کا مسئلہ حل کرو تو انہوں نے کہہ دیا کہ کمیونسٹ ہوگیا۔ عزیزانِ من! قرآن کے یہ مقامات قابلِ غور ہیں کہ سارے قرآن میں اس کے خلاف اعلانِ جنگ ہے تو اس کو اتنی بڑی اہمیت ہے۔

ہم راکٹ کا پرزہ سائیکل کے اندر لگانے کی بے سود کوشش میں مصروف ہیں

اب یہاں سے آگے بات چلائی۔ ہمارے ہاں معاشی نظام تو سارا غیر قرآنی ہے اور اُس میں بحث لیے پھرتے ہیں کہ جو ربٰو ہے یہ اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔

دہن کا ذکر کیا یہاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

غیر قرآنی معاشی نظام کے اندر ایک مسئلے کو لے کر دھن رہے ہیں۔ ''ویلی جٹی اون ویلے''۔ غیر قرآنی معاشی نظام میں ایک معیشت کا مسئلہ لے کر اب بحث ہو رہی ہے کہ یہ اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ ڈیزل آئل پہ چلنے والے انجن کے متعلق بحث ہو رہی ہے کہ اس میں AC کرنٹ دی جائے یا DC کرنٹ دی جائے' وہ تو انجن ہی کسی اور ٹائپ کا ہے۔ اُسے پہلے بجلی سے چلنے والا انجن بناؤ تو پھر اگلی بحث بھی چلے گی۔ لیکن یہاں ہے کہ وہ بحث چل رہی ہے۔

فقہہ کے بیان کردہ فارمولے کے مطابق اس حرام سُودی کاروبار کو حلال کرنے کا طریق

ربٰو کے متعلق کہا ہے کہ یہ سود ہے۔سود کا لفظ چونکہ بہت قابلِ نفرت ہوگیا تھا اس لیے کہا کہ یہ منافع ہے۔یعنی رام داس کا نام عبدالرحمٰن رکھا اور کہا کہ الحمدللہ مسلمان ہے۔پچھلی دفعہ میں نے بتایا تھا کہ اُنہوں نے کہا تھا کہ صاحب! اگر سود بھی ہے تو سود ہی رہنے دو اس سے بچنے کی کئی تدبیریں ہیں۔وہی فقہ کی کتابیں جس میں سود کو حرام قرار دیا ہے' جہاں وہ بحثیں ختم ہوتی ہیں اُس کے آخر ❶ میں لکھا ہوا تھا کہ اس سے بچنے کی شرعی تدابیر کیا ہیں۔تو آپ کو یاد ہے کہ اُس مصنف ❷ نے کتاب میں لکھا تھا کہ دیکھیے یہ جو مسلمان ہے' یہ خوامخوہ کے لیے حرام کھاتا چلا جا رہا ہے' ان تدبیروں کی رو سے اُسی کو کھاؤ تو حلال ہو جاتا ہے اور حلال ہی نہیں بلکہ ان کے بڑے میاں ❸ نے کہا تھا کہ اس سے ثواب ہوتا ہے۔آج بھی یہی بحثیں ہو رہی ہیں۔

ہم نے اسلام کو دنیا بھر کی نظروں میں مذاق بنا دیا ہے

عزیزانِ من! غیر قرآنی نظام سیاسی ہو' معاشی ہو' معاشرتی ہو' اُس میں اُس کے کسی جز کے متعلق یہ کہنا کہ یہ اسلامی ہے یا غیر اسلامی' بے معنی ہی نہیں بلکہ دنیا میں اسلام کا مذاق اڑانا ہے۔آپ نے وہ چار قانون ❹ رائج کر دیئے' ساری دنیا میں آپ کا مذاق اڑ رہا ہے' آپ کی قوم میں مذاق اڑ رہا ہے' چیخ رہے ہیں کہ ان کے مطابق سزا نہیں دی جا سکتی' یہ ناممکن العمل ہیں۔ان کو کسی کے سامنے جب پیش کیا جاتا ہے تو حیا سے آنکھیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔اور پھر ایک اور دلچسپ چیز ہے کہ جسے آج اسلامی کہا جا رہا ہے' یہ ڈکٹیٹرشپ کا نظام ہے۔اُس کے خلاف تحریکیں اٹھائی جاتی ہیں کہ قوم کو قانون سازی کی جو آزادی ملتی ہے یہ نظام اُس کو سلب کرتا ہے کہ وہ جمہوریت نہیں ہوتی' پارلیمان نہیں ہوتی۔قوم' ملت' امت اپنی مرضی سے قانون نہیں بنا سکتی۔یہ نظام قوم کے اس اختیار یا آزادی کو سلب کرتا ہے اور پھر اُس کے خلاف بڑی بڑی تحریکیں اٹھتی ہیں۔ہزار سال پہلے ہمارے ہی جیسے کچھ آدمیوں نے کچھ قانون بنائے اور آج ان قوانین کو لاگو کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ تم ان کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتے۔

---

❶ یعنی مفتی محمد ابوسعید غلام سرور قادری کی کتاب: ''معاشیات نظام مصطفٰی'' میں۔

❷ مفتی محمد ابوسعید غلام سرور قادری کی کتاب: معاشیات نظامِ مصطفٰی کا آخری باب کتاب الحیل میں یہ تدابیر درج ہیں۔

❸ یہ اشارہ فتاویٰ قاضی خاں مع عالمگیری جلد دوم کی طرف ہے۔

❹ یہ صدر ضیاء الحق (1988-1924) کے دورِ حکومت میں رائج کیے جانے والے قوانینِ حدود کی طرف اشارہ ہے جو 9 فروری 1979 کو نافذ ہوئے تھے۔

خدا کی ذات کے علاوہ قانون سازی کا حق تو کسی نبی کو بھی حاصل نہیں

عزیزانِ من! ہمارے ہی جیسے انسانوں کو کیا حق پہنچتا ہے کہ آج وہ ہماری آزادی سلب کریں۔ یہ حق صرف خدا کو پہنچتا ہے جس پر ہم ایمان لائے ہیں کہ ہم تیرے ہر قانون کی اطاعت کریں گے۔ اور خدا کی بھی اُسی صورت میں اطاعت ہوتی ہے کہ پہلے ہم اُس کو اپنا حاکم مانیں۔ خدا نے تو یہ کہہ دیا تھا کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے خواہ اُسے قانون سازی کے اختیارات ملیں' ایگزیکٹو کے ملیں' خواہ نبی بھی کیوں نہ ہو' اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ انسانوں سے کہے کہ تم میرے محکوم ہو جاؤ بلکہ اُس کو کہنا چاہیے کہ تم خدا کی کتاب کے محکوم ہو جاؤ۔ وہ تو نبی کو بھی یہ حق نہیں دیتا چہ جائیکہ ہم جیسے انسان' خواہ علم میں کیسے ہی کیوں نہ ہوں قانون سازیاں کریں۔ وہ تو کہتا ہے کہ ان کو یہ حق کس نے دے دیا کہ وہ ہزار سال پہلے کوئی قانون بنائیں اور ہمارے اوپر وہ قانون اس طرح سے لاگو ہو کہ اُس کے خلاف ایک لفظ نہ کہہ سکیں؟ یہ کس طرح سے اسلامی قانون ہو سکتا ہے؟ آج کے ڈکٹیٹر کا بنایا ہوا قانون حتیٰ کہ آج کے نظامِ پارلیمنٹ کا بھی بنایا ہوا قانون ہو' اُس کو تو آپ کہیں نہ کہیں چیلنج کر سکتے ہیں لیکن ان شرعی قوانین کو چیلنج بھی نہیں کیا جا سکتا۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم قرآنی معاشرت کے لیے ہوتی ہیں

عزیزانِ من! یہ ٹھیک ہے کہ آج میری آواز اتنی مؤثر نہیں ہے' مجھے اُس کی پرواہ بھی نہیں ہے۔ میں یہ چیزیں اس لیے کہے دیتا ہوں کہ غنیمت ہے کہ اس قسم کی ایجادات ہو گئی ہیں' یہ میرے سامنے رکھی ہیں جن میں یہ چیزیں محفوظ ہو جائیں گی۔ یہ دور اب لد رہا ہے خواہ وہ مذہبی پیشوائیت ہو' ملوکیت ہو' انسانوں کے قانون سازی کے اختیارات کا دور ہو' وہ اب لد رہا ہے۔ اس کے بعد دور آئے گا کہ اُس میں اس زمانے کی جب تاریخ سامنے آئے گی تو کم از کم کسی نے بھی یہ آواز سن لی تو وہ تو یہ چیز ہو گی کہ اس دور میں کوئی ایک تو ایسا تھا جو یہ آواز بلند کرتا تھا کہ غیر اسلامی نظام کے اندر اسلام کی بات کرنا بے معنی ہے۔ اُس نظام کو پہلے قرآن کی بنیادوں پہ استوار کیجیے پھر اُس کے اجزا کے متعلق گفتگو کیجیے' جو اُس کے اندر فِٹ اِن ہوتا ہے وہ اسلامی ہے اور جو اُس میں فِٹ اِن نہیں ہوتا' وہ غیر اسلامی ہے۔ خواہ وہ ہمارا بنایا ہوا ہو یا ہزار سال پہلے کا بنایا ہوا ہو۔ پہلے اُس انجن کو توڑو جو بجلی سے چلنے والا ہے۔

عزیزانِ من! جو بنیادی چیز ہے وہ ہے **لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ**: کسی کو اس کا اختیار حاصل نہیں ہے کہ انسانوں کے لیے وہ قانون بنا کر اُن کی آزادی اور پابندی کی حدود قائم کرے۔ وہ تو اس گورنر [1] نے صرف اپنے مقام کے باہر ڈیوڑھی بنا دی تھی کہ جس میں فریادی آ کر انتظار کریں' اُس کے متعلق خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ (581-644/45AD) نے کہہ دیا تھا کہ تمہیں کس نے یہ اختیار دیا

---

[1] حضرت عمروؓ بن العاص بن سہمی۔

جبکہ خدا نے انہیں آزاد پیدا کیا تھا تو تم ان کو غلام بنا کر بٹھا رہے ہو۔

انسان کی سب سے زیادہ ذلت اور رسوائی معیشت کی بنا پر ہی ہوتی ہے

عزیزانِ من! قرآن کی بنیادی تعلیم احترامِ انسانیت ہے' شرفِ آدمیت ہے۔ کوئی کسی قسم کا ایکشن جس میں کسی انسان کی عزتِ نفس پر حرف آتا ہو تو اُس کی آزادی سلب ہوگی جو خدا نے اس کو دی ہے۔ یاد رکھیے! یہ یکسر غیر اسلامی ہے خواہ اس کا کچھ بھی نام کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ اُس کے نزدیک نظام' قانون' حکم صرف وہ اسلامی ہے جس سے انسانیت کے شرف اور احترام میں اضافہ ہوتا ہو یا کم از کم برقرار رہتا ہو۔ یہ معاشی نظام کے متعلق اُس نے اتنی اہمیت سے کیوں کہہ دیا؟ اس لیے کہ یہ روٹی کی احتیاج ہے جس کی رو سے انسان سب سے زیادہ ذلیل ہوتا ہے۔ پھر اُس کے بعد جو جی میں آئے اس سے کراتے چلے جایئے۔ یہ اتنا بڑا اہم مسئلہ ہے۔ قرآن نے اس بنیاد کو لیا ہے کہ روٹی کے معاملے میں کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہ ہوتا' وہ کسی دوسرے کا محکوم نہ ہو اور روٹی اس طرح سے ملے کہ اُس کے عزتِ نفس کے اوپر کوئی حرف نہ آئے۔

انسان کی انسانیت قرآنِ حکیم کے معاشی نظام سے ہی وابستہ ہے

یہ نظام جس میں ہر فرد کو اُس کی ضرورت کے مطابق اس طرح روٹی ملتی ہے کہ اُس کے احترامِ انسانیت پہ زد نہیں پڑتی تو وہ قرآن کا معاشی نظام ہے۔ اور باقی جتنے بھی نظام ہیں اُن میں آپ دیکھیے کہ انسان انسان کی حیثیت سے باقی نہیں رہتا۔ یہ غیر قرآنی نظام کیا ہے؟ معاشرے میں ایک بڑھئی آپ کے ہاں صبح سے آتا ہے' وہ دن بھر کام کرتا ہے' شام کو آپ اُس کا مقرر کیا ہوا اُس کو دیتے ہیں۔ اُس نے آپ کے لیے کچھ کر کے دیا ہے' اُس کے بدلے میں آپ اُسے کچھ دیتے ہیں۔ سبزی والا دودھ بیچنے والے کو سبزی دیتا ہے اور اُس سے دودھ لیتا ہے' اسے تعاون کہا جاتا ہے' یہ ایک دوسرے سے Cooperation (تعاون) ہے' معاشرے میں اس کی ضرورت ہے۔

مذہبی سوچ نے دین اور دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے

یہ روپیہ جو کسی کو قرض کے اوپر دیتا ہے' وہ سال بھر کے بعد سو روپیہ جو دیا تھا وہ سو کا سو تو واپس لیتا ہے لیکن اُس کے اوپر دس اور لیتا ہے۔ یعنی سو دیئے تھے' وہ سو واپس لے لیے تو پہلی چیز یہ کہ کچھ دیتا نہیں ہے' اور اگلی چیز یہ ہے کہ بغیر کچھ دیئے ہوئے لیتا ہے جیسے اس سو کے قرض دینے میں 110 لیے یعنی 10 روپے 100 روپے کے اوپر لیے۔ عزیزانِ من! جو بغیر کچھ دیئے ہوئے لیتا ہے یہی ربٰو ہے۔ اسلامی نظام کے استوار کرنے والوں نے تو یہ کہہ دیا تھا اور کر بھی دکھایا تھا۔ سنیے! ایک بوڑھا ٹریژری آفس کی طرف جا رہا

تھا۔ بائی دی وے ہماری حالت یہ ہوگئی ہے کہ ہم نہ دین سے واقف ہیں' نہ اس کی اصطلاحوں کا پتہ ہے۔ ٹریژری آفس کا ترجمہ بیت المال ہی ہے اور ہمارا بیت المال اسلامی ہے اور ٹریژری آفس سیکولر ہے۔ ہاں' تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ وہ بوڑھا جا رہا تھا' کہا [1] کہ کدھر جا رہے ہو؟ بوڑھے نے کہا کہ میں بیت المال کا کچھ Due (واجب الادا) ادا کرنے جا رہا ہوں۔ کہا کہ ہم نے تو تمہیں پہلے نہیں دیکھا' ابھی دیکھ رہے ہیں۔ بوڑھے نے کہا کہ جی' میں غیر مسلم تھا' دوسری جگہ سے مسلمان ہو کر یہاں مدینے میں آیا ہوں۔ کہا کہ کب آئے ہوئے؟ بوڑھے نے کہا کہ ابھی دو مہینے ہوئے ہیں۔ کہنے لگے کہ حکومت نے دو مہینے میں تمہارے لیے کیا کیا ہے؟ بوڑھے نے کہا کہ ابھی تو میں آیا ہوں۔ کہنے لگے کہ جب اُس نے تمہارے لیے کچھ کیا نہیں ہے تو تم اس کے لیے Due (واجب الادا) کیسے دے رہے ہو' انتظار کرو' جب وہ تمہارے لیے کچھ کر دے تو اُس کے بعد Due (واجب الادا) دینا۔ جو حکومت نے تمہیں دیا ہے اُس کے بدلے میں تم سے کچھ لینا ہے ورنہ یہ ربوٰ ہو جائے گا۔

دین خداوندی کی عطا کردہ بنیادوں کے بغیر مذہبی سوچ کا محل کھڑا کرنے کی ناکام کوشش

ہمارے ہاں بحثیں چل رہی ہیں کہ جی' بنک کا سود حلال ہے یا نہیں؟ ڈیپازٹ کی ہوئی Money (رقم) حلال ہے یا نہیں؟ Provident Fund کے اوپر جو ہم لیں گے وہ حلال ہے یا نہیں؟ یہ وہی ہے کہ کوا حلال ہے یا حرام۔ عزیزانِ من! یہ بحثیں اسلامی نہیں ہیں۔ غیر اسلامی نظام کے اندر اسلامی بحثوں کا دخل کیا ہے۔ قرآن نے یہاں یہ کہا کہ **وَ مَآ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ رِّبًا لِّیَرۡبُوَا۟ فِیۡۤ اَمۡوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرۡبُوۡا عِنۡدَ اللّٰهِ (30:39)** تم جو اس طرح سے کسی کو کچھ دیتے ہو اور اُس کے بعد اُس میں سے زیادہ لیتے ہو تو سمجھتے یہ ہو کہ یہ سو کا سوا سو ہو گیا' یہ دولت بڑھ گئی۔ کہا کہ تمہارے تصور کے مطابق یہ بڑھ گئی ہے لیکن خدا اور رسول کے نظام کے مطابق یہ بڑھا نہیں ہے بلکہ یہ گھٹ گیا ہے۔

محنت کے بغیر حاصل کردہ دولت خداداد انسانی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتی ہے

اُس نے کہا یہ تھا کہ **لَیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (53:39)** معاوضہ ہر فرد کا محنت کا ہے۔ یہ جتنے افراد کسی کو کچھ دے کر آرام سے بیٹھ جاتے ہیں اور خود کچھ محنت نہیں کرتے بلکہ دوسرے کی محنت کا استحصال کر کے کچھ لیتے ہیں' وہ کہتا ہے کہ قوم میں ایسے افراد موجود ہو جائیں جو محنت کچھ نہ کریں اور زیادہ سے زیادہ کمائیں تو اس سے قومی دولت کم ہو جاتی ہے۔ قومی دولت اُس صورت میں بڑھتی ہے کہ جو کام کرنے والے افراد ہیں ان کی صلاحیتوں کی نشو و نما کی جائے' ان کی پرورش کی جائے' ان کو اچھی غذا دی

---

[1] یہ حضرت عمر فاروقؓ (581-644/45AD) کا واقعہ ہے۔

جائے ان کے لیے اچھے حالات پیدا کیے جائیں۔ اسلامی نظام کی بنیاد یہ ہے۔ اب ایک تو یہ ہے کہ کوئی فرد ایسا نہ ہو جو محنت کرنے کے قابل ہو اور محنت نہ کرے۔ یہاں اصول **لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى** (53:39) ❶ کا ہے۔ ان کو تو روٹی بھی نہیں مل سکتی جو محنت کرنے کے قابل ہوں اور محنت نہ کریں۔ جب اُس نے ہر فرد کو محنت کرنے والا بنایا ہے تو اگر اُس نظام کے اندر یا اُس مملکت میں ایسے لوگ ہونگے جو محنت نہیں کریں گے اور کھائیں گے تو اُس سے دولت کم ہو جائے گی۔ یعنی لائے کچھ نہیں اور اُس دولت میں سے کچھ کھا جائے تو اس سے دولت کم ہوگی۔

Investers ہوں یا Business Men یا Industrialists 'اگر ان کی جیب خالی کر دی جائے تو یہ ایک وقت کی روٹی کمانے سے عاجز دکھائی دیں گے

عزیزانِ من! جتنا بھی روپیہ Invest (لگا کر) کر کے اُس انوسٹمنٹ سے کچھ حاصل کیا جاتا ہے یہ ربٰو ہے۔ یہ جتنے بڑے بڑے Business Men '(کاروباری حضرات)' Industrialists (صنعت کار)' جاگیردار ہیں' یہ سرمائے کے اوپر کچھ لینے والے ہیں۔ اگر آج ان کے سرمائے Freeze (منجمد) ہو جائیں" تاں ایناں نوں ایک ٹائم دی روٹی کمان دا ول نئیں اوندا"۔ ❷ آپ دیکھیے کہ ملک کے اندر ایک طبقہ ہے جو ملک کی دولت میں کمائی کر کے تو کوئی اضافہ نہیں کرتا بلکہ کمائی کرنے والوں نے جو دولت ملک میں پیدا کی ہے' اُس کو بیٹھا ہوا کھاتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح دولت کم ہوگی۔ عزیزانِ من! قرآنِ کریم کے دو الفاظ ہیں' کیا بات ہے قرآنِ کریم کی! کہا کہ **يٰٓـاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا** (3:130) اے جماعتِ مومنین! ربٰو مت کرو۔ آگے ہے کہ **اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً** (3:130) ۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس کا ترجمہ کیا کیا جاتا ہے؟ کوئی ترجمہ' کوئی تفسیر اٹھا کر دیکھ لیجیے آپ کو یہی ملے گا کہ سود در سود نہ کھاؤ۔ یہ بحثیں ہیں کہ قرآن نے سود در سود سے منع کیا ہے' سادہ سود سے منع نہیں کیا۔ میں نے کہا ہے کہ جب ایک دفعہ گاڑی دوسری پٹڑی پہ جا پڑے تو جتنی تیزی سے چلتی جائے گی اپنی منزل سے دور ہٹتی چلی جائے گی۔

---

❶ انسان کو وہی نتائج مل سکیں گے جن کے لیے اس نے محنت اور کوشش کی ہوگی۔ جیسی جدوجہد' اسی قسم کے اس کے نتائج۔ خدائی پیمانے کے مطابق معاوضہ صرف محنت کا ہوگا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔244)۔

❷ انہیں تو ایک وقت کی روٹی کمانے کا ڈھب بھی نہیں آتا۔

ربٰو کے نظام کا ماحصل ہمیشہ دولت اور صلاحیتوں کی کمی کی شکل میں ظاہر ہوا ہے

یہ **اَضۡعَافًا مُّضٰعَفَةً (3:130)** ہے۔ عربی زبان جانے والے جھوم جائیں۔ کہا ہے کہ تمہارے ذہن میں یہ ہے کہ اس ربٰو سے دولت بڑھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے دولت بھی گھٹتی ہے اور کمانے کی صلاحیتیں بھی ماند پڑ جاتی ہیں۔ وہ کہنا ہی یہ چاہتا ہے کہ تم فریبِ نفس میں مبتلا ہو کہ اس سے دولت بڑھ جاتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ اُس فرد کی کمانے کی صلاحیتیں مضمحل ہوجاتی ہیں اور قوم کی دولت کم ہوجاتی ہے۔ کہا کہ **وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ (3:130)** ڈرو اس کے انجام سے۔ اب دیکھیے قرآن ربٰو کے مقابلے میں کیا لفظ لاتا ہے۔ **وَ مَآ اٰتَيۡتُمۡ مِّنۡ رِّبًا لِّيَرۡبُوَاۡ فِىۡۤ اَمۡوَالِ النَّاسِ (30:39)** خدا کے معیار اصول اور نظام کے مطابق یہ دولت ربٰو سے بڑھتی نہیں ہے۔ **وَ مَآ اٰتَيۡتُمۡ مِّنۡ زَكٰوةٍ تُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُضۡعِفُوۡنَ (30:39)** دولت زکٰوۃ سے بڑھتی ہے۔ تو ربٰو کے برعکس وہ جو لفظ لایا ہے وہ زکٰوۃ کا لفظ ہے۔

مروجہ تراجم نے قرآن کے معاشی نظام کی اصطلاحات کو بدل کر رکھ دیا

انہوں نے ربٰو کا ترجمہ سود کیا' پھر سود کی بجائے منافع کیا اور اُسی کے اندر پہلے مزارعت لائے یعنی اگر آپ کسی مزارع کو زمین خرید کر دیدیتے ہیں تو اُس سے آدھی بٹائی تمہاری ہے۔ Sleeping Partner (غیر کارگزار پتی دار) کی حیثیت سے گویا اگر آپ کسی بزنس (کاروبار) میں **Invest** (سرمایہ لگا) کردیتے ہیں تو اُس کے منافع میں جو کچھ مقرر کردہ وہ شیرِ مادر کی طرح حلال ہے۔ انہوں نے بہرحال ربٰو کو یہ کیا۔ اس سے تو پوچھو نہیں کہ کتنی دولت آتی ہے۔ اب اُس کے بعد کہا کہ ربٰو حرام ہے۔ اس کے مقابلے میں کہا کہ تم زکٰوۃ دیدو تو جتنا روپیہ تم جمع کرو گے وہ سارے کا سارا شیرِ مادر کی طرح حلال ہوجائے گا۔ اور زکٰوۃ کے متعلق یہ قانون بنالیا کہ اس میں **2.5%** دیدیا جائے تو وہ زکٰوۃ ہوتی ہے۔

اگر ربٰو کا کتا پانی میں ہی رہے تو زکٰوۃ کے اڑھائی ڈول نکالنے کا کیا مقصد؟

اس سارے مال میں سے جو اس طرح سے جمع کیا ہے کہ جو اپنی محنت سے نہیں لیا گیا خواہ وہ مزارعت سے ہو' مضاربت سے ہو' بینک کے منافع سے ہو' تو فتویٰ یہ ہے کہ اس دولت کی حد بندی نہیں کی جاسکتی اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کس حد تک تم یہ دولت جمع کر سکتے ہو۔ اس سارے کے سارے کو حلال کرنے کے لیے اس میں اڑھائی پرسنٹ دیدیا جائے تو باقی سارا حلال وطیّب ہوجاتا ہے۔ یہ سراسر ربٰو کے نظام سے اکٹھی کی ہوئی دولت ہے اور اُس میں سے اڑھائی پرسنٹ دیدیا جائے تو ان کے نزدیک حلال وطیّب ہوجاتا ہے۔ جاکر مولوی صاحب سے مسئلہ پوچھا کہ پانی میں کتا گر گیا ہے اب کیا کریں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ اُس میں سے

پچاس ڈول نکال دو تو وہ حلال ہو جائے گا۔ انہوں نے اُس میں سے وہ پچاس ڈول نکال دیئے۔ اُس کے باوجود پانی کو دیکھا تو پتہ چلا کہ اتنے میں کتا پھول کر پھٹ بھی گیا تھا' اُس میں بو بھی آتی تھی اور کچھ ذرے بھی نکلے تھے۔ اب کسی ہیلتھ آفیسر نے اس پانی کے متعلق پوچھا کہ اس میں کتا گر گیا تھا تو تم نے کیا کیا؟ کہنے لگے کہ مولوی صاحب سے فتویٰ پوچھا تھا تو اُنہوں نے کہا تھا کہ پچاس ڈول نکال دو تو حلال وطیّب ہو جائے گا۔ آفیسر نے کہا کہ پچاس ڈول تو نکال دیئے ''وچوں کتا وی کڈیا کے نہیں' کہندے کہ اے تے مولوی صاحب نے کہیا ای نہیں سی ہیگا''۔ ❶ اڑھائی فیصد کے حساب سے ڈول نکال دو اور ربوٰ کے نظام کا کتّا اُسی طرح رہنے دو۔

مذہب کے معاشی نظام کو قرآن کا معاشی نظام سمجھتے ہوئے اہلِ مغرب کی تنقید

عزیزانِ من! میں کچھ خوش ہو کر یہ باتیں نہیں کہتا۔ زندگی کا آخری دور ہے' میرے دل کی چیخیں ہیں جو نکل رہی ہیں۔ مجھے نہ ان لوگوں کے فقہ سے کوئی واسطہ ہے نہ' ان سے واسطہ ہے' مجھے واسطہ اس سے ہے کہ اسلام دنیا میں بدنام ہو رہا ہے۔ میری تو بدبختی یہ ہے کہ میں ان مغرب والوں کے خیالات پڑھتا ہوں۔ وہ جو آپ کے اکنامک سسٹم کے اوپر تنقید کرتے ہیں تو میری نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں کہ وہ اسلام کے متعلق یہ سب کچھ کہتے ہیں۔ اور اس سارے معاشرے کے مجرم یہ لوگ ہیں جو اس کو اسلام کہہ کر دنیا میں پھیلا رہے ہیں۔ کہا کہ **أُولَـٰئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ (30:39)** اس سے اضافہ نہیں ہوتا بلکہ اضافہ زکوٰۃ سے ہوتا ہے۔

ہر فرد کی معاشی ذمہ داری مملکت کو پوری کرنا ہوگی

زکوٰۃ کے لفظی معنی بھی قرآن سے یہ ہیں کہ کام کرنے والوں کو سامانِ نشوونما مہیا کرو۔ روٹی کی فکر دور کر دو' یہ پریشانی نہ رہے' ان کو اس کی فکر ہی نہ ہو کہ شام کو گھر جاؤں گا تو بچے بلک رہے ہونگے۔ یہ اپنے ذمے لو' قرآن کے نظام کی رو سے ہر فرد اور اس کے بچوں کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔ یہ نظام کی بنیاد ہے۔ زکوٰۃ کے یہ معنی ہیں کہ ان سب کی نشوونما کرو۔ ایسا جامع لفظ زکوٰۃ قرآن نے کہا ہے' نہ روٹی کہا ہے نہ کپڑا کہا ہے نہ مکان کہا ہے نہ میڈیکل ایڈ کہی ہے بلکہ ایک جامع لفظ ہے زکوٰۃ کہ سامانِ نشوونما اور یہ نشوونما بھی صرف Physical (جسمانی) نہیں ہے کہ اُسے پہلوان بنا دو بلکہ نشوونما میں ذہنی صلاحیتیں بھی ہیں' قلبی صلاحیتیں بھی ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی اہلِ جنت کو سامانِ نشوونما ملتا جائے گا۔ وہاں تو یہ روٹی والی بات نہیں ہے۔ وہاں سامانِ نشوونما کیا ہے؟ وہاں انسان کی اور صلاحیتیں ہیں جنہوں نے آگے بڑھنا ہے۔ تو اس چیز کے لیے زکوٰۃ جامع لفظ ہے کہ ان کو سامانِ نشوونما دیتے چلے جاؤ۔ یہ دیتے چلے جاؤ گے تو پھر تم دیکھو گے کہ کس طرح سے قوم کی دولت بڑھتی ہے۔

---

❶ پچاس ڈول پانی تو نکال دیا' یہ بتاؤ کہ اس میں سے کتا بھی نکالا تھا یا نہیں؟ کہنے لگے کہ مولوی صاحب نے یہ تو کہا ہی نہیں تھا۔

قوموں کے اندر کمانے کی استطاعت کیونکر کمزور پڑتی ہے

دو سو سال پہلے کی بات ہے کہ اُس ❶ نے "Wealth of Nations" کتاب لکھی تھی وہ آج بھی بڑی اسٹینڈرڈ کی کتاب مانی جاتی ہے۔ اُس میں مسئلہ یہ ہے کہ فرد کی انکم کا سوال نہیں ہوتا بلکہ قوم کی دولت کا سوال ہوتا ہے۔ قرآن وہ طریق بتاتا ہے جس سے قومی دولت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ وہ ہوتی اس طرح سے ہے کہ جو افراد کمانے والے ہیں وہ کماتے نہیں ہیں تو ان کی محنت کرنے کی صلاحیتیں اور استطاعت دن بدن مضمحل ہوتی چلی جاتی ہیں، وہ کسی کام کے قابل نہیں رہتے۔ اور دوسری طرف جو محنت کرتے ہیں تو ان کی محنت کی کمائی کا ایک حصہ ان کمائی نہ کرنے والوں کے لیے چلا جاتا ہے۔ یہ محنت کرنے والے بھوکے مر جاتے ہیں اور وہ محنت نہ کرنے کی وجہ سے سہل انگار ہو جاتے ہیں۔ قومی دولت میں اسی وجہ سے کمی واقع ہوتی ہے۔

بھوک کا خوف ختم ہونے پر انسانی صلاحیتیں کہیں زیادہ نشوونما پاتی ہیں

کہا کہ سوال یہ ہے کہ کسی کی کمائی میں سے کوئی شخص کچھ نہیں لے سکتا اور ہر فرد کی نشوونما کی ضروریات کی ذمہ داری مملکت کے پاس ہوتی ہے۔ اب نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت ہوتی ہے نہ خوامخواہ کسی کی مت ماری ہوئی ہے کہ روپیہ جمع کر کے رکھے اور رکھے تو اُس کو کیا کرے کیونکہ کوئی مکان نہیں بنا سکتا کہ جس کو کرائے پہ دے، کوئی زمین نہیں لے سکتا کہ جس کو پٹے پہ دے، انوسٹ نہیں کر سکتا کہ جہاں سے منافع لے۔ قرآن نے کہا کہ ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری لیتے چلے جاؤ، خود لو اور اُس کو اُس کام کے لیے فارغ کر دو جو کام اُس کے سپرد ہے پھر دیکھو کہ وہ کتنا کام کرتا ہے۔ رزق بہم پہنچاؤ۔ عربی میں رزق کے معنی سامانِ زندگی تو ہے لیکن اُس میں عربوں کے ہاں شرط ہے کہ سامانِ زندگی جو بروقت دیا جائے اُسے رزق کہتے ہیں۔ وہ رزق دیتا ہے تو بروقت دیتا ہے۔

جو قوم اپنا رشتہ قرآنی نظام سے وابستہ رکھے تو اس کی خزاؤں میں بھی بہار کا عنصر پوشیدہ ہوتا ہے

کہا کہ یہ ہے زکٰوۃ جو ہم نے کہا ہے کہ ''سامانِ نشوونما کی ذمہ داری لو''۔ **فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (30:39)**۔ پہلے سے سارا نظامِ کائنات یہ لیے چلا آ رہا تھا جس سے یہ نتائج اخذ کر کے آگے اُس نے بہم پہنچائے تھے کہ دیکھتے ہو کائنات کی ہر شے خدا کے قوانین کے تابع چلتی ہے۔ خزاں بھی آتی ہے تو درخت روتا نہیں ہے کیونکہ اُسے پتہ ہوتا ہے کہ اُس کی ٹہنیوں کے اندر

---

❶ اس کتاب کے مصنف کا نام آدم سمِتھ (Adam Smith: 1723-1790 AD) ہے۔

بہار پوشیدہ ہے لیکن جو ٹہنی درخت سے ٹوٹ کر گر گئی پھر اُس کے نصیب میں بہار نہیں ہوتی کیونکہ اُس نے قانونِ خداوندی سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے۔ یہ بات پیچھے سے چلی آ رہی تھی۔ یہاں تک قرآن لایا کہ سامانِ رزق دیتے چلے آ ؤ۔ اب کہا کہ آ ؤ ہمارے نظام کی طرف دیکھو تو سہی کہ **اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ ثُمَّ رَزَقَکُمْ** ❶ (30:40)۔ دیکھتے ہو ہمارا نظامِ معیشت۔ پیدا ہونے سے پہلے کی بات تو تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہے لیکن ہوتا یہی ہے۔

رحمِ مادر میں ایک جرثومے سے انسانی جسم کی تکمیل اور اس کی پرورش کا حیرت انگیز کرشمہ

عزیزانِ من! آج تک یہ بڑے بڑے سائنٹسٹ محوِ حیرت ہیں کہ رحمِ مادر میں ایک ذرا سا جرثومہ جو Naked Eye (خالی آنکھ) سے دیکھا بھی نہیں جا سکتا' کس طرح سے ایک پورا انسانی بچہ بن جاتا ہے۔ گوشت پوست' اندر کے اعضاء' دماغ' ہڈیاں' قلب' ان سب چیزوں کی کہاں سے پرورش ہوتی ہے' کیسے پرورش ہوتی ہے۔ یعنی سینکڑوں کی تعداد میں یہ عناصر ہوتے ہیں جن سے کہیں یہ خون بنتا ہے یا انسان کا جسم بنتا ہے۔ کہا کہ یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ بچے کی پیدائش سے دس منٹ بھی پہلے یہ رزق کے جو چشمے تھے وہ رواں نہیں تھے' جونہی وہ اس دنیا میں آیا تو اُس کا پہلے نظام سے رشتہ منقطع ہوا۔ یہاں آنے کے بعد اگر ایک سانس کے لیے بھی ہوا نہ ہو تو بچہ مر جاتا ہے۔ کہا کہ اُس کے پیدا ہونے سے پہلے ہم نے ہوا بنائی' روشنی بنائی' حرارت بنا دی اور اُس کے ساتھ ہی رزق کے چشمے رواں کر دیئے۔ وہاں انہیں رواں کیا ہے اور اس بچے کے اندر' جس کو اس سے پیشتر پتہ نہیں تھا کہ میں نے ماں کے تھنوں سے دودھ پینا ہے' تو یہ چیز اس کو کس نے سکھائی؟ اندر رحمِ مادر میں تو یہ بات نہیں جانتا تھا' اندر تو نہ یہ تھن تھے اور نہ یہ دودھ پیتا تھا۔ باہر آتے ہی کونسے استاد نے یہ بات کہی کہ اب وہ بلک کر چھاتیوں کی طرف جاتا ہے۔ رزق مل رہا ہے' بروقت مل رہا ہے۔ یہ نظامِ قدرت ہے۔ گوالا جو دودھ لاتا ہے تو گھر والے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ تُو نے اس میں پانی ڈالا ہے' وہ کہتا ہے کہ حرام ہے جو ایک قطرہ بھی پانی ڈالا ہو' اصل میں وہ بھینس نئی بچہ والی ہے' اس لیے اس کا دودھ پتلا ہے۔ یہ جو بچہ پیدا ہوا ہے تو اُس میں ابھی ہضم کرنے کی قوت بڑی کم ہوتی ہے تو یہ جو شروع میں پہلے دودھ آتا ہے تو اُس میں پانچ فیصد غذا ہوتی ہے اور پچانوے فیصد پانی ہوتا ہے۔ اور آپ حیران ہونگے کہ جوں جوں اس کے معدے کی قوتِ ہاضمہ بڑھتی چلی جاتی ہے تو اندر ایک مشینری از خود لگی ہوئی ہے وہ پانی کم کرتی چلی جاتی ہے اور دودھ گاڑھا کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ کون کرتا ہے؟ عزیزانِ من! رزق'

---

❶ یہ قانون اس خدا کا ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا اور سب کے لیے رزق (سامانِ زیست) مہیا کیا۔ (لہٰذا' جب رزق سب کے لیے ہے تو اس کی تقسیم بھی اس طرح ہونی چاہیے کہ اس سے سب کی نشوونما ہو جائے)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔939)۔

مناسب نشو ونما' وہ بروقت دے رہا ہے۔ یہ جو آپ کے ہاں Powder (پاؤڈر) دودھ کے ڈبے بنے ہوئے ہیں تو ان کے باہر جو چارٹ لگا ہوا ہوتا ہے کہ پہلے مہینے میں دودھ کی اتنی چمچیاں اور اتنے چمچ پانی کے' تو جوں جوں بچہ بڑا ہوتا جاتا ہے وہ دودھ کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں اور پانی گھٹاتے چلے جاتے ہیں۔ یہ انہوں نے جو چارٹ بنایا ہے تو یہ ماں کے دودھ کا Analysis (تجزیہ) کر کے بنایا ہے۔

پیدائش سے پہلے رحمِ مادر میں کوئی بچہ بھوک سے نہیں مرتا

کہا کہ **اَللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ ثُمَّ رَزَقَکُمۡ (30:40)**۔ اوکم بختو! اپنے ہاں یہ نظام رائج کرو۔ جتنی دیر تک یہ بچہ ہمارے کائناتی قانون کے اوپر ہے تو ہم حیوان کے بچے کو اور انسان کے بچے کو اس طرح سے رزق دیتے چلے جاتے ہیں۔ اُس کے بعد حیوان کا بچہ انہی کے ساتھ آزادی سے کھاتا پیتا ہے' وہاں کسی نے لکیریں نہیں کھینچی ہوئیں۔ اب جو انسانی بچہ تمہارے بس میں پڑ گیا تو دوسرے ہی دن بھوکا رہتا ہے کہ دودھ والا دودھ نہیں لایا کیونکہ اس کا بل نہیں دے سکے تھے اس لیے اُس نے دودھ بند کر دیا ہے۔ دنیا کی پچاس فیصد آبادی آج بھی رات کو بھوکا سوتی ہے۔ خدا کے نظام میں تو کوئی بچہ بھوکا نہیں سوتا۔ زکوٰۃ کے معنی اب آپ نے سمجھ لیے کہ **اَللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ ثُمَّ رَزَقَکُمۡ (30:40)**۔ ذرا سوچو کہ تمہارے نظام میں یہ نقص کہاں واقع ہوتا ہے؟ **ثُمَّ یُمِیۡتُکُمۡ (30:40)** ہمارا طبعی قانون ہے اور اُس کے مطابق ایک دن اس جسم کی مشینری نے چلنا بند کر دینا ہے' اسے موت کہتے ہیں۔

حیوانی اور انسانی زندگی میں ایک بنیادی فرق ہے

کہا کہ اگر تصورِ حیات یہ ہے کہ بچہ پیدا ہوتا ہے' کھاتا پیتا ہے' بڑھتا پھولتا پھلتا ہے' جوان ہوتا ہے' بوڑھا ہوتا ہے' مر جاتا ہے اور اس کے بعد انسانی زندگی ختم ہو جاتی ہے تو حیوان کے ساتھ بھی یہی بیتتی ہے اور انسان کے ساتھ بھی یہی بیتتی ہے۔ اگر یہ تصورِ حیات ہے تو اب آپ کا نظام حیوانی سطح پہ آ گیا۔ حیوانی سطح یہ ہے کہ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔ شیر کی قوت اگر بڑھی ہوئی ہے تو اُس کی موجودگی میں کوئی اور جانور شکار نہیں کر سکتا۔ البتہ حیوان میں بھی اتنا ہوتا ہے کہ اپنی ضرورت کے مطابق خون پیتا ہے' گوشت کھاتا ہے اور باقی دوسروں کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ وہاں Law (قانون) قوت ہے' جس میں جتنی قوت ہے وہ اتنا ہی تسلط رکھتا ہے۔ کہا کہ اگر زندگی کا تصور حیوانی ہے کہ پیدا ہوا اور اس نے اپنی زندگی بسر کی' پھر اس نے مر جانا ہے' ختم ہو جانا ہے تو پھر کسی Value (قدر) کی' کسی انسانیت کے شرف کی کسی قسم کا' کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس نے جتنا چھین لیا' جھپٹ لیا وہ اس کا ہے۔ یہ ہے ایک سیکولر نظام کہ اس میں سارا مال جمع بھی کرنا ہے' دوسروں کی کمائی کو چھین بھی لینا ہے' دوسروں کو بھوکے بھی مار دینا ہے'

محتاج بھی کر دینا ہے، محکوم بھی بنا دینا ہے۔ یہ سارا نظام اس لیے ہے کہ زندگی کا تصور یہ ہے کہ مر گئے اور معاملہ ختم ہوگیا۔ ''ایہہ جہان مٹھا، اگلا کن ڈٹھا'' ❶۔ اس اتنی سی چیز سے پھر ہر چیز جائز ہوجاتی ہے۔ اور زندگی کا دوسرا تصور یہ ہے کہ جسم پہ تو موت وارد ہوتی ہے لیکن جسے انسان کہا جاتا ہے وہ اس کے بعد بھی زندہ رہتا ہے اور جو کچھ اس نے یہاں کیا ہوا ہوتا ہے اُس کے مطابق اُس کے نتائج اُس نے وہاں بھگتنے ہوتے ہیں۔ یہ جو تصورِ حیات ہے کہ انسان یہاں جو کچھ کرتا ہے اگر یہاں اُس کے نتائج سے وہ کسی طرح بچ جاتا ہے تو وہ سوسائٹی کے قوانین ہیں۔ پہلے تو ان قوانین کی صورت یہ ہے کہ اگر سوسائٹی ربا کو جائز قرار دیتی ہے تو یہ کوئی جرم ہی نہیں ہے، اگر وہ اس کو جرم قرار دیتی ہے تو بچنے کی تدبیریں موجود ہیں لیکن اگر Concept of Life (تصورِ حیات) یہ ہے کہ

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

(غالب)

مجھے کسی کے سامنے جا کر ایک ایک قطرے کا حساب دینا ہے پھر انسان یہاں حیوانی سطح کی زندگی بسر نہیں کرتا، اور پھر Law (قانون) جنگل کا نہیں ہوتا بلکہ Law of Values (اقدار کا قانون) ہوتا ہے۔ اور Value (قدر) یہ ہے کہ کسی دوسرے کی محنت سے کچھ بھی استحصال کرنا بدترین جرم ہے جس کا مواخذہ خدا کے ہاں ہوگا۔ فرد کی سطح پہ اور مملکت کی سطح کے اوپر بھی یہی نظام ہے۔ حضرتِ عمرؓ (581-644/ 45 AD) نے ایک فقرے میں بات بتا دی۔ ان سے پوچھا گیا کہ خلافت کیا ہوتی ہے؟ کہنے لگے کہ میں تو اتنا ہی سمجھتا ہوں کہ خدا کے ہاں اس کی جوابدہی ہے کہ ''کہاں سے لیا تھا اور کہاں خرچ کیا تھا''؟ کیا نگاہیں تھیں ان لوگوں کی! کہا کہ اگر اس کا جواب اطمینان بخش دیدیا گیا تو وہ خلافت بھی ہے اور وہ جو خلیفہ ہے یہ بچ بھی گیا اور اگر اس Audit (آڈٹ) میں وہاں کوئی سقم رہ گیا تو نماز روزہ نہیں بخشوا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ اس نظام میں نماز روزہ کا مقام اور اہمیت کیا ہے؟

نظام کو عملی شکل دینے کے سلسلہ میں نماز روزہ کا مقام اور اس کی اہمیت

عزیزانِ من! یہ جو میں نے نماز روزہ کہا تو ان کی اہمیت بھی کم نہیں ہے۔ ان کی تو اتنی ہی حیثیت ہے کہ مثلاً اگر آپ ایک بڑھئی کو دس بیس یا چالیس روپے ❷ دیہاڑی پہ لاتے ہیں۔ اُس سے آپ نے ایک دروازہ بنوانا ہے۔ وہ شروع میں آ کر اپنے تھیلے

---

❶ یہ جہاں میٹھا ہے اگلا جہان کس نے دیکھا۔

❷ یاد رہے یہ بات ستمبر 1979 کی 28 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

سے پتھر کی سل نکالتا ہے اور اپنے اوزار تیز کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اگر وہ بڑھئی سارا دن اپنے ان اوزاروں کو تیز کرتا رہے اور شام کو آپ سے کہے کہ لائیے چالیس روپے تو کیا آپ اُسے دیدیں گے؟ دروازہ بنانے کے لیے یہ اوزار تیز کرنا ضروری تھا' مگر وہ دروازہ تو بنائے نہیں اور سارا دن اوزار تیز کرتا رہے تو کیا اس سے دروازہ بنانے کا وہ مقصد پورا ہو جائے گا؟ عزیزانِ من! یہ جو نماز روزہ ہے' یہ تو ان ہتھیاروں اوزاروں کو تیز کرنے کے لیے ہیں تاکہ تم دروازہ بنا کر لگا سکو۔ یہ پتھر کی سل بھی ضروری ہے لیکن مقصود بالذات نہیں ہے' مقصود بالذات تو دروازہ بنانا ہے' مزدوری دروازے کی ملنی ہے۔ تصورِ حیات یہ ہے کہ میں نے جوان سے معاملہ کیا ہے کہ چالیس روپے لونگا اور ان کا دروازہ مجھے بنا کر دینا ہے۔ اور یہ چیز یہی نہیں ہے کہ آج شام ختم ہوگئی اور معاملہ ختم ہوگیا بلکہ یہ جوان کے ساتھ اقرارنامہ ہوا ہے تو وہ شام اور سویر کا سوال ہی نہیں ہے وہ مقصود تو دروازہ بنانا ہے۔ اسی طرح یہاں سے زندگی کے ختم ہونے کا سوال بھی نہیں ہے بلکہ زندگی اس سے بھی آگے چلے گی تو یہ نماز روزہ مقصود بالذات نہیں ہے ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہ تصورِ حیات ہے کہ **ثُمَّ يُحْيِيكُمْ** **(30:40)** پھر زندہ بھی ہونا ہے۔

خدائے علیم وخبیر اس نظامِ کائنات کو صرف آئینی قوت کے ساتھ کنٹرول کرتا ہے

قرآن کریم نے کہا ہے کہ **هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ** **(30:40)** بتاؤ کوئی اور ہستی بھی ایسی ہے جو تمہارے لیے ایسا نظام پیدا کر دے۔ ٹھیک ہے ماں کا دودھ نہیں دیتے' ڈبے کا دودھ دیتے ہو تو ڈبے کا دودھ بھی تو خدا کا پیدا کردہ ہے کہ وہ جو گائے اور بھینس میں دودھ ہے' یہ اُسی کی شکل ہے۔ اصل یعنی اوریجن کے اعتبار سے تو یہ سارا رزقِ خداوندی ہے تم تو صرف شکل ہی بدلتے ہو' رزق تو وہی ہے جو گیہوں کا دانہ ہے جس سے تم نے ڈبل روٹی بنالی۔ پوچھا کہ کیا کوئی اور ایسی ہستی ہے جو رزق کی یہ بنیادی چیزیں تمہیں مہیا کر سکے۔ یہ چیزیں ایک مقصد کے حصول کے لیے مہیا کی تھیں۔

بقا اسی نظامِ حکومت کو ہوگی جو پوری نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش ہوگا

قرآن کہتا ہے کہ **اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ** **(13:17)** اُسی عمل کو' اُسی کام کو' بقا حاصل ہوگی جو نوعِ انسانی کے فائدہ کے لیے کیا جائے۔ جن اعمال میں اپنی نجات ہوگی وہ اسلامی نہیں ہے' وہ مذہب کی چیزیں ہیں۔ تم نے رندے کو تیز کرنا ہے' تیز اس لیے کرنا ہے کہ اس سے انسانیت کا بھلا ہو۔ کیا اس ذاتِ خداوندی کے علاوہ کوئی اور ایسا ہے؟ **سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ** **(30:40)** جاؤ' نگاہ دوڑا کر دیکھو' کوئی اور تمہیں ایسا نہیں ملے گا جو اس کی اس صفتِ رزاقیت کے اندر شامل ہو۔

اب اُس کے دیئے ہوئے رزق کے متعلق اس نے کہا ہے کہ یہ تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے اور وہ رب العٰلمین ہے۔ اُس کے اس دیئے ہوئے رزق کو جب تم سنبھال لو تو اُس میں سے آدھے انسانوں کو تو دو اور آدھے انسان بھوکے مر جائیں تو تم نے تو خدائی کا دعویٰ کر دیا۔

عزیزانِ من! سورۃ البقرہ کے شروع میں ہی جہاں زمین کا سوال ہے کہ ہم نے اس کو انسانیت کی بہبود کے لیے پیدا کیا' کہا کہ **فَـلَا تَـجْـعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا** (2:22) خدا کے ہمسر اور خدا نہ بناؤ کہ ہم نے انسانیت کی پرورش کے لیے پیدا کیا ہے اور تم اُس کو سمیٹ کر بیٹھ جاؤ۔ یہ دوسرا خدا بنا لینا ہے۔ کہا کہ جب بنیادی طور پر جو ذرائع رزق اور وسائلِ رزق ہیں' وہ صرف خدا کے ہیں' کسی انسان کے بنائے ہوئے نہیں ہیں' تو کسی انسان یا انسانوں کے نظام کو یہ حق کیسے پہنچتا ہے کہ اُس کی تقسیم اپنی مرضی کے مطابق کرے۔ جس دن بھی کوئی پوسٹ مین منی آرڈرز کی تقسیم اپنی مرضی کے مطابق کرے گا تو دوسرے دن وہ جیل خانے میں ہوگا۔ وہ تو اُسے اُس پروگرام کے مطابق تقسیم کرنے ہیں جو وہاں سے ملا ہے۔ اُس کا اپنا حصہ تو وہ چار پیسے تنخواہ کے ہیں جو اس کو تقسیم کرنے کے مل رہے ہیں۔

انسانی ضرورتوں کو متعین کرنے کا فارمولا

میرے پاس جب دوست آتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ ہر ایک کی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے اور ضرورت سے جو زائد ہے وہ دوسروں کے لیے دیا جاتا ہے' وہ کہتے ہیں کہ صاحب! اگر ایک شخص اپنی ضرورتیں ہی اتنی زیادہ بڑھا دے کہ اس کے پاس کچھ بچے ہی نہیں بلکہ جو کمایا ہے وہ بھی کم ہی رہ جائے' یعنی کوٹھیاں بھی ضرورت ہے' موٹر سائیکل بھی ضرورت ہے' نوکر چاکر بھی ضرورت ہے۔ یہ ضرورتیں اگر اُس نے خود متعین کرنی ہیں تو کیسے کرے؟ ہمارے ہاں یہ مثالیں موجود ہیں کہ جو ضرورت متعین کرتا تھا وہ کیسے کرتا تھا' یہ ضرورتیں امیر المومنین متعین کرتا تھا۔ اس کی مثالیں سنیے۔ سب سے پہلے خلیفۃ المسلمین حضرت ابوبکر صدیقؓ (573-634ء) خلافت سنبھالنے کے دوسرے دن حسبِ معمول کپڑا بیچنے کے لیے نکلے۔ پہلے وہ کپڑے بیچا کرتے تھے۔ یہ ان کا کاروبار تھا۔ کہا کہ کدھر جا رہے ہیں؟ اُنھوںؓ نے کہا کہ کاروبار کے لیے کپڑے لے جا رہا ہوں۔ کہنےؓ لگے کہ حضرت! آج سے آپ کا سارا وقت امت کی امانت ہے اور آپ کو حق حاصل نہیں ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق اُسے صرف کریں۔ تو پہلی دفعہ یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ جو ہیڈ آف دی سٹیٹ یا سربراہِ مملکت ہے اس کا وظیفہ کیا ہونا چاہیے۔ اُنھوںؓ نے کہا کہ بھئی! یہ مجھ پہ چھوڑ دو اور کہا کہ مدینے میں ایک مزدور کی کم از کم اجرت جتنی ہے تو میرا وظیفہ بھی اتنا ہی مقرر کر دو کیونکہ میں امت کا مزدور ہوں۔ کہا کہ اس

میں گذارہ کیسے ہوگا؟ جواب دیا کہ جیسے اُس مزدور کا گذارہ ہوتا ہے۔ کہنے لگے اگر مزدور کا گذارہ نہ ہوا' تو؟ کہنے لگے کہ پھر میں اُس مزدور کی اجرت بڑھا دونگا تاکہ اُس کے صدقے میں میری اجرت بڑھ جائے۔ عزیزانِ من! ہمیں پتہ ہی نہیں ہے کہ خدا پر ایمان کسے کہتے ہیں' حیات بالآخرت کا ایمان کسے کہتے ہیں؟ یہ کچھ ہم جانتے ہی نہیں ہیں۔

دنیا بھر میں ہر قسم کا فساد رزق کی غلط تقسیم کی بنا پر ہی برپا ہوتا ہے

وہ رزق جس نے پیدا کیا ہے وہ تو خدا کی ذات ہے۔ یہ سارا جو کچھ دنیا میں فساد برپا ہے یہ اُس کی غلط تقسیم کی وجہ سے ہے۔ سب سے بڑا ذمہ دار اپنا وظیفہ ایک مزدور کی مزدوری جتنا ٹھہراتا ہے تو نظام خود بخود ٹھیک ہو جاتا ہے۔ کہا کہ آخرت پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے یہ تمہارا نظام غلط ہے' جس کی وجہ سے **ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ (30:41)** ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پوری دنیا کے اندر فساد ہی فساد برپا ہو جاتا ہے' ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ **بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ (30:41)** انسان خود نظام بناتا ہے تو یہ اُس کی وجہ سے ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے یہ باتیں کہی گئی ہیں جب ان کی نگاہیں جزیرۃ العرب سے ذرا آگے بھی نہیں جاتی تھیں۔ آج نظر آ رہا ہے کہ بر اور بحر کے اندر کس طرح سے عالمگیر فساد برپا ہے۔ ہمارے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ اللہ کو منظور ہی یہ ہے' تقدیر ہی یہ ہے' وہ جس قوم کو چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے' جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے' جس کا چاہتا ہے رزق تنگ کر دیتا ہے' جس کا چاہتا ہے کھلا کر دیتا ہے اور یہاں کہا ہے کہ اسکی وجہ یہ ہے کہ **بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ (30:41)** یہ ناہمواریاں خود لوگوں کی اپنی پیدا کردہ ہیں' خدا کی طرف سے نہیں ہیں۔

خدا تعالیٰ کی ذات انسانوں کو ان کی بدعملیوں کی بنا پر ساتھ کے ساتھ جھٹکا دیتی رہتی ہے

ابھی اس سے پہلے یعنی 36 ویں آیت ہی تھی جس میں کہا تھا کہ **وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ (30:36)** یہ مصیبتیں جو تمہارے سامنے کھڑی ہوئی ہیں' یہ اچانک نہیں آ گئیں بلکہ یہ پہلے سے تمہاری بھیجی ہوئی ہیں۔ یہاں کہا کہ **بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ (30:41)** یہ انسانوں کے ہاتھوں کا کیا ہوا ہے۔ خدا کا نہیں۔ اس لیے کہا کہ **لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا** [1] **(30:41)** جو نظام انہوں نے وضع کیا ہے تو اُس میں کچھ حصہ ایسا ہے جس کا ابھی ابھی ان کو بدلہ مل جائے گا۔ یہ اس لیے ہے کہ **لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (30:41)** شاید اس سے یہ نظامِ خداوندی کی طرف واپس آ جائیں۔ اگر پہلے ہی ہلّے کے

---

[1] ان کی خود پیدا کردہ ناہمواریوں کے بعض تباہ کن نتائج ان کے سامنے آ چکے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 940)۔

اندران کوختم کردے تو **لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ** (30:41) کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ یہ جو لفظ **یرجعون** ہے یہ **اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ** (2:156) سے ہی ہے کہ خدا کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔ یہ **لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ** ہے کہ ہم تھوڑا سا جھٹکا دیتے ہیں تا کہ یہ اپنے خود ساختہ نظامِ زندگی سے منہ موڑ کر ہماری طرف آ جائیں۔ اگر جھٹکا نہیں دیا جائے گا تو وہ تو نظامِ خداوندی کی طرف نہیں جائیں گے۔ عزیزانِ من! قرآن کتنی بڑی عظیم چیز کہہ گیا ہے کہ غلط نظام قائم کرتے ہیں اور جب مکافاتِ عمل کی رو سے تباہیاں آتی ہیں تو ہم یہ نہیں کرتے کہ پہلے ہی جھٹکے میں پوری کی پوری قوم کو تباہ ہی کر دیا جائے۔ اگر یہ کر دیا جائے تو

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کُشی

تو پھر تو کوئی بھی باقی نہ رہا' جس کو تُو قتل کرے۔

مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کُشی

بجز اس کے کہ ان کو پھر زندہ کرے' پھر ان کو قتل کرے۔ وہ بہت بڑا کشادہ قلب ہے' وہ تنگ نظر نہیں ہے حالانکہ **اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ** (85:12) ہماری گرفت بڑی محکم ہوتی ہے لیکن گرفت کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ جیسے ایک تنگ نظر انتقامی انسان کرتا ہے کہ ہڈیاں تک توڑ کر رکھ دے۔

می نہ سزد خدائے را

ان سبق آموز جھٹکوں کے باوجود سبق حاصل نہ کرنے والوں کا انجام

کہتا ہے کہ ہم تھوڑا سا جھٹکا دیتے ہیں تو اُن کی خود پیدا کردہ ناہمواریوں کے تباہ کن نتائج ان کے سامنے آتے ہیں۔ اگر یہ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو **لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ** (30:41) یہی نتائج اس امر کے لیے کافی محرک ہو سکتے ہیں تا کہ یہ واپس آ جائیں یعنی یہ اپنے خود ساختہ نظامِ زندگی سے منہ موڑ کر نظامِ خداوندی کی طرف رجوع کریں۔ عزیزانِ من! سزا دینے والا بھی اتنا منصف ہو۔ کہا کہ جو اس جھٹکے کے بعد بھی واپس نہیں آتے تو ان کا حشر ہم سے نہ پوچھو' یہ انہی سے جا کر پوچھو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ **قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ** (30:42) جاؤ' اقوامِ سابقہ کی اجڑی ہوئی بستیوں کے جو کھنڈرات ہیں' ان کے پتھروں کے نقوش کو پڑھو' ان کی داستانیں ان کے اوپر تمہیں لکھی ہوئی ملیں گی کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ **ظهر الفساد** جو ہوا تھا اور اُس کے بعد یہ پہلے جھٹکے کے بعد بھی باز نہیں آئے تھے تو کہا کہ ہم سے نہ پوچھو بلکہ ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات سے پوچھو۔ **كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ** (30:42) ان کا جرم یہ تھا کہ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے

قوانین کے تابع چلتے تھے۔

دینِ خداوندی کا سہارا بننے والے کو پھر کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں رہی

عزیزانِ من! 30 ویں آیت سے یہ بات شروع ہوئی تھی کہ **فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا (30:30)** ہر طرف سے منہ موڑ کر اسی نصب العین کو سامنے رکھ کر اس کے نظام کی طرف بڑھتے چلے جاؤ۔ یہ ہے الدین۔ یہ سارا کچھ کہنے کے بعد پھر یہ کہا کہ **فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ** ❶ **(30:43)** وہ دین جو بغیر کسی سہارے کے خود اپنے اعتدال و توازن پہ قائم کھڑا ہے، جو بھی اس کا سہارا بنے گا اُس میں بھی یہ صلاحیت پیدا ہوجائے کہ وہ بھی کسی غیر کے سہارے کے بغیر اپنے پاؤں پہ آپ کھڑا ہوجائے۔ یہ دینِ قیم ہے۔ اس دینِ قیم کی طرف لوٹ آؤ۔ **مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ** ❷ **(30:43)** قبل اس کے کہ وہ آخری تباہی کا وقت آجائے، جب وہ آتا ہے تو پھر لوٹ کر نہیں جایا کرتا۔ تو اب **یرجعون** کی بات سمجھ میں آئی کہ وہ پہلے جھٹکے اس لیے دیتا ہے کہ اس سے بھی کچھ ان کو تنبیہہ ہوجائے، بات سمجھ میں آجائے کہ غلط نظام کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ اگر یہ بات نہیں ہے اور اس کے باوجود تم اپنے اُسی نظام کے اوپر اور اپنی ان غلط کوششیوں کے اوپر ہو تو پھر جاؤ اقوامِ سابقہ کے انجام کو دیکھو قبل اس کے کہ وہ آخری تباہی کا دن آجائے جو آتا ہے تو پلٹ کر نہیں جاتا۔

قوموں کی آخری تباہی کے نشانات کی شکل وصورت

اب سوال یہ ہے کہ وہ آخری تباہی کیسے آیا کرتی ہے؟ یہی نہیں ہے کہ تم سوئے ہوئے تھے، صبح اٹھے تو سارے مر گئے ہوئے تھے۔ کہا کہ آخری تباہی اس طرح سے آیا کرتی ہے کہ **يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ** ❸ **(30:43)** یہ جو تم آپس میں پارٹیاں بنا لیتے ہو تو ایک پارٹی دوسرے کے مقابلے میں کھڑی ہوجایا کرتی ہے اور قوم تباہ ہوجاتی ہے۔ یہ ہوجاتا ہے تو پھر وہاں کھڑے ہوکر یہ نہ کہہ دینا کہ اللہ نے کیا کر دیا۔ قرآن میں ہے کہ جب مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ خدا نے مجھے خوامخوہ کے لیے ذلیل کر دیا۔ **مَنْ كَفَرَ**

---

❶ بہر حال، یہ لوگ جو رَوش بھی اختیار کرتے ہیں، انہیں کرنے دو۔ تم اپنی تمام مساعی کو خدا کے محکم نظام کے قیام کے لیے وقف کر دو **(30:30)**۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ **940**)۔

❷ قبل اس کے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے، ظہور نتائج (انقلاب) کی وہ گھڑی سامنے آجائے جو کسی کے لوٹائے لوٹے گی نہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ **940**)۔

❸ یہ وہ وقت ہوگا جب یہ دونوں پارٹیاں نکھر کر الگ الگ ہوجائیں گی اور ایک دوسرے کے مدمقابل آ کھڑی ہوں گی (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ **940**)۔

فَعَلَیۡهِ کُفۡرُهٗ ❶ (30:44) جو صحیح نظامِ خداوندی سے سرکشی برتتا ہے تو اُس کی سرکشی کے تباہ کن نتائج اُسے بھگتنے پڑیں گے۔

نظامِ خداوندی کے عملی نتائج کی محسوس شکل اور علامات

وَ مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنۡفُسِهِمۡ یَمۡهَدُوۡنَ (30:44) اور جو خدا کے پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کرتا ہے اسے زندگی کی آسائشیں حاصل ہوجاتی ہیں' اُسے رزق بھی ملتا ہے اور سکون کے لیے پنگھوڑے بھی ملیں گے۔ ابھی ہم نے بچے کی بات کہی ہے' بچے کو رزق بھی ملتا ہے' دودھ بھی ملتا ہے' پھر اُس کو سکون کی ضرورت ہوتی ہے تو پنگھوڑا بھی دیا جاتا ہے جس کو ہلاتے ہو تو وہ سو جاتا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے کہ **لِیَجۡزِیَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنۡ فَضۡلِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الۡکٰفِرِیۡنَ** (30:45) ایمان اور عمل صالح کا بدلہٗ خدا کے فضل وکرم سے کسی کو ملتا ہے اور کفر کی راہ انسان کو کسی دوسری طرف لے جاتی ہے' وہ راہ جو خدا کے ہاں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی۔

بات یہ ہوئی تھی کہ وہ جو آنے والی گھڑی ہوتی ہے اُس سے پہلے اُس کے لیے علامات بھیج دیجاتی ہیں' Warnings (تنبیہات) ہوتی ہیں' تنذیر ہوتی ہے تاکہ وہ اس سے آگاہ ہوجائے' خبردار ہوجائے اور اپنی روش صحیح کرلے۔ کہا کہ اسی طرح سے یہ جو صحیح نظام ہوتا ہے وہ بھی پہلے دن ہی آکر اپنے نتائج برآمد نہیں کردیتا۔ پہلے اُس کی ابتدا ہوتی ہے لیکن شروع ہی سے اُس کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات۔ ❷ وہیں سے بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس کے بعد اس کے نتائج بڑے ہی خوشگوار ہوتے ہیں اس لیے کہا کہ **وَ مِنۡ اٰیٰتِهٖۤ اَنۡ یُّرۡسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ** ❸ (30:46) بارش سے پہلے پروہ ❹ کی ہوائیں آتی ہیں۔ ہمیں شہر والوں کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا' یہ جو کسان ہیں ان سے پوچھیے۔ وہ اُس ہوا سے فوراً اندازہ کر لیتے ہیں کہ دو تین دن کے اندر اندر بارش ہونے والی ہے اور وہ اُس پروگرام کے مطابق اپنی بوائی کے لیے انتظامات کرتے ہیں۔ اتنا محکم اصول ہوتا ہے کہ اسی طرح سے چلتا رہتا ہے اگرچہ اب تو کیفیت کچھ اور ہی ہوگئی ہے۔

---

❶ جن لوگوں نے قوانین خداوندی سے انکار (کفر) کی راہ اختیار کی ہوگی اس کا وبال ان پر پڑے گا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔940)۔

❷ (مثل) ہونہار بچے کے آثار پہلے ہی اچھے نظر آتے ہیں۔

❸ قانونِ خداوندی کے مطابق چلنے کے خوشگوار نتائج ایسے ہیں' جیسے خدا ہواؤں کو بھیجتا ہے تو وہ بارش کی خوشخبری دیتی ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔941)۔

❹ پورب کی ہوا۔

موسموں کے تغیر وتبدل میں فرق

میں کہا کرتا ہوں کہ اس سے پہلے تو ہمارے شاعر رونا روتے تھے کہ

آسمان کی جو گردش ہے اُس کے ماتحت انسان کو چلنا پڑتا ہے۔ وہ یہ کچھ کہتے تھے کہ انسان آسمان کی گردش کے تحت چلتے ہیں۔ اب آسمان انسانوں کی گردش کے تحت چلتے ہیں جیسے ہماری زندگی ہمارا معاشرہ Unpredictabl (ناقابلِ پیش گوئی) ہے کہ کوئی پتہ ہی نہیں چلتا کہ کدھر دیکھیں، کچھ معلوم ہی نہیں کہ کل کیا ہوجانا ہے۔ کوئی شخص ایک دن کے لیے **Predict** (پیش گوئی) نہیں کرسکتا، جھکڑ میں کوئی نہیں بتا سکتا کہ ہوا کدھر کی چل رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہم ایسے نیچے ہوگئے ہیں، وہ آسمان ہمارے کچھ تابع ہی ہوگیا ہے کہ کوئی موسم وقت پہ آتا ہی نہیں ہے۔ مئی سے لے کر ستمبر تک جھلسا دینے والی گرمی ہے، حالانکہ اُس میں ہر آٹھ دس دن کے بعد ایک بارش ہوجایا کرتی تھی، پھر جولائی وغیرہ کے مہینے کے اندر برسات آیا کرتی تھی۔ اب سارا کچھ الٹ ہوگیا:

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

اچھے نظام کے ابتدائی دور میں بھی راحت کا عنصر موجود ہوتا ہے

یہ جو نظامِ کائنات ہے، یہ غیر متغیر ہے۔ جب بارش کی خوشخبری دینے والی ہوائیں آتی ہیں تو **وَ لِیُذِیْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ** (30:46) اُس کے بعد پھر بارش آتی ہے۔ وہ بارش تمہارے لیے سامانِ زندگی کا موجب بنتی ہے۔ اس طرح جو ابتدا ہوتی ہے، وہ خوشگوار ہواؤں سے ہوتی ہے۔ اچھے نظام کا آغاز ہی ٹھنڈی ہواؤں سے ہوجاتا ہے، بارش اُس کے بعد آتی ہے خشکی میں یہ ہوتا ہے اور اُدھر **وَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ** (30:46) اور سمندروں میں یہی ہوائیں، قانون خداوندی کے مطابق کشتیوں کو چلاتی ہیں۔ اس طرح جب بارش آتی ہے یا اُس سے بھی پہلے کشتیاں اپنے اپنے ساحل کی طرف رواں دواں چل پڑتی ہیں۔ کیوں؟ **وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ** (30:46) تا کہ تم تلاشِ معاش میں اِدھر اُدھر نکلو۔ اور اُس کے بعد پھر فضلِ خداوندی کی کشائش ہوتی چلی جاتی ہے، پوچھو نہیں کہ کتنا ملتا ہے! **وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ** (30:46) اور اس طرح یہ سب ہم اس لیے کرتے ہیں تا کہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔ اس کے برعکس غلط نظام یہ ہے کہ محنتیں کی جاتی ہیں نتیجے نہیں نکلتے۔ وہ اس لیے کہ

دانہ ایں می کارد، آں حاصل برد

کھیتی یہ کرتا ہے فصل وہ لے جاتا ہے۔

شکر اور کفر کے معنی

عزیزانِ من! ''شکر'' یہ ہے کہ ہر ایک کی محنت بھرپور نتائج پیدا کرے۔ ''کفر'' یہ ہے کہ محنت اس کی ہو مگر اس کا ماحصل کوئی لے جا کر اپنے ہاں ڈھانپ دے۔ یہاں کہا کہ **لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (30:46)** تاکہ تمہاری کوششیں بھرپور نتائج کی حامل ہوں۔ اس کے بعد پھر تاریخی شہادت آ گئی۔ وہاں پہلے کہا تھا کہ ان بستیوں کے کھنڈرات کو دیکھو۔ درمیان میں کہا کہ نظامِ خداوندی یہ کچھ کیا کرتا ہے۔ اب کہا کہ **وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا** ❶ **(30:47)** اس سے پہلے بھی ہمارے پیغامبر' یہی پیغام لے کر آئے جواب ہم دے رہے ہیں۔ غلط روش پر کاربند قوم کو انہوں نے آگاہ کیا' تنذیر دی' وارننگ دی لیکن وہ نہیں مانے' جھٹکے آئے مگر باز نہیں آئے' وہ آخر تک چلے گئے تو پھر تو بہرحال وہی جو آخری تباہی کا وقت تھا' وہ آ گیا **فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا (30:47)**. **فانتقمنا** کے معنی عربی زبان میں انتقام نہیں بلکہ عرب اپنی زبان میں جرم کی سزا کو کہتے ہیں۔ یہاں **اجرموا** کا لفظ بھی یہی بتا رہا ہے کہ یہ جرم کا نتیجہ ہے۔

خدا تعالیٰ نے مومن کی مدد کرنا اپنا فرض قرار دیا ہے

سنکھیا پھانک لینے سے جو ہلاکت ہوتی ہے وہ سزا نہیں ہوتی بلکہ انسان کے اُن اقدام کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے سزا کو بھی ''جزا'' کہا ہے اور جزا کے معنی ہی ''کسی چیز کا فطری نتیجہ'' ہوتا ہے۔ **اَجْرَمُوْا** کے بارے میں یاد رکھیے کہ بنیادی طور پہ عربوں کے ہاں کسی دوسرے کے درخت سے پھل کا خوشہ کاٹ کر اپنے ہاں لے جانا جرم کہلاتا ہے اور ''اجرموا'' اسی سے ہے۔ یہ کتنی جامع قوم تھی۔ اب اس کے برعکس جو دوسرے لوگ تھے جو حق کا نظام لے کر اٹھے' ابھی ان کی ابتدا تو **مُبَشِّرٰتٍ** کی ہواؤں جیسی ہی تھی' ساز و سامان بھی اتنا زیادہ نہیں تھا' تعداد کی بھی کثرت نہیں تھی' حتٰی کہ ان کے پاس تو ابھی سر چھپانے کو جگہ بھی نہیں تھی لیکن جب بھی کوئی جماعت حق کا نظام لے کر اٹھتی ہے تو قرآن کہتا ہے کہ وہ غالب آ کر رہتی ہے۔ اور یہاں آگے ایک فقرہ ہے جس میں کہا ہے کہ **وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (30:47)** مومن ہو تو ان کی مدد کر کے اسے کامیاب بنانا ہم پر حق

---

❶ اسی قسم کے واضح قوانین ہم' تم سے پہلے' اپنے رسولوں کی معرفت بھیجتے رہے ہیں۔ وہ ان قوانین کو اپنی قوم کے سامنے پیش کرتے (لیکن وہ ان سے سرکشی برتتی اور آخر الامر) انہیں ان کے جرائم کی وجہ سے پکڑ لیا جاتا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 941)۔

ہے' واجب ہے۔ خدا کہتا ہے کہ ہم پر واجب ہے' کتنی بڑی چیز ہے جو کہہ رہا ہے!۔ ہمارے ہاں وہ حقوق العباد اور حقوق اللہ کی بحثیں چلتی ہیں۔ ارے حقوق تو سارے ہی عباد کے' بندوں کے' ہوتے ہیں۔ یہاں کہا کہ جی نماز پڑھنا خدا کا حق ہے۔ عزیزانِ من! سارے حقوق انسانوں کے ایک دوسرے کے اوپر ہیں۔ ان حقوق کا جو ادا کرنا ہے وہ خدا کے احکام کی تعمیل ہے۔ بندوں کا حق خدا پر نہیں۔ خدا تو کہتا ہے کہ **كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا** (30:47) ہم پر تمہارا حق ہے۔ دنیا کی کسی مذہبی کتاب میں مجھے یہ چیز نہیں ملی۔ تم مومن ہو جاؤ تو پھر یہ ہماری ذمہ داری ہو جاتی ہے اور تمہارا ہم پر حق ہو جاتا ہے کہ ہم تمہیں غالب کریں۔ ہمارے ہاں پچیس سال سے' بلکہ ہزار سال سے دعائیں مانگی جا رہی ہیں کہ یا اللہ! اسرائیل کو تباہ و برباد کر دے۔ عزیزانِ من! سیدھی سی بات ہے یا تو یہ کہنا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) وہ وعدہ خلاف ہے یا ہم مومن نہیں ہیں۔

خدا تعالیٰ کی ذات بھی اگر اپنا وعدہ (معاذ اللہ) پورا نہ کرے تو اس سے بھی پوچھا جا سکتا ہے

یہ جو وعدے کی بات ہے تو قرآن کی رو سے اس کی بڑی ہی اہمیت ہے۔ یعنی انسانوں کے متعلق تو یہ تھا کہ **كَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلاً** (17:5) وعدہ تم دوسرے انسانوں سے ہی نہیں کرتے وہ تو تمہارا اور ان کا معاملہ ہے' وعدے کے متعلق ہم بھی تم سے پوچھیں گے کہ تم نے پورا کیا تھا یا نہیں۔ اور یہ کہنے سے پہلے ایک اور چیز ہے کہ **كَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُوْلًا** (33:15) جو ہم وعدہ کرتے ہیں اگر خدانکردہ وہ پورا نہ ہو تو تم ہم سے پوچھ سکتے ہو کہ کیوں پورا نہیں کیا۔ **كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ** (30:47) اسی کو خدا کا قانون' خدا کا وعدہ کہا جاتا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ یہ ''ہمارا وعدہ ہے کہ مومنین کو غالب کر کے رہیں گے' یہ ان کا حق ہے''۔ پھر یہ کیوں نہیں ہوتا؟ میں نے کہا ہے کہ یا تو (معاذ اللہ) یہ کہنا پڑے گا کہ یہ جو اُس نے کہا ہے' یہ غلط کہا ہے' وعدہ کیا ہے اور وعدہ خلافی کر رہا ہے۔ حق ادا نہیں کر رہا (معاذ اللہ)۔

خدا سے اپنا کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کی بجائے دعائیں مانگتے رہتے ہیں

اگلی شرط تھی کہ **نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ** (30:47) مومنین کے ساتھ ہم یہ کرتے ہیں۔ تو بات صاف ہو گئی کہ ہم مومن نہیں ہیں اس لیے یہ نہیں ہو رہا۔ اُس نے تو مومنین کے لیے شرط لگا دی۔ بجائے اس کے ہم یہ کوشش کریں کہ اس کے مطابق ہم مومن بن جائیں تا کہ خدا کا وہ جو حق ہے وہ پورا ہو اور ہماری مدد ہو' یہ ہم نہیں کرتے بلکہ بار بار اکٹھے ہو کر دعائیں کیے جاتے ہیں کہ یا اللہ! اسرائیل کا بیڑہ غرق کر دے۔ تیس سال سے عرفات کے میدان میں جمع ہو کر بھی یہ ہو رہا ہے۔ جس طرح خانہ بدوشوں کے لڑکے ہوتے ہیں کہ ''دے جا بابا اللہ دے واسطے''۔ یعنی تیس سال سے ان کی یہ صورت ہے اور وہاں سے پھر بھی مار پڑ رہی ہے۔ ایک دن

بھی کھڑے ہوکر اگر انہوں نے سوچ لیا ہوتا کہ وہ **نَصۡرُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ** کہتا ہے۔ اگر نصرت اس کی نہیں آتی اور اُس کے لیے تو مانگنے کی بھی ضرورت نہیں ہے وہ تو **حَقًّا عَلَیۡنَا (30:47)** کہہ رہا ہے۔ یہ نہیں کہتا کہ تم مانگو گے اور ہم بھیک کی طرح دیں گے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تو ہمارا فریضہ ہے۔ اور اگر اس طرح سے نہیں ملتا تو پھر یہ ہے کہ ہم مومن نہیں ہیں۔ ایک دن وہاں کھڑے ہوکر یہ سوچ لیتے کہ کس لیے نصرت نہیں مل رہی تو دعائیں مانگنے کی بجائے مومن بننے کی طرف آ جاتے تو ہزار بار اُس کی نصرت ملتی۔ اس لیے کہ وہ وعدہ خلافی کبھی نہیں کیا کرتا۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ الروم کی آیت 47 تک آ گئے۔ 48 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ؕ

❀❀............❀❀............❀❀

آٹھواں باب: **سورة الروم** (آیات 48 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج اکتوبر **1979**ء کی **5** تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الروم کی آیت **48** سے ہو رہا ہے:**(30:48)**

تاریخِ انسانیت میں ابلیس کا کردار

سلسلۂ کلام جو درحقیقت قرآن کریم کا بنیادی موضوع ہے وہ حق اور باطل' غلط اور صحیح نظام کے ٹکراؤ سے متعلق ہے۔اس سے پہلی آیت میں کہا گیا کہ **وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ رُسُلًا اِلٰی قَوۡمِهِمۡ** (30:47) اے رسول! یہ بات کوئی تمہارے ہی ساتھ منفرد نہیں ہوئی' یہ تو جس دن بھی کائنات کی اسٹیج پہ آدم کی نمود ہوئی تھی' اُس کے مقابل میں ابلیس کی بھی نمود ہوگئی تھی۔ابلیس نے وہیں چیلنج دیدیا تھا کہ اسے اس قدر باعثِ تکریم اور وجہ شرف بنایا جا رہا ہے' ملائکہ کا مسجود بنایا جا رہا ہے' بہت بڑا مقام دیا جا رہا ہے' ٹھیک ہے بھیجیے اسے زمین پہ' میں بھی جاتا ہوں پھر آپ دیکھیے گا کہ میں اسے کس طرح تگنی کا ناچ نچاتا ہوں۔وہ جو اس کے الفاظ ہیں وہ تو اس سے بھی زیادہ سخت ہیں' ہمارے ہاں اس کے لیے لفظ ہی نہیں ملتا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ اُس نے ایک ایسا لفظ [1] استعمال کیا تھا جس کے مفہوم کی ادائیگی کے لیے گاؤں کے بچوں کی ایک مثال ہے کہ یونہی وہ کہیں سے کوئی بچھیرا پکڑ لیتے ہیں اور بغیر زین کے' بغیر ساز کے' اُس پہ چڑھ دوڑتے ہیں' لگام بھی نہیں ہوتی' بلکہ مونج کی ایک رسی ہوتی ہے وہ اُس کی تھوتھنی سے لپیٹ دیتے ہیں اور اُس رسی کو پکڑ کر جو کچھ اُس کا حلیہ بناتے ہیں تو اس لفظ کا تصور یہی ہے۔ دنیا کا ہر فرعون یہی کرتا ہے یہ جو کیفیت ہوتی ہے' وہ اتنے استبداد' پستی' قوت' ذلت کی کیفیت و ماہیت ایک لفظ میں آتی ہے۔

ابلیس کو زندگی بھر کے لیے ضمانت دینے کا وعدہ

اس وقت ابلیس نے کہا تھا کہ تم ذرا اس کو بھیجو اور پھر دیکھو کہ میں کس طرح اس کا حشر کرتا ہوں۔کہا کہ ٹھیک ہے تم اپنی سی کر دیکھنا۔ابلیس نے کہا کہ ایک بات ہے جس کی ضمانت چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ایسا نہ ہوجائے کہ میرا ہاتھ اس کی گردن پہ ہو اور تم اُس وقت میرا ٹینٹوا دبا دو' جب تک آدم موجود رہے مجھے بھی مہلت ملنی چاہیے۔کہا کہ ٹھیک ہے' تمہیں بھی اس کی اجازت ہے۔ یعنی یہ ہے وہ جو چیلنج ہے۔بات تو قرآنِ کریم تمثیلاً سمجھاتا ہے۔ساری تاریخِ انسانیت اسی کشمکش کی تاریخ ہے۔اور اُسی میں یہ کہا کہ اے رسول! یہ تمہارے ساتھ کوئی انوکھی بات نہیں ہو رہی ہے' یہ تو پہلے دن کی بات ہے اور ہم نے اُس سے اس کا وعدہ کیا ہوا ہے اور ہمارے وعدے برحق ہوتے ہیں۔ہم سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔اگر ہم انسانی قلب پہ ہاتھ رکھ کر دیکھیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ کبھی کبھی اللہ میاں کو غصہ بھی چڑھتا ہوگا اور کبھی جی مسوس کر بھی رہ جاتا ہوگا کہ ہماری اس مخلوق کے ساتھ ہو کیا رہا ہے کہ جس کے متعلق ہم نے کہا تھا کہ ہم اسے احسن تقویم میں پیدا کر رہے ہیں۔لیکن چونکہ وعدہ کرلیا تھا کہ میں دخل نہیں دونگا' میں تمہارا ٹینٹوا نہیں دباؤنگا'

---

[1] اِحۡتِنَاکٌ: لَاَحۡتَنِکَنَّ ذُرِّیَّتَهٗۤ (17:62)

معاف رکھیے گا' انسانی الفاظ ہی استعمال کرنے پڑتے ہیں' یہ سب کچھ اللہ میاں برداشت کرتا گیا' اپنے وعدے کے خلاف نہیں گیا اور یہ بڑی بات ہے۔ قدرت ہوتو وہ جو خدا کو حاصل ہے' وعدے کا پاس ہوتو یہ کہ اپنی آنکھوں کے سامنے یہ سب کچھ ہوتا دیکھتا چلا آ رہا ہے لیکن جو وعدہ کیا تھا کہ ہم دخل نہیں دیں گے' بڑی Fair Play ہوگی' لہٰذا وعدہ کے مطابق ابلیس کی کارگذاری میں دخل نہیں دیا گیا اور یہی شرفِ انسانیت ہے۔ اگر اُس کے مقابلے میں اُس وعدے کے خلاف انسان اور اس کے ساتھ یہ مل جاتے تو یہ فتح کچھ فتح نہ ہوتی۔ اکیلے تنہا مقابلہ کرتے ہوئے انسان کو اگر اُس کے ہاتھوں کبھی شکست بھی ہو جاتی ہے تو کہا کہ حق وصداقت کے دامن کو نہ چھوڑنا' شکست کھا جانا۔ انسان اپنی حمیت اور غیرت اور شرافت اور کرامت کو اگر برقرار رکھتا ہوا کسی وقت کسی مستبد قوت کے ہاتھوں شکست بھی کھا جاتا ہے تو یہ وہ شکست ہے جس کے متعلق جگر (مرادآبادی) (1890-1960) کا بڑا خوبصورت مصرع ہے:

تجھے اے جگر مبارک یہ شکستِ فاتحانہ

حق کا دامن تھامتے ہوئے شکست کی قدر و قیمت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا

عزیزانِ من! جماعتِ مومنین کو اگر کبھی ان کے ہاتھوں شکست ہوتی تھی تو یہ وہ شکست ہوتی تھی جس کو "شکستِ فاتحانہ" کہا جاسکتا ہے لیکن قرآن نے تو رسول اللہ ﷺ سے کہا ہے **فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ (30:47)** وہ واضح دلائل لے کر آئے۔ انبیائے کرام کو قرآن کہتا ہی یہ ہے کہ وہ دلائل لے کر آتے تھے حالانکہ بھیجنے والے کے پاس قوتیں تو اتنی تھیں کہ دنیا کی کوئی قوت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی لیکن وہ قوت کے زور پر' ڈنڈے کے زور پر' انبیا کے ہاتھوں کچھ نہیں کراتا تھا بلکہ جہاں دیکھیے انبیا کے بارے میں یہی کہا کہ دلائل لے کر آئے تھے' براہین لے کر آتے تھے۔ ٹھیک ہے طریقہ یہی ہونا چاہیے۔ قوت کا میدان تو حیوانات کی زندگی تک چھوڑا ہے' وہاں Law of the Jungle (قانونِ جنگل) ہوتا ہے۔

شرفِ انسانیت کا وقار دلائل و براہین کے مقدس ترازو میں تولا جاتا ہے

انسان کی دنیا میں تو شرفِ انسانیت یہی ہے کہ یہ دلیل و برہان سے بات کرتا ہے۔ یہ انبیائے کرامؑ بالبیّنٰت آتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ دھاندلی سے' استبداد سے' اس کے مقابلے میں ڈنڈا پیش کرتے تھے۔ یہ تھی وہ چیز جس کو ان کا جرم کہا گیا ہے۔ **فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا** [1] **(30:47)**۔ میں نے جیسا پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ عربی زبان میں "جرم" اسے کہتے تھے کہ "دوسروں کے درخت کا پھل کاٹ کر اپنے گھر لے جانا"۔ باقی چیزوں کو آپ اخلاقی معائب کہہ سکتے ہیں۔ اس کے اندر آپ دیکھیے

---

[1] (لیکن وہ ان واضح قوانین) سے سرکشی برتتی۔ اور آخرالامر) انہیں' ان کے جرائم کی وجہ سے پکڑ لیا جاتا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 941)۔

کہ بات کتنی گہرائی تک چلی جاتی ہے۔ کہا کہ یہ اس لیے نہیں تھا کہ **وَ کَانَ حَقًّا عَلَیۡنَا نَصۡرُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ** [1] **(30:47)** ہم نے کوئی رعایت برتی ہے بلکہ اس لیے تھا کہ مومنوں کی مدد کرنا' ان کو غلبہ عطا کرنا' ہمارے ذمہ فرض ہے۔''خدا کے ذمہ فرض ہے۔''

اس قدر محیر العقول کائنات کا مالک اپنے وعدہ کو پورا کرنا اپنا فریضہ قرار دیتا ہے

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ میں نے بہرحال دنیا کی ساری مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا ہوا ہے۔ یہ جو چیز ہے یہ کہیں کسی جگہ نظر نہیں آتی کہ خدا کہے کہ مجھ پر فریضہ عائد ہوتا ہے۔ اللہ لا انتہا قوتوں کا مالک' اقتدارات کا مالک' اپنے اوپر خود ایک فریضہ عائد کر لیتا ہے اور پھر اُس سے کبھی ادھر اُدھر نہیں ہٹتا ہے۔ کہا کہ **کَانَ حَقًّا عَلَیۡنَا نَصۡرُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (30:47)**۔ تو میں نے عرض کیا تھا کہ ہم جو محض دعائیں مانگ مانگ کر یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں اُس کی نصرت حاصل ہو جائے اور عملاً تجربہ بتا رہا ہے کہ نہیں حاصل ہوتی تو یہ کیا ہے؟ اُس نے شرط لگائی ہے کہ **نَصۡرُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (30:47)** وہ مومنین کی مدد کرتا ہے جو اپنی غیرت وحمیت پر حرف نہیں آئے دیتے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ بات بڑی صاف سی ہے۔ یہ کسوٹی ہے۔ نصرت کے معنی غلبہ ہوتا ہے یا اُس کا نتیجہ غلبہ ہوتا ہے۔ کہا کہ کہیے کہ **اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَ الۡفَتۡحُ (110:1)** نصرت کے تو معنی نظر آ جاتے ہیں۔ یہ چیز ذہنی نہیں ہے' نظری نہیں ہے' قیاسی نہیں ہے' یہ تخیلاتی نہیں ہے بلکہ یہ ایک محسوس چیز ہے جس کو نصرتِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ یہ فتح ہے' کامیابی ہے' غلبہ ہے' تسلط ہے۔ یہ نکھر کر سامنے آتا ہے' یہ نہیں ہے کہ عقیدت کے طور پر اپنے ذہن میں یہ سمجھ لیا کہ ٹھیک ہے جی' اللہ کی نصرت ہمارے ساتھ ہے''بھاویں جوتیاں پین ڈیاں ہون [2]''۔ نصرت کے معنی کے لیے تو اُس نے دوسری جگہ کہا ہے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کفار کبھی مومنین پر غالب آ جائیں لیکن یہ نصرت مومنین کی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ یہ ہے شرط۔ اگر نصرت حاصل نہیں ہوتی تو یہ نہیں ہے کہ (معاذ اللہ) خدا اپنے وعدے سے انحراف کرتا ہے' وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ وہ نصرت تو برحق ہے لیکن جو اگلا ٹکڑا ہے وہ ہے **نَصۡرُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (30:47)**۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم مومن نہیں ہیں۔ اُس نے شرط لگا دی تھی کہ اُن کی مدد کرونگا' اُن کو غلبہ عطا کرونگا۔ جیسا کہ میں نے متعدد بار عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم اپنے ہر نظریئے' ہر دعوے کے اثبات کی صداقت میں جو مثالیں پیش کرتا ہے' وہ محسوس(Concrete) ہوتی ہیں۔ اب یہ دیکھیے کہ وہ کیا مثال پیش کرتا ہے۔ اس کی طرف سے نصرت

---

[1] ہم پر واجب ہے کہ ہم ان لوگوں کی مدد کریں جو ہمارے قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں اور اس مدد کا پہلا قدم یہ ہے کہ جو لوگ اس نظامِ حق و صداقت کی مزاحمت کریں' انہیں راستے سے ہٹا دیا جائے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 941)۔

[2] خواہ جوتے ہی پڑ رہے ہوں۔

مومنین کی ہے' خدا کی نصرت اور مومنین' یہ دونوں چیزیں لازم وملزوم ہیں۔ اگر کسی قوم کی جو مومن ہونے کی مدعی ہے' نصرت نہیں ہوتی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مومن نہیں ہے۔

نصرتِ خداوندی کی مثال سمندر کی شکل میں' بادلوں کی شکل میں' بارش کی شکل میں' کھیتی کی شکل میں دیکھیے

کہا کہ **اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ کَیْفَ یَشَآءُ وَ یَجْعَلُهٗ کِسَفًا فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ج فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ○ وَ اِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِیْنَ** ❶ **(30:48-49)**۔ یہ چودہ سو سال پہلے کی مثالیں ہیں۔ آج کا فلسفہ داں بھی ان کا معترف ہے اور گاؤں کا ہل چلانے والا بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ کہا ہے کہ تم دیکھو تو سہی کہ پہلے ہوائیں چلتی ہیں۔ قرآن بارش کا پورا نظام بتا رہا ہے۔ تیز ہوائیں سمندر میں طغیانی یعنی ہیجان سا برپا کرتی ہیں۔ سمندر کا پانی اتنا کھاری اور کڑوا ہوتا ہے کہ چار قطروں سے زبان پھٹ جاتی ہے' ایک گھونٹ لے لیا جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ سورج کی کرنیں اس قسم کے پانی سے تمام کڑوے کسیلے مادے' وہیں سمندر میں' چھوڑ دیتی ہیں اور آبِ مقطر یعنی کشید شدہ پانی اپنے ڈول بھر بھر کر اوپر لے جاتی ہیں۔ یہ سرنجوں میں جو پانی استعمال ہوتا ہے وہ کشید شدہ پانی ہوتا ہے۔ نصرتِ خداوندی کے پروگرام ذرا ملاحظہ فرماتے چلے جایئے۔ وہاں پھر وہ ہوائیں ان بادلوں کو پھیلا دیتی ہیں۔ پانی اس شکل میں کہ وہ فضا میں معلق رہ رہا ہے۔ کبھی ذہن میں آ سکتا ہے کہ یہ پانی جو ہمارے ہاں اتنا برستا ہے کیا وہ کہیں فضا میں معلق بھی رہ سکتا ہے۔ پہلے تو یہ کہ پانی سمندر سے اٹھتا ہے اور وہاں جانے کے بعد یہ فضا کے اندر تیرتا پھرتا ہے۔ وہ پانی جو پانی کی شکل میں ایک منٹ بھی فضا میں ٹھہر ہی نہیں سکتا' ہوائیں اُسے لیے لیے پھرتی ہیں۔ ہماری مشیت' ہمارے طبعی قوانین کے مطابق جس مقام پہ اسے برسنا ہے پھر وہاں وہ پانی کی شکل میں برستا ہے۔ جب وہ برستا ہے تو کسان کے لیے وہ اس قدر وجہ بشارت' خوشخبری' خوشگواری کا موجب ہوتا ہے کہ اُسے زندگی مل جاتی ہے حالانکہ اس سے ذرا پہلے وہ بالکل مایوس ہو چکا ہوا تھا۔

---

❶ اس ضمن میں ہواؤں کی مثال کو ایک دفعہ پھر سامنے لاؤ۔ وہ ہواؤں کو بھیجتا ہے تو وہ سمندر کے آبخرات (بخارات) میں ہیجان پیدا کر کے انہیں اوپر اٹھاتی ہیں۔ پھر وہ اپنے قانونِ فطرت کے مطابق ان بادلوں کو فضا کی پہنائیوں میں پھیلا دیتا ہے۔ پھر وہ مختلف حصوں میں بٹ کر الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ پھر تُو دیکھتا ہے کہ ان بادلوں میں سے مینہ برستا ہے حالانکہ یہ لوگ اس سے پہلے' اس بارش کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکے ہوتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ **941**)۔

فصل اس کی پروان چڑھتی ہے جو زراعت کے اصولوں کے مطابق محنت کرتا ہے

کہا کہ یہ تو سارا پروگرام ہماری طرف سے ہوتا ہے لیکن اُس کے بعد ایک شرط نیچے کے لیے بھی ہے کہ یہ فصل صرف اُس زمین پہ اگاتا ہے جسے انسان نے زراعت کے لیے تیار کیا ہو۔ یہ ہے مومن۔ اُس کی یہ جو ساری نصرت ہے کہ وہ سمندر سے پانی کشید کر کے بارش کی شکل میں زمین پر برسانے تک ہوتی ہے' یہ اُسے کچھ فائدہ نہیں دیتی جس نے فصل بونے کے لیے اپنی زمین تیار نہیں کی' جس نے صاف اور صالح بیج وقت پہ نہیں بویا' جس نے وقت پہ ہل نہیں چلایا' جس نے اُس پودے کی پرورش نہیں کی۔ کہا کہ ہماری طرف سے تو یہ نصرت ہمارے وعدے کے مطابق آتی ہے۔ آپ یہاں اُس مومن کی جگہ اُس کاشتکار کو رکھیے اور دیکھیے کہ یہ ''نصرت'' کس طرح صاف ہو جاتی ہے۔ اسے کہتے ہیں برہان یا بیّنات۔ اگر انسان نیچے یہ کچھ نہ کرے تو اس کی نصرت کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔

یہ بارش کا جتنا نظام ہے یہ انسان کے بس کی بات نہیں' یہ تو اُس کی طرف سے آتا ہے' یہ ذرائع اسباب اُس کی طرف سے آتے ہیں لیکن ان ذرائع سے قانون کے مطابق جو فائدہ اٹھانا ہے یہ نیچے انسان کے ساتھ ہے۔ اس لیے خدا اور انسان کو ایک دوسرے کا رفیق کہا گیا ہے۔ اور وہ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے کہ جو حضورؐ کی حیاتِ ارضی میں آخری الفاظ ہیں کہ **بل ھو الرفیق الاعلٰی** [1] ہمارا اور اُس کا تعلق باہمی رفاقت کا ہے' اس طرح کا کہ وہ رفیقِ اعلٰی ہے اور ہم رفیقِ ادنٰی ہیں۔ رفاقت کا تعلق اگر اُس کے ساتھ ہے تو پھر اُس کی نصرت فائدہ دے سکتی ہے۔ یہ جو کہا ہے کہ **حَقًّا عَلَيۡنَا نَصۡرُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (30:47)** تو یہ کسان اس بات کے اوپر ایمان رکھتا ہے کہ یہ جو اس طرح بارش برسی' یہ جو اس نے زمین اس قسم کی بنائی' اس میں اگر بروقت صحیح بیج بو دیا جائے اور زراعت کے قانون کے مطابق پھر اس میں اگلے جو پروگرام ہیں اس کے مطابق طے کیے جائیں تو اس کا ایمان ہوتا

---

[1] 18 یا 19 صفر 11ھ کو نبی اکرمؐ کا مزاج ناساز ہوا۔ قریب 13 روز علالت رہی۔ زمانہ علالت میں حضورؐ اپنے فرائض کی انجام دہی میں اسی جذب و انہماک سے مصروف رہے...... علالت کے تیرھویں روز (یکم ربیع الاول 11ھ' مئی 632ء صبح کے وقت طبیعت میں کچھ سکون تھا لیکن نقاہت زیادہ تھی اس لیے آپ نے حجرۂ مبارک سے لیٹے لیٹے پردہ اٹھا کر مسجد کی طرف دیکھا تو لوگ نماز میں مشغول تھے۔ اللہ کے بندوں کو اپنے اللہ کے سامنے سجدہ ریز دیکھ کر فرطِ مسرت سے چہرہ بشاش ہو گیا۔ جھکی ہوئی نگاہوں سے درگاہِ رب العزت میں تشکر و امتنان کے سجدے ادا کیے۔ جوں جوں دن چڑھتا گیا مرض کی شدت بڑھتی گئی۔ نقاہت سے بار بار غشی طاری ہو جاتی تھی لیکن جب ہوش آتا تھا تو زبانِ مبارک پر یہ الفاظ آتے تھے کہ **مَعَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ** ''ان سعادتمند روحوں کی معیّت جنہیں اللہ نے اپنے انعامات سے نوازا''۔ اور کبھی یہ کہ **اَللّٰهُمَّ** الرفیق الاعلٰی سب سے بڑی رفاقت خدائے بزرگ و برتر کی ہے۔ سہ پہر کے قریب تین مرتبہ فرمایا: بل الرفیق الاعلٰی قلب کا سکون و اطمینان ایک ہلکے سے تبسمِ جاں نواز کی صورت میں چہرہ پرنکہت پاک و نور افشاں ہوا۔ مگر فطرت کو یہ معصومانہ انداز ایسا خوش آیا کہ اس نے اسے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا۔ اور اس طرح اس پُر بہار زندگی کی جوئے رواں دامنِ صحرا سے صحنِ گلستان میں داخل ہو گئی۔ (پرویزؒ: معراج انسانیت' ادارہ طلوع اسلام' کراچی' 1969' ص۔ 771)۔

ہے کہ ایک ایک دانہ سات سات سو دانے دے گا۔

تعمیری پروگرام کی تکمیل کی خاطر مستحکم طور پر عمل پیرا ہونا اولین شرط ہے

وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ **اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (41:30)** یہ ربنا اللہ جو کہہ دینا ہے' یہ تو اس کی ابتدا ہے' اُس کے بعد جو جم کر کھڑے ہونا ہے یہ' جو ایمان ہے' یہ کاشتکار کا ہوتا ہے۔ میں جو کہا کرتا ہوں کہ گھر میں فاقے آ رہے ہیں' بچوں کو کھانے کے لیے آٹا نہیں مل رہا' ایک گیہوں کی بوری رکھی ہوئی ہے لیکن وہ اُسے پسواتا نہیں ہے بلکہ وہ اس بارش کے انتظار میں ہے۔ بارش برستی ہے تو وہ ان دانوں کو مٹی میں ملا کر چلا جاتا ہے۔ عزیزانِ من! چھ مہینے تک ہر صبح آتا ہے' دن بھر کھیت میں کام کرتا ہے' شام کو بغیر کسی قسم کی مزدوری لیے ہوئے خالی ہاتھوں واپس گھر چلا جاتا ہے۔ ایک دن نہیں' دو دن نہیں بلکہ کم از کم چھ مہینے تک بلا مزد و معاوضہ صبح جاتا ہے اور شام کو آجاتا ہے۔ اُس کا ایمان ہے کہ یہ جو فصل میں نے بوئی ہے تو ایک ایک دانے سے سات سات سو دانے ملیں گے۔ یہ ایمان اُس سے سب کچھ کرا رہا ہوتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ **حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (30:47)**۔ مومنین کی مدد کرنا ہم پہ فرض ہے۔ پھر کہا ہے کہ **فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ (30:50)**۔ رحمت کے معنی سامانِ نشو ونما دینا ہوتا ہے۔ اُس کے سامانِ نشو ونما دینے کی یہ علامات ہیں' آثار ہیں۔ یعنی اسی پانی سے یا ان ہواؤں سے یا ان بادلوں سے سامانِ نشو ونما نہیں ملتا بلکہ یہ تو سامانِ نشو ونما دینے کے لیے آثار ہیں' علامات ہیں' یہ نشانیاں ہیں کہ اس سے ملے گا۔ ملے گا ایسے کہ جب وہ کسان اُس سے رفاقت کرے گا۔ پہلے تو اُس کو اس بات کا ایمان ہوگا کہ یہ میرے گیہوں کی بوری جو میں نے بچوں کو فاقے رکھ کر پسوائی نہیں' مٹی میں ملائی ہے' یہ یقیناً ایک بوری کی جگہ سو سو بوریاں میرے گھر میں آئیں گی۔ یہ یقین ہے اس کا' یہ ایمان ہے اس کا' یہ مومن اس بات پہ ہے۔ اور یہ اس کے لیے صرف آثار ہیں۔ **فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ (30:50)** ان آثار کو دیکھ کر اس نتیجے پہ پہنچو کہ **كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (30:50)** زمینِ مردہ میں کس طرح زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ زمینِ مردہ میں اس طرح زندگی پیدا ہوتی ہے۔

قوموں کی زندگی کے غیر متبدل اصول اسی طرح موثر ہیں جس طرح انسانی جسم کے لیے طبعی اصول

خدا کی طرف سے دیئے ہوئے سارے سامان' وسائل اور پیداوار ہیں۔ کہا ہے کہ انسان کی طرف سے ان کو اُس کے بتائے ہوئے قانونِ طبعی کے مطابق استعمال کرنا۔ اس طرح سے زمینِ مردہ میں حیاتِ تازہ پیدا ہوتی ہے۔ کہا کہ وہ جو ہم نے کہا تھا کہ حق و باطل کی اس کشمکش کے اندر بھی مومنین کی نصرت ہم پر فرض ہے تو وہ اس طرح سے فرض ہوتی ہے۔ یہ اگر کوئی مردہ قوم بھی ہے اور وہ

اس قسم کا ایمان ہمارے قوانین کی محکمیت کے اوپر لے آتی ہے اور پھر دیکھیے کہ یہ سارے آثارِ رحمت کس طرح آتے ہیں۔ وہ ان کو صحیح طریق پر **Utilize** (استعمال) کرتی ہے' قاعدے اور قانون کے مطابق استعمال کرتی ہے۔ اس کے بعد پھر وہ جو مردہ قوم ہے ایک زندہ قوم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ وہ عام طور پر کھیتی کی مثال دیتا ہے اور بڑی برجستہ مثال ہے۔ اُس میں جو چیز رفاقت کی ہے وہ بتاتا ہے کہ مومنین کی نصرت کیوں ہم پہ فرض ہے۔ غیرِ مومن کی کیوں فرض نہیں ہے' اس لیے کہ اُسی گاؤں کے اندر وہ دوسرا کسان جو گھر میں بیٹھا ہوا سویا رہتا ہے' اُسی دن وہ شام کو جا کر گھر میں رکھا ہوا گیہوں پسوا لاتا ہے اور اُس کے گھر نہایت لذیذ پراٹھے پکتے ہیں۔ پکتے تو ہیں' صرف چار دن تک پکتے ہیں پھر اُس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے وہ ہے **فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا (30:47)** پھر فاقے آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ ہماری طرف سے نہیں آتے' ہم کسی کو فاقے نہیں دیتے' ہم نے تو سامانِ نشوونما اس طرح بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ یہ جو ان قوانین سے انکار کرتا ہے' وہ کافر ہے' اسے وہ آثارِ رحمت کچھ فائدہ نہیں دیتے' یہ تو مومن کو فائدہ دیتے ہیں۔ اور یہ روزمرہ کا تمہارا تجربہ ہے۔ **اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (30:50)** اُس نے تو ہر بات کے لیے قانون مقرر کر دیا ہے' پیمانے مقرر کر دیئے ہیں اور اُس کے خلاف وہ کبھی نہیں کرتا۔ **وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً (33:62)** ہماری روش میں' ہماری سنت میں' تم کبھی تبدیلی نہیں پا سکو گے۔

انسان کے لیے سطحِ ارض پر معیشت کے شعبے کی اہمیت

عزیزانِ من! چلتے چلتے ایک اہم چیز سامنے آ گئی۔ قرآن کا معاشی نظام جب بھی میں نے پیش کیا ہے آپ دیکھتے چلے جا رہے ہیں کہ وہ اسے کتنی اہمیت دیتا ہے اور دینی بھی چاہیے۔ انسانوں کی اس سطحِ ارض کے اوپر جو طبعی زندگی ہے اُس کا تو مدار ہی معیشت کے اوپر ہے۔ یہ طبعاً زندہ رہے گا تو آگے جو اُس کے پروگرام ہیں' ان کو بروئے کار لائے گا۔ وہ اقدار' وہ **Values**' وہ تمام اصول' زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے کے پروگرام ہیں' ان کو جو چلتا پھرتا انسان ہے یہی پورا کرے گا۔ اگر یہی زندہ نہیں رہتا ہے تو وہ تو آگے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے اس سطحِ ارض کے اوپر اس کی جو طبعی زندگی ہے' بڑی اہم ہے۔ جب طبعی زندگی اہم ہے تو اس زندگی کو زندہ رکھنے' قائم رکھنے' برقرار رکھنے' آگے بڑھانے کے لیے' جو سامان ہیں' جو وسائل ہیں' جو ذرائع ہیں' وہ بھی اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے معیشت کے نظام کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اگر یہ بگڑ جاتا ہے تو اس کے بعد یہ اقدار اور اصول وغیرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مُلاّ ہم کو کافر اور کافر ہم کو مُلاّ کہتا ہے: پرویزؒ

کچھ عرصہ پیشتر مارکس ازم کا نظام یعنی کمیونزم روس میں چلا اُس کے بعد چین میں چلا۔ میرے متعلق عجیب صورت مشہور ہے۔ جب بھی میں نے روٹی کا سوال پیدا کیا تو مُلاّ نے کہا کہ یہ کمیونسٹ ہے۔ کمیونسٹ سے گلہ آیا کہ صاحب! تم بات تو بڑی معقول کرتے چلے جاتے ہو لیکن آگے جا کر تمہیں پتہ نہیں کیا ہو جاتا ہے کہ بیچ میں اللہ لے آتے ہو تو تم تو مُلاّ کے مُلاّ ہو۔ مُلاّ کافر کہتا ہے اور کافر ہم کو مُلاّ کہتا ہے۔

وقت کے تقاضوں نے آج یہ ثابت کر دیا ہے کہ دنیا کا کوئی نظام خدا کے تصور کے بغیر چل ہی نہیں سکتا

بہرحال اب تاریخ کا تجربہ بتا رہا ہے کہ کمیونزم اللہ کے بغیر چلتا نہیں ہے۔ باقی چیزیں چھوڑ دیجیے کہ بحث کا یہ موقعہ نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وحی کیا چیز بہم پہنچاتی ہے جس کے نہ ہونے کی بنا پہ وہ نظام چل نہیں سکے۔ وہ نظام تو وہی ہے جو انہوں نے فطرت اور تاریخ سے مشاہدہ کے بعد پا لیا تھا کہ ''ہر شخص کو اُس کی ضرورت کے مطابق دیا جانا نظام کا فریضہ ہے اور اپنی استطاعت کے مطابق کام کرنا اُس کا فریضہ ہے''۔ یہ ہے سارا نظام۔ یہ نظام وحی کی اُس چیز کے بغیر چل نہیں سکتا تھا۔ یہ کارل مارکس **(1818-83)** کی اُس کے ساتھیوں کے ساتھ Discussion (بحث و تمحیص) موجود ہے۔

کمیونزم کو عملی شکل دینے کے سلسلہ میں مارکس کی ناکامی کی وجہ

کارل مارکس **(1818-83)** نے جب یہ اصول دیا تو اُس وقت ان کے اعتبار سے یہ دنیا میں پہلی آواز تھی لیکن ان کے سامنے قرآن نہیں تھا اس لیے انہیں پتہ نہیں تھا کہ یہ پہلی آواز نہیں بلکہ چودہ سو سال کے بعد کی آواز دہرائی گئی ہے' یہ الگ بات ہے کہ چودہ سو سال کی تاریخ میں پھر یہ آواز نہیں اٹھی۔ بہرحال یہ آواز اٹھی۔ اس کی پوری جماعت نے' پوری پارٹی نے کہا' کہ کیا خوب بات ہے جو تم نے کی ہے' موج ہوگئی' چلو اب اس کے اوپر عمل کرو۔ کہنے لگا کہ یہیں میری دشواری ہے کہ اسے چلا نہیں سکتا۔ اُنہوں نے کہا کہ کیا کہہ رہے ہو' ایک اصول دے رہے ہو اور چلا نہیں سکتے۔ کہنے لگا کہ اس اصول کے اندر ایک کمی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کے مطابق جان مار کر صبح سے شام تک کام کرے اور وہ اپنی ضرورت سے زیادہ کما لے اور اُس میں سے صرف اپنی ضرورت کے مطابق لے اور باقی سب کا سب دیدے اور روز ایسا کرے اور ساری عمر ایسا کرے۔ کہنے لگا کہ مجھے انسان کے اندر وہ Incentive' وہ محرک' وہ جذبہ' نہیں ملتا جس کی بنا پہ وہ ساری عمر یہ کرے۔ میں اس لیے اُسے عملاً کبھی نہیں چلا سکتا۔

مارکس کے پاس مطلوبہ معاشی نظام کے لیے کوئی جذبہ محرکہ نہ تھا

Discussion (بحث مباحث) کے بعد اُس کی پارٹی کے بہت سے ممبر اس سے الگ ہو گئے' غصے ہو گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ شخص بڑے بلند کیریکٹر کا آدمی تھا ورنہ کوئی اور ہوتا تو یونہی پیچھے لگ جاتا کہ بات ہی کونسی ہے یوں کر دیں گے اور جب نہ ہوا تو کہا کہ تمہاری وجہ سے نہیں ہوا۔ ہمارا کوئی لیڈر ہوتا تو یہ کرتا۔ اُس نے کہا کہ تاریخ کے مطالعہ نے مجھے بتایا ہے کہ علاج تو یہی ہے لیکن میری بصیرت یہ بتا رہی ہے کہ انسان کے اندر اس کے لیے Incentive (جذبہ محرکہ) ہونا چاہیے کہ وہ روز آ کر محنت کرے اور زیادہ سے زیادہ کمائے' کم از کم لے اور باقی سارا دوسروں کی احتیاجات کے لیے دیدے۔ تو وہ کس بنا پر ساری عمر یہ کرتا رہے؟ مجھے انسان کے اندر یہ جذبہ کہیں نظر نہیں آتا کہ وہ یہ کیسے کرے گا۔ پارٹی نے ساتھ چھوڑ دیا' اعلانیہ اس کو مردود قرار دیدیا۔ اُس نے کہا کہ جو جی میں آئے کہو لیکن جو بات میں سمجھتا ہوں کہ میں نہیں کر سکتا تو میں اُس کا وعدہ نہیں کر سکتا۔

زندگی بھر کے لیے ایک قابلِ عمل جذبہ محرکہ صرف قرآنِ حکیم ہی دیتا ہے

پہلی چیز تو یہ وحی ہے جسے وہ کہتے ہیں کہ تم خدا کو بیچ میں لے آئے ہو۔ ارے بھئی! خدا اور وحی انسان میں یہ جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ یہ کتابچہ [1] میں نے لکھا تھا: ''جہاں مارکس ناکام رہ گیا (اُس سے آگے)'' تو اُنہوں نے کہا کہ بھئی! مارکس ازم کو تو ابھی چھوڑ دو وہ تو ہم نہیں کر سکتے البتہ سوشل ازم پہ آ جاؤ کہ سارے ذرائع پیداوار حکومت اپنی تحویل میں لے لے اور اس طرح سے ذاتی جائیداد اور ملکیت کا تصور اٹھا دے۔ یہ ہے سوشل ازم۔ یہ انقلاب 1917 ء میں آیا تھا۔ لینن **(1870-1924)** اُس کے بعد اسٹالن **(1879-1953)** اور پھر خروشیف **(1894-1971)** تھے۔ یہ لوگ ان کے نظریات کو چھوڑ کر کچھ اور ہی ہو گئے ہیں۔ اُس کا نام ابھی تک مارکس ازم رکھا ہوا ہے لیکن وہ سارے اصول چھوڑ دیئے ہیں۔

چین میں ماؤزے تنگ کی پرستش کے بعد اس کے اصولوں کی انتہا درجے کی نفی

China (چین) اٹھا تو لوگوں کی نگاہیں اُس کے اوپر اٹھیں۔ China (چین) نے یہ کہا کہ یہ روس والے مارکس ازم سے مرتد ہو گئے ہیں' ہم ان اصولوں کو لے کر اٹھے ہیں۔ ان کے ہاں ماؤزے تنگ **(1893-1976)** کی پرستش ہوتی تھی۔ فی الواقعہ ان لوگوں نے خدا کا انکار کیا۔ انسان خلا میں تو نہیں جیتا' اُس کو تو ایمان لانا ہوتا ہے اس لیے وہ ماؤزے تنگ پہ ایمان لائے۔ وہ

---

[1] پمفلٹ

ماؤزے تنگ کی پرستش کرتے تھے۔ یہ آپ لوگوں نے فلموں میں یا ٹی وی پہ دیکھا کہ جنگلوں میں چلے جا رہے ہیں اور راستے میں کوئی مشکل آ گئی ہے تو ماؤزے تنگ کی کتاب نکالی اور دیکھا کہ اُس نے یہ کہا ہے اور اُس پہ چل پڑے۔ ماؤزے تنگ کا ابھی کفن بھی میلا نہیں ہوا اور آج کل آپ کیا خبریں پڑھ رہے ہیں۔ ماؤزے تنگ کے جہاں جہاں یہ اصول لکھے ہوئے ہیں وہ ان دیواروں سے ان اصولوں کے اوپر کوٹ کر رہے ہیں' بورڈ اتار رہے ہیں' تحریک چل پڑی ہے کہ اس نے جو Revolution (انقلاب) بتایا تھا وہ بہت بڑی غلطی کی تھی وہ اصول چل نہیں سکتے۔ اُس کے اصولوں کے خلاف تحریک چل پڑی ہے اور وہ تمام کے تمام اصول بدلے چلے جا رہے ہیں۔

ہر آنے والا انسان پہلے اصولوں کو چھوڑ کر نئے قانون بنا لیتا ہے

رشیا [1] نے سب کچھ بدلا تو نام ابھی تک انہوں نے مارکس ازم رکھا ہوا ہے۔ وہ چین کے اندر ماؤازم کا یہ سارا کچھ بدل رہے ہیں لیکن نام وہی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ جتنے بھی انسانوں کے بنائے ہوئے نظام اور اصول اور قواعد اور قوانین ہیں' وہ اُس کے بعد آنے والوں کا جب جی چاہے' بدل دیتے ہیں' بدل کر کوئی اور اصول لے آتے ہیں۔ اب جو لوگ چین یا روس کے ابتدائی اصولوں پر ایمان لائے تھے وہ آج ان کو کچھ اور اصول دے رہے ہیں تو ان کی نگاہوں میں وہ مرتد ہوئے ہیں۔ وہ لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور سائبیریا کے صحرا کے اندر ان لوگوں کو محبوس کیا ہے۔ چین میں یہ چیز شروع ہوگئی ہے۔ یعنی یہ اصول روز تبدیل ہو رہے ہیں۔ اس کی ضمانت کیا ہے' اس پہ یقین کس طرح سے آئے کہ یہ جو اصول دیا جا رہا ہے یہ بدلے گا نہیں؟

وحی کی طرف سے دیئے گئے اصولوں کو نہ بدلنے کی ضمانت

وحی نے جو اصول دیا اُس کی خصوصیت یہ ہے کہ **تَـمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ (6:115)** یہ مکمل ہوگیا جو کچھ ہم نے کہنا تھا' جو اصول دینے تھے' دے دیئے اور اب **لَا مُبَـدِّلَ لِـكَـلِمٰتِ اللّٰهِ (6:34)** کلمات اللہ میں تبدیلی نہیں ہے۔ یہ ہے وحی۔ حکومتیں آئیں اور جائیں' افراد آئیں اور جائیں لیکن کوئی ان میں تبدیلی نہیں کرسکتا۔ عزیزانِ من! یہاں آ کر اللہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ جس کا اس پہ ایمان ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے اُس کا اس پہ بھی ایمان ہے کہ **لَا مُبَـدِّلَ لِـكَـلِمٰتِ اللّٰهِ (6:34)** ان میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا' اضافہ نہیں کرسکتا' منسوخ نہیں کرسکتا۔ ایک دفعہ اس کو دیکھ لیجیے' دلیل و برہان اور عقل و بصیرت کی رو سے پہچان لیجیے تو اگر آپ کا دل اس کے اوپر ٹھکتا ہے کہ یہ اصول صحیح ہیں تو ان کو قبول کر لیجیے۔ پھر دنیا کی کوئی قوت ایسی نہیں ہے جو آ کر یہ کہے

---

[1] سابقہ یو ایس ایس آر (USSR)

کہ صاحب! اس اصول کی بجائے ہم یہ کرتے ہیں۔

تمام عالمِ انسانیت کے لیے سکونِ قلب قرآن حکیم کے غیر متبدل اصولوں میں ہی مضمر ہے

یہ ہے وحی کی منفرد خصوصیت۔ یہاں ایمان کی ضرورت پڑتی ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے کسی قانون اور نظام میں یہ بات نہیں ہے۔ کوئی اس کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ میں کہہ رہا ہوں کہ پوری عالمِ انسانیت کس قدر امن اور اطمینان میں رہ سکتی ہے اگر اُسے معلوم ہو جائے کہ یہ جو ضابطہٗ قانون ہے اس میں دنیا کی کوئی قوت تبدیلی نہیں کرے گی۔ اگر تبدیلی کرے گی تو وہ پھر قرآنی نظام نہیں رہے گا۔ وہ استبداد ہے، دھاندلی ہے، طاغوتیت ہے، شیطنت ہے۔ اگر اس میں کسی نے بھی کوئی کسی بھی قسم کی تبدیلی کی ہے تو وہ اس کو خدا کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ مارکس ازم کو مارکس ازم نہیں کہا جائے گا کہ اُس میں فکرِ مارکس کا تو کوئی گوشہ بھی نہ رہے اور نام وہی دیتے چلے جائیں۔

اسلام کے خلاف گہری سازش

آپ کے ہاں جو ہوا ہے وہ یہ ہے کہ نظام تبدیل کیا اور پورے کے پورے قرآن کو ٹھپ کر کے رکھ دیا ہوا ہے۔ بدقسمتی سے نام وہی اسلام کا دیئے چلے جا رہے ہیں۔ **لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ (10:24)**۔ جس نے اس میں تبدیلی کی اور پھر بھی اس کو وہی اسلام کہا تو یہ خدا کے خلاف چیلنج ہے، بغاوت ہے۔ قرآن کے نظام کے لیے منفرد خصوصیت یہ ہے کہ **لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ (10:24)** اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

کائنات کا ایک ایک ذرہ پوری انسانیت کے لیے بلا مزدو معاوضہ ایک تحفہ ہے

قرآن نے بارش کی مثال دی، زمین کی مثال دی، کاشتکار کی مثال دی، نصرتِ خداوندی للمؤمنین کی مثال دی اور آگے بات آئی کہ **وَ لَئِنۡ اَرۡسَلۡنَا رِیۡحًا فَرَاَوۡہُ مُصۡفَرًّا لَّظَلُّوۡا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ یَکۡفُرُوۡنَ (30:51)** اس کے بعد وہی ہوائیں جو بارش لا رہی تھیں تو جب وہی ہوائیں چلتی ہیں تو فصل کو پکا دیتی ہیں۔ کسانوں سے پوچھو کہ گیہوں کو بونے کے بعد وہی ہوائیں اسے کیسے پکاتی ہیں، مئی جون میں یہ ہوائیں اتنی خشک ہوتی ہیں کہ ان سے وہ فصل پکتی ہے اور پھر یہی ہوائیں گیہوں کو گاہنے کے کام آتی ہیں۔ اگر ان ہواؤں میں ذرا سی نمی پیدا ہو جائے تو گیہوں کا دانہ آپ کو نہیں مل سکتا۔ یہ اُس نظام کے مطابق ہے۔ اس طرح سے یہ سب کچھ ملتا ہے۔ اور آگے وہ لفظ آیا جہاں یہ سارا نظام بتایا گیا کہ کاہے کے لیے تھا تو پھر انسان اس میں کرتا کیا ہے۔ **مِنۡۢ بَعۡدِہٖ یَکۡفُرُوۡنَ (30:51)** یہاں آ کر انسان کا ہاتھ لگا، اُس نے ہمارا نظام چھوڑا۔ کفر کے معنی ہوتا ہے ''کسی چیز کو ڈھانپ کر رکھ

لینا''۔ کہا کہ ''سمندر تہاڈے پیو دا سی [1] '' کہ جہاں سے یہ کشید شدہ پانی گیا' کیا یہ بادل تم نے کہیں سے خریدے تھے' یہ بارش کہیں سے تم نے گروی رکھی ہوئی تھی' یہ زمین جو ہم نے بچھا دی ہوئی ہے یہ کس کی ملکیت تھی جو تمہارے پاس آ گئی؟

نعمائے خداوندی سے انسان صرف استفادہ کرنے کا حق رکھتا ہے' ملکیت کا نہیں

ہم نے یہ سب کچھ کیا' تم نے تو صرف ہمارے ان اسباب سے فائدہ اٹھایا' صرف اس میں تمہاری محنت ہے۔ ذرائع اور سامان سارے ہمارے دیئے ہوئے ہیں تو **لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53:39)** تم تو صرف اپنی محنت کے حقدار ہو۔ آ ؤ! باہمی سودا ہے' کاروبار ہے تو کاروبار میں حصہ بٹا لیں۔ بتاؤ تو سہی کہ اس سو میں کتنے فیصد تمہارا ہے اور کتنا فیصد ہمارا ہے۔ عزیزانِ من! قرآن نے کہا کہ تمہاری تو صرف محنت ہے' باقی یہاں سے وہاں تک سارا کچھ ہمارا ہے۔ اُس محنت میں بھی ہمارا قانون ہے کہ وہ جو دانے کو سو سو بنانا ہے تمہاری تو صرف محنت ہے۔ کسی کسان سے پوچھو تو کہے گا کہ ''جیہڑا زیادہ محنت کرے گا زیادہ پھل ملے گا''۔ **لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53:39)** تم اپنی محنت سے زیادہ کے حقدار نہیں ہو۔ کہا کہ جی' ہماری محنت کا تو ہم نے لے لیا ہم گھر لے جائیں گے لیکن یہ جو آپ کا ہے' یہ جو نوے فیصد بوریاں بھری ہوئی رکھی ہیں' یہ کس کو دیا جائے؟ عزیزانِ من! آیئے پوچھ لیں کہ یہ کس کو دیا جائے۔ قرآن نے کہا کہ آیئے معاملے کی بات ہے ''تے ذرا نکھیڑ کے گل کریئے''۔ [2] اگر ہمارا وہ جو زراعت کا قانون ہے وہ زمین کے اندر کارفرمانہ ہوتا تو فصل لینا تو ایک طرف وہ جو بیج ڈالا تھا' وہ بھی آپ پر چٹی پڑ جاتی۔

سورج کے ذریعے سمندر کے نمکیاتی پانی کو کشید کرنے کا محیّر العقول سلسلہ

کہا کہ **اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِىْ تَشْرَبُوْنَ ○ ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ (56:68-69)** یہ پانی جس پہ اس کھیتی کا سارا دارومدار ہے تو کیا یہ بارش کہیں تمہارے کارخانے سے ہوتی ہے؟ کیا اس کے اندر کوئی تمہاری کاریگری تھی؟ یہ جو اس قدر کشید شدہ پانی بادلوں کی شکل میں اڑائے پھر رہے ہیں پھر ان کو برسایا' اگر وہ سمندر کا ویسے کا ویسا پانی آ جاتا تو جو یہاں اگی ہوئی کھیتیاں یا درخت ہیں' سارے جھلس کر رہ جاتے۔ عزیزانِ من! اتنے سے ٹکڑے کے اوپر غور کرنا چاہیے کہ سمندر کا پانی ہے' ساری دنیا اس وقت صاف پانی کے لیے ترس رہی ہے جو پینے کو نہیں ملتا' لیکن سمندر کے کنارے بس رہے ہیں۔ سائنسدان بڑی بڑی ترکیبیں کر رہے ہیں' مشینیں بنا رہے ہیں کہ سمندر کے پانی کو پینے کے قابل بنایا جائے اور وہ اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ اگر ایک گلاس بھر پانی کسی طرح سے بنا لیتے ہیں تو اس پر اتنا خرچ آتا ہے جتنا گلاس بھر سونے پہ آتا ہے۔ اس لیے وہ

---

[1] کیا سمندر تمہارے باپ کی میراث تھا کہ

[2] ذرا واضح طور پر بات کریں' نکھار کریں۔

بیٹھے ہیں کہ کیا کریں۔ اور یہاں پوچھو ہی نہیں کہ کشید کیا ہوا پانی کس طرح بلا مزد و معاوضہ ایک پیسہ لگائے بغیر مل رہا ہے۔ کہا کہ بارش تو خیر ہوئی ہی سہی کہ سورج نے یہ کیا۔

کاروبارِ حیات میں انسانی زندگی کی نشوونما کے لیے قدرت کی کاریگری کا حصہ

کہا کہ **لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ (56:70)** اگر بارش وہی برستی جو سمندر کا کھاری پانی ہے تو فصل تو ایک طرف رہی تم بھی ختم ہو جاتے۔ بتاؤ تو سہی کہ اس کاروبار میں ہمارا کتنا حصہ ہے۔ **اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ o ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ (56:68-69)** کھیتی کے پکنے کے لیے حرارت کو دیکھیے کہ یہ کتنا بڑا سرچشمۂ حرارت ہے جو ہم نے اوپر رکھ چھوڑا ہے' اُس میں ایندھن کہاں سے ڈلتا ہے' کیسے وہ کروڑوں سال سے اُسی رفتار سے گرمی دیئے چلا جاتا ہے' اُس کی حرارت کم ہی نہیں ہوتی' نہ وہ کبھی چولہا پھٹتا ہے کہ ''بی بی دے کپڑے سڑ جاون''۔ ❶ کس نظام کے ماتحت وہ دیئے چلا جا رہا ہے' وہ حرارت اور پھر یہ تمہارے ہاں کی جو حرارت ہے کہ جن لکڑیوں سے تم حرارت لیتے ہو' وہ ساری کی ساری سبز لکڑیاں ہوتی ہیں' پانی سے بھری ہوئی' وہی سورج ان میں سے پانی لے جاتا ہے تو تمہیں لکڑیاں دیدیتا ہے کہ لو بابا! جلاؤ اور اپنا کام کاج کرو۔ کہا کہ یہ کس کا نظام ہے؟ **نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً (56:73)**۔ ذکر کے ایک بنیادی معنی ہوتے ہیں ''وہ شے جو از خود موجود ہو' ہماری بنائی ہوئی نہ ہو ❷''۔ کہا کہ ہم نے اس کو اس شکل میں بنایا کہ یہ تمہاری بنائی ہوئی نہیں ہے بلکہ یہ سب کچھ ہمارا ہے۔ آؤ اس سارے کاروبار کے اندر حساب کرلو اور بتاؤ کہ تمہارا کیا ہے:

آنکھ نرگس کی ' دہن غنچے کا ' حیرت میری
ان کی تصویر میں پوچھو کوئی ان کا کیا ہے

کہا کہ میں کوئی ایسا رپھڑ ڈالنے والا کاروباری نہیں ہوں' بتاؤ کہ کتنے پرسنٹ تمہارا ہے۔ کہا کہ جی ہماری تو محنت تھی' باقی سارا آپ کا تھا۔ ٹھیک ہے ہم اپنا حصہ لے جاتے ہیں لیکن ہم نے پوچھنا یہ ہے کہ یہ جو باقی آپ کا رہ گیا ہے' یہ کس کو دیدیں؟ کہا کہ **وَمَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ (56:73)** دنیا کے بھوکوں کو جا کر دیدو' ہمیں مل جائے گا۔

---

❶ بی بی کے کپڑے جل جائیں۔

❷ تاج العروس کے مطابق "مَذْکُوْرًا" کے معنی ہیں ''ایسی چیز جو اپنی ذات سے وجود میں آ گئی ہو اور قائم ہو''۔ لین نے اس کے معنی **a thing existing by itself** کہا ہے۔

(Lane, Edward William: An Arabic-English Lexicon,Librairie Du Liban, Beirut-Lebanon, 1968,p97.

دیگر تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن (جلد دوم)' ادارۂ طلوع اسلام' لاہور' **1960**ء' ص ص **689** تا **700**۔

خدا تعالیٰ کا نظامِ ربوبیت لامحدود وسعتوں کی صفات عظمیٰ کا حامل ہے

کہا کہ ہم نے قرآن کی ابتدا **اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ (1:1)** سے کی تھی کہ ہم بھی قابلِ ستائش اس لیے ہیں کہ پوری عالمگیر انسانیت کی ربوبیت کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پیمانے پر تم بھی ربوبیت کرتے ہو' اپنے بال بچوں تک کرتے ہو' آگے زیادہ سے زیادہ کرتے ہو تو خاندان تک پہنچاتے ہو' بہت بڑا انتظام کسی نے کیا تو قوم کے لیے کچھ کر دیا۔ کہنے لگے کہ یہ ساری چیزیں ربوبیتِ کبریٰ ہیں' چھوٹے پیمانے کے اوپر ہیں۔ جو ہمارا نظام ہے وہ ربوبیتِ عظمیٰ چاہتا ہے' عالمگیر انسانیت کی ربوبیت چاہتا ہے۔ اس کے لیے کہا کہ **فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الۡعَظِيۡمِ (56:74)** تم پوری کوشش کرو کہ خدا کی ربوبیتِ عظمیٰ کا جو نظام ہے اُس کو پورا کرو۔ اور وہ یہ ہے کہ اتنی محنت کر کے یہ سب کچھ اگاؤ' محنت کے مطابق اپنا حصہ لے جاؤ اور ہمارا حصہ ربوبیتِ عالمینی کے لیے اس دنیا کے بھوکوں کو دیدو۔ ان سے پوچھا کہ صاحب! خدا نے جو یہ کہا ہے کہ **فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الۡعَظِيۡمِ (56:74)**۔ تو یہ کیا ہے؟ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے رکوع میں جاؤ تو **سُبۡحٰنَ رَبِّيَ الۡعَظِيۡمِ** تین دفعہ پڑھو۔ عزیزانِ من! چھوڑیے ان کی باتوں کو' دل دکھتا ہے۔

قرآنی حکومت میں نظامِ ربوبیت کی نشانی الارض لِلّٰہِ کی ترجمانی علامہ اقبالؒ کی زبانی

پھر سوچیے کہ اُس نے شروع سے کیا نظام بتایا۔ بیج ڈالنے سے لے کر آخر تک یہ جو آیات ہیں اقبالؒ **(1877-1938)** نے بڑی خوبصورتی سے اپنے ہاں ان کا ترجمہ کیا ہے۔ ''بالِ جبریل'' میں اُس کی نظم کا عنوان **الارض للہ** ہے:

پالتا ہے بیج کو مٹّی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھّم سے بادِ سازگار
خاک یہ کس کی ہے' کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سِکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دِہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں' تیری نہیں' میری نہیں

عزیزانِ من! خدا نے اقبالؒ (1877-1938) کو بڑی صلاحیت دی تھی' شعریت ہے تو اُس کا بدل نہیں ہے' حقائق کی یہ کیفیت ہے کہ قرآن کا ترجمہ کیے جا رہا ہے۔

اب سمجھے اس کے معنی کہ یہ سب کچھ ہم کرتے ہیں۔ اُس کے بعد کہا کہ **مِنۢ بَعۡدِهٖ يَكۡفُرُوۡنَ** (30:51) تم اس کاروبار سے بھی انکار کر جاتے ہو۔ جو کچھ وہاں سے پیدا ہوتا ہے اُس میں جو ہمارا حصہ ہے اُس کو ڈھانپ کر بیٹھ جاتے ہو' سارے کا سارا ہی لے کر چلے جاتے ہو۔ تمہاری یہ کیفیت ہے۔ اب بتاؤ کہ جو کاروبار میں اس قدر بددیانت ہو تو اُس کے متعلق کیا کہا جائے۔ یہ تمہاری کاروبار کی بددیانتی ہے کہ جتنا حصہ ہمارا ہے وہ بھی سمیٹ کر لے جاتے ہو اور ڈھانپ کر رکھ لیتے ہو۔ اُس کے بعد ہے کہ اے رسول! یہ جو کچھ ہم نے کہا ہے سوچو تو سہی کہ جو عقل و فکر سے اس کو سُنے گا اور غور کرے گا تو کیا وہ انکار کی جرأت کر سکتا ہے؟ لیکن یہ سب کچھ تم ان کو سناتے چلے جاتے ہو' اس کے باوجود یہ کہتے بھی چلے جاتے ہیں کہ نہیں' یہ سارے کا سارا زمیندار کا ہے' ساری زمین بھی اُس کی ہے' زمین کی ملکیت بھی اُس کی ہے۔ جو لوگ ایسے واضح حقائق کو یوں جھٹلاتے جائیں' انہیں راہِ راست پر کس طرح لایا جا سکتا ہے؟ **فَاِنَّكَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰى** (30:52) زندہ انسانوں کو تُو بات سمجھا سکتا ہے لیکن مُردوں کو نہیں سنا سکتا۔

سورج کی روشنی سے وہی شخص استفادہ کرسکتا ہے جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے

قرآن تو یہ کہتا ہے کہ **لِّيُنۡذِرَ مَنۡ كَانَ حَيًّا** (36:70) تو اس غلط روش کے انجام سے اُسے ہی آگاہ کر سکتا ہے جس میں زندہ رہنے کی کوئی تمنا اور خواہش موجود ہے۔ کہتا ہے کہ **وَ لَا تُسۡمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوۡا مُدۡبِرِيۡنَ** (30:52) اسی طرح سے جو بہرے ہیں تُو ان کو بھی نہیں سنا سکتا۔ بہروں کی بھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ان کو بھی سنایا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ تمہاری طرف منہ کر کے کھڑے ہوں کہ کچھ اشاروں سے' کچھ کنائیوں سے' سمجھ سکیں لیکن جو بہرہ منہ پھیر کر چلتا ہے اُس کو نہیں سمجھا سکتا۔ دونوں کیٹگریز (اقسام) آ گئیں: ایک یہ کہ مردے جن میں زندگی کی رمق تک نہیں' اور دوسرے ایسے انسان کہ زندگی کی رمق تو ہے لیکن کیفیت یہ ہے کہ سننا ہی نہیں چاہتے۔ **وَ مَاۤ اَنۡتَ بِهٰدِ الۡعُمۡيِ عَنۡ ضَلٰلَتِهِمۡ** (30:53) اندھے کو کیا بتایا جائے کہ کونسا صحیح راستہ ہے اور کونسا غلط۔ ہمارے سورج کی روشنی اُسی کو فائدہ دے سکتی ہے جو اپنی آنکھیں کھولے۔ سورج کا طلوع کرنا تو ہمارے ذمہ فرض ہے لیکن آنکھیں کھولنا تو تمہارا کام ہے۔ یہ رفاقت ہے خدا کی اور انسان کی۔ ہمارے سورج سے تم فائدہ نہیں اٹھا سکتے اگر آنکھیں نہیں کھولتے۔ جو خود آنکھیں بند کر لے' جو اندھا بن جائے اُس کو اُس کی گمراہی سے کون صحیح راستے پہ لا سکتا ہے۔ **اِنۡ تُسۡمِعُ اِلَّا مَنۡ يُّؤۡمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ** (30:53) تُو اسے سنا سکتا ہے جو عقل و بصیرت کی رو سے اس فیصلے پہ

پہنچے کہ بات یہ ٹھیک کہتا ہے اور اُس کے بعد پھر وہ ان قوانین کے سامنے جھک جائے۔ صرف اتنی ہی بات نہیں ہے کہ وہ یہ سمجھ لے کہ بات یہ ٹھیک کہہ رہا ہے' یہ تو صرف ذہنی چیز ہے۔ عمل کے لیے صرف ذہن کا مطمئن ہونا کافی نہیں ہے بلکہ انسان کے جذبات کا اُس سمجھی ہوئی چیز کے جوتابع رہنا ہے یہ ہے اگلی چیز۔ اور یہ ہے جسے مسلمون کہتے ہیں:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

(غالب)

طبیعت جذبات کے تابع چلتی ہے۔ آپ کو بہت سے لوگ ایسے ملیں گے جن کے متعلق آپ انہیں سمجھائیں گے کہ بابا! مر جاؤ گے کیا کرتے ہو' یہ چیزیں کھاتے ہو۔ وہ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے ''میں وی جاننا ہیگاں' پر بڑی کوشش کتی ہیگی اے' پر نہیں چھٹ دی''۔ ❶

قوموں کی زندگی میں نشیب وفراز زندگی کا ایک لازمی جز ہے

کہا کہ اسی اصول میں قوموں کی زندگی کے عروج و زوال کا راز بھی پنہاں ہے۔ قوموں کی حالت بھی دراصل افراد کی سی ہوتی ہے' قوموں کی زندگی میں بھی یہ پروگرام آتا ہے کہ جیسا انسان کی طبعی زندگی میں پروگرام ہوتا ہے لیکن گھبراؤ نہیں کہ اس وقت تم میں بہت ضعف ہے' کمزوری ہے۔ اس کی مثال واضح ہے کہ **اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ** (30:54) ارے دیکھو تو سہی کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے' تو کتنا کمزور اور ناتواں ہوتا ہے۔ اُس بچے کی اُس حالت سے کہ جب وہ پیدا ہوتا ہے اُس کی پوری زندگی کے لیے تو اصول مقرر نہیں کیے جاسکتے۔ **ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ** (30:54) کمزوری کے بعد نشوونما پاتا ہے' صحیح غذا ملے' صحیح قوانین کے مطابق اُس کی پرورش ہو تو وہ طاقتور ہوتا ہے' جوان ہوتا ہے۔ **قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَيْبَةً** (30:54) لیکن اگر جوانی میں وہ ان قوانین کو توڑ دیتا ہے تو پھر کمزوری آجاتی ہے۔ یہ عمل استمرار چاہتا ہے' استقلال چاہتا ہے' ثبات چاہتا ہے' دوام چاہتا ہے۔ وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ ''مرتے دم تک مومن رہو'' تو وہ یہ بات ہے۔ یہ کسی خاص دور تک نہیں کہ ان طبعی قوانین کی آپ نے اطاعت کر لی اور قوت آگئی بلکہ یہ تو اسی طرح مسلسل جاری رکھنا پڑے گا' مرتے دم تک مسلم رہنا پڑے گا۔ **يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ** (30:54) یہ سب تخلیقی پروگرام ہمارے قانونِ مشیت کے مطابق جاری وساری ہے۔

---

❶ یہ مجھے بھی معلوم ہے' بڑی ہی سرتوڑ کوشش کی ہے مگر یہ ہے کہ نہیں چھوٹتی۔

جسمانی صحت کی طرح قوم کی صحت کو برقرار رکھنا زندگی بھر کے لیے ضروری ہے

اب سوال یہ ہے کہ اس کا یہ تخلیقی پروگرام کس طرح جاری وساری ہے؟ کہا کہ **وَ هُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ (30:54)** اس کے لیے اس نے علم کی بنا پر قانون مقرر کیے ہیں۔ یہ صیغہ بتا رہا ہے اور عربی زبان جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ جو ''قدیر'' کا صیغہ ہے اس کا کیا مطلب ہے'' یہ استمرار چاہتا ہے' تسلسل چاہتا ہے' دوام چاہتا ہے''۔ یہ چیز نہیں ہے کہ کسی وقت ہنگامی طور پہ ہم کچھ ایسی چیز کر دیتے ہیں بلکہ دوامی طور پہ یہ ہمارا نظام اسی طرح سے چلا آ رہا ہے' اس میں تبدیلی نہیں پیدا ہوسکتی۔ قوموں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ کوئی بات نہیں اگر وہ کسی وقت کمزور ہوگئی ہے تو اُس کے قانون کے مطابق غذا دی جائے' اُس کے مطابق پرورش کی جائے تو ماشاء اللہ توانا ہو جائے گی لیکن اُس کے بعد انہوں نے پھر ان قوانین کو چھوڑ دیا تو پھر کمزوری آ جاتی ہے اور صحت بگڑتی ہے اور یہ کمزوری آہستہ آہستہ قبر کی طرف لیے چلی جاتی ہے۔ یوں قوموں کے اوپر وہ ساعت آ جاتی ہے جب نظر آتا ہے کہ ان کی طبعی زندگی' قومی زندگی ختم ہو رہی ہے۔ **وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ لا مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ط كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ (30:55)** جب پھر وہ زوال آتا ہے تو اُس وقت یہ کہتے ہیں کہ صاحب! اصل میں ہمیں مہلت کا وقفہ زیادہ نہیں ملا تھا۔ انبیائے کرام کا سلسلہ پہلے دن سے جاری رکھا' مسلسل کہتے چلے آئے' آخری نبی کو جو کتاب دی ہے وہ محفوظ رکھ دی اور مکمل کر دی۔ اس کے باوجود جب وہ پھر اپنے ہاتھوں سے کیے ہوئے جرائم کی مکافات کے رو سے زوال پذیر ہوتے ہیں' موت سامنے آتی ہے' تو کہتے ہیں کہ ہمیں کچھ زیادہ وقت نہیں ملا تھا۔ کہا کہ **كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ (30:55)** اصل میں بات تو یہ ہے کہ وقت تو بہت تھا' کہا بھی جاتا تھا' بات بتائی بھی جاتی تھی لیکن بہرے کی طرح منہ موڑ کر چل دیتے تھے اور آج کہہ رہے ہیں کہ صاحب! ہمیں بہت تھوڑا وقت ملا۔

عزیزانِ من! وقت تھوڑا نہیں ہوتا' بس سمجھنے کی بات ہے۔ **وَ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ (30:56)** لیکن وہ لوگ جن کو علم اور ایمان حاصل ہے وہ یہ بات ان سے کہتے ہیں کہ کیا کہہ رہے ہو کہ وقت بہت تھوڑا تھا' ارے تمہیں تو اتنا لمبا وقت ملا تھا اور اس کے باوجود یہ بات آج کہتے ہو۔ تم قانونِ خداوندی کے مطابق اس تمام دور میں سے گزرے ہو۔

موت وحیات کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد قابلِ غور ہے

یہاں یہ لفظ ہے: **يَوْمِ الْبَعْثِ (30:56)**۔ میں یہ عرض کر دوں کہ جسے مرنے کے بعد کی زندگی' قیامت کی زندگی' آخرت

کی زندگی' موت کے بعد کی زندگی کہتے ہیں' وہ اسلام اور ایمان کی بنیاد ہے اور اُس پہ ہمارا ایمان ہے لیکن اسے سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن نے زندگی اور موت یا موت کے بعد پھر زندگی جو کہا ہے تو یہ صرف اگلی دنیا کے لیے نہیں کہا بلکہ اس دنیا کے اندر بھی قوموں کی موت اور حیات کے متعلق جو قوانین دیئے ہیں ان کے لیے بھی یہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ''بعث'' کا جو لفظ ہے یہ عام طور پر ہمارے ہاں مرنے کے بعد کھڑے ہو جانے کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کے معنی ہوتا ہے کہ ''کسی کو راستے سے ہٹا دینا' جو موانعات کسی کی راہ میں کھڑے ہونے کے لیے' زندہ ہونے کے لیے' ہوں ان کو ہٹا دینا''۔ وہ جو مرنے کے بعد کی زندگی کے لیے یہ بعث لفظ قرآن میں آیا ہے تو وہ یہ ہے کہ تمہاری زندگی کے راستے میں جو کچھ موانعات آ گئے تھے وہ ہم ہٹا دیں گے۔ اس دنیا کے اندر کی یہ چیز کہی ہے۔

ہر وہ طاقت یا نظام جو انسانیت کے راستے میں رکاوٹ ہے خدا تعالیٰ کا قانون اسے اپنے راستے سے ہٹا دے گا

دوسرے مقام پہ یہ کہا ہے کہ یہ اتنے بڑے بڑے جتنے بھی سرمایہ دار ہیں' یہ لوگوں کی محنت کو دبائے بیٹھے ہیں' محنت کشوں کی محنت کا استحصال کرتے ہیں' وہ سرمایہ دار یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ بعث ہوگی ہی نہیں۔ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ قیامت آئے گی ہی نہیں۔ یہ ترجمہ غلط ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہمیں راستے سے کوئی ہٹا ہی نہیں سکتا' ہم جو انسانیت کی راہ کو روکے بیٹھے ہیں تو کوئی طاقت ہمیں راستے سے ہٹا نہیں سکتی۔ قرآن نے کہا ہے کہ ہمارا قانون یہ ہے کہ جو بھی انسانیت کے راستے کے اندر رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں تو ہم **بعث** کرتے ہیں' ہم ان رکاوٹوں کو دور کر دیتے ہیں۔ اسی لفظ بعث کے معنی انقلاب ہوتا ہے۔ یہ جماعت جو اٹھتی ہے یہ صرف یہ کرتی ہے کہ انسانیت کے راستے کے اندر جو یہ لوگ رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں یعنی یہ نظام سرمایہ داری' نظام ملوکیت' نظام پیشوائیت والے تو وہ آسمانی انقلاب قرآن کی روشنی میں ان رکاوٹوں کو راستے سے ہٹا دیتا ہے ''تے نہر چلن لگ جاندی اے''۔ [1] یہ جو لوگ تھے یہ کہتے تھے کہ تم یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں راستے سے کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ تو یہی تمہاری غلطی تھی۔ **فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ** (30:56) وہ آج کا دن آ گیا' وہ دور آ گیا ہے کہ تمہیں راستے سے ہٹا دیا جائے گا۔ **وَ لٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ** (30:56) تم اپنے زعم میں سمجھے بیٹھے تھے کہ ہمیں ہٹانے والا کوئی ہے۔ یاد رکھو! جو چیز بھی خدا کے نظام اور قانون کے خلاف کی جائے گی اسے ہٹا دیا جائے گا۔ وہ جو کہا ہے کہ مہلت کا وقفہ تو اُس میں ضرور آتا ہے' دانے کو گندم کا خوشہ بننے میں چھ مہینے ضرور لگ جاتے ہیں لیکن یہ اُس خدا کا اٹل قانون ہے کہ جو بھی انسانیت کے راستے میں کھڑا ہوگا اور جس کے

---

[1] تو نہر بہنا شروع کر دیتی ہے۔

ہاتھوں سے تکریمِ انسانیت کے اوپر حرف آئے گا تو وہ راستے سے ہٹا دیا جائے گا۔ یہ خدا کا قانون ہے اور وہ خبیر اور علیم خدا ہے۔ وہ ہنگامی وقت نہیں ہے بلکہ قدیر ہے۔ کہا کہ **فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنفَعُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَعْذِرَتُهُمْ وَ لَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ (30:57)** جب یہ وقت آ جاتا ہے' یہ انقلاب کی گھڑی آ جاتی ہے تو کوئی معذرت قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ یہ جو معذرت کا لفظ ہے اس کے معنی ہوتے ہیں ''اپنے جرائم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرنا''۔ عذر لفظ اسی سے ہے اور اُس کے معنی ہوتے ''پردہ پوشی کرنا''۔ یہاں کہا ہے کہ یہ نہیں ہے کہ پھر بھی اعتراف کر لیں بلکہ وہ کوشش کرتے ہیں کہ اس قسم کے کچھ دلائل' کچھ Arguments (براہین)' کوئی Logic (منطق) دیں کہ نہیں جی' یہ تھا اور وہ تھا۔ کہا کہ پھر ان کی یہ کچھ کیفیت ہوتی ہے۔

مہلت کا وقفہ ختم ہو جائے تو پھر توبہ کی قبولیت کا وقت بھی ختم ہو جاتا ہے

اب آگے ایک اور بڑی بات آتی ہے۔ کہا کہ جب یہ استبداد ان کے ہاتھ میں تھا' قوت ہاتھ میں تھی' تو نظر آتا تھا کہ دنیا میں ان جیسا بہادر کوئی نہیں ہے' ان جیسا جرأت والا کوئی نہیں ہے۔ اب کیفیت یہ ہے **وَ لَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ (30:57)** وہ ہر چوکھٹ کے اوپر ماتھا رگڑیں گے اور کہیں بھی ان کا سجدہ قبول نہیں ہوگا' یہ ان کے کسی کام نہ آ سکے گا۔

اب اس سورۃ کی آخری آیات آ رہی ہیں اور میں نے کہا تھا کہ سورۃ کی آخری آیات سورۃ کا ملخص ہوتی ہیں۔ کہا کہ **وَ لَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ (30:58)** ہم قرآن میں مثالیں دے کر بات سمجھاتے ہیں' مختلف طرق و اسالیب سے حقائق کو واضح طور پر بیان کرتے ہیں' تشبیہات سے بات سمجھاتے ہیں کہ مثال سے بات اور واضح ہو جاتی ہے۔ **وَ لَئِن جِئْتَهُم بِآيَةٍ لَّيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ أَنتُمْ إِلَّا مُبْطِلُونَ** [1] **(30:58)** ان کو لاکھ سمجھاؤ لیکن یہ کہتے ہیں کہ یار چھوڑو ''ایہہ جگ مِٹھا' اگلا کن ڈٹھا''۔ آگے سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ تم یونہی ڈرا دیتے ہو' ہماری قوت تو بہت زیادہ ہے۔ ہر فرعون کی کیفیت یہی ہوتی ہے اور اس کیریکٹر کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب موت سامنے آتی ہے تو پکار اٹھتا ہے کہ میں ایمان لایا اور اُسے جواب ملتا ہے کہ فٹے منہ تیرا۔ [2] تمہیں ایمان لانا اب یاد آیا۔ اب خدا یاد آ رہا ہے جب موت سامنے آئی ہے' کچھ تو کیریکٹر دکھاتا۔ عزیزانِ من! قرآن ہے۔ وہ جو غیرت ہے' حمیت ہے' خودداری ہے اُس کو کفر میں بھی قابلِ تحسین قرار دیتا ہے۔ کہا کہ استبداد تھا' تو فرعون تھے لیکن آخر میں تمہارا کیریکٹر تو یہ نکلا کہ اب موت سامنے آئی ہے تو ایمان والی بات کر رہے ہو۔

---

[1] لیکن اس کے باوجود' جن لوگوں نے پہلے سے طے کر لیا کہ وہ تمہاری دعوت کو کبھی تسلیم نہیں کریں گے خدا کا کوئی قانون بھی جب ان کے سامنے پیش کیا جائے گا تو وہ یہ کہہ کر اس کی مخالفت کریں گے کہ یہ سب جھوٹ اور فریب کاری ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 944)۔

[2] تُف! لعنت تجھ پر۔

دلوں پر مہر کیونکر لگتی ہے؟

قرآن کریم کہتا ہے کہ **كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (30:59)** جو بھی علم و بصیرت سے کام نہیں لیتا' تعصب کی بنا پر اس قسم کی روش اختیار کر لیتا ہے' تو بس یوں سمجھو کہ دلوں پہ مہریں لگ جاتی ہیں۔عزیزانِ من! دلوں پہ مہریں لگتی ہیں' کانوں میں ڈاٹ لگ جاتے ہیں' آنکھوں پہ پردے پڑ جاتے ہیں۔یعنی ساری دنیا دیکھ رہی ہوتی ہے کہ کس قدر قیامت آ رہی ہے' کس قدر فساد ہو رہا ہے' کس قدر ظلم ہو رہا ہے' کس قدر بنیادیں کمزور ہو رہی ہیں مگر

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

وہ اس لیے کہ ان کے دلوں پہ مہر لگ جاتی ہیں کہ **لَا يَعْلَمُوْنَ (30:59)** نہ ان تک صحیح معلومات پہنچتی ہیں اور نہ وہ خود علم و بصیرت سے کام لیتے ہیں۔اس کے بعد رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا کہ ان لوگوں کی بات یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ ان کا یہ طرزِ عمل تمہارے دل پر بڑا گراں گزرتا ہے' تمہیں رنج ہوتا ہے' افسوس ہوتا ہے۔تمہاری کیفیت اُس معالج کی طرح ہوتی ہے جو مریض کا صحیح علاج کرے۔ضدی مریض کی حالت سے جو کیفیت معالج کی ہوتی ہے' وہی تمہاری ہو جاتی ہے۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کے قلبِ حساس کا ذکر اور بدرجہ اتم استقامت کی تلقین

قرآن نے کہا کہ ہم تمہاری کیفیت کو جانتے ہیں اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ مشکلات کا بڑا سامنا ہے' لمبی منزل ہے' راستے بڑے دشوار گزار ہیں لیکن **فَاصْبِرْ (30:60)** استقامت کو ہاتھ سے نہ چھوڑو' چلے جاؤ' راستہ صحیح ہے' بالکل نہ گھبراؤ۔اس لیے کہ **اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (30:60)** خدا کے وعدے سچے ہیں۔اور اس استحکام کے پروگرام کے اندر ایک تھوڑی سی نصیحت بھی ہے' ایک تلقین ہے جو بڑی اہم ہے۔یعنی یہ کہ اس سے منہ موڑ لینا' تھک کر بیٹھ جانا' استقامت نہ رہنا یہ تو الگ بات ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوگا۔کہا کہ **وَ لَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ (30:60)** تم سے کوئی ذرا سی بھی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جس سے ان کو قیاس گزرے کہ تم گھبرا گئے ہو۔ہم جانتے ہیں کہ تم نہیں گھبراؤ گے' استقامت ہوگی لیکن دیکھنا کبھی اس قسم کی کوئی حرکت' کوئی آثار نہ ہوں کہ یہ لوگ سمجھیں کہ تم گھبرا گئے ہو۔یہ کرو اور دیکھو کہ **اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (30:60)** خدا کے وعدے کس طرح ایک ایک کر کے پورے ہوتے ہیں کیونکہ ان کی نصرت تمہارے مومن ہونے کے ساتھ مشروط تھی اور اس طرح سے تمہارے ایمان اور ثبات کی زندہ شہادت مل جائے گی۔اور پھر دیکھو کہ کس طرح خدا کے وعدے سچے ہو کر آتے ہیں۔ **اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ o وَ رَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (110:1-2)** نصرتِ خداوندی یوں آئے گی کہ

یہی قوم نہیں بلکہ پوری دنیا فوج درفوج چلی آئے گی۔

آخر کار نوعِ انسانی کو وحی کی روشنی سے استفادہ کرتے ہوئے استقامت کا سبق حاصل کرنا ہی پڑے گا

جب یہ صورت ہوجائے کہ نظام قائم ہوجائے' سلطنت مل جائے' مملکت مل جائے' بڑی مستحکم ہو' دنیا فوج درفوج آ رہی ہو تو اُس کے بعد راوی عیش لکھتا ہے کہ موج ہوگئی اب تو کچھ کرنے کا کام ہی نہیں ہے۔ کہا کہ یوں نہ سمجھو۔ یہی تو وہ وقت ہے جب اور زیادہ محنت اور کوشش سے تمہیں کام لینا پڑے گا۔ یہ نہ سمجھ لینا کہ اب کام ختم ہوگیا ہے بلکہ یہ ہونے کے بعد تو ایک اور منزل شروع ہوتی ہے۔ ایک سیکنڈ کے لیے بھی سستا نہ جانا' تساہل نہ برتنا' تغافل نہ برتنا۔ **فَسَبِّــــحْ (110:3)** اور تیزی سے اس میں کوشش کرتے چلے جاؤ۔ اگر کہیں کوتاہی ہو تو وہیں اُسی وقت اُس کے ازالے کی کوشش کرو۔ **اِنَّـهٗ كَـانَ تَـوَّابًا (110:3)**۔ اُسی وقت اس کے ازالے کی کوشش کرو۔ یہاں **تَـوَّابًا (110:3)** آیا ہے۔ پتہ چلے کہ غلط راستہ ہے تو وہاں سے پیٹھ پھیر کر ادھر کو واپس آتا ہے تو اس کا ہر قدم تائب کا ہوتا ہے اور اسے توبہ کہتے ہیں۔ اور خدا وہاں کھڑا دیکھ رہا ہوتا ہے جہاں سے اس نے غلط راستہ اختیار کیا تھا کہ یہ پلٹتا ہے یا چلا ہی جا رہا ہے۔ کہا کہ کسی مقام کے اوپر بھی جب تم محسوس کرو کہ غلط قدم اٹھ گیا ہے تو پلٹ کر پھر اس طرف قدم اٹھاؤ۔ جب تم یوں قدم اٹھاؤ گے تو تم تائب ہوگے اور خدا وہاں کھڑا ہوا دو قدم اٹھائے گا۔ خدا تواب ہے جو شدت سے بھاگ کر آتا ہے کہ ''اوتُوں آتے سہی''۔ ❶

عزیزانِ من! سورۃ الروم آج ختم ہوتی ہے' آئندہ سورۃ لقمٰن **31** ویں سورۃ سے درس شروع ہوگا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

❀❀............❀❀............❀❀

---

❶ ارے! تم آؤ تو سہی۔

سُـــورَةُ لُقْمَٰنَ

پہلا باب: سورۃ لقمٰن (آیات 1 تا 11)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1979ء کی 12 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ لقمٰن سے ہو رہا ہے جو 31ویں سورۃ ہے۔

حروفِ مقطعات کی وضاحت

سابقہ سورۃ کی آخری آیات میں سے ایک آیت میں یہ کہا گیا تھا کہ **وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ** (30:58)۔ اس قرآن میں دین سے متعلق، انسانی زندگی سے متعلق، جتنے بھی حقائق ہیں انہیں مختلف مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ اور اسی کے تسلسل میں اس سورۃ کی پہلی آیت ہے **الٓـمّٓ** (31:1)۔ یہ پہلے الفاظ تو وہی ہیں جنہیں مقطعات [1] کہتے ہیں۔ یہ متعدد

---

[1] ان کی مکمل تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۃ طٰہٰ، طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005، ص ص۔ 21 تا 22۔ نیز مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۃ الشعرآء، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2008ء، ص ص۔ 23 تا 24۔

مقامات پہ آئے ہیں اور ہر مقام پہ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ عربی اسلوبِ بیان کا ایک انداز ہوتا تھا۔قرآن سے پہلے تو عربی زبان میں کوئی کتاب تھی ہی نہیں، کتاب کی شکل میں تو وہاں یہ پہلی کتاب آئی ہے اس سے پہلے تو ان کے ہاں صرف شاعری تھی۔عربی زبان کے شعراء کے کلام میں یہ انداز تھا اور عبرانی زبان میں بھی یہ انداز تھا کہ وہ الفاظ کے حروف لے کر ان سے مخففات بناتے تھے۔ان مخففات کے ذریعے سے وہ اپنی بات بیان کرتے تھے۔

قرآن کی بہت سی سورتیں ایسی ہیں جن کے ابتدا میں یہ مخففات آتے ہیں۔ان مخففات کا انداز تو اب یہی ہے کہ وہ لفظ ان حروف کا امتزاج ہے۔ان حروف کے متعلق میں اپنی بصیرت کے مطابق ہمیشہ یہ کہا کرتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے ہی مختصرات ہیں انہی کی سمٹی ہوئی مخفف سی شکل ہے۔اس کے معنی اس انداز سے میں نے اپنے ''مفہوم القرآن'' میں بھی کیے ہیں۔یہاں کہا ہے کہ **الــــم** **(31:1)**۔اللہ علیم وحکیم کا ارشاد یہ ہے کہ **تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (31:2)**۔وہ جو ہم نے پہلے کہا ہے کہ اس قرآن میں تمام حقائق اور موضوعات کے متعلق ہم نے مختلف مقامات پر بیان کیا ہے تو اب کہا ہے کہ یہ بھی اسی الکتاب کی آیات ہیں جو آپ کے سامنے اب آ رہی ہیں۔

حکمت کے لفظ کا قرآنی مفہوم: زندگی کی حدود کو متعین کرنا

الکتاب تو بہرحال قرآن ہے، یہی منزل من اللہ ہے اور کتابِ حکیم ہے۔بہت سے مقامات پہ قرآنِ کریم کو قرآنِ حکیم، کتابِ حکیم کہا گیا ہے۔ حکمت کے متعلق تو میں متعدد مقامات پہ یہ عرض کر چکا ہوں کہ یہ بڑی بنیادی چیز ہے۔حکمت کے متعلق نظری طور پر کہا جائے تو یہ وہ شے ہے جو دلائل و براہین کی رو سے ثابت کی جائے، یونہی دھاندلی سے کوئی بات نہ کہہ دی جائے یا منوالی جائے۔یہ نہ ہو کہ ایک بات کو صحیح کہا ہے لیکن پتہ نہیں چلتا کہ کیوں کہا گیا ہے۔جو اس کی The why of it ہے، وہ کیا ہے، اس کی علت کیا ہے، کیوں کہا گیا ہے، مقصد کیا ہے؟ یہ تمام چیزیں حکمت میں آ جاتی ہیں اور جب اسے ہم عملی زندگی میں لیتے ہیں تو اسے عربوں کی ایک مثال سے سمجھیے۔عربوں کے ہاں، یہ جو ریوڑ چراتے تھے، تو ہوتا یہ تھا کہ کوئی بھیڑ اُدھر بھاگ جاتی تھی، کوئی اِدھر بھاگ جاتی تھی، چرواہا انہیں اکٹھا کر کے، جب محفوظ راستے پر چلاتا تھا کہ دائیں بائیں، اِدھر اُدھر نہ ہونے پائیں تو یہ جو طریق ہوتا تھا یہ طریق حکمت کہلاتا تھا۔اب یہ جو کتاب ہے تو آپ سوچ لیجیے کہ اس میں حکیم کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ زندگی کے دریا کو سیلاب نہیں بننے دیتی، یہ اُس کے لیے ساحل متعین کرتی ہے کہ وہ انہی ساحلوں کے درمیان میں دریا اور نہر کی شکل میں، چلے تاکہ اس کے سارے فوائد تعمیری ہوں۔جونہی وہ ساحل ٹوٹیں یعنی ان کے جو کنارے ہیں وہ اِدھر اُدھر سے خواہ وہ پورے ٹوٹ جائیں یا کہیں سے شگاف پڑ جائے، تو پھر اس سے پانی کی وہ تعمیر باقی نہیں رہتی بلکہ وہی پانی تخریب کا موجب بن جاتا ہے، سیلاب بن جاتا ہے۔یہ حکمت ہے۔میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ ذہنی طور پر، فلاسفی کے بھی یہی معنی ہیں کہ وہ جو حکمت اور دانائی اور دانشمندی ہے، اس کے ساتھ قائل کرنے کی قوت کا نام ہوتا ہے۔اس میں واقعات کے اسباب ونتائج کا

ناگزیر تعلق ہوتا ہے۔ اسے فلسفہ کہتے ہیں اور وہ کرتا یہ ہے کہ انسان کے منتشر خیالات کو ایک خاص راستے کے اندر لے جاتا ہے۔ اسی کو Logic (منطق) کہتے ہیں کہ اسباب وعلل کی طرح بات میں سے بات بنے کہ اس کی وجہ یہ ہوئی اور اس کی وہ' اگر یہ قاعدہ چھوڑ دیا جائے تو وہ ذہنی انتشار رہتا ہے۔ ''حکیم'' میں تو بہت سی چیزیں آتی ہیں۔

قرآنِ کریم کو کتابِ حکیم کہا ہے اور اس کے بعد اس کا مقصد یہ بتایا ہے کہ یہ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ (31:3) ہے۔ اب عام ترجمہ آپ دیکھیں گے تو اُس میں لکھا ہوگا کہ یہ احسان کرنیوالوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے تو اس سے کیا بات سمجھ میں آئے گی یعنی اس چیز کی کیا تک ہے کہ ایک کتابِ حکیم ہے' عالمگیر انسانیت کی ہدایت کے لیے دی جا رہی ہے اور بتایا بھی جا رہا ہے کہ وہ ہدایت ہے اور رحمت ہے لیکن ساتھ لِّلْمُحْسِنِيْنَ کہا جا رہا ہے جیسے شروع میں دوسری ہی سورۃ البقرہ کے اندر آتا ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (2:2)۔ اس کے لیے ترجمہ کیا جاتا ہے کہ یہ ہدایت ہے متقیوں کے واسطے تو جو پہلے ہی متقی ہے اُس کو ہدایت کی کیا ضرورت ہے؟ کیا کبھی کسی نے کھڑے ہو کر یہی سوچا بھی ہے؟ تفسیریں اٹھائیں تو ان میں بھی یہی ہے' ترجمے اُٹھائیں تو جس ترجمے کو لیجیے خواہ وہ کسی زبان میں کیوں نہ ہو' وہاں یہی ملے گا کہ متقیوں کے لیے ہدایت ہے' اب جو متقی نہیں ہیں ان کے لیے تو اس میں کچھ نہ ہو! اور جو پہلے ہی متقی ہیں' ان کو ہدایت کی کیا ضرورت ہے۔

قرآنِ حکیم کو قرآن کی زبان میں ہی سمجھا جا سکتا ہے

میں نے اس لیے عرض کیا ہے کہ جب تک قرآنِ کریم کے ان الفاظ کے جو بنیادی معانی ہیں ان کو Reconstruct (از سرِ نو تعمیر وتشکیل) نہیں کیا جائے گا' یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ اس کے وہ معنی کیا ہیں' قرآن سمجھ میں نہیں آئے گا۔ قرآن ہی کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ نہیں رکھا بلکہ یہ عجیب بات ہے کہ اُس زمانے کی زبان محفوظ ہے اور یہ بھی محفوظ ہے کہ یہ عرب ان الفاظ کو کن معنی میں استعمال کرتے تھے۔ اس سے قرآن کا سمجھنا کتنا آسان ہوا۔ متقین کی وہ بات تو میں نے آپ کو پہلے بتائی تھی کہ حضرت عمر ؓ (581-644/45AD) سے پوچھا گیا کہ متقی کس کو کہتے ہیں؟ اُنہوں نے پوچھنے والے اُس بدو سے کہا کہ جب تم خاردار جھاڑیوں میں سے گزرتے ہو' راستہ ایسا ہے' جس کے دائیں بائیں ایسی کانٹے دار جھاڑیاں ہیں کہ کپڑوں کو الجھا دیتی ہے تو کیا کرتے ہو؟ عربوں کے کپڑے تو آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ تو ٹینٹ پہنے ہوئے چلے جا رہے ہوتے ہیں۔ پوچھا یہ ہے کہ وہ کچھ پہنا ہوا ہو اور خاردار جھاڑیاں ہوں تو کیا کرتے ہو؟ کہا کہ ہم کپڑوں کو اکٹھا کرتے ہوئے' ان کانٹوں سے بچتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ کہا کہ یہ متقی ہونا ہے۔ آپ دیکھیے کہ وہ لوگ کیسے سمجھتے تھے اور پھر ان باتوں کو کیسے سمجھاتے تھے!

ایک بدو پوچھ رہا ہے کہ متقی کسے کہتے ہیں؟ اس کے لیے یہ چیز کہہ کر صحیح راستہ بتا دیا ہے۔ عزیزانِ من! اسے کہا گیا کہ جب تم کسی ایسے راستے سے گزرتے ہو جہاں خاردار جھاڑیاں ہوں تو کیسے گزرتے ہو؟ اس نے کہا کہ جی' اِدھر سے لباس کو یوں لپیٹتے ہیں' اُدھر سے

یوں لپیٹتے ہیں' ادھر کانٹے سے بچتے ہیں' اُدھر کانٹے سے بچتے ہیں۔ کہا کہ جو اس طرح سے راستے کے خطرات سے یوں سمٹ کر' لپٹ کر' محفوظ ہو کر' گزرتا ہے تو اسے متقی کہتے ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ کتاب حکیم اُسے صحیح راستہ دکھاتی ہے جو راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلنا چاہتا ہو۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ یہ کہے کہ مجھے بچ کر چلنا ہے' مجھے الجھنا نہیں ہے' ان کانٹوں سے کپڑے نہیں پھڑوانے ہیں۔ جو راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلنے والا ہے' یہ کتاب اُس کے لیے ہدایت ہے۔ اگر کوئی جائے ہی خودکشی کرنے کے لیے تو اُس کے لیے یہ کہنا کہ صاحب! آگے نہ بڑھنا' پانی زیادہ گہرا ہے' وہ کہے گا کہ میں تو آیا ہی ڈوبنے کے لیے ہوں۔ جو آیا ہی ڈوبنے کے لیے ہے' راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے بچنا ہی نہیں چاہتا ہے' اُسے یہ صحیح راستہ کیا دکھائے گی۔ اس کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ کیا تم زندگی میں خطرات سے بچ کر چلنا چاہتے ہو تو آؤ تمہیں وہ راستہ دکھائیں۔

انسانیت کے لیے دوسری اہم شرط محسنین کا کردار ہے

شرطِ دوم لِلْمُحْسِنِيْنَ ہے۔ وہاں لِلْمُتَّقِيْنَ (2:2) تھا اور یہاں لِلْمُحْسِنِيْنَ (31:3) ہے۔ پہلی چیز اتنی ہی ہے کہ خطرات سے بچنا ہی چاہیے لیکن یہ تو Negative (منفی) پہلو ہے۔ یہ خطرات سے بچنا ہے' اُس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا' بلکہ اُس کو بچایا جاتا ہے یعنی چلنے والے کے کپڑے بچتے ہیں' کانٹوں سے پاؤں بچتے ہیں۔ وہ کسی چیز سے بچنا ہے۔ یہ چیز منفی پہلو ہوتا ہے لیکن یہ بھی بڑا ضروری ہے کہ انسان کی خطرات سے حفاظت ہو۔ اس سے وہ انسان تو پھر ویسے کا ویسا ہی رہا۔ اس کے بعد لِّلْمُحْسِنِيْنَ (31:3) ہے۔ اب ہمارے ہاں مشکل یہ ہے کہ یہ الفاظ اتنے پامال ہو گئے ہیں کہ ان کے بھی پھر معنی بیان کرنے پڑتے ہیں۔ محسن کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو اپنی زندگی کو حسین بنانا چاہے۔ اب یہ Positive (مثبت) بات آ گئی۔ میں نے کہا ہے کہ اب تو یہ بھی سمجھانا پڑے گا کہ زندگی کو حسین بنانا کیا ہے؟ انگریزی زبان میں Beautification کی بھی یہ چیزیں موجود ہیں۔ یہاں محسنین آیا ہے۔ قرآن میں آیا ہے کہ محسنین حسنِ کائنات کو نکھارنے والے ہیں' اپنی زندگی کو حسین بنانے والے ہیں۔ متقین وہ ہیں جو حفاظت سے چلنے والے ہیں' خطرات سے محفوظ رہنے والے ہیں۔ اتنا حصہ تو یہ ہے کہ وہ جیسے ہیں ویسے ہی رہے' کچھ اور نہیں بنے ہیں۔ یہی مقصد نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کو حسین بنانے کے خواہشمند ہیں' ان کے لیے صحیح راستے کی طرف راہنمائی بھی ہے۔ صحیح راستے کے لیے' صحیح منزل کی طرف پہنچنے کے لیے' راہنمائی تو بڑی ضروری ہے اور راستے میں مسافر کے لیے سامانِ سفر بھی تو چاہیے' جسے زادِ سفر کہتے ہیں وہ بھی تو چاہیے تو **رحمة** (31:3) کہا ہے۔

رحمت کے معنی زادِ سفر کے ہیں' سامانِ نشوونما کے ہیں۔ کیا بات ہے قرآن کی! تین الفاظ ہیں: هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ (31:3)۔ ان کے اندر پوری کائنات سمٹا کر رکھ دی ہے۔ پہلے تو ان کے لیے جو یہ تہیہ کریں کہ ہم نے اپنی زندگی کو حسین بنانا ہے' یہ ضروری بات ہے کہ اُس کے لیے صحیح راستہ کونسا ہے؟ یہ صحیح راستہ متعین کرنا ہے۔ اب دوسری بات یہ ہے کہ مسافر راستے پہ چل پڑا ہے' چلا جا رہا ہے' لمبی منزل ہے' راستے میں اس کو زادِ سفر کی ضرورت ہوگی اور یہ زادِ سفر وہ ہے جو اسے خرید کر نہیں لینا ہوگا۔ رحمت کے معنی ہی یہ ہیں

کہ جو خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ از خود ملے۔ وہ اس قسم کا ہدایت کرنے والا ہو' راستہ دکھانے والا ہو' جو صرف راستہ ہی نہ دکھائے بلکہ پورے راستے میں اس کے لیے زادِ راہ کا انتظام بھی کرے۔ وہ جو شاہراہوں پر Midway Hotel کھولے ہوئے ہوتے ہیں' وہ اسی انتظام کے لیے ہی تو ہوتے ہیں لیکن انہیں ہوٹل کیسے کہا جائے کیونکہ وہاں تو ہر چیز پیسے سے ملتی ہے' جبکہ رحمت یہ ہے کہ وہ زادِ راہ بھی از خود ملے' بلا مزد و معاوضہ ملے۔ اس نے راستہ ہی نہیں بنایا بلکہ راستے کے اوپر اس قسم کے جو Midway Hotels کھولے ہیں' وہ مہمان خانے ہیں' جہاں وہ سب کچھ بلا مزد و معاوضہ ملے گا۔ کہا یہ ہے کہ وہ جو راستے بھر میں خطرات سے حفاظت کرتے ہیں' وہ متقی ہیں اور اس کے بعد زندگی کو خوشنما اور حسین بنانے کے لیے سارے سامانِ نشوونما بلا مزد و معاوضہ ہیں' جو انہیں ملتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا کرتے ہیں؟ ان کے لیے کہا کہ اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَ ھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ (31:4)۔ یہی الفاظ کم و بیش شروع میں آئے ہیں۔ جہاں سے سورۃ البقرۃ شروع ہوتی ہے۔ آیا ہے کہ الٓمّٓ ۔ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۔ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ[1] (2:1-3)۔ اور اس کے بعد ہے کہ وَ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ[2] (2:4)۔ یہاں بھی وہی شرائط ہیں اور یہ بنیادی شرائط ہیں۔ اب ہمارے ہاں محسنین کا ترجمہ احسان کرنے والے کیا گیا ہے' وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کا ترجمہ نماز پڑھنے والے کیا گیا ہے اور وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ کا ترجمہ اڑھائی پرسنٹ زکٰوۃ دینے والے کیا ہے۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہ محسنین کا ترجمہ ''احسان کرنے والے'' کر کے کیوں یہ مطمئن ہو گئے؟ وہ اس لیے کہ وہ جو اڑھائی پرسنٹ زکوۃ کے طور پر دیتے ہیں تو وہ دوسروں کے اوپر احسان کرتے ہیں تو یہ خود بخود ہی اس کے اندر آ گئے ورنہ اگر یہ چیز قرآن کی رو سے ہوتی ہے کہ اس کی زندگی حسین بن جائے تو پھر دیکھنا پڑے گا کہ کیا ہماری ان نمازوں سے' ان نمازیوں کی' اور اڑھائی پرسنٹ زکٰوۃ دینے والوں کی زندگی حسین ہوتی ہے؟ کیا یہ حسنِ کائنات میں اضافہ کرتے ہیں' کیا یہ اس کی زلفوں کی مشاطگی کرتے ہیں کیا؟ اس کی زلفوں کو سنواتے ہیں؟

---

[1] خدائے علیم و حکیم کا ارشاد ہے کہ تم جس ہدایت کی آرزو رکھتے ہو (1:5) وہ ہمارے اس ضابطۂ قوانین کے اندر محفوظ ہے (15:9) جس میں نہ بے یقینی اور تذبذب ہے' اور نہ کوئی نفسیاتی الجھن۔ یہ ضابطۂ قوانین سفرِ زندگی میں' ان لوگوں کو انسانیت کی منزلِ مقصود کی طرف لے جانے والی راہ بتاتا ہے جو غلط راستوں کے خطرات سے بچنا چاہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ان حقیقتوں پر یقین رکھتے ہیں جو نگاہوں سے اوجھل ہیں اور صحیح روش کے ان نتائج پر بھروسہ رکھتے ہیں جو اگرچہ ابتداً ان کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں جن کا آخر الامر سامنے آ جانا یقینی ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے یہ لوگ اس نظام کو قائم کرتے ہیں جس میں تمام افراد قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے جائیں اور جو سامانِ نشوونما انہیں دیا جاتا ہے' اس میں سے' اپنی ضروریات کے بقدر لے کر (2:219) باقی نوعِ انسانی کی پرورش کے لیے کھلا رکھتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔2)

[2] وہ اس طرح اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ اس ضابطۂ خداوندی پر عمل کرنے سے ایک نئی زندگی کی نمود ہو جاتی ہے اور یوں حال کی جدوجہد سے انسان کا مستقبل روشن ہو جاتا ہے...... وہ مستقبل جس کا سلسلہ اسی دنیا تک محدود نہیں بلکہ وہ مرنے کے بعد بھی آگے چلتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔2 تا 3)۔

کائنات کو حسین سے حسین تر بنانے کے فریضہ کی ادائیگی اور اس کا ثمر

اللہ تعالیٰ نے جو انسان کو خالقیت کے اندر اپنا رفیق بتایا ہے تو یہ بہت بڑا مقام ہے۔ اپنے آپ کو احسن الخالقین کہا ہے۔ ویسے توحید کی کیفیت یہ ہے کہ جب ہم اللہ صاحبِ اقتدار کہیں گے تو اُس میں کوئی بھی شامل نہیں لیکن اُس نے تخلیق کے اندر انسانوں کو شامل کیا ہے۔ یہ انسانوں کی خصوصیت ہے حیوان کی نہیں ہے کہ وہ خدا کے امرِ تخلیق میں رفیق بنتا ہے اور رفیق ایسا بنتا ہے کہ اس کے لیے اقبالؒ (1877-1938ء) کی وہ نظم دیکھنے کی ہے۔ اس کے شروع میں کہا گیا ہے کہ خدا نے یہ کہا کہ دیکھیے! ہم نے یہ کائنات بنائی اور یہ کرّے بنائے اور یہ ارض بنائی:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم

(پیامِ مشرق)

تاریک رات تو نے بنائی تھی تو میں نے بجلی کے قمقمے ایجاد کیے۔ کہو تمہاری راتوں کو نور دینے والا تو ہے یا میں ہوں۔

سفال آفریدی ایاغ آفریدم

یہ مٹی اور مٹی کا تودہ ہی تھا کہ تم نے بنا کر یہاں رکھ دیا۔ سوچو تو سہی کہ اُس میں حسین آبخورے کس نے بنائے' تم نے بنائے یا ہم نے بنائے؟ ٹھیک ہے کہ میٹریل (مواد) کا پہلے موجود ہونا نہایت ضروری ہے' وہ تو یہ کبھار نہیں بنا سکتا۔ وہ میٹریل (مواد) تو خدا کا ہی دیا ہوا ہے لیکن اُس میٹریل (مواد) کو جو حسین بنا دینا ہے تو یہ ہے حسنِ کائنات میں اضافہ کرنا۔ وہ As it is (جیسا ہے) تو کوئی بات نہیں۔ خدا نے آدم کو پیدا کر کے کہا کہ دیکھو یہ ہماری کائنات ہے' یہ ہم نے ایسے بنا دی ہے اور کیا اب اس کا ایسا رکھنا ہی مطلوب و مقصود ہے؟ اس نے کہا

گفت آدم کہ چنیں ہست و چناں خواہد بود ❶

یہ غلط ہے کہ یہ جیسی ہے' یہ ویسی وہی رہے گی۔ تم نے ایسی بنائی ہے تو میں اسے ایسی بارونق بناؤں گا۔ خدا نے کہا کہ زندہ باد! یہی تو اس کا حسنِ رفاقت ہے کہ غاروں کے اندر بسنے والے انسانوں کو چاند پر بسنے والے انسان بنا دیا۔ اب یہ وہ چیز ہے جو محسنین کے اندر آتی

---

❶ باقی مخلوق' خدا کی بنائی ہوئی کائنات کو چھیڑتی نہیں لیکن انسان کی یہ حالت ہے کہ بقول علامہ اقبالؒ

گفت یزداں کہ چنیں است و چناں خواہد ماند　　گفت آدم کہ چنیں ہست و چناں خواہد بود

یہ کچھ ہے (What is) کو جو کچھ ہونا چاہیے (What ought to be) بنا دینے کا جذبہ انسان ہی کے سینے میں پنہاں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ خود کائناتی قوانین کے مطابق بھی کائنات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس طرح پوری کی پوری کائنات ارتقائی منازل طے کیے جا رہی ہے (پرویزؒ: ابلیس و آدم' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1983ء' ص۔45)۔

ہے۔بس فرق اتنا ہے کہ ان یورپ والوں نے خارجی کائنات کو تو حسین بنایا لیکن اپنی زندگی کو حسین نہ بنا سکے۔اب چہرہ روشن ہے مگر اندرون چنگیز سے تاریک تر ہے۔انہوں نے حسن کے یہ معنی سمجھے ہیں کہ یہ سارا میک اَپ (Make up) ہے۔میری بیٹیاں معاف رکھیں۔وہ جو باہر چمکتی ہوئی' بھڑکتی ہوئی' پری نظر آتی ہے گھر میں آ کر منہ ہاتھ دھو کر شیشے کے سامنے کھڑی ہوتی ہے تو اپنے آپ سے ڈر جاتی ہے۔زندگی کو حسین بنانے کے یہ معنی نہیں ہیں۔یہ غازہ کی اور حنا کی محتاج نہیں ہوتی۔یہ زندگی اس پیکر کا ہی نام نہیں گو کہ اس کو بھی صاف ستھرا رکھنا ضروری ہے۔زندگی تو انسانیت کا نام ہے۔یہ تو حسنِ انسانیت کے اندر اضافہ ہے۔اب یہ جو محسنین ہیں تو اس میں دونوں حسنِ کائنات کو نکھارنے اور سنوارنے والے بھی اور اپنی زندگی کے اندر حسن پیدا کرنے والے بھی آ جاتے ہیں۔اور یہ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ سے پیدا ہوگی۔

فضا کے اندر نظامِ صلوٰۃ پر عمل پیرا ہونے والے پرندوں کی مثال

جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ تو بہت بڑا پروگرام ہے۔صلوٰۃ کے معنی تو آپ جانتے ہی ہیں۔جیسا قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ دیکھو تو سہی کہ یہ فضا میں اڑنے والے پرندے کس طرح اپنی تسبیح اور صلوٰۃ کو جانتے ہیں۔ان کے جتنے فرائضِ منصبی ہیں یہ ان سے واقف ہیں۔راستے میں پختگی سے چلنے کی کیفیت یہ ہے کہ ایک چھوٹا سا پرندہ اپنے گھونسلے سے اڑتا ہے' سارا دن اس فضا کی پہنائیوں کے اندر سینکڑوں' ہزاروں میل کا سفر طے کرتا ہے۔شام ہوتی ہے تو کوئی راستہ نہیں' کوئی جی ٹی روڈ نہیں' کوئی راستے پہ نشاناتِ راہ نہیں' اور نہ ہی کسی سے پوچھتا ہے لیکن سیدھا اپنے گھونسلے میں آ جاتا ہے' کبھی اس کو Miss (فراموش) نہیں کرتا۔یہ ہیں ہدایتِ خداوندی پہ چلنے والے۔اس کو صلوٰۃ کہتے ہیں کہ ''جو فریضہ آپ کے سپرد کیا گیا ہے' جو راستہ آپ کو دکھایا گیا ہے' جو نظام تجویز کیا گیا ہے' اس کو اس طرح سے قائم کیا جائے کہ اس نظام کے اندر بسنے والا ہر شخص قوانینِ خداوندی کی از خود اطاعت کرتا ہوا چلا جائے''۔جیسا ریس کورس میں وہ نمبر دو کا گھوڑا ہوتا ہے۔میں نے کہا تھا کہ عرب اس گھوڑے کو مصلی کہتے تھے جو ریس کورس میں دوسرے نمبر پہ آئے مگر شرط یہ ہو کہ پہلے اور اس کے درمیان فاصلہ نہ ہو اور یہ پہلے سے آگے بھی نہ بڑھے۔یہ ہے صراطِ مستقیم جس کے لیے کہا کہ اِنَّ رَبِّىْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (11:56) میرا خدا صراطِ مستقیم پہ جا رہا ہے۔یہ نمبر اول کا گھوڑا ہے' بلاتمثیل ہے اور مصلی ہے نمبر دو گھوڑا' اس کے پیچھے پیچھے چلنے والا' آگے نہیں بڑھے گا لیکن دونوں میں فاصلہ بھی نہیں ہوگا۔یہ جو نظام قائم کیا جائے گا یہ ایسا ہوگا کہ اس میں ہر فرد صفاتِ خداوندی کا ایسا حامل ہو کہ ان دونوں میں انقطاع بھی نہ ہو اور یہ آگے بھی نہ بڑھ سکے۔یہ ہے نظامِ صلوٰۃ۔اس سے حسنِ زندگی میں اضافہ ہوتا ہے۔

اشیائے زکوٰۃ کا طریق اور اس کا مقصد و منتہا

نظامِ صلوٰۃ کا مقصد یہ ہے کہ ایتائے زکوٰۃ ہو، یہ اپنے آپ ہی کے لیے نہیں بلکہ کہا ہے کہ ہم نے راستے کے اندر رحمت (سامانِ نشوونما) کے لیے مڈوے ہوٹل کھولے تھے تو ہم تو اس میں سے ایک لقمہ بھی نہیں چکھتے۔ دوسری جگہ ہے کہ ہم تو صرف تمہیں کھلاتے ہیں، تم نے دیکھا ہے کہ ہم تو کبھی نہیں کھاتے۔ کہا کہ اسی طرح سے اپنی زندگی کو تو تم نے حسین بنایا لیکن اس سے اتنا ہی مقصد نہیں تھا، مقصد ایتائے زکوٰۃ ہے۔ اس کے لیے تمام انسانیت کو سامانِ نشوونما مہیا کرنا تمہارا مقصود ہے۔ یہ ہیں محسنین۔ وہ جو دوسرے انسان ہیں، وہ بھی توانا، صحت مند، حسین، نشوونما یافتہ ہوں گے تو پھر یہ جو کائنات کا حسن ہے اس میں اضافہ ہوگا۔ آپ اپنے آپ نہایت صحت مند توانا پہلوان بن جایئے تو وہ بھی ٹھیک ہے لیکن اگر آپ کے ساتھ جو ہمسایہ ہے، وہ تپِ دق (TB) کے اندر مبتلا ہے اور مر رہا ہے تو کیا آپ اس معاشرے کو حسین کہیں گے؟ وہ تو پوری عالمگیر انسانیت کے لیے ایک نظام ہے۔ یہ ایتائے زکوٰۃ اور اقامتِ صلوٰۃ سارے قرآن میں اکٹھے آتے ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ ہے ''خدا کے قوانین کے پیچھے اس طرح اتباع کرتے چلے جانا کہ یہ عمل مسلسل و متواتر ہو''، لیکن یہ تو ایک فرد ہو گیا۔ مقصودِ حیات اتنا ہی نہیں ہے کہ یہ اس طرح سے چلتا ہے بلکہ اگلی چیز اس عمل کے لیے لازم و ملزوم ہے کہ ایتائے زکوٰۃ ہو یعنی ''باقی انسانوں کی نشوونما کا بھی سامان کرو''، اور جب یہ دو چیزیں آ جائیں گی تو پھر اپنی زندگی میں بھی اور حسنِ کائنات میں بھی اضافہ ہوگا۔ اب ہم یہاں آ گئے جہاں یہ نظام، ان مارکس ازم والوں سے، روس والوں سے، ان کے مقابلے میں بالکل مختص ہو گیا۔ آپ کو یاد ہے کہ میں نے آپ کو ہمیشہ یہ بتایا ہے کہ مارکس (83-1818ء) نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ معاشی مشکلات کا حل صرف ایک ہی ہے کہ ''ہر شخص اپنی محنت کے مطابق کام کرے اور اس میں سے اپنی ضروریات کے مطابق لے کر باقی جتنا فاضل ہے یہ انہیں دیدے جن کی کمائی ان کی ضروریات پوری نہیں کر سکتی۔ اس نے کہا ہے کہ یہ ہے میرے نزدیک صحیح نظام یعنی

From each according to his capacity, to each according to his needs.

مارکس جہاں ناکام رہ گیا اس سے آگے

میں نے بتایا تھا کہ خود اس کی پارٹی کے لوگوں نے اس سے یہ کہا کہ یہ بڑا بلند اصول ہے جو تم نے دیا ہے اور ہمارے دل میں ٹھک گیا ہے کہ حل یہی ہے، اب اسے قائم کرو۔ وہ کہنے لگا کہ یہی تو مشکل ہے۔ وہ آج کے سیاستدانوں کی طرح نہیں تھا کہ دل میں جانتے ہیں کہ یہ چیز ممکن نہیں ہے لیکن پھر بھی بلند آہنگ دعاوی کرتے چلے جاتے ہیں کہ یہ کر کے دکھا دیں گے اور ہم وہ کر کے دکھا دیں گے۔ قرآن کہتا ہے کہ وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ (2:9) لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن کم بخت اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔

ایک تاؤ دیا جاتا ہے تو ساری منافقت کا ملمع اتر جاتا ہے۔ مارکس (83-1818ء) نے یہ اعتراف کیا کہ میں اس کو عملاً قائم نہیں کر سکتا اس لیے کہ یہ بات ہے کہ ایک شخص صبح سے شام تک' جان مار کر محنت کرے اور اس میں سے اتنا سا اپنے لیے لے اور باقی سارا دوسروں کو دیدے اور یہ ایک دو دن کی بات نہیں بلکہ ساری عمر ایسا کرے' سوال یہ ہے کہ وہ ایسا کیوں کرے؟ اس کا Incentive (جذبہ محرکہ) کیا ہے کہ جو اسی طرح سے کرتا چلا جائے؟ مجھے یہ جذبۂ محرکہ نہیں مل رہا اور اس کے بغیر یہ نظام چل نہیں سکتا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ بات تو میری سمجھ میں آئی ہے لیکن وہ جذبۂ محرکہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اس پر اس کی پارٹی کے ممبر اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ یہ لوگ کفر میں بھی پختہ تھے' یہ کتنی بڑی جرأت تھی جو اس نے کی تھی ورنہ کہہ دیتا کہ ٹھیک ہے جی' چلائیں گے اور چلانے کے دس دن بعد کہہ دیتا کہ میں کیا کروں' میرے ساتھ اس قسم کے لوگ ہیں اور یہ ساری ذمہ داری ان کے سر عائد کر دیتا مگر اس نے ساری ذمہ داری اپنے اوپر لی کہ میں یہ چیز فکری طور پر تو دے سکا ہوں لیکن مجھے وہ جذبۂ محرکہ نہیں مل رہا۔

مارکس کی ناکامی کے بعد سوشل ازم کی شکل میں لینن کی ناکامی

لینن (1924-1870ء) تک نے بھی یہ بات کہہ دی پھر جب اُسے کہا کہ تم ہی کچھ کرو تو اس نے کہا کہ بات تو وہ ٹھیک کہتا ہے۔ پوچھا گیا کہ پھر یہ کیسے ہوگا۔ کہنے لگا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ انسان کچھ اور ٹھوکریں کھاتا ہوا خود کسی اس نتیجے پر پہنچے کہ مجھے یہ کرنا ہے' پھر تو وہ یہ کچھ کچھ ہو سکے گا لیکن آج تو انسانوں میں' یہ بات میں نہیں دیکھتا اس لیے میں بھی یہ نہیں کر سکتا۔ وہ سوشل ازم کے اوپر آ گئے کہ چلو' وہ تو نہیں ہوسکتا البتہ اتنا تو کر لیجیے۔ یہ سوشل ازم ہے جو آج رائج [1] ہے' یہ مارکس ازم نہیں ہے' یہ کمیونزم ہے۔ یہ سوشل ازم ہے جو چل ہی نہیں سکتی تھی اور وہ بھی ناکام رہی ہے' کیونکہ انسان کے لیے اس میں جذبۂ محرکہ Incentive نہیں ہے۔

اس سلسلہ کے حل کے لیے قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ جذبۂ محرکہ کی لم

عزیزانِ من! Incentive (جذبہ محرکہ) کے بغیر تو آدمی چارپائی سے نہیں اٹھ سکتا' گھر کے کمرے سے باہر نہیں نکلتا' بازار نہیں جاتا' کام پہ نہیں جاتا۔ کچھ حاصل کرنے کے لیے پہلے اپنے اندر ایک چیز پیدا ہوتی ہے۔ یہ جذبہ ہی ہے جو آپ کو اس طرح سے کاروبار میں مصروف رکھتا ہے تو یہ ہے جذبہ کہ انسان اس طرح سے ساری عمر محنت کرتا رہے اور اپنی ضرورت کے مطابق لے کر باقی دوسروں کو دیتا چلا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ انسان وہ کچھ کیوں کرے' اس کا جذبۂ محرکہ کیا ہے؟ اگر زندگی کو اسی دنیا کی زندگی سمجھ لیا جائے تو پھر تو ہر شخص یہ کہے گا کہ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں دوسرے کی خاطر جان ماروں کیونکہ کل کو اس نے بھی اور میں نے بھی مر جانا ہے۔ جذبۂ

---

[1] یہ 1917ء میں پہلی دفعہ روس میں رائج ہوا۔

محرک یہ ہے جو قرآن نے کہا کہ وَهُمْ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (31:4) زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں ہے بلکہ زندگی کو اور آگے بڑھنا ہے' آگے جانا ہے' ختم نہیں ہو جانا۔ جسم کی موت کے ساتھ انسان کی زندگی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس سے بلند منزلیں طے کرنے کے لیے یہ آگے جاتی ہے' اور بلند منزل وہ طے کرتا ہے جو اس دنیا میں دوسروں کی نشو ونما کا سامان پہنچاتا ہے۔ جب یہ ایمان حاصل ہو جائے کہ میں جتنا دوسروں کو دوں گا اتنی ہی میری جو اگلی منزل ہے' وہ زیادہ بلند ہوتی چلی جائے گی تو اس پر قرآن کہتا ہے کہ اس ایمان کے بھروسے پہ انسان یہ کچھ کرسکتا ہے' اس کے بغیر نہیں کرسکتا۔ یہ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (2:4) یونہی نظری (Academic) سی بات نہیں ہے بلکہ یہ وہ لم (Rationale) ہے' وہ لنک (Link) ہے جو مارکس کو نہیں مل رہا تھا' جس کی وجہ سے وہ عملی قدم نہیں اٹھا رہا تھا اور نہ ہی وہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے ہاں آخرت پہ ایمان ہے ہی نہیں بلکہ وہ زندگی کو اسی دنیا کی زندگی مانتے ہیں۔ اس لیے اس شخص نے اس کا اعتراف کر لیا کہ میں جذبہ محرکہ نہیں دے سکتا۔ اس کے ذہن میں آخرت پر ایمان کا تصور ہی نہیں تھا اور ان میں سے کسی کے ذہن میں بھی نہیں ہے۔ یہ جو کمیونسٹ ہیں یا سیکولر تصورِ حیات والے ہیں' ان میں سے کوئی بھی اس نظام کو قائم نہیں کرسکتا۔ اس لیے کہ وہ جھکڑ کی طرح چلے گا اور دوسرے دن ختم ہو جائے گا۔

روس کی تباہی و بربادی کے بعد چین میں لال کتاب کا حشر

روس کا جو حشر ہو رہا ہے' وہ آپ کے سامنے ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ وہاں کیا ہوا ہے اور کیا ہو رہا ہے! اب China (چین) کے اوپر نگاہیں اٹھ رہی تھیں کہ صاحب! وہ دیکھیے۔ اس میں کم از کم وہ چیز نظر آتی ہے کہ وہ تو صرف ماؤزے تنگ (Meo Ze-dong 1893-1976) کی شخصیت تھی' جس کے بل بوتے پہ یہ چل رہا تھا۔ ابھی اس کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا کہ توڑ پھوڑ شروع ہو گئی جب کہ ماؤزے تنگ کی وہ لال کتاب ان کے لیے صحیفۂ کائنات تھی۔ آپ نے تصویروں میں دیکھا ہوگا کہ جنگلوں میں کھڑے ہیں' راستے میں کوئی مسئلہ پیش آ گیا ہے' تو لال کتاب کھول لی ہے' ان لوگوں کا اس لال کتاب پہ اتنا ایمان تھا' آج اسی کتاب میں ماؤزے تنگ کے یہ سارے نظریئے اور اقوال درج ہیں' جو انہوں نے جہاں جہاں شہروں میں' گاؤں میں جہاں کہیں بھی جگہ تھی' نقش کر کے' پینٹ کر کے' لگا دیئے تھے' آج وہ سارے غائب ہوتے جا رہے ہیں اور اس کی بیوی سمیت اس کے ساتھیوں کو گرفتار کیا جا رہا ہے۔ اس سے آپ دیکھیے کہ وہ جو قرآن تیسرا ٹکڑا وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (2:4) کہتا ہے وہ کتنا اہم ہے اور قرآن اسے ہر جگہ کیوں لاتا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو میں نے اپنی اس کتاب میں کہا تھا کہ ''جہاں مارکس ناکام رہ گیا (اس سے آگے ❶)'' تو یہ اُس سے آگے ہے۔

---

❶ پرویزؒ: نظامِ ربوبیت' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1989' جہاں مارکس ناکام رہ گیا (اس سے آگے)' ص ص۔ 318 تا 356۔

ایک جگہ تو قرآن میں یہ لکھا ہوا ہے کہ جو آخرت پہ ایمان نہیں رکھتا' وہ ایتائے زکوٰۃ کو نہیں پہنچ سکتا۔ میں ''کیوں'' اپنی محنت کا سارا ماحصل دوسرے کو اٹھا کر دیدوں؟ اس ''کیوں'' کا جواب نہیں مل سکتا سوائے ایمان بالآخرت کے۔ تو یہ جو چیز ایمان بالآخرت ہے' یہ اس لیے دی جاتی ہے کہ ایتائے زکوٰۃ کا نظام ممکن ہو۔ یہ ممکن ہی اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ آخرت پر ان کا ایمان ہو۔ یہ وجہ ہے جو قرآن ہمیشہ اس کو لاتا ہے اور یہ کچھ کہنے کے بعد وہاں سورۃ البقرۃ میں بھی یہی کہا تھا اور یہاں بھی یہی کہا کہ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ (31:5)۔ یہ دیکھنا چاہو کہ کون اس راستے پہ چل رہا ہے جس نے ہمیں کہا تھا کہ ہمارا وہ راستہ ہے' اس راستے میں رحمت بھی ملے گی اور اس کی زندگی بھی حسین ہوجائے گی؟ عزیزانِ من! یہ دیکھنے کی بات ہے۔ اس کے لیے کہا ہے کہ أُولَٰئِكَ (31:5) یہ ہیں وہ لوگ جن میں یہ چیز ہے۔ اور پھر سنیے! یہ دیکھنے کے لیے اقامتِ صلوٰۃ کا نظام ہے جس میں ہر شخص قوانینِ خداوندی کی پیروی کرتا چلا جائے جیسے ہر پرندہ اسی طرح سے پیروی کیے چلا جاتا ہے جو فریضہ اس کے ذمے سونپ دیا گیا ہے وہ خود اس کو ادا کیے چلا جاتا ہے۔

انسانی اعمال کے سلسلہ میں کھیتی کی مثال کی اہمیت

اس اقامتِ صلوٰۃ سے مقصود ایتائے زکوٰۃ ہے کہ نوعِ انسانی کی نشوونما کے لیے وہ سب کچھ دیئے چلا جاتا ہے۔ اس کے لیے کہا کہ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ (31:5)۔ یہ ہیں وہ لوگ جو صحیح راستے پہ چلنے والے ہیں اور اگلی بات یہ ہے کہ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (31:5) یہ وہ لوگ ہیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔ یہاں پھر کھیتی سے ہی تشبیہ دی ہے۔ قرآن عام طور پہ کھیتی سے تشبیہ دیتا ہے۔ اس لیے کہ جو عمل کا دانہ ہے وہ برومند ہونے کے لیے ایک وقفہ چاہتا ہے' مسلسل حفاظت چاہتا ہے' مسلسل قانون کا اتباع چاہتا ہے اور اس کے بعد جا کر ایک دانہ سات سات سو دانے دیتا ہے۔ یہ جو آخر میں دانے دیتا ہے وہ آخرت ہے۔ آخرت کے معنی مستقبل (Futurity) ہیں کہ مستقبل پر یقین رکھے۔ جو کسان اس مستقبل پہ یقین نہیں رکھتا وہ کبھی بیج بوتا ہی نہیں ہے' محنت کرتا ہی نہیں ہے۔ زراعت کی' فلاحت کی قرآن کی یہ ایسی برجستہ مثال ہے کہ انسان عش عش کر اٹھتا ہے۔ جیسا میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ گھر کا پورا اثاثہ ایک بوری گیہوں کی ہے' فاقے آ رہے ہیں' آٹا ہے نہیں۔ وہ اس گیہوں کو جا کر پسواتا نہیں ہے بلکہ جا کر مٹی میں ملا کر آ جاتا ہے۔ چھ مہینے تک صبح اُٹھتا ہے' درانتی رسی پھوڑا ہاتھ میں لیتا ہے اور سارا دن جا کر وہاں اس کھیت میں گرمی کے زمانے میں خون پسینہ ایک کرتا ہے' سردیوں کی راتوں میں پانی دیتا ہے اور یہ کچھ کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ کسی قسم کے Return (معاوضہ) کے بغیر کیوں کرتا چلا جاتا ہے؟ اس لیے کہ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ (2:4) اسے اس کے مستقبل کے اوپر ایمان ہے کہ اس نے اتنے دانے دینے ہیں' اس میں اتنی فصل پیدا ہوجانی ہے۔ جس دن اس کا اس کے اوپر ایمان نہیں رہے گا اس کا مستقبل تاریک ہوجائے گا اور یہی انسانی اعمال کی مثال ہے۔ جو

اس کھیتی کی حفاظت نہیں کرتے تو لوگ کھڑی فصلیں کاٹ دیتے ہیں۔

انسان کا ہر آنے والا سانس پہلے سانس کی آخرت ہوتا ہے

یہ ٹھیک ہے کہ آخرت کے معنی مرنے کے بعد کی زندگی بھی ہے لیکن اس کے یہی معنی ہی نہیں ہیں بلکہ انسان کا ہر آنے والا جو سانس ہے وہ پہلے سانس کی آخرت ہے، ہر نیا دن پچھلے دن کی آخرت ہے۔ یہ وہی ہے جسے مستقبل یا Future کہتے ہیں، ہر نئی نسل جو ہے وہ مستقبل ہے، قوم کے بعد اگلی آنے والی قوم اس کی مستقبل ہے اور اسی طرح سے اس زندگی کے بعد آنے والی زندگی اس کا مستقبل ہے۔ یہاں بھی وہی قوم مصلح ہو سکتی ہے جو اپنا ہی خیال نہ کرے بلکہ آنے والی نسلوں کا بھی خیال کرے، آنے والی قوم کا بھی خیال کرے۔ کہا ہے کہ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ❶ (31:5)۔ ایک تو یہ ہیں اور ان کے مقابل میں دوسرے لوگ وہ ہیں جن کے لیے کہا ہے کہ وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا❷ (31:6)۔ قرآن انسانی زندگی کو اتنی قیمتی متاع بتاتا ہے کہ اس نے کہا کہ جس نے کسی ایک جان کو بھی ناحق تلف کر دیا تو یوں سمجھو کہ گویا اس نے پوری انسانیت کو تباہ کر دیا۔ یہاں کہا ہے کہ جو اتنی قیمتی زندگی ہے، یہ اسے بیچ دیتے ہیں اور اس کے بدلے ''لھو'' خریدتے ہیں۔ ہمارے ہاں لھو ولعب تو عام استعمال ہوتا ہے۔ انہوں نے ''لھو'' کے معنی گانا بجانا کر دیا کہ بس وہ اس گانے بجانے کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اب یہ گانے بجانے والے تو کچھ تھوڑی سی ہی Percentage (فی صد) ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ ''اور وہ لھو ہیں جو تاش کھیلتے ہیں۔'' عزیزانِ من! عرب ہر اس بات کو جو کسی بلند مقصد کی طرف سے توجہ کو ہٹا کر، کسی کمتر درجے کی طرف کر دے، تو وہ اسے لھو کہتے تھے۔ بلند ترین درجہ تو یہ تھا کہ زندگی کو حسین بنایئے، خود بھی خوشحال رہیے اور دوسروں کے لیے بھی یہ کچھ کیجیے، تخلیقِ کائنات کے اندر اضافے کرتے چلے جایئے۔ اس طرح سے آخرت بھی حسین ہوتی چلی جائے گی۔ یہ کتنا بڑا بلند مقصد ہے! اس مقصد کے مقابلے میں آپ اپنی زندگی یا صرف اپنی طبعی زندگی کے مطابق خواہ قوم ہو یا فرد ہو، جو کچھ بھی وہ کریں گے، وہ بلند مقصد کی طرف سے توجہ ہٹا کر، پست مقصد کی طرف لے آنیوالی چیز ہو گی۔ یہ ہے لھو۔ اب ان کو کون بتائے اور کون سمجھائے کہ یہ ''لھو'' نہ گانا بجانا ہے اور نہ تاش کھیلنا۔ یہ تو کبھی بلند مقصد کی طرف سے توجہ ہٹا کر کسی کمتر درجے کی طرف لے جانے والی چیز ہے۔

---

❶ یہی لوگ ہیں جو خدا کے بتائے ہوئے صحیح راستے پر چلتے ہیں اور یہی ہیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں (2:5)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص 945)۔

❷ جو زندگی کا بلند مقصد اپنے سامنے نہیں رکھتے، اور طبعی زندگی کی عارضی لذتوں اور بے معنی مسرتوں ہی کو مقصودِ حیات سمجھ لیتے ہیں، وہ اس طرح خود بھی گمراہ ہوتے ہیں، اور دوسروں کو بھی، بلا علم و دانش، صحیح راستے سے بہکاتے ہیں۔ یہ زندگی کے بلند مقاصد، اور ان کی طرف لے جانے والے صحیح راستے کو مذاق سمجھتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص 946)

قرآنِ حکیم کے بنیادی تصورات کو سمجھے بغیر اس کتاب عظیم کا پروگرام سمجھ میں نہیں آ سکتا

عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ جب تک یہ جو دین کے Basic Concepts (بنیادی تصورات) ہیں، ان کی تعمیر نو نہیں کی جائے گی، نہ قرآن کے مقاصد سمجھ آئیں گے، نہ پروگرام سمجھ آئے گا، نہ اس کا مفہوم سمجھ آ سکتا ہے۔ میں یہ کہوں تو یہ پیچھے پڑ جائیں گے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (2:219) یہ پوچھتے ہیں کہ اتنی محنت کرنے کے بعد ہم اس میں سے کتنا خود لیں اور کتنا دوسروں کو دیدیں۔ کہا کہ او بابا! یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ تمہاری اپنی نشو ونما کے لیے جتنے کی ضرورت ہے، اتنا لو اور اس سے زائد جو بچتا ہے، وہ دوسروں کی نشو ونما کے لیے دیدو۔ وہ تو سارے کا سارا دینا تھا۔ یہ ہے ایتائے زکوٰۃ کا بلند مقصد، جو یہ نہیں کرتے، ان کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ❶ (31:6)۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہزار برس سے یہ امت دوسرے راستوں پہ پڑی ہوئی ہے۔ وہ هُدًى وَّرَحْمَةً (31:3) اس راستے کو بتاتا تھا جس میں ایتائے زکوٰۃ تھا۔ مگر یہ ان کو لَهْوَ الْحَدِيْثِ (31:6) کی طرف لانے کے بعد دوسرے ہی راستے پر ڈال دیتے ہیں۔ گاڑی دوسری پٹڑی پہ پڑ گئی۔ اور اس کے بعد ہے کہ جب ان سے اصل بات کہی جائے هُـزُوًا (31:6) کرتے ہیں، مذاق اڑاتے ہیں، استہزا کرتے ہیں۔ استہزا کے اندر ایک نفرت کا پہلو ہوتا ہے، ذلت کا پہلو ہوتا ہے۔ اب ہمارے ہاں تو مشکل یہ ہے کہ اس کے ترجمے مزاح اور استہزا کیے جاتے ہیں جب کہ مزاح تو بڑی چیز ہے۔ اس کے لیے انگریزی میں Humour کا لفظ ہے۔ اس میں دوسروں پہ پھبتیاں کسنا، طنز کرنا، طعن کرنا، تشنیع کرنا نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ جو بلند مقصد کے متعلق کچھ بات کرنے والے ہیں، یہ ان سے استہزا کرتے ہیں، ان کا مذاق اڑاتے ہیں، ان پہ طعن و تشنیع کرتے ہیں۔ اس طرح سے یہ دوسروں کی ذلت کرتے ہیں مگر انہیں پتہ نہیں ہے کہ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (31:6) اس روش کے نتیجے میں جو ہونے والا ہے، وہ ذلت آمیز تباہی ہے۔ یہ بلند مقصد کی طرف بلانے والوں کے ساتھ استہزا کرتے تھے۔ استہزا کی نسبت سے اس تباہی کو ذلت آمیز قرار دیا ہے۔ کہا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے، پھر یہ کہ وہ اپنی مفاد پرستیوں کے نشے میں اتنے سرمست ہوتے ہیں کہ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْـرًا (31:7) جب ان کے سامنے قوانینِ خداوندی پیش کیے جاتے ہیں تو نہایت نخوت اور تکبر سے یوں منہ موڑ جاتے ہیں گویا کہ ان کے کانوں میں ڈاٹ لگ رہے ہیں، جن کی وجہ سے انہوں نے سنا ہی نہیں کہ انہیں کیا کہا گیا ہے۔

---

❶ یہ لوگ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں، اور دوسروں کو بھی، بلا علم و دانش، صحیح راستے سے بہکاتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔946)۔

نفسیاتی طور پر سب سے زیادہ نخوت اور تکبر میں گرفتار علما کی اکثریت ہوتی ہے

ٹھیک ہے کہ نخوت اور تکبر دولت کے نشے میں ہوتا ہے لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ سب سے بڑا جو تکبر اور نخوت ہے' وہ ان میں ہوتا ہے' جنہیں علما کہتے ہیں۔ ان کے ہاں کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنے گروہ کے سوا باقی سب کو فاسق' گنہگار' جہنم کے کُندے کہتے ہیں۔ چلے جا رہے ہیں اپنے اس انداز کے اندر اور جونہی کسی کی پتلون پہ نظر پڑی کہ وہ ٹخنوں سے نیچے ہے' تو ماتھے پہ جفر کے نقشے بننے لگ جاتے ہیں' آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں' منہ سے جھاگ نکل رہی ہے' دنیا بھر کی گالیاں طنز و طعن و تشنیع ان کے خلاف کیے جا رہے ہیں۔ اس استکبار کے ساتھ یہ چلتے ہیں کہ جیسے جیب کے اندر انہوں نے جنت کی ٹکٹیں رکھی ہوئی ہیں اور وہ بانٹنے کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔ اتنا تکبر اور اتنی نخوت ہوتی ہے۔ کہا کہ وَلّٰی مُسْتَكْبِرًا (31:7)۔ یہ ہیں جو سب سے پہلے منہ موڑ کر جاتے ہیں۔ یہ گنہگار بیچارہ تو پھر بھی کبھی سن ہی لیتا ہے' اس کے دل میں کبھی خیال پیدا ہو ہی جاتا ہے کہ خدا کی بات ہے مگر یہ ہیں کہ وَلّٰی مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا (31:7) ایسے جیسے ان سنی کی جاتی ہے' ایسے جیسے کانوں میں ڈاٹ لگے ہوئے ہیں اس لیے کہا کہ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (31:7) ان کو مطلع کر دو کہ ان کی یہ روش انہیں بڑے الم انگیز عذاب میں مبتلا کر دے گی۔ یہاں استکبار تھا' بڑا پن تھا اور اس نشے میں بدمست ہونا تھا۔ اب یہاں ان کی اس تباہی کو الم انگیز تباہی کہا ہے' دردناک تباہی کہا ہے۔ یہ تباہی ذلت آمیز ہوتی ہے' الم انگیز ہوتی ہے' دردناک ہوتی ہے کیونکہ یہ ان کے مکافاتِ عمل کے نتیجے میں آتی ہے۔ وہ خدا جو رؤف و رحیم بھی واقع ہوا ہے' ان انسانوں کے متعلق جو اپنے ہاتھوں سے تباہی اپنے اوپر لیتے ہیں' کہتا ہے کہ يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ (36:30) او میرے بندے! تجھے کیا ہو گیا ہے' تو نے کیا کر دیا ہے!! لیکن جب قومیں اس مقام پہ' اس منزل پہ' پہنچ جاتی ہیں کہ وہ اپنے ہاتھوں سے ذلت آمیز تباہیاں مول لیتی ہیں تو ان کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ جب یہ تباہی یوں ہوتی ہیں تو ان کی اس تباہی پہ نہ زمین روتی ہے' نہ آسمان آنسو بہاتا ہے۔

اب ایک طرف ان لوگوں کا گروہ ہے اور اس کے مقابلے میں وہی اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ والے الْمُفْلِحُوْنَ (31:5) ہیں۔ کہا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (31:8)۔ ان کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جو آخرت کا یہ ایمان رکھتے ہیں اور اپنے ہاں وہ متعین پروگرام قائم کرتے ہیں جو بتایا گیا ہے یعنی اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کرتے ہیں تو قرآن نے اسے عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (31:8) کہا ہے' یہ بڑی چیز ہے۔

انسانی ذات کی نشوونما انسان کی اپنی صلاحیتوں کی رہین منت ہوتی ہے

انسان کو خدا نے بڑی صلاحیتیں دی ہیں۔ وہ Potential Form (مضمر حالت) کے اندر ہیں' غیر نشوونما حالت

(Undeveloped Form) میں ہیں۔ یہ قرآن وہ پروگرام دیتا ہے جو کہیں باہر سے لاکر اس انسان کو کچھ اور نہیں بناتا بلکہ وہ کہتا ہے کہ اس کے اندر کی صلاحیتیں Develop (بارزر) ہوتی چلی جاتی ہیں اور اس کا حسن نکھرتا چلا جاتا ہے۔ صحت تو اسی کا نام ہوتا ہے کہ اندر سے صحیح صالح خون پیدا ہو' باہر سرخی لگا لینے سے تو انسان کی صحت نہیں ہوتی۔ صحت اندر کی کیفیت کا نام ہوتا ہے۔ اس کو وہ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کہتا ہے۔ یہ وہ پروگرام ہے' جو اس کی اپنی صلاحیتوں کو نشوونما دے دیتا ہے' Develop (بارزر) کر دیتا ہے' تو اس کی صحت برومند ہو جاتی ہے۔ وہ جو پروگرام Adopt (اختیار) کرتا ہے تو اس کے ماحصل کو قرآن نے لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيْمِ - خٰلِدِيْنَ فِيْهَا (31:8-9) کہا ہے۔ یعنی اس کے لیے پُرآسائش زندگی ہوگی یہاں بھی اور اس کے بعد بھی۔ ہمارے ہاں تو جونہی جنت کا لفظ آیا فوراً آخرت کی طرف نگاہ گئی حالانکہ یہاں کی ذلت اور خواری کی زندگی کو' بھوک کی زندگی کو' خدا کا عذاب کہا ہے' خوف اور بھوک کو خدا کا عذاب کہا ہے' ذلت اور مسکنت کو خدا کا غضب کہا ہے۔ ان کی یہاں کی ساری زندگی اس قسم کی ہوتی ہے اور جب ان سے کہیے کہ صاحب! اعمالِ صالحہ یہ نتیجہ کیوں نہیں پیدا کرتے تو کہتے ہیں کہ کریں گے لیکن وہاں آخرت میں جا کر پیدا کریں گے۔ قرآن تو یہاں کی بات کرتا ہے' وہ تو پہلی دعا جو سکھاتا ہے' وہ یہ ہے کہ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً (2:201) اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیاوی زندگی کی خوشگواریاں بھی حاصل ہوں اور اُس سے آگے فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً (2:201) کہتا ہے کہ اُخروی زندگی کی خوشگواریاں بھی حاصل ہوں' وہ تو پہلے اس دنیا کے اندر حسنات کہتا ہے' دنیا کی یہ زندگی حسین بناتا ہے اور یہ حسنِ مسلسل ہے جو آگے جاتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ یہاں تپ دق کا مارا ہوا مرتا ہے وہاں پہلوان بن جاتا ہے۔ جس پودے کی جڑیں کمزور ہیں وہ پھل بھی نہیں دے سکتا۔ یہ یہاں کی زندگی کے متعلق خوشگواریوں کا ذکر ہے۔ اس لیے وہ قرآن میں جنت کا لفظ لاتا ہے۔

اونٹ کا معدہ چاک کر کے پانی پینے والی قوم کو جنت کی خوشخبری

عزیزانِ من! عربی زبان میں آپ دیکھیے ان عربوں کے ہاں صحرا کی زندگی تھی' کوسوں تک کوئی درخت ہی نظر نہیں آتا تھا' جھاڑیاں ہوتی تھیں' کہیں درخت نظر آتا تھا تو وہ کھجور کا درخت تھا' اتنے سے حصے میں اُس کا سایہ ہوتا ہے۔ جنت کا لفظ اس نے اس لیے کہا ہے کہ وہ اس قسم کے گھنے سائے والے باغات اور درخت ہوں جن کے نیچے چیزیں ان کے سائے سے چھپ جاتی ہیں۔ ان عربوں کو' اس ریگستان کی زندگی بسر کرنے والوں کو' یہ خوشخبری دی جائے کہ اس قسم کے باغات ہوں گے۔ وہ پیپل یا بڑ کے درخت کے باغ نہیں بلکہ وہ نہایت عمدہ پھل کے باغات ہوں۔ ایسے باغات یا تو وہ شام میں دیکھتے تھے یا طائف کی وادی میں یہ چیزیں ہوتی تھیں یعنی یہ تھے اعلیٰ درجے کے انار' بہترین قسم کی کھجوریں' انگور کے لٹکے ہوئے خوشے۔ ان کے ہاں صحرا میں پانی نہیں تھا' وہ اس پانی کو ترستے تھے' صحرا میں

پانی ختم ہوجاتا تھا تو اونٹ کا معدہ چاک کر کے اس کے اندر سے پانی نکال کر پی جاتے تھے۔ پانی کی یہ کیفیت تھی۔ یہاں یہ کہا گیا کہ ایسے باغات ہوں گے جن میں پانی یہی نہیں کہ تالاب بھرا ہوا ہوگا بلکہ رواں دواں ہوگا یعنی ان کے تخیل کے مطابق اس سے زیادہ کوئی چیز دلکش، خوشگوار، زندگی کو حسین بنانے والی، بہترین آسائشیں دینے والی، ہو ہی نہیں سکتی۔

سنیے! عزیزانِ من! حضرت بل کے مزار کے کنارے جمعہ کا اجتماع تھا اور واعظ وعظ کر رہا تھا۔ سردی کا زمانہ تھا، برفیں پڑی ہوئی تھیں، کشمیر کا علاقہ تھا تو وہاں جنت کا بیان ہو رہا تھا۔ میں نے کہا کہ اگر اس نے یہ کہا کہ اتنے گھنے سائے ہوں گے، اس کے اندر پانی کڑکڑاتا جاڑا ہوگا، تو لوگوں کے دانتوں نے بجانا شروع کر دینا تھا مگر اس واعظ نے کہا کہ جنت میں اتنے اتنے بڑے لحاف ہوں گے، کوئلہ ہوگا، وہ کوئلہ خود جلے گا، جلتا رہے گا۔ میں نے کہا کہ ان کی جنت یہی ہو سکتی ہے۔ اگر وہ ان سے کہتے کہ وہاں گھنے سائے ہوں گے اور پانی ہوگا ''تے او کہندے سانوں ذرا تھوڑی جہنم وی دکھا میاں!''❶ یہ یاد رکھیے کہ قرآن کا یہ انداز تھا۔ ان کے لیے یہ کچھ تھا۔ جب حضرت عمرؓ کے زمانے (634-644/45AD) میں فتوحات حاصل ہوئی ہیں تو آپ دیکھیے گا کہ ایران سے فتح کے بعد جو گورنر سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا خط آیا ہے تو اس میں انہوں نے جو وہاں کا نقشہ کھینچا ہے کہ وہاں ہمیں کیا کیا ملا تو وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا تھا بلکہ وہ قرآن کی آیات لکھتے چلے جاتے ہیں۔ لکھا ہے کہ وہاں قالین ہوں گے، فرش ہوں گے، چاندی سونے کے برتن ہوں گے تو آپ جانتے ہیں کہ وہ ایرانیوں کے ہزاروں سال کے اکٹھے کیے ہوئے نوادرات تھے اور کیا کچھ تھا! وہ یہ کچھ لکھ کر کہتے ہیں کہ ہمیں یہ بھی ملا، ہمیں یہ بھی ملا۔ یہ جنت النعیم تھیں جن کے وعدے کیے جا رہے تھے کہ یہ جنت النعیم تمہیں ملیں گی، تم ان میں رہو گے۔ یہ معنی کیسے ہوئے؟ عزیزانِ من! قرآن تو دُور جانے ہی نہیں دیتا، وہیں بات سمجھا دیتا ہے۔ کہا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيْمِ ـ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا (31:8-9) جو لوگ ہمارے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور انسانی معاملات کو سنوارنے والے کام کرتے ہیں، ان کے لیے پُر آسائش زندگی ہوگی، یہاں بھی اور اس کے بعد بھی۔ یہ کچھ کہا اور اس کے بعد کہا کہ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا (31:9) اللہ کے وعدے سچے ہیں۔

صداقت اور حق کے الفاظ کے فرق کو واضح کرنے کے لیے چالیس ہزار شہروں اور قلعوں کا ثبوت

آیئے عربوں سے پوچھیں کہ ان کے نزدیک ''حق'' اور ''صداقت'' کے کیا معنی ہیں۔ جب تک وہ نظریئے کی حیثیت سے ہے تو وہ ''صداقت'' ہے، ان کے ہاں ''حق'' کے معنی یہ ہیں کہ کسی نظریئے کا ٹھوس اور محفوظ شکل میں ثابت ہو کر سامنے آ جانا۔ وہ اگر محسوس شکل میں سامنے Establish (قائم) نہیں ہوتا تو اس وقت تک وہ اُس کو حقیقت یا حق نہیں کہتے بلکہ صداقت کہتے ہیں کہ

---

❶ تو وہ کہتے کہ میاں! ہمیں تھوڑی سی جہنم بھی دکھا دو۔

ٹھیک ہے ہمارا ایمان ہے' بات سچی ہے۔ حق کے اندر دو چیزیں ضروری ہیں ایک یہ کہ وہ شے محسوس شکل میں ہو اور دوسرا یہ کہ وہ Establish (قائم) ہو جائے۔ اس لیے ایک نظریہ جب محسوس شکل میں Establish (قائم) ہو کر سامنے آئے تو وہ اس کو حق یا حقیقت کہتے تھے۔ یہاں کہا یہ ہے کہ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقًّا (31:9) ہم جو وعدہ کر رہے ہیں' یہ محسوس شکل میں Establish (قائم) ہو کر تمہارے سامنے آ جائے گا۔ ان کے ہاں حقیقت کہتے ہی اس چیز کو تھے۔ یعنی ویسے تو ہمارے ہاں حقیقت Real کو یا Reality کو کہتے ہیں اور اس سے Realise کا لفظ ہے۔ آپ کو تو معلوم ہوگا کہ Realise کے معنی کیا ہیں؟ Realise کے معنی ہوتے ہیں: To Make Real۔ یہ ہیں' حق کے معنی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ یہ رسول اللہؐ کے ذرا بعد غالباً حضرت ابوبکرؓ کا ہی زمانہ (34-632ء) تھا کہ ان کے ہاں کے کسی سپاہی سے ایک غیر مسلم نے پوچھا کہ دنیا میں ہر کلمہ کی ایک حقیقت ہوتی ہے تمہارے کلمہ کی حقیقت کیا ہے؟ اس نے جواب دیا تھا کہ یہ چالیس ہزار شہر اور قلعے جو ہم نے فتح کیے ہیں' ہمارے کلمہ کی یہ حقیقت تمہیں نظر نہیں آتی۔ اسے کہتے ہیں حق' اسے عرب حقیقت کہتے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقًّا (31:9) چند ہی آیات پہلے سورۃ الروم میں اس نے کہا تھا کہ وَكَانَ حَقًّا عَلَيۡنَا نَصۡرُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (30:47) یہ وہی چیز ہے کہ ''مومنوں کو یہ خدا کا وعدہ ہے جو ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آ جائے گا۔ عطا کر دینا' یہ ہمارے اوپر حق ہے''۔ جب حق کے بنیادی معنی آپ یہ لیں گے کہ وہ Establish (قائم) شکل میں' محسوس طور پر' سامنے آ جائے تو اس نے وہ ٹھیک کہا تھا کہ یہ چالیس ہزار شہر اور قلعے جو ہم نے فتح کیے ہیں' یہ ہمارے کلمہ کی حقیقت ہے۔ ان کے ہاں تو حق کے معنی یہ ہوتے تھے۔

خدا العزیز ہے اور اس کا وعدہ نظری' ذہنی یا لفظی نہیں بلکہ الحق ہوتا ہے

کہا ہے کہ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقًّا (31:9) یہ وعدہ محض نظری نہیں ہے' ذہنی نہیں ہے' لفظی نہیں ہے۔ اس کے اوپر تو تم ایمان لے آؤ گے کہ اللہ کے وعدے سچے ہوتے ہیں۔ وعدے سچے نہیں' بلکہ وعدہ حق ہے کہ یہ محسوس شکل میں Establish (قائم) ہو جائے گا کہ یہ جو ہم کہہ رہے ہیں کہ لَهُمۡ جَنّٰتُ النَّعِيۡمِ (31:8) یہ محسوس شکل میں ہمارے سامنے آئے گا تو حق بنے گا ورنہ ویسے تو ایمان ہے کہ اللہ کے وعدے سچے ہیں لیکن اس کو وہ وعدۂ حق اس شکل میں کہا جائے گا جب وہ تمہارے سامنے محسوس شکل میں آئے گا۔ کہا کہ کس طرح سے یہ بات ہے؟ جواب دیا کہ اس طرح سے کہ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ (31:9)۔ ہمارے ہاں تو یہ لفظ عزیز ہی پھر اور معنوں میں استعمال ہونے لگ جاتا ہے یعنی ہماری ان سے عزیز داری ہے۔ آگے بڑھیں تو کہتے ہیں کہ وہ بڑا اعزیز' معزز ہے' اس کی بڑی عزت ہے۔ یہاں کہا ہے کہ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ (31:9)۔ جب خدا کے لیے عزیز کا لفظ آئے تو اس سے عزیز داری تو ہے نہیں۔ عربی زبان میں

عزت کے معنی غلبہ کے ہیں۔ یہاں کہا کہ وَهُوَ الْعَزِيزُ (31:9)۔ وہ صاحبِ غلبہ ہے‘ قوت اور اقتدار رکھتا ہے یعنی اپنے وعدے کو ایک محسوس حقیقت بنانے کا اقتدار رکھتا ہے۔ وہی وعدے کو حقیقت بنا سکے گا جس میں اس کی قدرت ہو۔ یہ ہماری قدرت ہے لیکن اس قدرت کے متعلق یہ نہ سمجھو کہ ہم یہ ساری چیزیں ڈنڈے کے زور پر کریں گے۔ سنو! ہم استبداد نہیں کریں گے‘ دوسروں کی جنتیں چھین کر تمہیں اس طرح سے نہیں دیں گے۔ ہم عزیز ہیں‘ ہمارا اقتدار ہے لیکن یہ الْحَكِيمُ (31:9) ہے۔ یہ حکمت کے ساتھ ہے‘ یہ Rationally (شعور واستدلال پر) ہے۔

زندہ قوموں کی پہچان

عزیزانِ من! دنیا میں امن اور خوشحالی اسی قوم کو نصیب ہوسکتی ہے جس کو اقتدار حاصل ہو‘ وہ عزیز بھی ہو اور حکیم بھی ہو۔ خدا کی یہ دونوں صفتیں اکٹھی آتی ہیں:

قوت ِ بے رائے جہل است و جنون
رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں

اگر محض حکمت ہی حکمت ہے اور اس کے ساتھ غلبہ وغیرہ نہیں ہے تو کہا کہ یہ افسانے ہیں اور اگر قوت ہی قوت ہے اور اس کے ساتھ حکمت نہیں ہے تو یہ جنون ہے۔

کائنات کے اس وسیع وعریض محیرّ العقول سلسلہ کی پہچان

کہا ہے کہ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (31:9) آؤ تمہیں بتائیں کہ وہ کس قسم کا عزیز وحکیم ہے؟ سنو! خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (31:10) اس فضا کے اندر عظیم الجثہ کرّے ہیں‘ تم اندازہ نہیں کرسکتے کہ یہ کرّے کتنے بڑے عظیم ہیں۔ یہ دُور بیٹھے ہوئے ہمیں تو سورج اتنا سا ہی نظر آتا ہے۔ یہ سورج آپ کی زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے اور یہ ان سب عظیم الجثہ کرّوں میں سے چھوٹا ہے۔ بڑے تو یہ کہکشاں کے ذرے ہیں جو ریت کی طرح نظر آتے ہیں۔ کہا کہ اتنے عظیم القدر کرّے فضا میں تمہیں کھڑے نظر آتے ہیں۔ یہ بِغَيْرِ عَمَدٍ (31:10) ہیں۔ ان کے نیچے کوئی ستون نہیں ہوتا لیکن وہ تو علیم وحکیم بات کررہا ہے جب Scientific Discoveries (سائنسی حقائق بےنقاب) ہوں گی تو اس وقت تو کہیں گے کہ صاحب! یہ بات تو نہیں ہے کہ ان کے نیچے کوئی ستون نہیں یعنی بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (31:10)۔ اس قسم کے ستون نہیں ہیں جنہیں تم آنکھوں سے دیکھ سکو بلکہ وہ کششِ ثقل ہے۔ اب سائنسدان بتارہا ہے کہ یہ کن ستونوں کے سہارے سارے کے سارے کھڑے ہیں۔ ستونوں کا انکشاف ہورہا ہے لیکن وہ آنکھ سے نہیں

دیکھے جا رہے ہے۔ یہ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (31:10) ہے۔

عزیزانِ من! یہ قرآن ہے۔ کہا ہے کہ وَأَلْقٰى فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ (31:10) اس زمین کو دیکھیے۔ اس میں تو تمہیں یہ ہمالیہ جیسے پہاڑ اور قراقرم جیسے پہاڑ نظر آتے ہیں۔ کیا کبھی ذہن میں آ سکتا ہے کہ اتنے اتنے پہاڑوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے، یہ کرّہ ارض فضا میں کہیں کھڑا رہ سکتا ہے؟ کہا کہ کھڑا ہی نہیں ہے بلکہ یہ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ (31:10) تیزی سے گھوم رہا ہے۔ عزیزانِ من! یہ دنیا کا سائنسدان بوکائے ❶ (1911-1989ء) ہے جو اس کے سامنے جھکا ہے کہ چودہ سو سال پہلے یہ بات قرآن نے کہی۔ اس نے تو یہ بات سمجھ لی کہ عربوں کے ہاں جا کر میری ''لغات القرآن'' کی طرح اس نے اس کے معنی خود متعین کیے تو بات سمجھ میں آ گئی۔ ہمارے ہاں تو یہی تھا کہ زمین ہمیں کھانے پینے کا سامان دیتی ہے۔ عربوں سے پوچھو کہ یہ کیا چیز ہے؟ ہر چیز جو مسلسل حرکت میں رہنے والی ہو تو اس کے لیے یہ لفظ ''تمید'' آتا ہے۔ وہ ''تمید'' چکی کے اوپر کے پاٹ کو کہتے تھے۔ کہتا ہے کہ تمید حرکت کر رہی ہے، بکم یعنی تمہیں اپنے اوپر لیے اس طرح تیزی سے چل رہی ہے کہ ''تسی ڈگدے وی نہیں ہیگے ❷'' اور بِغَيْرِ عَمَدٍ کھڑی ہے، اتنے اتنے بڑے پہاڑ ہیں، ایک جگہ ساکن نہیں ہے بلکہ تمہیں ساتھ لیے ہوئے تیزی سے گھوم رہی ہے۔ ہمارا غلبہ اور حکمت ساتھ دیکھی ہے۔ پھر فوراً ہی کہا کہ وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ (31:10) تم ہی نہیں، پتہ نہیں کتنے جاندار ہیں، جو اس زمین کے اوپر اس طرح سے چلے جا رہے ہیں، ان میں سے کوئی بھی نہ گرتا ہے نہ کوئی لغزش کرتا ہے۔

یہاں تو صرف ارض کا ذکر ہے، کہ یہاں متنفس ہیں، جاندار ہیں جن کو ذی حیات کہتے ہیں۔ ان ذی حیات میں یہ سب آ جاتے ہیں۔ یہ بات پہلے بھی آ چکی ہے لیکن (42:29) میں سب کے متعلق یہ چیز آئی ہے۔ عزیزانِ من! یہ وہ آیات ہیں جن پر آج یورپ کے علم افلاک کے سائنسدان محوِ حیرت ہیں۔ میں فرانس کے سائنسدان ❶ کا ذکر کرتا ہوں کہ وہ ان آیات کی بنا پر عش عش کر اٹھا اور قرآن کی صداقت پر پکار اٹھا ''اللہ اکبر'' کہ چودہ سو سال پہلے علم الافلاک والے کے ذہن میں یہ تصور نہیں آ سکتا تھا جو قرآن کہہ گیا ہے۔ عرب کی سرزمین میں جہاں علم کا نشان نہیں تھا، ایک ان پڑھ شخص وہاں بیٹھا ہوا یہ بات کہہ رہا ہے۔ کہا کہ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (42:29) یہ فضائی کرّے ساری پہنائیوں میں، Universe (کائنات) کے اندر پھیلے ہوئے ہیں اور یہ ارض ساری کی ساری اس کی تخلیق ہے اور یہ اسی طرح سے ویرانے نہیں ہیں بلکہ وَبَثَّ فِيهِمَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ (42:29)۔ یہ زمین اور ان کرّوں میں سے بھی ایسے

---

❶ اس کی کتاب کا حوالہ یہ ہے:

Bucaille Maurice: The Bible, The Qur`an And Scienc, Islamic Book Service,1998.

❷ کہ آپ گرتے بھی نہیں ہیں۔

ہیں جن کے اندر ذی حیات مخلوق بستی ہے۔ مخلوق کے معنی ہمارے جیسے ہی بندے نہیں بلکہ پتہ نہیں کہ وہ کس قسم کی مخلوق ہے۔ اس نے تو جامع لفظ "ذی حیات" دیا ہے، اس نے انسان نہیں کہا، حیوان نہیں کہا، بلکہ یہ کہا کہ ان میں ذی حیات بستے ہیں۔ یعنی جن کرّوں کے متعلق اس سے پیشتر ذہن میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ ہے کیا؟ آج یہ سائنسدان اس نشان پہ چلے ہوئے ہیں کہ جس کرّے میں ان کو کہیں نمی مل گئی تو سمجھ لیجیے کہ وہاں ذی حیات ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن نے کہا تھا کہ وَ جَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ کُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ (21:30) یاد رکھو! جہاں کہیں پانی ہوگا، وہاں زندگی ہوگی۔ مریخ کے پیچھے اسی لیے پڑے ہوئے ہیں کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ وہاں نمی کے آثار نظر آتے ہیں، ہم نے دیکھنا ہے کہ وہاں کیسے ذی حیات ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ وَ بَثَّ فِیۡہِمَا مِنۡ دَآبَّۃٍ (42:29)۔ اور وہ ذی حیات جو اس نے ان میں (زمین اور آسمانی کرّوں میں) پھیلا رکھی ہیں۔ وہاں صرف ارض تھا اور یہاں "فیھما" ہے یعنی ان سب کے اندر۔ آگے کہا ہے کہ وَ ہُوَ عَلٰی جَمۡعِہِمۡ اِذَا یَشَآءُ قَدِیۡرٌ (42:29) اس کے قانون میں یہ بھی بات ہے کہ یہ آبادیاں آپس میں کبھی مل بھی جائیں گی۔ اللہ اکبر! یہاں کہا کہ وَ بَثَّ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّۃٍ (31:10) اور اس نے سطح زمین پر انواع واقسام کے ذی حیات پھیلا رکھتے ہیں اور آگے کہا ہے کہ وہ وَ اَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً (31:10) بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور یہ کہ زندگی پانی سے ہے۔ یہاں کا پانی تو سمندر کا ہے جو اچھے بھلے جاندار کو مار دیتا ہے۔ میں نے پچھلی دفعہ یہ عرض کیا تھا کہ اُس کا جو واٹر سپلائی سسٹم ہے وہ یہ ہے کہ یہاں سمندر سے کھاری پانی کو کشید کر کے اس کے بعد پھر بارش کی شکل میں وہ اسی زمین کے اوپر واپس لے آتا ہے۔ آگے کہا کہ فَاَنۡۢبَتۡنَا فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍ کَرِیۡمٍ (31:10)۔ پھر اس پانی اور اس زمین کے امتزاج سے، یہاں وہ کس قدر انواع واقسام کی، اعلیٰ درجہ کی چیزیں اُگاتا چلا جاتا ہے، اور پھر اُس کے ساتھ "کریم" کا لفظ آیا ہے کہ یہ ہماری کرم نوازیاں ہیں، وہ بڑا اکریم واقع ہوا ہے۔

خدا تعالیٰ کا قائم کردہ نظامِ ربوبیت اور اس کے متعلق ہدایات

عزیزانِ من! اب اگلی بات آئی کہ ہٰذَا خَلۡقُ اللّٰہِ (31:11) ان انسانوں سے کہو جو اپنا معاشی نظام بناتے پھرتے ہیں کہ یہ تو وہ کائنات ہے جسے ہم نے پیدا کیا ہے، یہ پانی، یہ زمین اور اس سے اُگنے والی ساری چیزیں خدا نے پیدا کی ہیں۔ بَثَّ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّۃٍ (31:10)۔ جہاں جاندار پیدا کیے تو ان جانداروں کے لیے یہ رزق کا سامان خدا نے پیدا کیا ہے۔ آگے کہا کہ فَاَرُوۡنِیۡ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ (31:11) یہ جو سمیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں، ان سے پوچھو کہ تم نے کیا پیدا کیا ہے۔ پوچھو ان سے کہ تم نے کیا پیدا کیا ہے؟ بَلِ الظّٰلِمُوۡنَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ (31:11)۔ جو اپنا پیدا کیا ہوا نہیں ہے، دوسرے کا پیدا کیا ہوا ہے، اس کو سمیٹ کر بیٹھ جانا انتہائی ظلم ہے، کھلا ہوا ظلم ہے۔ ان سے کہو کہ ان میں کیا چیز ہے جو تم نے پیدا کی ہے؟ جس نے پیدا کی ہے یہ اُس کی ملکیت ہے۔ وہ اپنی

ملکیت کی تقسیم کے متعلق جو کہتا ہے تو یہ اُس کے مطابق تقسیم کرنے کی بات ہے۔ اس کے مطابق تقسیم نہ کرنا بے حد ظلم ہے اور عربی زبان میں ظلم کے لفظ کے متعلق میں نے یہ عرض کیا ہوا ہے کہ ''جس شے کو جس مقام پہ ہونا چاہیے اُسے وہاں نہ کھا جائے تو اسے ظلم کہتے ہیں۔'' اس ظلم میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ خدا کو اُس کے مقامِ خدائی سے اتار کر نیچے لے آ ؤ کہ یہ تیری ملکیت نہیں ہے۔ یہ ظلم ہے یعنی خدا کو اس کے مقام سے نیچے لے آنا اور انسان کو اُس کے مقام سے اونچا لے جانا کہ جس کا یہ مالک ہو نہیں سکتا اُس کا مالک بنا دینا' یہ ظلم ہے۔ کس طرح ایک لفظ کے اندر دونوں طرف سے یہ جو ظلم کی چیز ہے' وہ بیان کرتا ہے۔ کہا کہ اس نظام کے اندر ہم نے دآبۃ کی پرورش کے لیے جو کچھ دیا تھا' اُس کو افراد سمیٹ کر لے جائیں کہ صرف اپنی خاندانی' قومی پرورش ہو تو پہلی چیز یہ کہ یہ ظلم ہوا کہ جس مقصد کے لیے یہ چیزیں تھیں وہ مقصد پورا نہ ہوا۔ دوسرا ظلم یہ ہے کہ خدا نے جو پیدا کیا تھا وہ اس کی ملکیت تھی اس سے چھین لی۔ تیسری چیز یہ ہے کہ جن کی یہ نہیں ہیں' یہ ان کو دیدیں۔ اسی لیے کہا کہ **الظّٰلِمُوۡنَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ**(31:11) اس سے زیادہ کھلی ہوئی گمراہی کوئی نہیں۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ لقمٰن کی 11 ویں آیت تک آئے ہیں۔ 12 ویں آیت کو ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

دوسرا باب: سورۃ لقمٰن (آیات 12 تا 13)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عزیزانِ من ! آج اکتوبر 1979ء کی 19 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ لقمٰن کی آیت 12 سے ہو رہا ہے:

(31:12)

تاریخی طور پر حضرت لقمان کے متعلق مختلف بیانات کی وضاحت

جیسا کہ میں نے پچھلے درس میں عرض کیا تھا کہ اس سورۃ کا نام ہی سورۃ لقمان ہے اور یہ لفظ' یہ نام 12 ویں آیت میں پہلی دفعہ آتا ہے۔ کہا ہے کہ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ (31:12)۔ حضرت لقمان ❶ کے متعلق یقینی طور پر بالتحقیق نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کونسی شخصیت ہیں اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ خدا کے نبی تھے کیونکہ قرآنِ کریم میں زمرۂ انبیائے کرام علیہم السلام میں ان کا نام کہیں نہیں آتا۔ ان کو نبی کہہ کر نہیں پکارا گیا۔ حضرت لقمان کی بہت سی ضرب الامثال عربوں کے ہاں مشہور تھیں' جنہیں حکمت کی باتیں کہا جاتا ہے۔ یہ بعض

---

❶ قرآنِ کریم نے حضرت ہودؑ اور حضرت صالح علیہم السلام کے درمیان ایک ایسی ہستی کا ذکر کیا ہے جو اگرچہ بالتصریح حضرات انبیائے کرام کے زمرہ میں شامل نہیں لیکن ان کی تعلیم کو نمایاں حیثیت دی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ہودؑ مع اپنے متبعین کے اپنی برباد ہونے والی قوم کے دیار و مسکن سے نکل کر حجاز کی جانب آ گئے تھے اور اسی علاقہ میں ان کی نسل (عادِ ثانیہ) بڑھی اور پھیلی۔ ان میں ایک نیک سیرت حکمران گزارے جسے لقمان کہا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکمران حضرت ہودؑ کی شریعت کا متبع تھا اور اپنی حکمت و دانائی کے لحاظ سے حکیم لقمان کے نام سے مشہور تھا۔ ایک قدیمی کتبہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے (پرویزؒ: جوئے نور' طلوع اسلام ٹرسٹ' (رجسٹرڈ)' لاہور' 1994' ص۔ 61)۔

خیالات ہیں اور میں نے عرض کیا ہے کہ یہ کوئی تاریخی تحقیق تو نہیں ہے' بس یونہی خیالات ہیں۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ حضرتِ ایوبؑ کے بھانجے تھے۔ میں پھر اسے عرض کر دوں کہ یہ کوئی تاریخی تحقیق کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ لوگوں کے خیالات ہیں جو میں نے عرض کیا ہے اور یہ آپ کے سامنے بھی آ گئے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حضرتِ داؤد علیہ السلام کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے اور یہ ایک ہزار سال تک زندہ رہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ مصر کے رہنے والے ایک حبشی غلام تھے۔ مستشرقین بھی اس باب میں کوئی یقینی رائے نہیں رکھتے۔ یورپ میں بہت سی اس قسم کی حکمت کی باتیں بطور ضرب الامثال مشہور ہیں اور وہ ان کے ذہن میں ایک افسانوی سی فکر ہے۔ سیلز کا خیال ہے کہ یہ یونانی AESOP ہیں۔ یہ وہی سیلز ہے جس نے قرآنِ کریم کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

اس کا خیال ہے کہ یہ لقمان یہی AESOP (ایساپ) ہیں۔ ایک ڈاکٹر اسپرینجر (Dr.Spranger)[1] ہیں' اُنہی کے ہاں ایک لفظ ALXAI ہے' اُس کی بھی ضرب الامثال بہت مشہور ہیں۔ اُس نے کہا ہے کہ یہ لقمان الکسائی (ALXAI) ہیں۔ یہ (Victorian Era 1837-1901) کا مصنف ہے اس کا بھی یہی خیال ہے۔ تورات کی کتاب[2] الامثال میں بہت سی اس قسم کی ضرب الامثال ہیں' وہ ایک نام لموایل ہے' وہ ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں یعنی یہ اس کے متعلق مختلف خیالات ہیں۔ عربوں میں بہرحال لقمان کے نام سے بہت سی ضرب الامثال مشہور تھیں اور قرآنِ کریم میں یہیں یہ لفظ آیا ہے' نہ ہی اس کی تفصیل کہیں اور دی گئی ہے اور نہ انہیں زمرۂ انبیائے کرامؑ میں شامل کیا گیا ہے۔ چونکہ ان کی حکمت کی باتیں مشہور تھیں' اس لیے قرآنِ کریم نے بھی یہ کہا ہے کہ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ (31:12) اُنہیں حکمت و دانائی کی باتیں عطا کی گئی تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ وحی کے ذریعے اُنہیں دی گئی ہوں تو پھر وہ انبیاء میں آئیں گے' اس لیے کہ قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس میں ہماری طرف سے ہادی نہ بھیجا گیا ہو۔ اُن میں سے بعض کا ذکر ہم نے بالتصریح کر دیا ہے۔ اس لیے یہ بھی مان لیا جائے کہ یہ جوان کو حکمت کی باتیں کہا گیا ہے' اگر یہ بذریعہ وحی آئی تھیں تو ان کو نبی مان لیا جائے گا۔ بہرحال ان کا احترام تو ہم پر ضروری ہو گیا کہ خدا نے خاص طور پر قرآن کے اندر ان کا نام لیا اور اس طرح سے

---

[1] اس ڈاکٹر کا خیال ہے کہ یہ ایبونہ کے الکسائی (ALXAI) ہی کا دوسرا نام ہے۔

[2] تورات کی کتاب الامثال میں یاقہ کے بیٹے اجور (امثال 30/1) اور لمواپل بادشاہ (امثالی 31/1) کی حکمت کی باتیں' عرب کے لقمان کے نصائح سے ملتی جلتی ہیں۔ اس قیاس کے مطابق جناب لقمان کو بنی اسماعیل میں سے ہونا چاہیے غرضیکہ کثرتِ تعبیر سے یہ خواب ابھی تک پریشان ہے۔ اس کا حل آنے والے زمانہ کے انکشافات کا منتظر ہے۔ قرآنِ کریم تاریخ کی کتاب نہیں' اس لیے اس نے لقمان میں تذکیر و موعظمت سے بحث کی ہے' حسب و نسب اور مقام و زبان سے نہیں (پرویزؒ: جوئے نور' طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1994ء' ص۔ 66)۔

ان کے ذکر کو ابدیت سے ہمکنار کر دیا۔ قرآنِ کریم قیامت تک محفوظ رہے گا تو یہ لقمان اور اس کی حکمت کی باتیں' جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں' یہ بھی محفوظ رہیں گی۔ گویا اہمیت اس اعتبار سے ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے خود لقمان کی حکمت کی باتوں کو قرآنِ کریم میں درج کیا اور لقمان کی یہ باتیں اس لیے درج ہوئیں کہ وہ باتیں قرآنِ کریم کی حکمت کے مطابق ہیں۔ ہم اس اعتبار سے بھی انہیں لیں گے کہ قرآنِ کریم کے مطابق اگر کوئی شخص بھی کچھ کہتا ہے تو ہم کہیں گے کہ تم سچ کہتے ہو۔ کسے باشد اگر وہ ہم سے یہ کہے کہ بھئی! سچ بولنا اچھی بات ہے تو ہم کہیں گے کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ سوال نہیں ہے کہ جو شخص یہ کچھ کہہ رہا ہے' وہ از خود کہہ رہا ہے یا اس نے کہیں سے سنا ہے یا ان کی کسی کتاب میں لکھا ہے بلکہ ہمیں اُس بات سے واسطہ ہے' جو بات اُس نے کہی ہے ہم اس لیے اُسے صحیح تسلیم کریں گے کہ وہ قرآن کے مطابق ہے۔ ہمارے پاس اصول یہ ہے کہ کوئی بات بھی جو کہیں سے بھی آئے اگر وہ قرآن کے مطابق ہے تو ہم اُسے صحیح تسلیم کر لیں گے۔ اگر وہ قرآن کے خلاف ہے تو اُس کی نسبت کسی کی طرف بھی کیوں نہ کی جائے' ہم کہیں گے کہ یہ صحیح نہیں ہوسکتی اس لیے کہ ہمارے پاس پرکھنے کی جو کسوٹی ہے' وہ خدا کی کتاب ہے۔ اس لیے اس اعتبار سے یہ جتنی چیزیں خدا کی کتاب نے خود لقمان کی کہی ہیں' ان کی حکمت کو ہم اس لیے سچا مانتے ہیں کہ قرآن نے ایسا کہا ہے اور جو کچھ کہا ہے' اسے آپ دیکھیں گے کہ وہ قرآنِ کریم کی حکمت کے مطابق ہے۔ ہمارے ہاں تو پھر لقمان کو طبیب کی حیثیت سے مانا جاتا ہے۔ اب تو ہمارے ہاں آہستہ آہستہ طبیب کا لفظ ہی پیچھے ہٹ گیا ہے' اُس کی جگہ حکیم کا لفظ ہی آ گیا ہوا ہے۔ یہ جتنے ہمارے ہاں طبیب ہیں وہ حکیم ہی کہلاتے ہیں حالانکہ حکمت اور طبابت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر طبابت کے ساتھ حکمت شامل ہو تو پھر پوچھیے نہیں کہ شفا کس طرح سے آتی ہے لیکن حکیم تو اصل میں عربی زبان میں فلاسفر کے لیے ہی آتا ہے۔ حکمت و دانائی کی بات' Reason سے یا Rationally جو کچھ کہا جائے گا' اُس کے لیے یہ لفظ آتا ہے اگرچہ معنی کے اعتبار سے تو آپ آگے چل کر دیکھیں گے کہ اس کے اندر بڑی وسعت ہے لیکن بہرحال جب حکمت کی باتیں کہا جائے گا تو وہ دانائی کی باتیں ہوں گی' Reason کی باتیں ہوں گی۔

عربوں کے ہاں الفاظ کو محسوسات کی بنیاد پر جانا اور سمجھا جاتا تھا

حضرت لقمان کے متعلق پہلی چیز یہ کہی گئی کہ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ (31:12)۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے: ''اللہ کا شکر کرو''۔ اور شکر کرنے کا عمل آپ کو معلوم ہی ہے کہ وہ کھانا کھایا اور اس کے بعد کہا کہ یا اللہ! تیرا شکر ہے' تیرا احسان ہے۔ اتنی بڑی چیز جو خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ یہ کرو تو یہ تو کوئی بہت بڑی چیز ہے۔ یہ چیز تو ہمارے دروس میں بیسیوں دفعہ آ چکی ہے' یہ اصطلاحات پہلی دفعہ نہیں آئیں۔ میں نے کہا تھا کہ شکر کا مفہوم عربوں کے ہاں یہ ہوتا تھا کہ ''وہ طریق اختیار کرنا جس سے

کسی کی محنت بھرپور نتائج پیدا کردے۔'' چنانچہ وہ اس لفظ کو یوں استعمال کرتے تھے۔ میں نے کہا ہے کہ عربی زبان میں بات سمجھ میں اس لیے آجاتی ہے کہ عرب اپنے ہاں جب یہ الفاظ استعمال کرتے تھے تو محسوس چیزوں پہ ان کا اطلاق کرتے تھے' وہ ان چیزوں کو محسوس چیزوں پہ Apply (منطبق) کرتے تھے۔ عرب تو فلاسفی' نظری چیزوں سے واقف ہی نہیں تھا بلکہ وہ صرف محسوسات سے واقف تھا۔ جتنے بھی قرآنِ کریم کے اندر یہ الفاظ یا عربی زبان میں جو الفاظ اس قسم کے آئیں گے وہ تصوراتی نہیں ہوتے' وہ محض نظری طور پر نہیں بولتے تھے بلکہ وہ محسوس چیزوں کے اوپر ان کا اطلاق کرتے تھے اور وہاں سے پھر ایک تصور لیتے تھے۔ بات اس لیے سمجھ میں آجاتی ہے کہ وہ محسوس چیزوں پہ اس کا اطلاق کرتے تھے۔

شکر کے لفظ کا وہ مفہوم جو محسوس شکل میں سمجھا جا سکتا ہے

شکر کے معنی یہ ہیں کہ ''جس کی محنت بھرپور نتائج پیدا کرے۔ وہ بکری یا اونٹ یا بھیڑ جس کے تھن دودھ سے اتنے بھرے ہوئے ہوں کہ ان میں سے خود دودھ کے قطرے ٹپک رہے ہوں' تو یہ جو تھن ہوتا تھا یہ مشکور ہوتا تھا'' اب یہاں سے آپ تصور میں لائیے کہ وہ پھر اس محسوس چیز کے لیے جب یہ لفظ بولتے تھے تو اب آگے ساری بات چل پڑی کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ اس کا ملخص یہ ہوا کہ ''کوئی ایسا طریق جس سے انسان کی محنتیں ایسے بھرپور نتائج پیدا کریں کہ وہ دودھ کے قطروں کی طرح ٹپکتے ہوئے نظر آجائیں'' یہ ہے جسے خدا کا شکر کہا لیکن خدا کا شکر نہیں بلکہ یہ للہ شکر ہے۔ ترجمہ تو اس کا ہم یہی کریں گے کہ خدا کے لیے شکر۔ مفہوم جہاں بھی یہ آئے گا کہ جسے آپ خدا کے لیے کہتے ہیں تو یہیں تو اس نے کہا تھا کہ اِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (31:12) ارے بابا! ہم تو ان چیزوں سے مستغنی ہیں' جو ان سے مستغنی ہے' ہم اس کے لیے یہ کہیں کہ ہم اُس کے لیے یہ کرتے ہیں' کچھ عجیب سی بات لگتی ہے۔ جہاں بھی یہ چیز آئے کہ ''خدا کے لیے یا خدا کے راستے میں'' تو اُس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ اُس مقصد کے حصول کے لیے ہے جو خدا نے مقرر کیا ہے یعنی اُس مقصد کے حصول کے لیے بھرپور محنت کرو' پوری پوری محنت کرو۔ جو خدا نے مقرر کیا ہے۔

اسلام مذہب نہ ہونے کی بنا پر ہی سچا دین ہے

عزیزانِ من! ایک ہی بات آگے آئی جس نے مذہب اور دین کے فرق کو محسوس طور پر نکھار کر سامنے کر دیا اور وہاں سے یہ چیز بھی آئی کہ اسلام ہی کیوں سچا دین ہے۔ یہ جو آپ کے ہاں ازم (Isms) ہیں' یہ ادیان ہیں۔ یہ جو دھرم ہیں مثلاً ہندومت' یہودیت' عیسائیت' یہ دین نہیں ہیں' یہ مذاہب ہیں۔ اسلام مذہب نہیں ہے' اس لیے اسلام کا ان کے ساتھ تقابل ہی غلط ہے۔ یہ تو دو مختلف نوع کی چیزیں ہیں۔ ہمارے ہاں سارے مناظرے' بحثیں مذہب والوں کے ساتھ ہوتے چلے جاتے ہیں اور ہم نے ثابت کر دیا کہ اسلام سب

سے اچھا مذہب ہے جب کہ یہ مذہب ہی نہیں ہے۔ اسے ثابت کرو کہ یہ مارکس ازم سے اچھا ہے' یہ کیپٹل ازم سے اچھا ہے' یہ ڈیما کریسی سے اچھا ہے' یہ ہر ازم (Ism) سے اچھا ہے۔ یہ جسے آج آپ ازم کہتے ہیں یہ نظامِ حیات ہیں' نظامِ زندگی ہیں۔ یہ ہیں الدین کے معنی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ایک چیز سامنے آتی ہے جس سے ازم (Ism) اور مذاہب کی بات نکھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ جو لِلّٰہِ ہے اس کے لیے یہ نہیں ہے کہ اللہ کے لیے یہ کچھ کیا جاتا ہے۔

مذہب کے اندر انسان کا ہر عمل خدا کے لیے کیا جاتا ہے جب کہ دین میں انسان کا ہر فعل اس کی اپنی ذات کے لیے ہوتا ہے

مذہب میں جو بھی اہلِ مذہب کرتا ہے' وہ اللہ کے لیے کرتا ہے۔ یہاں تک کہ قرآنِ کریم میں ہے کہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (51:56)۔ اس کا عام ترجمہ آپ دیکھیں گے' یہ کیا جاتا ہے کہ ہم نے جن اور انس کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کرتے رہیں یعنی پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ ہمیں سجدے کرتے رہیں' ہماری پرستش کرتے رہیں۔ عزیزانِ من! غور کیجیے کہ خود خدا کے متعلق اس سے کیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اس تصور میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ ہمیں اس دنیا میں بھیجا' ہم سے نہ پوچھا' نہ ہماری کوئی رائے لی' نہ ہماری کوئی رضا مندی لی' بغیر پوچھے یہاں بھیج دیا اور بھیجنے کے بعد کہا کہ ہم نے اس لیے بھیجا ہے کہ ہماری پرستش کرتے رہو۔ خدا تو کہتا ہے کہ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (3:97) ہم اس سے مستغنی ہیں۔ دنیا میں خدا کو ماننے والے جتنے ہیں وہ جو کچھ کرتے ہیں وہ اس لیے کرتے ہیں کہ خدا کے لیے یہ کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اللہ کو خوش کر لو' اسے راضی کر لو۔ یعنی یہ سارا کچھ ہو ہی اس لیے رہا ہے کہ وہ ناخوش ہے' اسے خوش کر لو' وہ ناراض ہے' اسے کسی طرح سے راضی کر لو۔ یعنی اُس کا کوئی کام کر رہے ہیں۔ وہ جیسے مزدور کو یہاں مزدوری پہ لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہاں بنیاد کھودو' یہاں دیوار کے لیے مٹی لے آؤ' اینٹ لے آؤ تو مزدوروں کا اُس میں اپنا کوئی Interest (دلچسپی) نہیں ہوتی' تعلق نہیں ہوتا' وہ تو شام کو ہاتھ جھاڑ کر چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ مکان بھی پورے کا پورا تعمیر ہو جاتا ہے تو وہ اپنی روزانہ کی اجرت لیتے ہیں اور اُس کے بعد چلے جاتے ہیں۔ وہ سب کچھ اس کے لیے کرتے ہیں' ان کا تعلق اس میں اتنا ہی ہوتا ہے کہ انہیں اس میں سے روٹی مل جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا خدا کا تصور یہ ہے؟ وہ تو اپنے آپ کو مستغنی کہتا ہے: غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (3:97)۔ وہ ساری کائنات سے مستغنی ہے تو کیا وہ اپنے کسی کام کے لیے یہ کچھ کہے گا کہ یہ کرو اور وہ کرو؟

مذہب میں خدا کی پرستش کا تصور دین کی ساری عمارت کو ہی منہدم کر دیتا ہے

آپ نے غور فرمایا کہ کتنی بڑی چیز ہے۔ مذہب میں پرستش کا تصور یہ ہے کہ خدا یہ چاہتا ہے کہ تم بیٹھے میرے قصیدے پڑھا کرو' مجھے

سجدے کیا کرو' میرے آگے ہاتھ جوڑا کرو' ڈرا کرو اور یہ سارا کچھ میرے لیے کیا کرو۔ یعنی جو کچھ وہ کہتا ہے وہ اپنے لیے کہتا ہے کہ میرے کچھ کام (معاذ اللہ) رکے ہوئے ہیں' تم یہ کر آؤ۔ مذہب کا یہ تصور ہے۔ پہلی چیز حکمت کی جو کہی گئی ہے' وہ یہ کہی ہے کہ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ (31:12)۔ اب میں لفظِ شکر ہی کہے جاؤں گا۔ تو کہا کہ تم شکر کرو[1] کیونکہ وَ مَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ (31:12) جو شکر[1] کرتا ہے وہ میرے لیے نہیں بلکہ اپنی ذات کے لیے کرتا ہے۔ عزیزانِ من! دنیا کے مذاہب کی مبینہ کتابیں تو ایک طرف رہیں' فلسفے تک کی چیزوں کو ڈھونڈ ماریئے اور دیکھیے کہ یہ چیز کن بلندیوں پہ جا کر کہی گئی ہے۔ ایک حکم دیا جاتا ہے کہ شکر کرو اور کہا یہ جاتا ہے کہ جو ایسا کرتا ہے وہ میرے لیے کچھ نہیں کر رہا بلکہ وہ اپنے لیے یہ کرتا ہے۔ ہم تو صرف اُس کو Direction (ہدایت) دے رہے ہیں' ہمارا کوئی بگڑا ہوا کام وہ نہیں سنوار رہا بلکہ وہ اپنے ہی بگڑے ہوئے کام سنوار رہا ہے' وہ اپنی ہی ذات کو حسین بنا رہا ہے۔ یہ جتنے احکام بھی ہیں ان میں سے میں دو چار مثالیں پیش کرتا ہوں۔ آپ نے غور کیا ہے کہ یہ نقطہ کتنا اہم ہے' اس ایک نقطے سے اسلام باقی تمام ادیان سے اور باقی تمام مذاہب سے الگ ہو جاتا ہے' کتنا افضل ہو جاتا ہے' کتنا منفرد ہو جاتا ہے' کتنا Unique ہو جاتا ہے! ہر جگہ تصور یہ ہے کہ خدا کا جو حکم ہے مانا جاتا ہے' اُس کا حکم ہے' اُس کا کوئی کام ہے' اُس کے لیے یہ کیا جاتا ہے جبکہ خدا کہتا ہے کہ مَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ[2] (31:12)۔ ایک دوسری جگہ کہا ہے کہ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ (6:105) تمہارے خدا کی طرف سے Search Light (دانشِ نورانی) آ گئی' اُس نے راستے روشن کر دیئے۔ اس لیے فَمَنْ اَبْصَرَ (6:105) جو آنکھیں کھول کر چلے گا تو فَلِنَفْسِهٖ (6:105) اُس کا اپنا ہی فائدہ ہوگا۔ ہمارا کام یہ تھا کہ ہم نے سورج طلوع کر دیا' روشنی کر دی' اب اُس کے بعد اس روشنی میں جو دیکھ کر چلے گا تو اُس کا اپنا فائدہ ہے۔ ہمارا کوئی کام بگڑا ہوا نہیں تھا جس کے لیے ہم نے سورج کو طلوع کیا' راستے روشن کیے اور تمہیں کہا کہ آنکھیں کھول کر چلو۔ وَ مَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا (6:105) اور جو آنکھیں بند کرے گا' وہ خود گڑھے میں گرے گا۔ نہ آنکھیں کھول کر چلنے والا ہمارا کچھ سنوارے گا' نہ آنکھیں بند کر کے چلنے والا ہمارا کچھ بگاڑے گا۔ باقی رہا یہ کہ ہم نے سورج چڑھا دیا' طلوع کر دیا' روشنی کر دی' راستے روشن بھی کر دیئے تو کیا ایک بات آگے اور بھی کر دیجیے کہ آ کر ان کی آنکھیں بھی زبردستی کھول دیجیے؟ کہا کہ نہیں' یہیں تو انسانیت کا اور حیوانات کا فرق شروع ہوتا ہے۔ حیوان کی آنکھیں تو ہم زبردستی کھولتے ہیں لیکن انسان کے شرف کا تقاضا ہے کہ اس سے زبردستی نہ کی جائے۔ اس کے راستے روشن کر دیئے جائیں اور اُس کے بعد پھر یہ چیز اس پہ چھوڑ دی جائے کہ آنکھ کھول کر چلتا ہے یا آنکھ بند کر کے چلتا ہے کیونکہ

---

[1] یعنی یہ کہ نعمائے خداوندی کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کیا کرو (شکر)۔

[2] جو نعمائے خداوندی کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرتا ہے' اس کی ذات کی صلاحیتیں بھرپور انداز سے نشوونما پاتی ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 947)

وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ (6:105) ہم کوئی کوتوال مقرر نہیں ہوئے ہیں کہ ڈنڈے مار مار کر تمہاری آنکھیں کھولیں کہ صحیح راستے پہ چلو۔ اُس کا کوئی کام بگڑ رہا ہوتا تو وہ تو ڈنڈے مارتا۔ مزدور اگر ہماری مرضی کے مطابق کام نہیں کرتا، تغافل برتتا ہے تو ہم اُس کو ڈنڈے مارتے ہیں کیونکہ ہمارا کام بگڑ رہا ہوتا ہے۔ اور جو روشنی کے ہوتے ہوئے خود ہی آنکھیں بند کر کے چلتا ہے تو خدا کہتا ہے کہ ہم ان کو ڈنڈے مار کر ان کی آنکھیں نہیں کھولتے۔ یہاں کہا ہے کہ فَلِنَفْسِهٖ (6:105) اپنی ذات کے لیے یہ خود یہ کچھ کرے گا۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ (10:108) پوری نوعِ انسانی کو مخاطب کیا گیا ہے۔ کہا کہ اے نوعِ انسان قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ (10:108) الحق تمہارے خدا کی طرف سے آ گیا ہے۔ ان الفاظ کے معنی اگر بیان کرونگا تو ایک درس اس کے لیے کافی نہیں ہو سکے گا۔ کہا ہے کہ الحق تمہارے خدا کی طرف سے آ گیا۔ اب فَمَنِ اهْتَدٰى (10:108) جو بھی اس صحیح راستے پر چلتا ہے فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ (10:108) وہ اپنے لیے چلتا ہے۔ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (10:108) جو صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راستہ خود اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو خود خطرات میں ڈالتا ہے۔ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ (10:108) ہم ڈنڈا لیے تمہارے پیچھے نہیں پھرتے کہ تمہیں زبردستی سیدھی راہ پر چلائیں۔ یہ تو پہلے یہ سمجھنے کی بات ہے کہ یوں چلنا میرے فائدے میں ہے اور اس کے خلاف جانا میرے نقصان میں ہے۔

انسانی دنیا میں جبر کا پہلو انسان کی انسانیت کو پامال کر دیتا ہے

عزیزانِ من! جہاں کہیں جبر کا پہلو آیا تو دین بھی گیا، شرفِ انسانیت بھی گئی، حق بھی گیا۔ خدا نے بار بار کہا ہے کہ ہم تم پہ حفیظ نہیں، ہم تم پہ وکیل نہیں اس لیے کہ یہ جو لِنَفْسِهٖ (10:108) کہا ہے، یہ انسان کی اپنی ذات کے لیے کہا ہے۔ انسانی ذات کی خصوصیت اختیار و ارادہ ہے۔ اس کائنات میں اختیار و ارادہ کُلی اور پرتو خدا کو حاصل ہے اور اس کائنات کے اندر صرف انسان کو دیا گیا ہے۔ یہ خصوصیتِ خداوندی ہے جو خدا نے انسان کو دی ہے۔ اسی لیے یہ جو خصوصیت دی گئی ہے تو قرآن میں اس کو نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ[1] (38:78) کہا ہے کہ یہ ہماری توانائی تھی، ہماری اتھارٹی تھی، ہماری قدرت تھی، ہماری ایک خصوصیت تھی، اس میں سے ہم نے اسے کچھ دیدیا ہے۔ یہاں زندگی نہیں کہا کیونکہ زندگی تو حیوانات کو بھی ملی ہوئی ہے۔ یہ اختیار و ارادہ کی خصوصیت جو انسان کو دی گئی ہے اسے کہا گیا ہے کہ یہ تو ہماری خصوصیت تھی، ہم نے اس کو اس میں سے دیدیا۔ یہ انسان کی ذات ہے، ذات کا تو تقاضا ہی اختیار و ارادہ ہے۔ جتنا یہ اپنے اختیار و ارادے کو استعمال کرتا چلا جائے گا ذات میں توانائیاں پیدا ہوتی چلی جائیں گی اور جتنا اختیار و ارادے کو خدا کی بتائی اقدار کے مطابق استعمال کرتا چلا جائے گا، اتنی ہی اس کی ذات حسین ہوتی چلی جائے گی۔

---

[1] میں اس میں اپنی توانائی کا ایک شمہ ڈال دوں، اور یوں وہ صاحبِ اختیار وارادہ، انسانی ذات کا حامل، بشر بن جائے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1064)

انسان کا ہر عمل خالصتاً انسانی ذات کے متعلق ہی ہوتا ہے

قرآن نے کہا کہ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ❶(18:29) جب بات ہی یہ ہے کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہ تمہارے ہی فائدے کے لیے ہے تو پھر اس میں ہم زبردستی کیوں کریں گے۔ کہا کہ وَ مَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ(29:6) جو بھی تم محنت کرو گے، جو جدوجہد بھی تم کرو گے، وہ ہمارے لیے نہیں بلکہ وہ تم اپنی ہی ذات کے لیے کرو گے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو سنو! اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ(29:6) خدا تو تمام کائنات سے مستغنی ہے۔ ہم اپنے لیے کسی سے کوئی کام کیوں کرائیں گے، ہمارا کونسا کام رکا ہوا ہے جس کے لیے ہمیں ضرورت ہو کہ تم یہ کرو اور تم وہ کرو۔ ہم تو صرف Direction (ہدایت) دیتے ہیں۔ اب آپ غور فرمائیے کہ پہلے یہ حکم دیا گیا ہے کہ ان اشکر لله (31:12) تو وہ ایسا ہے جیسے کوئی حکم ہے۔ قرآنِ کریم حکم والی بات یوں نہیں کہتا بلکہ وہ ہدایت کہتا ہے اور اُس کا ترجمہ Direction ہوتا ہے۔ وہ ڈاکٹر کی طرح آپ کو ڈائریکشن دیتا ہے کہ یہ دوائی اتنے اتنے گھنٹے کے بعد، یہ سفوف اس طرح سے، یہ کیپسول یوں کھا لینا ہے، پرہیز یوں کرنا ہے۔ اگر وہ مریض یہ سارا کچھ ڈائریکشن کے مطابق کرتا ہے تو کیا اُس سے ڈاکٹر کی صحت ٹھیک ہوتی ہے؟ نہیں وہ مریض تو اپنی صحت کے لیے یہ کرتا ہے۔ اگر اُس کے خلاف جاتا ہے تو ڈاکٹر کبھی بیمار نہیں ہوتا بلکہ اس مریض کا اپنا مرض بڑھتا ہے۔ ڈائریکشن دی اور اُس کے بعد مریض سے کہہ دیا کہ جینا چاہتے ہو تو یہ کرو، مرنا چاہتے ہو تو یوں نہ کرو۔ یہ ہے فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ(31:12)۔

عزیزانِ من! پہلی چیز یہ سمجھ لیجیے کہ الدین کا جو نظام ہے اُس میں جو کچھ کہا گیا ہے اور جس طرح سے ان احکام کی تعمیل کی جاتی ہے، وہ خدا کے لیے نہیں ہے بلکہ وہ انسان کی اپنی ذات کے سنوارنے کے لیے ہوتا ہے۔ اور اُس کے لیے محسوس شکل میں ایک اسٹینڈرڈ (معیار) ہمارے سامنے رکھا ہے کہ یہ کچھ کرتے جاؤ گے تو تم ایسے بن جاؤ گے۔ خدا تو محسوس نہیں ہے، نہ ہی یہ کہہ سکتا تھا کہ تم خدا بن جاؤ گے اور اگر کہتا بھی تو ہمیں کیا معلوم ہوتا کہ کیا بن جاؤ گے۔ اُس نے کہا ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ تمہارے جیسے ایک انسان نے جو کچھ ہم نے کہا ہے اُس کے مطابق عمل کیا ہے، اور حرفاً حرفاً عمل کیا ہے، وہ صاحبِ خلقِ عظیم ہے۔ اور وہ ہیں ہمارے نبی محمد ﷺ۔ جن کے لیے قرآن نے کہا ہے کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ(60:6) اس جیسے تم بن جاؤ گے اگر تم نے خدا کے اقدار کی پابندی کی۔ تمہیں وحی نہیں مل سکتی لیکن تمہاری سیرت، تمہارا نفس، تمہاری ذات سنور جائے گا اور حسین ہو جائے گی۔ اس کے لیے یہ محمد ﷺ تمہارے لیے محسوس معیار ہیں۔ خدا کے لیے نہیں کچھ کیا جا رہا بلکہ اپنی ہی ذات کے لیے یہ کچھ کیا جاتا ہے۔

---

❶ جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔665)

تری جلوہ گاہِ جمال میں مرا ذوقِ دید نکھر گیا
تری ضوفشانیِ حسن نے مری حیرتوں کو سجا دیا

جبینِ نیاز کا ایک ایک سجدہ انسانی ذات کو قدم قدم پر سرفرازیوں کی نوید دیتا ہے

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ کوئی انسان خدا تو نہیں بن سکتا البتہ صفاتِ خداوندی کا عکس اُس کے اندر آ جاتا ہے۔ مقصد ہی خدا کا یہ تھا کہ چھوٹے پیمانے' پہ جس پیمانے پہ ہم نے تمہیں اپنی توانائی میں سے ایک شمہ دیا ہے' اسی پیمانے پہ ہماری جو مکمل ترین صفات ہیں' ان کا بھی ایک ایک عکس اپنے اندر پیدا کرتے چلے جاؤ۔ اور خدا تو اس کے لیے بیتاب ہے کہ تم کسی طرح سے چھوٹے پیمانے پہ ہمارے جیسے بن جاؤ۔ یہ ہے خدا جو قرآن پیش کرتا ہے:

شعاعِ مہر خود بیتاب ہے ذوقِ تمنا سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

شعاعِ مہر نہ ہو تو شبنم سے کہیے کہ اڑ کر تو دکھائے۔ یہ زمین پہ گر جائے گی' پستیوں کی طرف آ جائے گی' اڑ نہیں سکے گی' یہ صرف شعاعِ مہر کا صدقہ ہے کہ یہ پستیوں کی بجائے بلندیوں پہ جا پہنچتی ہے۔ جس قطرے کو وہ شعاع نصیب نہیں ہوتی' وہ خاک میں مل جاتا ہے' پست تریں درجے پہ آ جاتا ہے۔ جس کی قسمت یاور کرتی ہے' جس کو وہ شعاع مل جاتی ہے تو پوچھو نہیں کہ پھر وہ کہاں جا پہنچتا ہے۔ جہاں سے گر کر نیچے آیا تھا انہی بلندیوں کے اوپر چلا جاتا ہے اور یہی معراجِ انسانیت ہے۔ کہا ہے کہ **وَمَنۡ یَّشۡکُرۡ فَاِنَّمَا یَشۡکُرُ لِنَفۡسِہٖ** (31:12)۔ جو نعمائے خداوندی کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرتا ہے' اس کی ذات کی صلاحیتیں بھرپور انداز سے نشوونما پاتی چلی جاتی ہیں۔ عزیزانِ من! موضوع ہی یہی ذاتِ انسانی ہے۔ پھر وہ بات آ گئی مگر شعر تو فارسی کا ہے لیکن اس مقام کے اوپر ہے بڑا برجستہ:

حکایتِ قدِ آں یارِ دلنواز کنم

میں اُس یارِ دلنواز کے قد کی حکایتیں بیان کر رہا ہوں۔

بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

مگر اس بہانے عمر تو اپنی ہی دراز کر رہا ہوں۔ یہ ہے ذکرِ ذات' یہ ہے قرآن کا دیا ہوا خدا کا تصور۔ ''بے ساختہ چھی پون نوں جی کراوندا اے [2]''۔

---

[1] جو ایسا کرتا ہے' اسکی ذات کی صلاحیتیں بھرپور انداز سے نشوونما پاتی ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 947)

[2] بے ساختہ ان سے بغلگیر ہونے کو دل چاہتا ہے۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

لیکن جبینِ نیاز کا یہ جو سجدہ ہے' وہ اُس کے لیے نہیں ہے۔

ترے سنگِ در نے بدل دیا ہے یہ پستیوں کو فراز میں

اور اب اس کا نتیجہ یہ ہے:

کہ ہزاروں عرش جھلک رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

اُس کے ہاں جو سجدہ کیا جاتا ہے تو اُس کو سجدے کی کیا ضرورت ہے! وہ تو لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (29:6) ساری کائنات سے مستغنی ہے۔ وہ اس کا محتاج ہی نہیں کہ کوئی شخص اس کے لیے کچھ کرے۔ وہ تو اپنی پستیوں کو فراز میں بدلنے کا ایک بہانہ ہے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

حقوق اللہ کا تصور بنیادی طور پر ہی غلط ہے

قرآن نے کہا ہے کہ وَ مَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ (31:12) ۔میں کہا کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں حقوق اللہ کا ایک تصور ہے یعنی یہ کہ ہمارے اوپر اللہ کے حقوق ہیں۔ یہ تصور غلط ہے۔ حقوق العباد ہی ہیں جو ہمارے ہیں' اللہ تو بطور حق کے ہم سے کچھ بھی نہیں مانگتا' وہ تو کہتا ہے کہ جو کچھ بھی ہے وہ لِنَفْسِهٖ تمہاری ہی اپنی ذات کے لیے) ہے' ارے بابا! تمہارے ہی لیے ہے' مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں۔ آگے کہا ہے کہ وَ مَنْ كَفَرَ (31:12) جو اس سے انکار کرتا ہے' فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (31:12) اس کا نقصان اسی کو اٹھانا پڑتا ہے خدا کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا اس کا قانون اپنی نتیجہ خیزی کے لیے کسی کی مدد کا محتاج نہیں۔ وہ از خود حسن وخوبی سے کارفرما رہتا ہے کہ اس کے نتائج ہر دیدۂ بینا سے' بے ساختہ خراجِ تحسین وصول کر لیتے ہیں۔ وہ اپنا کوئی بگڑا ہوا کام اسی لیے سنوارنا چاہتا ہے کہ لوگ کہیں: واہ بھئی شاہجہان! کیا خوب تاج محل بنایا ہے۔ وہ جو بنانے والے تھے ان کا اتنا ہی کام تھا کہ انہوں نے شاہجہاں کی خاطر اینٹ لگائی' گارا لگایا' پتھر لگایا اور کر کرا کے چلے گئے۔ پھر تاج محل بن گیا تو شاہجہاں کی تعریف ہونے لگی۔ انسان کا یہی جذبہ ہے جو اس قسم کی چیزیں بناتا ہے کہ کسی طرح سے اُس کی حمد وستائش ہو۔

انسانوں کی طرح خدا تعالیٰ کی ذات کسی سے اپنی تعریف کروانے کی محتاج نہیں

قرآن کہتا ہے کہ مَنْ كَفَرَ (31:12) جو اس طرح نہیں کرتا تو ہمارا کیا بگاڑتا ہے۔ اپنا ہی بگاڑتا ہے۔ وہ تو کہتا ہے کہ فَاِنَّ اللّٰهَ

غَنِیٌّ حَمِیْدٌ (31:12)۔ یہاں حمید آیا ہے۔ عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ فعیل کے وزن کے اوپر جو الفاظ آتے ہیں تو ان کے معنی ہوتا ہے کہ ہنگامی طور پہ ایسا نہیں کہ کبھی ایسا ہو گیا بلکہ وہ ہوتا ہے' جو مستقلاً بالکل اُسی قسم کا ہی رہے۔ یہاں کہا ہے کہ ہم تو شروع سے آخر تک حمید ہی حمید ہیں۔ اس لیے کیا ہم تمہارے تاج محل بنانے کے محتاج ہیں کہ تم بناؤ گے تو ہماری تعریف ہوگی؟ نہیں' ہم تو بذاتہٖ حمید ہیں۔ ہم یہ اس لیے چاہتے ہیں کہ ہم تو حمید ہیں ہی لیکن یہ سب کچھ کرنے والے کو ہم محمدﷺ کہتے ہیں کہ جن کی حمد کی جائے گی۔ وہ احمدؐ تھا' ہماری حمد کرتا تھا' یہ کرتے کرتے وہ مقامِ محمود پہ پہنچ گیا۔ عزیزانِ من! یہ وہی حمد کا لفظ ہے۔ مقامِ محمود پہ پہنچ گیا اور ساری دنیا کے لیے محمدﷺ بن گیا۔ اور وہی ہے جواب ہمارے لیے اسٹینڈرڈ ہے' اسوۂ حسنہ ہے' ورنہ خدا تو حمید ہے' جب اسلام نہیں تھا تب بھی وہ حمید تھا' جب انبیائے کرامؑ نہیں تھے تب وہ حمید تھا' جب انسان نہیں تھے' تب وہ حمید تھا' جب کاریگر نہیں تھے اُس کا ''تاج محل'' اُس وقت بھی موجود تھا۔ اس نے غَنِیٌّ حَمِیْدٌ (31:12) کہا ہے۔ یہ شکر یعنی صلاحیتوں کا بھرپور انداز میں نشوونما پانا تمہاری اپنی ہی ذات کے لیے ہے۔

عزیزانِ من! یہ ہوتا کس طرح ہے' یہ بات اگلی ہی آیت میں بتا دی۔ میں نے کہا ہے کہ نفسِ انسانی کی خصوصیت اُس کا اختیار و ارادہ ہے' خدا بھی اُس میں دخل نہیں دیتا۔ کہا ہے کہ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ (18:29)۔ میں نے کہا ہے کہ جہاں یہ اختیار و ارادہ سلب ہوا یعنی اس نے اپنے طور پہ اُس پہ کوئی پابندیاں عائد کر لیں تو وہ تو ان پابندیوں سے ''می شود از جبر پیدا اختیار''۔ جب وہ پانی ساحلوں کے اندر ہوتا ہے تو ایک نہر کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور وہ ہے جو تعمیری نتائج پیدا کرتا ہے۔

خدا تعالیٰ نے بھی اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں

اپنے اوپر جو پابندی خود عائد کی جاتی ہے اُسے جبر نہیں کہا جاتا۔ خدا نے خود اپنی ذات پہ بھی پابندیاں عائد کی ہوئی ہیں۔ کہا ہے کہ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ (6:12) ہم نے اپنے اوپر فرض قرار دیا۔ تو جو اپنے اختیار سے برضا و رغبت پابندی عائد کرتا ہے' خدا یہ کہنے سے (معاذ اللہ) مجبور نہیں ہو گیا۔ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ (30:47) آیا ہے۔ یہ جو بظاہر پابندی نظر آتی ہے' تو یہ اصول یاد رکھیے کہ برضا و رغبت اگر کوئی اپنے اوپر پابندی عائد کرتا ہے تو یہ پابندی جبر نہیں کہلاتی۔ جبر وہ ہے جو دوسرے کی طرف سے پابندی عائد کی جائے۔ انسانی ذات کی تحسین و تزئین اور نشوونما (Development) اُس وقت ہوتی ہے کہ اس کے اختیار و ارادے کے اوپر خارج سے کوئی جبر نہ ہو بلکہ یہ از خود اُسے سواحل کے اندر محبوس کر دے۔ خدا بھی اس کے اوپر حفیظ اور وکیل اور داروغہ نہیں بننا چاہتا۔ اسے کہا ہے کہ اپنی ذات کے لیے یہ کچھ کرو۔ اگلی ہی آیت کے اندر یہ بات واضح کر دی۔ کہا کہ وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِہٖ (31:13)۔ لقمان اپنے بیٹے سے کہہ رہا ہے۔ قرآن نے یوں انداز بیان کیا ہے کہ لقمان بیٹے کو کچھ نصیحت کر رہے ہیں۔ وَ ھُوَ یَعِظُہٗ (31:13) وہ اس کو نصیحت

کر رہے ہیں' مار مار کر نہیں کہہ رہے حالانکہ بیٹے کو تو تھپڑ مار مار کر بھی کچھ کرایا جاتا ہے۔ یہاں حکمت کی بات تھی اس لیے وہ اُس کو بھی نصیحت کے انداز سے سمجھا رہے ہیں۔ کہا کہ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (31:13)۔ ویسے تو عظمت کے معنی بلندی اور حمیت ہوتا ہے' ''عظم'' ان ہڈیوں کو کہتے ہیں جن کے سہارے سارا جسم کام کرتا ہے۔ کہا کہ سب سے بڑا جو بنیادی ظلم ہے وہ شرک ہے۔

قرآن حکیم نے عبادت' پرستش' توحید اور شرک کے بنیادی تصورات کے فرق کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے

عزیزانِ من! ہم نے جب اپنے ہاں عبادت کا ترجمہ پرستش کر لیا اور خدا کی پرستش کرنے لگ گئے تو اُس کو معبود کہا۔ اب ہم نے شرک کا مفہوم یہ سمجھ لیا کہ یہ بتوں کی پرستش کرنا ہے یعنی خدا کے سوا کسی اور کی پرستش کرنا' ہمارے ہاں شرک ہو گیا اور مشرک کہتے ہی ان کو ہیں جو بت پرست ہوتے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ یہ بہت بڑی سازش تھی۔ الدین تو وہ نظام تھا جو آپ کو اعلون بنا رہا تھا' تمام اقوامِ عالم کے اوپر آپ کو غالب بنا رہا تھا۔ یہ کس طریق سے آپ کو وہ بنا رہا تھا؟ وہ یونہی اٹھا اٹھا کر تو نہیں بنا رہا تھا۔ یہ تو کچھ تصورات دیئے تھے' کچھ اصول دیئے تھے' کچھ اقدار دی تھیں' احکام دیئے تھے' کچھ ساحل باندھے تھے۔ ان کے مطابق چلنے کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ اسلام جو الدین ہے وہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9:33) تمام دنیا کے جو نظام ہیں' یہ ان کے اوپر غالب ہو گیا اور جو مومن تھے ان کو اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (3:139) کہا تھا' یہ مومنین کا مقام تھا۔ یہ مقام بنیادی طور پر کس بنا پہ حاصل ہوا تھا؟ اس سے جسے توحید کہتے ہیں۔ آج تو اس کے کچھ معنی ہی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں توحید وہ ہے جس نے دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا تھا اور اب یہ ''فقط مسئلہ علم الکلام'' ہے یعنی یہ اب علمِ کلام کا ایک مسئلہ بن کر رہ گیا ہے۔ وہ کیا چیز تھی جس سے یہ ساری دنیا پر بالا و بلند ہوئے تھے؟ وہ تھی شرک سے اجتناب یعنی یہ کہ شرک نہ کیا جائے۔ یہ کہہ کر بڑا آسان ہو گیا کہ صاحب! ہم تو بتوں کی پرستش نہیں کرتے' خدا کے اس حکم کی تعمیل ہو گئی۔ بتوں کی پرستش تو انہوں نے ہزار برس سے چھوڑی ہوئی ہے لیکن نہ تو ان کا یہ اسلام لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9:33) ہوا' نہ یہ اعلون ہوئے۔ ہوا یہی کہ اس نے عبادت کہا تھا' انہوں نے پرستش شروع کر دی۔ پرستش سے تو یہ باقی مذاہب پر آ گئے' بس طریقِ پرستش میں ذرا فرق ہو گیا۔ ہمارے ہاں ایک اصلاحی چیز ہوئی۔ کہا گیا کہ یہ قبروں پہ جانا اور دیئے وغیرہ جلانا غلط ہے لیکن اس سے بھی تو وہ بات نہ بنی کیونکہ یہ بھی ایک نظری سی چیز ہو گئی۔ یہ کیا چیز تھی جو یہ شرک ظلمِ عظیم تھا۔

خدا نے خود بتایا ہے کہ شرک کسے کہتے ہیں۔ کہا کہ لَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (18:26) وہ اپنے حقِ حکومت میں کسی کو

شریک نہیں ہونے دیتا۔ خدا ان معنوں میں معبود نہیں ہے کہ وہ ایک پرستش کی شے ہے بلکہ وہ ان معنوں کے اندر ہے کہ حکم صرف اس کا واجب التعمیل ہے، حکومت صرف اُس کی جائز ہے۔ لا الہ کوئی اور الہٰ نہیں ہے۔ ہم نے تو الہ کا ترجمہ بھی معبود کر رکھا ہے کہ کوئی پرستش کے قابل نہیں سوائے اللہ کے جبکہ لفظ الہ کے معنی عربی زبان کے اندر صاحبِ اقتدار ہیں۔ لا الہ یہ ہوا کہ کائنات کے اندر کوئی نہیں جسے حقِ حکومت حاصل ہے۔ توحید یہ ہے کہ **الا اللہ** اُسی خدا کو حقِ حکومت حاصل ہے۔ یہاں کہا ہے کہ **لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا** (18:26) وہ اپنے اس حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا اور مومن کی Definition (تعریف) یہ ہے کہ **لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا** (18:110)۔ وہاں (18:26) میں ''حکم'' کا لفظ تھا یہاں (18:110) میں ''عبادت'' کا لفظ ہے۔ قرآن تو اپنے معنی آپ کر رہا ہے۔ کہا کہ مومن خدا کے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا' اگر شریک کیا جائے تو یہ شرک ہو گیا اور یہ ظلمِ عظیم اس لیے ہے کہ اس سے خدا تو اُس مقام سے نیچے آ گیا' اُس مقام پہ تو اُس صورت میں تھا کہ لا الہ ہوتا' کوئی اور دوسرا اُس کا ہمسر نہ ہوتا بلکہ اُس کا مقام منفرد ہوتا' بلند ترین مقام اُس کا ہوتا لیکن جب بھی آپ نے کسی انسان کو اس کا حق دیدیا تو وہ اور یہ دونوں نیچے آ گئے۔ اور یہ انسان کہ جس نے اُس کا محکوم ہونا تھا' یہ اب اُس کے حقِ حکومت میں شریک ہو کر اُس کے مقام کے اوپر چلا گیا۔ یہ اپنے مقام پہ نہ رہا تو یہ ظلم ہو گیا' وہ اپنے مقام پہ نہ رہا' یہ ہو گیا ظلم۔ اُس نے کہا کہ یہ دونوں طرف سے ظلم ہے اور یہی تو ظلمِ عظیم ہے۔

عزیزانِ من! وہ **لِنَفْسِهِ** (31:12) تھا کہ جو کچھ انسان کرتا ہے' وہ اپنی ذات کے لیے کرتا ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما (Development)' اس کی تحسین و تزئین' اس طرح سے ہوتی ہے کہ اس کے اختیار و ارادے میں وسعتیں پیدا ہوں اور اگر یہ اپنے اوپر کسی قسم کی پابندی عائد کرتا ہے تو خود' بطیبِ خاطر' اپنی رضامندی سے' عائد کرے جیسے خدا نے اپنی رضامندی سے اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کی ہوئی ہیں۔ اسی طرح انسان خود اپنے اوپر پابندیاں عائد کرے۔ وہ پابندیاں **إِلَٰهَهُ هَوَاهُ**❶ (25:43) نہ ہوں کہ تمہاری اپنی خواہشات ہوں' اپنی آرزوئیں ہوں' اپنی تمنائیں ہوں' جو جہاں چاہیں بے محابہ ہو جائیں یعنی جہاں تک جی چاہے چلی جائیں یا جہاں جی چاہے رک جائیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ خدا کی بتائی ہوئی پابندیاں ہیں' صرف خدا کی بتائی ہوئی ہیں اور ان پابندیوں کو تم نے خود اپنے اوپر عائد کرنا ہے۔ یہ ہے الدین' یہ ہے صحیح اسلام۔ اسی لیے اُس نے کہا کہ **إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ** (12:40) جو الحکم ہے یہ صرف اُس کے لیے ہے' اس کی ذات کے لیے ہے' کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ اب سوال یہ رہ گیا کہ جیسے خدا تو غیر محسوس' غیر مرئی (Invisible) ہے وہ تو **لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ**❷ (6:104) ہے۔ نہ وہ ہمارے سامنے آئے' نہ ہم اس کی بات سنیں تو

---

❶ (حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی خواہشات اور جذبات کو اپنا معبود بنا رکھا ہے) سو جو شخص اپنی خواہشات کا غلام اور پرستار بن جائے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 824)۔

❷ انسان کا علم' محسوسات تک محدود ہے۔ اس کی نگاہیں غیر محدود و غیر محسوس ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت تک پہنچ ہی نہیں سکتیں۔ اس کے برعکس **وھو یدرک الابصار** (6:104) علمِ خداوندی' تمام نگاہوں کو محیط ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 313)۔

کیسے معلوم ہو کہ اُس کا حکم کیا ہے اُس کی محکومیت کیسے اختیار کریں اور یہ معلوم ہو کہ یقینی طور پر واقعی اُس کی محکومیت ہو رہی ہے؟ اُس نے کہا کہ بات بڑی آسان ہے۔ ہم تو سامنے نہیں آتے، ہم تو محسوس نہیں ہیں لیکن ہم نے اپنے احکام کا ایک ضابطہ خود تمہاری طرف نازل کر دیا ہے۔ ہمارا حکم بھی انفرادی طور پر نہیں مانا جائے گا بلکہ قانون کی اطاعت کی جائے گی۔ Rule of Law (قانون کی حکمرانی) ہوگا، وہ ڈکٹیٹر بھی نہیں بننا چاہتا۔ قانون کی کتاب دیدی کہ یہ قانون ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ کسی انسان کو اس میں حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے لیے قانون بنائے۔ جسے آپ اسلامی حکومت کہتے ہیں، وہ قانون نہیں بناتی ہے بلکہ وہ خدا کے قوانین کو ان حالات کے مطابق نافذ کرتی ہے جن حالات میں اُس دور میں انسان گزر رہے ہوتے ہیں۔

خدا تعالیٰ کی صفات کو انسان انسان کے اندر علیٰ حدّ بشریت پیدا کرنا ہے

عزیزانِ من! ایک بات اور سن لیجیے کہ خدا کی صفات انسان کے اندر علی حدِ بشریت پیدا ہوتی جاتی ہیں لیکن خدا کی جو صفت یا جو خصوصیت ہوتی ہے، اس کی وہ صفت یا خصوصیت اس کے اندر داخل نہیں ہونی چاہیے۔ اگر وہ داخل کر دی جائے تو پھر یہ خدا بن جاتا ہے، پھر یہ شخص خدا کے مقام پہ پہنچ جاتا ہے۔ یہ تو خدا کی صفات کو انسان کے اندر علیٰ حدِ بشریت پیدا کرنا ہے۔

ایک دوسرے پر حکومت کرنے کا تصور حیوانات میں بھی نہیں پایا جاتا ہے

خدا کے احکام کے متعلق اُس نے خصوصیت یہ دی تھی کہ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (10:64) اُس کے ان قوانین میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اگر ان میں تبدیلی کر دی جائے تو یہ بھی شرک ہے اور اگر انسانوں کے بنائے ہوئے کسی قانون میں یہ خصوصیت پیدا کر دی جائے کہ وہ تبدیل ہی نہیں ہو سکتے تو یہ بھی شرک ہے۔ یہ جسے آپ آدمیت کی تاریخ کہتے ہیں، وہ اسی خوں فشاں داستان کا تذکرہ ہے کہ ہر انسان چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح دوسرے انسان پر کچھ حکومت کرے، کچھ دباؤ رکھے جبکہ حیوانات کے اندر یہ بات نہیں ہوتی۔ شیر جیسا قوتوں کا مالک، کبھی کسی دوسرے شیر کے اوپر اس طرح حکومت نہیں چاہتا، وہ اپنی نوع کے کسی فرد کے اوپر حکومت نہیں چاہتا۔ یہ انسان کے اندر ایک ہوس ہے کہ دوسرے انسان کے اوپر کچھ اتھارٹی رکھے، خواہ چھوٹی سی رکھے۔ اس میں وہ لذت لیتا ہے۔

انسان میں کسی ادنیٰ سی سطح پر بھی حکومت کرنے کا تصور اسے فرعون بنا دیتا ہے

عزیزانِ من! آپ چھوٹے سے چھوٹے پیمانے سے شروع کیجیے تو دیکھیے کہ یہ جو مزدور ہوتے ہیں تو انگریز نے ان میں سے ایک کو

Mate بنا دیا۔ اُس زمانے میں قُلی کی تنخواہ آٹھ آنے زیادہ ہوتی تھی لیکن ''اوہ میٹ فیر کسے نوں حقہ وی نہیں پین دیندا سی'' ❶۔ باقی سارے مزدور تھے اور یہ میٹ تھا تو اُس کی گردن اکڑ جاتی تھی۔ یہ کیا چیز تھی؟ یہ اپنے جیسے انسانوں پر تھوڑا سا حقِ حکومت اُس کو مل گیا تھا۔ جونہی یہ چیز آئی یہ انسان سے شیطان ہوا۔ دفتروں میں سارے کلرک ہوتے تھے' ایک کو ہیڈ کلرک کہہ دیا جاتا تھا' کبھی تو اس کو کچھ الاؤنس دیدیا جاتا ہے'' کدی ایویں ای ٹرخایا جاندا تے ایہدے اچ ای خوش ہوندا ہیگا کہ ہیڈ کلرک تے ہیگاں ❷۔'' اُس کی بیوی سے بھی پوچھیے تو وہ کبھی یہ نہیں کہتی کہ میرے میاں وہاں کلرک ہیں بلکہ وہ کہتی ہے کہ ''او جی اوتھے ہیڈ کلرک نیں'' ❸۔ اس جذبے کو آپ دیکھیے اور اسے بڑھاتے چلے جائیے۔ کتنا ہی دولت مند دکاندار کیوں نہ ہو اُس کی یہ کیفیت نہیں ہوتی لیکن جونہی اُس نے انڈسٹری قائم کی اور اُس کے ماتحت ہزار مزدور ہوئے تو اُس کے بعد اُس کو دیکھیے کہ وہی جو دولت مند تھا اب کیا بن گیا ہے۔ کسی آدمی کا کیریکٹر پرکھنا ہو تو اُس وقت پرکھو جب وہ خاوند بن جائے' ہمارے ہاں تو اُسے کہتے ہی خداوندِ مجازی تھے۔ وہ تو ذرا سی جھجک پیدا ہوئی' اُس (لفظِ خداوند) میں سے ''د'' نکال دیا اور وہ ''خاوند'' بن گیا' ورنہ اندر سے وہ اپنے آپ کو خداوند ہی سمجھتا ہے۔ پھر (معاذ اللہ' معاذ اللہ) حدیثیں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیں کہ (معاذ اللہ) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر خدا کے سوا کسی کو سجدے کی اجازت ہوتی تو میں عورت کو کہتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کیا کرے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ آدمی کا کیریکٹر پہچاننا ہو تو اُس وقت دیکھیے جب وہ خاوند بن جائے۔ اب میری بہنیں اور میری بیٹیاں ہنس تو رہی ہیں تو اب آپ کی بھی بات کہہ دوں۔ جب کسی عورت کا کیریکٹر پہچاننا ہو تو اُس دیکھیے جب وہ ساس بن جائے۔ عزیزانِ من! بات ساری اتنی ہے کہ

آدمی کو خدا نہ دکھلائے آدمی کا کبھی خدا ہونا

ساری قیامت اس کے اندر ہے۔

مالکِ یوم الدین کا عملی مفہوم اور اس کی خصوصیت

جسے آپ دین کہتے ہیں' دن میں معلوم نہیں کتنی دفعہ ہم نماز پڑھنے والے کوئی چوالیس مرتبہ تو مالک یوم الدین کہتے ہی ہیں اور الدین تو ہم روز پکارتے ہیں' دین ہر وقت ہم زبانوں پہ لاتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ الدین کیا ہے؟ وہ نظام جس میں حکومت صرف خدا کی

---

❶ لیکن وہ میٹ کسی کو تھوڑی سی فرصت بھی نہیں لینے دیتا تھا کہ وہ حقہ ہی پی سکے۔

❷ کبھی اسی طرح (بغیر الاؤنس) ٹرخا دیا جاتا ہے لیکن اس پر بھی وہ خوش ہو جاتا ہے کہ ہیڈ کلرک تو ہوں۔

❸ جی! وہ وہاں ہیڈ کلرک ہیں۔

قائم رہے۔ الدین کی تشریح قرآن نے خود کر دی۔ کہا کہ تم روز دین اور الدین کہتے ہو تو سنو! وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا يَوۡمُ الدِّيۡنِ (82:17) کچھ علم بھی ہے تمہیں کہ جب الدین نافذ ہو تو اُس دور کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ اتنا اہم ہے کہ کہا کہ ثُمَّ مَآ اَدۡرٰىكَ مَا يَوۡمُ الدِّيۡنِ (82:18) ایک دفعہ پھر پوچھتا ہوں تم سے کہ کچھ معلوم بھی ہے تمہیں کہ الدین جس دور کے اندر نافذ ہوگا تو اُس دور کی کیفیت کیا ہوگی؟ عزیزانِ من! توجہ سے سنیئے قرآن کا ایک لفظ Miss (بھول) نہ کر جایئے گا۔ کہا کہ يَوۡمَ لَا تَمۡلِكُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَيۡـًٔا (82:19) جس میں کسی انسان کا کسی دوسرے انسان پہ کوئی دباؤ نہیں ہوگا۔ یہ ہے الدین کا دور۔ تو کیا انارکی (انتشار) ہو جائے گی؟ کہا کہ وَالۡاَمۡرُ يَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ (82:19) اس دور میں معاملات سارے اُس کے قانون کے مطابق چلیں گے۔ عزیزانِ من! کہا ہے کہ یوم لَا تَمۡلِكُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَيۡـًٔا (82:19) کسی بات میں بھی کوئی انسان دوسرے انسان کا دبیل [1] نہیں ہوگا۔ یہ ہے الدین اور اب بات سمجھ میں آئی جو کہا کہ اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ (31:13) یاد رکھو! شرک ظلمِ عظیم ہے۔ خدا کو واحد مان لینے سے کہ صرف ایک ہی خدا ہے اُس کا کیا سنورتا ہے، دوسرا کہتا ہے کہ نہیں، دس بیس ہیں تو اُس کا کیا بگڑتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ ہے ہی نہیں تو اُس کا کیا بگڑتا ہے۔ وہ تو غَنِيٌّ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ (3:97) ہے۔ انسان تو ایک طرف جب یہ پوری کائنات ہی نہیں تھی تو وہ تو اُس وقت بھی خدا تھا۔ اُس کا کچھ نہیں بگڑتا بلکہ انسان ہی کا بگڑتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں نے درس میں یہ بات سنائی تھی یا نہیں کہ یہ جو شرک کے معنی ہیں، ہماری نگاہوں سے تو یہ صدیوں سے اوجھل رہے ہیں۔ ہم نے بت پرستی کو ہی شرک سمجھا ہے اور اس سے اجتناب کیا تو توحید والے بن گئے یا مثلاً قبروں پہ جس نے جانا چھوڑ دیا تو توحید والے بن گئے۔

1935ء میں توحید کے ہی سلسلہ میں ملازمت کے دوران علامہ پرویزؒ کے ساتھ ایک ہونے والا ذاتی واقعہ

غیر مسلم اور خاص طور پہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اقوامِ مغرب، اچھی طرح جانتی تھیں کہ شرک کیا ہے اور اسلام میں توحید کسے کہتے ہیں۔ یہ ایک ذاتی واقعہ ہے جسے میں عرض کر رہا ہوں اور آپ کو معلوم ہے کہ میں درس میں ذاتی باتیں نہیں کیا کرتا۔ چونکہ یہ واقعہ میرے ساتھ ہوا ہے اس لیے میں کہہ رہا ہوں۔ یہ واقعہ غالباً 1935ء میں یا جب پہلی دفعہ ''آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دلی'' قائم ہوا پیش آیا اور پہلی دفعہ ہی یہ سوال سامنے آیا کہ جو گورنمنٹ سرونٹ ہیں، کیا ان کو بھی ریڈیو پر تقریر کرنے کے لیے بلایا جائے، کیا ان کو اجازت دی جائے یا نہ دی جائے؟ سوال اس طرح سے پیدا ہوا کہ حج کی تقریب تھی۔ میں وہاں کی مسجد میں خطبے بھی دیا کرتا تھا، نمازیں بھی پڑھایا کرتا تھا۔ عام طور پہ سیکرٹریٹ کے اندر کچھ مسلمانوں کا نمائندہ بھی سمجھا جایا کرتا تھا، لکھتا پڑھتا بھی تھا، کتابیں بھی تھیں۔ انہوں نے مجھے بلایا کہ حج کی

---

[1] ماتحت، تابع

تقریب پر ریڈیو پہ ایک تقریر کرو۔ پہلی دفعہ یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا گورنمنٹ سرونٹ ریڈیو پہ جا سکتا ہے یا نہیں؟ میں ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھا' جسے اب منسٹری آف انٹیریئر (وزارتِ امورِ داخلہ) کہتے ہیں۔ یہ اس قسم کے تمام معاملات وہیں طے ہوا کرتے تھے۔ یہ سوال وہاں ہوم ڈیپارٹمنٹ میں آیا اور بات چلی کہ اجازت دی جائے یا نہ دی جائے کیونکہ یہ بات اصولی نوعیت کی تھی۔ نیچے سے یہ چیز کہی گئی کہ اجازت دی جائے لیکن مقرر کو کہا جائے کہ وہ پہلے اپنی تقریر کا مسودہ پیش کیا کرے' یہاں سے وہ مسودہ دیکھ لیا جائے۔ اگر وہ قابلِ اعتراض نہ ہو تو پھر اجازت دیدی جائے۔ یہ بات اوپر چلی گئی۔ سیکرٹری' مشرقی علوم کا فاضل تھا۔ وہ مجھے اس لیے بھی جانتا تھا کہ یہ ایک قدرِ مشترک بھی تھی۔ اُس نے مجھے بلایا اور کہنے لگا کہ یہ سوال آیا ہے تو میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہارا اس تقریر میں موضوع کیا ہوگا۔ میں نے کہا کہ جی! یہ خالص ایک مذہبی تقریر ہے' مذہبی موضوع ہوگا' میں اسوۂ حضرت ابراہیم علیہ السلام پیش کروں گا اور اس سلسلے میں حج کی بات آنی ہے۔ میں نے اسوۂ ابراہیمی علیہ السلام کو اپنا موضوع قرار دیا ہے اور اُس کے مطابق میں وہاں تقریر کروں گا۔ مجھ سے کہنے لگا کہ اچھا! اسوۂ ابراہیمی علیہ السلام پہ آپ تقریر کریں گے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ صاحب! یہ تو بڑا Innocent (معصوم) سا موضوع ہے' مذہبی تقریب ہے' مذہبی تقریر ہونی ہے۔ اس کو تو سیاست سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ کہا کہ اسوۂ ابراہیمی علیہ السلام کے اندر یہ کہو گے جو قرآن نے کہا ہے' جو حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا کہ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (6:80)۔ مجھ سے پوچھا کہ کیا یہ کہو گے؟ میں نے کہا کہ ہاں جی یہ تو آیت ہے اور میں یہاں سے شروع کروں گا۔ کہنے لگے کہ جو وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (6:80) ہے تو کیا آپ کو پتہ ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ لَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا (18:26) وہ اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ کہنے لگے کہ یہ جو یہاں برطانیہ کی حکومت قائم ہے یہ تو شرکِ عظیم ہو جائے گی۔ کیا اس کا کوئی تعلق سیاست سے نہیں ہے؟ عزیزانِ من! میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ یعنی اس اعتبار سے کہ یہ چیز جو ہم ہزار سال سے بھولے ہوئے ہیں' ہم نے اس کو بت پرستی قرار دیا ہے لیکن یہ تو میں کس طرح سے یہاں پہنچی ہوئی ہیں کہ شرک کے معنی وہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔

اُس وقت میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ قومیں جو چاہتی ہی نہیں ہیں کہ کسی طرح سے بھی اسلام کا احیا ہو تو یہ اس لیے نہیں کہ جو ہم کہتے ہیں کہ صلاح الدین ایوبی کا یہ بدلہ لے رہے ہیں بلکہ اس لیے ہے کہ انہیں پتہ ہے کہ جو اسلام ہے وہ کیا ہے' الدین کس کو کہتے ہیں؟ یہ دین تو کسی انسان کی حکومت کو مانتا نہیں ہے' یہ اگر دنیا کے اندر قائم ہو گیا تو کسی انسان کی حکومت ہی باقی نہیں رہے گی۔ یہ وجہ ہے جو مذہب کی تو اتنی اجازت دیئے چلے جاتے ہیں' اتنی Facilities (سہولیات) ہمیں وہاں انگریز کے زمانے میں مذہب میں حاصل تھیں۔

انگریز نے آزادی کی جنگ کے بعد آتے ہی جو اعلان کیا تھا وہ یہی کیا تھا کہ ہندوستان میں رہنے والے تمام اہلِ مذاہب کو ان کی مذہبی آزادی ہوگی اور پھر اس کے گن گائے گئے' قصیدے پڑھے گئے۔ وہ جو (الطاف حسین) حالیؒ (1837-1914ء) نے کہا تھا:

بجتا ہے فقط چرچ میں اتوار کو گھنٹا

سنکھ اور اذاں گونجتے ہیں روز برابر

یعنی جن کی حکومت ہے' ان کے ہاں تو آٹھویں دن جا کر کہیں پکار ہوتی ہے اور آپ اندازہ لگایئے کہ ان کی حکومت نے تم کو اتنی آزادیاں دی ہیں کہ ''سنکھ ❶ اور اذاں گونجتے ہیں روز برابر''۔ اذاں کی آزادی تو تھی لیکن اللہ اکبر کے معنی سمجھنے کی آزادی نہیں تھی۔ وہاں نمازوں کا بڑا اہتمام ہوتا تھا' اس قدر اس کے لیے انتظامات ہوتے تھے کہ پہلے سیکرٹریٹ کے درمیان میں وہ ایک عام سی گاؤں کی مسجد تھی پھر وہ اتنی عالیشان مسجد بن گئی تھی اور میں وہاں خطبے دیا کرتا تھا۔ یہ کا ہے کی آزادی تھی؟ یہ مذہب کی آزادی تھی۔ دین کے متعلق تو اُس سیکرٹری نے مجھے بتایا دیا تھا کہ یہ اسوۂ ابراہیمیؑ پیش کرو گے اور اُس کے بعد تم کہو گے کہ یہ تو جی مذہبی تقریر ہے' اس کو سیاست سے کیا تعلق!! یہ الگ بات ہے کہ اس کے بعد اُس نے مسکرا کر مجھ سے کہا کہ میں نے اس کے اوپر یہ آرڈر پاس کیے ہیں کہ یہ تقریر کرنے والا سمجھ بوجھ کا آدمی ہے' گورنمنٹ سروس کے اندر بھی ہے' سروس کے قواعد وضوابط سے واقف بھی ہے۔ اگر اس کو ملازمت کے اندر رہنے کی ضرورت ہوگی تو خود اپنی تقریر پہ پابندی کرے گا اور اگر جی نہیں چاہے گا تو اُس کو توڑنے گا' اس کو ملازمت سے نکال دینا' یہ خود ہی بھٹکتا پھرے گا۔ میں کہہ رہا تھا کہ شرک کے معنی وہ جانتے تھے اور اب بھی یہ قومیں جانتی ہیں۔

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

یہ گل ہے جو نہیں جانتا تھا مگر یہ تحریکِ پاکستان کے زمانے میں جو ہماری مخالفت کرنے والے علما تھے' اس کا ان کے ساتھ جھگڑا ہی اتنا تھا۔ وہ جھگڑا اقبالؒ (1877-1938) نے ایک شعر میں بیان کر دیا ہے:

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت

نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اسلام کا احیا تو مذہب کی بجائے دین کی حکمرانی سے مشروط ہے

عزیزانِ من! اسلام کی آزادی تو اُس دن ہوگی' جس دن کیفیت یہ ہو کہ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (18:26) اور اُس کے

---

❶ ناقوس

بعد پھر عملاً کیفیت یہ ہو کہ اُس دور کے اندر ایک خدا کی محکومیت اختیار کرنے سے دنیا کی ہر حکومت سے انسان اونچا ہو جائے یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا (82:19) اسلام کا احیا اُس دور میں ہو گا جب کیفیت عملاً یہ ہو گی کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا دبیل نہیں رہے گا۔ اب آپ نے بات سمجھ لی کہ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ (31:12) اور پھر یہ چیز کہ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (31:13)۔ لقمان کی حکمت کی باتوں میں سے دو ہی چیزیں پہلے ہمارے سامنے آئیں، آگے بھی بات آتی چلی جائے گی لیکن مضمون دوسرا شروع ہو رہا ہے اس لیے میں اجازت چاہتا ہوں۔

آج ہم سورۃ لقمان کی دو ہی آیات 12 اور 13 لے سکے ہیں، 14 ویں آیت سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

تیسرا باب: سورة لقمٰن (آیات 14 تا 16)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1979ء کی 26 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ لقمٰن کی آیت 14 سے ہو رہا ہے:

(31:14)

آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلی آیات میں لقمان کی چند حکمت آموز باتوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ ہم یقینی طور پہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ان کا شمار زمرۂ انبیاء میں تھا کیونکہ قرآن نے ایسا نہیں کہا لیکن جو کچھ اُس میں کہا گیا ہے وہ قرآنِ کریم کی تعلیم کے ہی مطابق ہے بلکہ اُسی کے احکام ہیں' اُسی کی تعلیم ہے۔ پچھلی آیت تک تو ہم آ چکے تھے کہ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (31:13)۔ شرک کو ظلمِ عظیم کیوں کہا گیا' اس کی وضاحت میں نے کی تھی۔ خدا کے سوا کسی اور کی محکومیت یا اطاعت اختیار کرنا شرک ہے اور ظلمِ عظیم اس لیے ہے کہ اس طرح سے نہ خدا اپنے مقام پہ رہتا ہے' اُس کے برابر ہم دوسرے کو بٹھا دیتے ہیں' اور نہ انسان اپنے مقام پہ رہتا ہے' اسے اس کے مقام سے جو اس کا خدا کی محکومیت کا مقام تھا' ہم اس سے اونچا لے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ ظلم ہے۔ اور چونکہ معاملہ ایک طرف خدا کا اور دوسری طرف انسان کا ہے جو کہ کائنات میں سب سے اشرف اور صاحبِ اختیار ہے' ان دونوں کو جب اپنے مقام سے ہٹا دیا جائے تو یہ ظلمِ عظیم ہو جاتا ہے۔ یہ ہے جسے قرآنِ کریم نے شرک کہا ہے۔ یہ شرک بت پرستی نہیں ہے' پرستش کا تو سوال ہی قرآن میں نہیں آتا۔

والدین سے حسنِ سلوک: لقمان کی بات

لقمان کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اگلی بات قرآن نے یہ کہی ہے کہ وَ وَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَ فِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَ لِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ - وَ إِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَّاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (31:14.15) ہم نے (خدا نے) والدین کے متعلق بھی انسان کو کچھ احکام اور ہدایات دی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہی کہ اُس کی ماں کو دیکھو کہ پہلے تو وہ نو مہینے تک اُس گوشت کو اپنے رحم میں اٹھائے پھرتی ہے اور پھر اُس کی رحم کے اندر ہی اس طرح سے پرورش ہوتی ہے کہ ماں کا اپنا ہی ایک جسم کا جزو ہے جس سے یہ بچہ تیار ہو رہا ہے۔ گویا وہ اپنے جسم کا ایک حصہ اس بچے کی تخلیق کے لیے منتقل کیے جا رہی ہے' خود کمزور ہوتی چلی جاتی ہے اور اُس بچے کی تخلیق کیے چلی جاتی ہے۔ عجیب انداز سے یہ چیز کہی۔ پھر اُس کے بعد وہ پیدا ہوتا ہے تو کم از کم دو سال تک اُس کو دودھ پلاتی ہے۔ یہ جو دودھ ہے یہ بھی تو اندر کوئی خارج کی مشین تو لگی ہوئی نہیں ہے کہ جہاں سے وہ دودھ ہے بلکہ ماں کے اپنے جسم کا ہی حصہ ہوتا ہے' اُس کے خون ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے جسے وہ بچے کی پرورش کے لیے اُدھر منتقل کرتی چلی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق کہا تھا کہ اُس کی صفتِ رحیمیت ہے۔ وہ جو میں نے عرض کیا ہے کہ جو ''رح م'' ہے' وہ مادہ ہی ایک ہے۔ خدا کی صفتِ رحیمیت اور اُس کے ساتھ ماں کی جو رحیمیت ہے' یہ دونوں اس بچے کی اندر شامل ہوتی ہیں۔ کہا ہے کہ أَنِ اشْكُرْ لِي وَ لِوَالِدَيْكَ (31:14) ۔ اس میں پہلے کہا تھا أَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ (31:12) خدا کا شکر یہ بھی ادا کرو اور اس کے ساتھ ہی ان والدین کا بھی شکریہ ادا کرو۔ یہ شکریہ ادا کرنا کیا چیز ہے؟ باقی کائنات کو چھوڑ دیجیے' انسانی بچے کو لیجیے۔ آپ یہ دیکھیے رحمِ مادر کے اندر اُس کی پرورش کا اور ربوبیت کا جو انتظام ہے' یہ رحیمیت ہے کہ خدا کی طرف سے سامانِ نشو و نما ملتے چلے جانا اور نہایت لطافت و راحت و محبت سے بلا مزد و معاوضہ ملتے چلے جانا۔ یہ خدا کی رحیمیت تھی' اُس کا ایک نظام ہے' اُس کا ایک انتظام ہے جو رحمِ مادر میں ہوتا ہے۔ اس میں اُس ماں کا اپنا کوئی حصہ خود نہیں ہوتا یعنی یہ اُس کی اپنی کوشش ہے یا اپنے کسب و ہنر سے نہیں ہوتا' اُس کے اختیار و ارادے سے بھی نہیں ہوتا۔ یہ تو خالصتاً خدا کی طرف سے رحیمیت ہے۔ اس رحیمیت کا یہ جو درجہ ہے' یہ جو حصہ ہے' اس کے لیے تو خدا کا شکریہ ہے۔

بچے کی پیدائش کے بعد ماں کی مامتا کا بدرجہ اتم کردار

اب اُس کے بعد بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اُس پیدا ہونے میں یہ جو اُس کے لیے ذریعہ پرورش ہے جسے دودھ کہا جاتا ہے یہ بھی خدا ہی کے نظام کے تابع ہوتا ہے۔ وہی جو رحمِ مادر کے اندر تھا اُسی کی ذرا بدلی ہوئی شکل باہر آ گئی۔ اس میں اب ماں بھی شریک ہوتی ہے۔ یعنی

رحم کے اندر یہ بات نہیں تھی کہ ماں نہ چاہے تو بچے کی جو پرورش ہے وہ نہ ہو سکے۔ یہاں باہر آنے کے بعد سامان خدا کا دیا ہوا ہوتا ہے لیکن اُس کے اندر اُس بچے کو بروقت دودھ دینا' صحیح دودھ دینا' اُس کی حفاظت کرنا' اُس کی پرورش کرنا' نگہ پرداخت کرنا' ماں پہ ہوتا ہے۔ گویا بچے کی نشو ونما کا جو پہلا مرحلہ تھا وہ خالصتاً خدا کی طرف سے سامان بھی تھا اور نگہبانی بھی اُسی کی تھی' ماں کا اُس کے اندر دخل ہی نہیں تھا۔ وہ تو جیسا قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وہ تو ایک بوجھ اٹھائے ہوئے تھی' حمل کے معنی ہی بوجھ ہوتا ہے۔ اُس میں اس کا دخل نہیں تھا۔ اب بچے کی پیدائش کے بعد سامانِ نشو ونما تو خدا ہی کی طرف سے مل رہا ہے لیکن اُس میں اب ماں کا دخل ہو گیا ہے کہ وہ جس طرح چاہے اُس سامانِ نشو ونما کو اس بچے کی پرورش کے لیے صرف میں لائے۔ اب اس میں انسان یعنی ماں اور خدا دونوں شریک ہو گئے۔ ماں کے اندر ایک جذبہ جو بچے کی پرورش کا ہے وہ ایک عجیب وغریب چیز ہے۔ یہ حیوان اور انسان میں مشترک ہے۔ حیوانی بچے کی ماں بھی اُسی طرح سے بچے کو دودھ دیتی ہے اور اُس کی پرورش کرتی ہے۔

پرورش کے سلسلہ میں انسانی بچے اور حیوانی بچے میں بنیادی فرق ہے

انسانی بچے کی ماں کو بچے کی پرورش کے لیے اُس سے زیادہ تر دد اور مشقتیں اٹھانا پڑتی ہے اور پھر اس کے لیے اتنا لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ حیوانوں کے تو بچے اتنے میں خود بچے پیدا کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں جتنے میں یہ میاں صاحب گھٹنے چلنے کے بھی قابل نہیں ہوتے۔ دو اڑھائی سال تک کے لیے انسانی بچہ ماں کے دودھ پہ رہتا ہے۔ حیوانوں میں سے کوئی حیوان بھی ایسا نہیں ہے جس کا بچہ اتنے لمبے عرصے تک اس طرح سے اس نشو ونما کے اوپر رہے۔ اور پھر ماں کی محبت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اُس کا تو جی چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو بچے کے اندر انڈھیل دے' اُس کو فکر ہی اُس بچے کی ہوتی ہے۔ ذرا دودھ میں کمی ہوئی تو ماری ماری پھرتی ہے کہ میرے دودھ میں کمی کیوں ہو گئی' بچہ بھوکا رہ جائے گا۔ اپنے دودھ کی افزائش کے لیے کہیں غذاؤں کا انتظام ہے' کہیں دواؤں کا انتظام ہے۔ بچہ اگر کسی وقت دودھ نہیں پیتا ہے تو یہ نہیں کہتی کہ چلو اچھا ہوا میرا آج کا دودھ تو بچ گیا بلکہ اُس کے لیے پھر وہ ماری ماری پھرتی ہے کہ بچہ کیوں دودھ نہیں پی رہا۔ وہ ڈاکٹروں کے پاس جاتی ہے اس کا علاج کراتی ہے۔ کیفیت یہ ہوتی ہے کہ سردیوں کی ٹھنڈی رات میں وہ بچہ ساتھ سلایا ہوا ہوتا ہے' وہ رات کو پیشاب کر دیتا ہے تو وہ جگہ ٹھنڈی ہو جاتی ہے' ماں خود اُدھر سو جاتی ہے اور بچے کو خشک جگہ پہ سلاتی ہے' اگر وہاں بستر پہ جگہ نہیں رہتی تو وہ اپنے پیٹ پہ اُس کو سلاتی ہے۔ یعنی اُس کی زندگی کا' اُس کی کوششوں کا' اُس کی امیدوں کا سارا محور ہی یہ بچہ ہو جاتا ہے۔

ماں کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنے دامن کے حسین وجمیل خوابوں کے تصور میں گزرتا چلا جاتا ہے

پہلے ہی دن سے اُس کے ذہن میں یہ ہے کہ چاند بچہ ہے' سہرے لگیں گے' یہ کچھ ہوگا۔ اُس کی اتنی لمبی تمنائیں اس بچے کے ساتھ

مرکوز ہوتی ہیں۔ وہ جب ابا اماں کہنے لگتا ہے تو پوچھو نہیں کہ کس طرح نذر نیاز بانٹتی ہے' خوشی میں لڈو تقسیم کرتی ہے کہ بچے نے بولنا سیکھا ہے۔ اور اگر وہ دو قدم چلنا سیکھتا ہے تو پوچھو نہیں کہ ماں کا دل کتنا بلیوں اچھلتا ہے' ایک ایک کو کہتی ہے کہ اب تو منّے نے چلنا بھی سیکھ لیا ہے' کھڑا ہونے بھی لگ گیا ہے۔ یعنی آپ دیکھیے کہ یہ کیا جذبہ ہے جو یہ پیدا ہو گیا ہے۔ اُس کے بعد یہ جو سالگرہ' منانے کی چیز ہے تو یہ ماں کے اسی سفر کے جذبے کے ابھار کی ایک شکل ہے۔ کہتی ہے کہ ماشاء اللہ بچہ ایک سال کا ہو گیا ہے' اب اس کی دوسری سالگرہ ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ساری توجہات کا مرکز یہ بچہ ہو جاتا ہے۔ یہ جذبہ اُسی خالق نے پیدا کیا ہوا ہے' اس میں سامانِ نشو ونما یعنی جو دودھ ہے وہ بھی اُسی کا ہے لیکن اُس کے بعد اس کی تقسیم کا جو انتظام ہے' اس کا جو استعمال ہے اُس میں اب انسان ساتھ آ گیا۔

خدائے رحیم کی رحمانیت میں طبقاتی تقسیم کوئی وجود نہیں رکھتی

عزیزانِ من! اب یہیں سے ایک نقطے کی طرف آ جایئے کہ اُس نے جو سامانِ نشو ونما دیا ہے تو محل یا کوٹھی کے اندر رہنے والی بیگم صاحبہ کے رحم کے اندر بچہ ہو یا اُس کے سرونٹ کوارٹر یا جھونپڑی کے اندر مزدور کی بیوی کا بچہ ہو' خدا کی رحیمیت دونوں جگہ یکساں کام کر رہی ہوتی ہے۔ وہاں امیر اور غریب کے بچے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ جب بچہ دنیا میں آتا ہے تو جس قسم کا دودھ جس انداز سے اس بیگم صاحبہ کی چھاتیوں سے آتا ہے اُسی قسم کا اُس مزدور کی بیوی کی چھاتیوں سے آتا ہے' اُس کی رحیمیت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اب اس میں اگر کسی جگہ کوتاہی ہوتی ہے تو میں نے کہا ہے کہ انسان بیچ میں آ جاتا ہے۔ لیکن وہ جو اس بچے کی پرورش کے لیے دودھ دے رہا ہے وہ دونوں میں یکساں ہوتا ہے۔ اُسی طرح سے دونوں میں عرصہ گزرنے کے ساتھ وہ دودھ گاڑھا ہوتا چلا جاتا ہے' جوں جوں بچے کے معدے میں ہضم کی قوت بڑھتی چلی جاتی ہے وہ دودھ پتلے سے گاڑھا ہوتا چلا جاتا ہے کہ غذائیت زیادہ ہو اور ''مائیت [1]'' اُس کے اندر کم ہو۔ یہ اُس مزدور کی بیوی اور رئیس صاحب کی بیوی کے اندر' دونوں میں' یکساں طور پہ یہ نظام کارفرما رہتا ہے کیونکہ یہ اُس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔

انسانیت کی برادری کو سامانِ نشو ونما کے بل بوتے پر تقسیم کرنا عظیم شرک ہے

جونہی وہ پرورش کا پہلا نظام ختم ہوتا ہے اور بچے کی پرورش یا اُس کی نشو ونما انسانوں کے ہاتھوں سے ہوتی ہے تو اب محل کے بچے میں اور اس کوارٹر کے بچے میں فرق پیدا ہو جاتا ہے حالانکہ وہ جو سامانِ نشو ونما دیا ہوا ہے' وہ اُسی کا دیا ہوا ہے لیکن اب وہ انسانوں کے ہاتھ میں ہے اس سے تفریق شروع ہو جاتی ہے اور یہ تفریق شرک ہے۔ یہیں سے سارے مسائل شروع ہوتے ہیں۔ بچے کے دودھ پینے تک

---

[1] یعنی پانی (یہ ماء سے ہے)

نہ اُس مزدور کی بیوی کے بچے میں اور نہ اُس بیگم صاحبہ کے بچے میں کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔ جو ملتا ہے‘ جس انداز سے ملتا ہے‘ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ جب تک رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اُس وقت تک تو ان دونوں میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ اور جونہی زندگی کا اگلا قدم اٹھتا ہے اور انسانوں کے ہاتھوں میں رزق کی تقسیم آتی ہے تو مزدور کی بیوی اور شہزادے کے بیٹے میں فرق شروع ہو گیا اور ساری عمر اس کے اندر فرق رہے گا۔ خدا نے تو کوئی فرق نہیں کیا تھا‘ رحمِ مادر میں کوئی فرق نہیں کیا تھا‘ جو دودھ اُس نے دونوں بچوں میں سپلائی کیا تھا اُس میں کوئی فرق نہیں کیا تھا۔ لیکن جب بھی وہ بچہ کچھ کھانے کے قابل ہو جاتا ہے تو اب یہ جو اس کے منہ میں لقمہ جاتا ہے اور اُس کے منہ میں لقمہ جاتا ہے تو یہاں آ کر طبقاتی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں سے شرک ہو جاتا ہے کیونکہ انسان نے اُس کے اندر دخل دینا شروع کر دیا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اس ماں کا جی چاہتا ہے کہ وہ اپنا خون‘ اپنی روح‘ اپنی جان سب کچھ انڈیل کر بچے کے اندر ڈال دے۔

انسانی دنیا میں انسان کے اختیار و ارادے پر پہلی پابندی

میں نے جو ابھی ابھی کہا ہے کہ وہ دو قدم چلنے لگتا ہے تو اس کو اتنی خوشی ہوتی ہے کہ بچہ اپنے پاؤں پر چلنے لگ گیا ہے لیکن جب یہی بچہ بڑا ہو کر خود اپنے پاؤں پہ چلنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ میں اپنے پاؤں پر چلوں تو پھر یہ ماں اور باپ اُسے اپنے پاؤں پر چلنے نہیں دیتے‘ پھر وہ چاہتے ہیں کہ تمہیں ہماری مرضی کے مطابق چلنا پڑے گا۔ اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ جو خدا کی طرف سے رزق ملتا ہے وہ رزق دیئے چلے جاتا ہے۔ یاد رکھیے کہ تقسیمِ رزق کی وجہ سے سارے طبقات پیدا ہوئے ہیں۔ خدا نے تو سامانِ رزق سب کے لیے اسی طرح سے دیا ہوا ہے۔ اب پھر اُس نقطے پر آیئے کہ جب یہ اپنے پاؤں پہ چلنے کے قابل ہوتا ہے اور چلنا چاہتا ہے تو پھر ماں باپ اسے اپنے پاؤں پہ نہیں چلنے دیتے۔ لیکن خدا جو رزق دیئے چلا جا رہا ہے تو وہ اس کے بڑا ہونے پر بھی اس کے اختیار و ارادے کو سلب نہیں کرتا‘ وہ کہتا ہے کہ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18) ۔ ہمارا کام یہ تھا کہ ہم نے تمہیں رزق بھی دیدیا‘ ہم نے تمہیں راستہ بھی دکھا دیا‘ اب تمہارا جی چاہے اِدھر جاؤ یا تمہارا جی چاہے اُدھر جاؤ‘ ہم دخل نہیں دیں گے۔ اب ماں باپ اور خدا کا فرق شروع ہو گیا۔

قرآنی تعلیم کی بنا پر ماں باپ کی اطاعت کا تصور باطل ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے یہ ایسے ہی نہیں کہا کہ والدین کے ساتھ احسان کرو۔ یہ بات تو دین کے نظام میں داخل ہے۔ یہ کیا بات تھی کہ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ (31:14) ایک آیت پہلے اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ (31:12) کہا ہے‘ وہاں صرف خدا کے متعلق کہا ہے کہ اس کا شکر کرو اور یہاں والدین کے متعلق کہا ہے کہ ان کا بھی شکر کرو۔ کہا یہ ہے کہ ان کی اطاعت تم پہ فرض نہیں ہے۔ اور یہ بات

آپ کو یاد ہوگا کہ کئی درسوں میں آ چکی ہوئی ہے۔ جتنے بھی دنیاوی مذاہب ہیں ان کی کتابیں بھی دیکھیں، اخلاقیات کی کتابیں بھی دیکھیں، ہر جگہ یہی ہے کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے اور آپ کے ہاں تو یہ مسلمہ ہے۔ قرآنِ کریم نے کہیں یہ نہیں کہا کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے یا ان کی اطاعت کرو۔ قرآن میں ہے کہ بِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا [1] (4:36) اور ہر جگہ یہی ہے۔ بلکہ یہاں تو کہا کہ اگر یہ کہیں کہ خدا کے ساتھ شریک [2] بھی کرو تو فَلَا تُطِعْهُمَا [3] (31:15)۔ انہیں اس سے سختی سے روک دیا گیا ہے۔ جسے ہم کہتے ہیں کہ اطاعت فرض ہے تو یہاں روکا گیا ہے کہ تم نے بالکل بھی اطاعت نہیں کرنی ہے۔ کہا کہ وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا (31:15) اور قائدۂ معروف کے مطابق دنیا کے اندر ان کا ساتھ دو، ان کے ساتھ احسان کرو، شفاقت کرو۔ ان کی اطاعت نہیں کرو۔ وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ (31:15)۔ اطاعت کا تو کہا ہے کہ قطعاً نہیں کرنی ہے اور جو ہمارے راستے پہ چل رہا ہے اُس کے پیچھے پیچھے چلو۔ یہ بات پہلے بھی آ چکی ہے لیکن چونکہ یہاں یہ آیتیں آئی ہیں اس لیے ان کا دہرانا ضروری ہے۔ میں نے کہا ہے کہ دنیا کے ہر مذہب میں، کسی سے سنیے یا اخلاقیات والے ہیں ان سے سنیے تو یہی کہیں گے کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔

ماں باپ کی اطاعت کے سلسلہ میں رام چندر کی کہانی

ہندو دھرم کے اندر تو آپ کو معلوم ہے کہ جوان کے رام چندر جی ہیں، وہ ولی عہد تھے۔ ان کے ہاں رام کو ایشور یعنی خدا کا اوتار مانتے ہیں اور اُس کی پرستش ہوتی ہے۔ رام نے کیا کارِ نمایاں سرانجام دیا تھا جس کی وجہ سے اُس کو خدا مانتے ہیں؟ یہ کہ رام کا باپ بوڑھا ہوا تو اُس نے ایک جوان بیوی سے شادی کر لی۔ اُس نے اس بوڑھے سے قول لے لیا کہ تمہارے بعد میرا بیٹا ولی عہد ہوگا حالانکہ وہ رام بڑا تھا اور وہ ولی عہد مقرر ہو چکا تھا۔ رام کو بلایا اور کہنے لگے کہ بیٹے! اس کو میری بڑھاپے کی مت ماری ہوئی کہو یا کوئی اور چیز کہو کہ میں یہ قول دے چکا ہوں کہ جو ولی عہدی ہے تمہارے پاس نہیں بلکہ چھوٹے بیٹے کے پاس ہوگی۔ وہاں لکھا ہے کہ یہ اتنا غلط فیصلہ تھا کہ باپ بھی رو رہا تھا اور بیٹا بھی رو رہا تھا لیکن بیٹے نے باپ سے کہا کہ پتا جی! آپ جب قول دے چکے ہیں تو قول نہ ہاریئے، میں آپ کی اطاعت کرونگا۔ بادشاہ کی بیوی نے یہ کہا تھا کہ یہی نہیں کہ ولی عہد نہ رہے بلکہ اس کو دیس نکالا دیدیا جائے۔ تو رام نے کہا کہ میں کل ہی چلا جاتا ہوں۔ اور

---

1. وہ اپنے ماں باپ سے حسنِ سلوک سے پیش آئے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1177)۔
2. **وان جاھدک علیٰ ان بشرک بی مالیس لک بہٖ علم** (31:15) لیکن ماں باپ سے حسنِ سلوک کی اس قدر تاکید کے ساتھ ہم نے انسان سے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر وہ تم پر زور دیں کہ تم شرک کے مرتکب ہو۔ ان کا ایسا کہنا جہالت پر مبنی ہے۔ کائنات میں کوئی ہستی ایسی نہیں جو خدا کی شریک ہو سکے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 948)۔
3. تو تم ان کی بات بھی نہ مانو (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 948)

یوں رام راج پاٹ چھوڑ چھاڑ کر جنگل میں چلے گئے۔ ان کے ہاں رام کا یہ جو عمل تھا کہ اُس نے باپ کے اس قول کے پالن میں اُس کی اطاعت کی اور جنگل میں چلا گیا' اتنا بڑا کام تھا کہ کہا: یہ انسان نہیں' یہ تو خدا ہے۔ یعنی دھرم میں یہ بات آئی اور عمل کی یہ کیفیت ہوئی۔ 1965ء کی جنگ ❶ میں کھیم کرن فتح ہوا' تو ہماری فوجوں نے یہ بتایا کہ ہم جو کھیم کرن گئے ہیں تو ہم نے وہاں دیکھا کہ سارے کھیم کرن کے اندر کوئی مرد نہیں تھا' کوئی جوان عورت نہیں تھی بلکہ جو بوڑھے ماں باپ تھے وہ سارے اندر پڑے ہوئے تھے اور ان کے نوجوان ان کو چھوڑ کر بھاگ گئے ہوئے تھے۔ ایک طرف اطاعت کی کیفیت یہ ہے اور عمل کی کیفیت یہ ہے۔ ہمارے ہاں کے مجاہدین نے ان کو وہاں سے اٹھایا تھا اور نہایت حفاظت سے ان کی پرورش کے طریقے پر وہاں سے ان کو ہمارے ملک کے اندر پہنچایا تھا کہ جہاں ان کی بڑی نگہداشت اور پرورش ہو رہی تھی ❶۔

والد کے سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ کا اسوۂ حسنہ

قرآن نے ہمارے سامنے اسوۂ ابراہیمیؑ پیش کیا ہے جس کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے کہ اُنہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان! آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ اپنے ہاتھ سے سارا دن بت بناتے رہتے ہیں' شام ہوتی ہے تو اُس کے سامنے سجدہ کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ ہے اسوۂ ابراہیمیؑ کہ باپ بھی غلط پہ چلتا ہے تو بیٹا اُس کو بھی ٹوکتا ہے۔ اس کے برعکس ان کے ہاں کا اسوہ یہ تھا کہ رام نے باپ کے قول کا پالن کیا اور دونوں مان رہے تھے کہ یہ غلط ہے۔ اِدھر وہ ابراہیمؑ ہیں جنہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ غلط کر رہے ہو۔ قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کی زندگی ہمارے لیے اسوہ قرار دی ہے۔ اُس کے ساتھ ہی ماں باپ کے متعلق کہا ہے کہ وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (4:36)۔ یہ صحیح مقام ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا اور میں کئی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ عربی قاعدے کی رو سے احسان کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ "کسی میں جو کمی پیدا ہو جائے تو اُس کمی کو دور کر دینا۔"

---

❶ اس تمام کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: (i) شہر کے لوگ' طلوع اسلام (11:18) نومبر 1965' ص ص 21 تا 24۔ (ii) پاکستان کی نئی زیارت گاہیں' طلوع اسلام (1:19) جنوری 1966ء ص ص۔ 57 تا 76۔ (iii) پاکستان کی نئی زیارت گاہیں (2)' طلوع اسلام (3:19)' مارچ 1966ء ص ص 61 تا 67 بقیہ ص۔ 80۔ (iv) شہدائے جنگِ ستمبر 1965ء طلوع اسلام (10:27)' اکتوبر 1974' ص ص۔ 25 تا 47' (V) شہدائے جنگِ ستمبر 1965ء کی یاد میں' طلوع اسلام (9:30)' ستمبر 1977' ص ص۔ 41 تا 56' (Vi) شہدائے جنگِ ستمبر 1974ء کی یاد میں: ان کارناموں کو افسانے نہ بننے دیجیے۔ طلوع اسلام (9:31)۔ ستمبر 1978ء ص ص۔ 21 تا 35۔

بڑھاپے میں قیدِ تنہائی کا احساس

قرآن نے یہ نہیں کہا کہ ماں باپ کی صرف روٹی کا انتظام ضرور کر دیا کرو۔ قرآن نے ہر جگہ یہی کہا ہے کہ وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (4:36) اپنے والدین سے حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ ان میں جو کمی رہ گئی ہے اسے دُور کرو۔ اب غور کی بات یہ ہے کہ یہ کیا کمی واقع ہوئی ہے؟ ایسے ماں باپ بھی ہیں اور بہت سے ہونگے جو زندگی کے آخری دم تک ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرتے ہیں یعنی ان کے پاس اتنی دولت' اتنا رزق موجود ہوتا ہے۔ پھر یہ احسان کیا ہے؟ یہ کمی پورا کرنا کیا ہے؟ ہمارے ذہن میں تو یہی ہے کہ بڑھاپے میں وہ اس قابل نہیں رہتے کہ کمائی کریں اس لیے ان کو روٹی دیا کرو۔ اور پھر جس طرح سے روٹی دیجاتی ہے وہ ہمیں معلوم ہے۔ قرآن نے روٹی دینے کی بات نہیں کہی۔ عزیزانِ من! قرآن کا تو ایک ایک نکتہ غور طلب ہے۔ کمی یہ ہوتی ہے کہ بڑھاپے میں تنہائی ہو جاتی ہے اور تنہائی دنیا میں سب سے زیادہ سنگین سزا ہے۔ اُس کے اپنے وقتوں کے دوست' رفیق جن کے ساتھ وہ باتیں کر سکتا تھا' وہ ایک ایک کر کے اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ جو اگلی جنریشن (نسل) آتی ہے اُس میں اور ان میں جذباتی Gap (خلا) ہوتا ہے اس لیے یہ اُس کے رفیق بن نہیں سکتے۔ خود جو بیٹے ہیں وہ بڑے ہو چکے ہوتے ہیں ان میں اور اُن میں جذباتی فرق ہوتا ہے۔ یہ جو چیز ہے یہ سب سے بڑی کمی ہے۔ پھر قرآنِ کریم کہتا ہے کہ عمر کے تقاضے سے ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کی عقل بھی اوندھی ہو جاتی ہے' یہ کچھ چڑ چڑے بھی ہو جاتے ہیں' ناقص العقل ہو جاتے ہیں' بھولنے لگ جاتے ہیں' حافظہ کمزور ہو جاتا ہے۔ یہ ساری ان کے اندر کمی ہوتی گئی۔ اب یہ جو کچھ ماں باپ کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ ڈانٹ رہا ہے' جھڑک رہا ہے' ابا جی! ابھی آپ سے یہ کہا تھا اور آپ یوں کر رہے ہیں' دن رات اُس ابا جی کو روٹی تو دی جاتی ہے لیکن اُس کے ساتھ یہ کچھ ہو رہا ہے۔ یہ تو ابھی وہاں ہو رہا ہے جہاں جوائنٹ فیملی ہے جس کے اندر یہ ابا جی یا اماں جی رہ رہی ہیں ورنہ ایسی صورتیں بھی تو ہمارے معاشرے میں ہیں کہ تلسی داس (1550-1624) نے کہا ہے:

دھیاں جوائی لے گئے اور بہوئیں لے گئیں پُوت
تلسی داس نِرول جی تم رہ گئے اُوت کے اُوت

تو ماں باپ کا اس عمر میں آ کر جو ''اُوت کا اُوت رہ جانا ہے'' یہ ہے اصل میں جو ان کی کمی ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (4:36) ان کی اس کمی کو پورا کرو۔ یہ (اہلِ مغرب) بڑا احسان جتا رہے ہیں کہ انہوں نے اپنے ہاں ویلفیئر اسٹیٹ قائم کی ہے' اولڈ ایج بینیفٹ قائم کیے' اولڈ ایج ہاؤسز بھی مقرر کیے۔ جو لوگ ولائت' خاص طور پہ لندن وغیرہ میں' گئے ہیں وہ آ کر بتاتے ہیں کہ ان بوڑھوں بیچاروں کا وہاں کیا حشر ہوتا ہے۔ لڑکھڑاتے ہوئے' چلتے ہوئے' تنہا اکیلے کہیں ہائیڈ پارک (Hyde

Hark) کی ایک بنچ میں ایک بیٹھا ہے' اور کہیں دوسری پہ دوسرا بیٹھا ہے۔ یعنی کل ہی جن کا یہ سارا ذہن ساری دنیا کے اندر شریک تھا آج وہ اس حالت میں ہیں:

عالم کی فضا پوچھو محرومِ تمنا سے
بیٹھا ہوا دنیا میں اٹھ جائے جو دنیا سے

یہ اگر دنیا سے اٹھ جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔

قرآن حکیم کے نزدیک فیملی سسٹم ایک نعمت سے کم نہیں

وہ کہتے ہیں کہ وہ جو ہائیڈ پارک (Hyde Hark) میں بنچ پہ بیٹھا ہوتا ہے اُس کو روٹی مل رہی ہے' کپڑا مل رہا ہے۔ جس کو یہ سامانِ پرورش کہہ رہے ہیں یہی تو اُس کی کمی نہیں ہے۔ کمی تو یہ ہے کہ ہر بوڑھا وہاں روتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ جسے آپ فیملی سسٹم کہتے ہیں' جسے آپ گھر کہتے ہیں' یہ بہت بڑی چیز ہے۔ انسان تمدنی حیوان (Social Animal) واقع ہوا ہے۔ جبھی میں نے عرض کیا ہے کہ اس کی سنگین ترین سزا تنہائی ہے' یہ اس کی افتادِ تخلیق کے خلاف ہے' یہ انسانوں کے اندر ہی رہ سکتا ہے۔ جتنا جی چاہے کھانے پہننے کو دیجیے لیکن اگر تنہائی دیجیے تو آپ دیکھیے کہ انسان کے اوپر قیامت برپا ہوجاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے انسان کی وہ زندگی رکھی ہے جو کہ انسان کی تمدنی زندگی کے اندر کا تقاضا ہے۔ اسے آپ فیملی سسٹم کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی یہ چیز ابھی کل تک محفوظ تھی۔

یورپ میں سوائے انکل کے نہ چچا ہوتا ہے نہ ماموں' پھوپھا نہ خالو

یورپ نے جہاں اور بڑی ترقیاں کیں اُنہوں نے عائلی زندگی یا فیملی لائف کا تصور ہی ختم کر دیا۔ وہ جو انہوں نے عائلی زندگی کا نقشہ ختم کیا ہے تو ان کی زبان کے اوپر دیکھو کہ اس چیز کا کتنا اثر ہوا ہے۔ ہمارے ہاں چچا اور ہوتا ہے' ماموں اور ہوتا ہے' پھوپھا اور ہوتا ہے' خالو اور ہوتا ہے۔ ان کے اپنے اپنے مقام ہوتے ہیں لیکن وہاں انگریزی زبان میں صرف انکل (Uncle) ہوتا ہے' اگر نکھیڑ کرتے ہیں تو Maternal-Uncle کہہ دیتے ہیں لیکن پھر بھی بات سمجھ میں نہیں آتی یعنی ان کے ہاں رشتوں کے لیے زبان میں لفظ ہی نہیں رہے۔ فیملی لائف کو اجاڑنے سے یہ اثر ہوتا ہے۔ Father- in- Law تک تو بات چلتی ہے لیکن جب Brother- in -Law ہوتا ہے تو پھر تو جیسے ہمارے Law میں کنفوژن ہے اسی طرح ان کے ہاں Brother -in- Law کا پتہ نہیں چلتا کہ سالا ہے یا بہنوئی ہے یعنی ان کے ہاں کیونکہ بولی میں کچھ فرق ہی نہیں ہے وہ صرف In law والی بات ہے۔ اس لیے ادھر کا Brother -in -Law ہوا تو کیا' اُدھر کا Brother in Law ہوا تو کیا' ورنہ فیملی لائف کے اندر تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ سالا اور بہنوئی کیا چیز ہوتی

ہے۔اسی طرح سے پھوپھی اور خالہ اور چچی اور ممانی وغیرہ سب کی سب آنٹی ہوتی ہیں۔یعنی وہ جو فیملی کے اندر رشتوں کے الگ الگ تعلقات تھے اور یہ بڑا فرق تھا' آج شاید اگلی جنریشن (نسل) سمجھ نہ سکے کہ ماموں میں اور چچا میں فرق کیا ہوتا ہے۔اُنہوں نے اپنے ہاں فیملی کا جو تصور تھا اُس کا نقشہ ہی بدل دیا۔

Homes (گھروں) کے بجائے Houses (مکانات) ہیں

وہاں یورپ کے اندر آپ کو Houses (مکانات) ملیں گے Homes (گھروں) نہیں ملیں گے۔ہوم اور ہاؤس میں بڑا فرق ہوتا ہے:

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

انسان ہو اور اس کی یہ زندگی ہو تو اس کا جو اندرونی تقاضا ہے یہ زندگی اُس کے خلاف ہے کہ ''کٹی عمر ہوٹلوں میں' مرے ہسپتال جا کر''۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں والدین اور اولاد کے لیے حدود کا تعین

قرآنِ کریم نے یہ جو زور دیا ہے کہ وَّ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا (4:36) والدین کی کمی کو پورا کرو تو قرآن ہر جگہ یہ زور دیتا چلا جا رہا ہے۔اور اطاعت سے منع فرما دیا۔قرآن نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔جب تک تو بچہ ماں باپ کی نگرانی کا' ان کی پرورش کا محتاج ہے' اپنے فیصلے آپ نہیں کر سکتا اُس وقت تک ٹھیک ہے ان کی ہدایت کے مطابق اُس کو چلنا چاہیے لیکن جب وہ اس عمر میں پہنچ جائے کہ وہ خود صاحبِ اختیار و ارادہ ہو گیا ہے تو اُسے اپنے فیصلے آپ کرنے ہوں گے۔جب وہ صاحبِ اختیار و ارادہ ہوتا ہے تو خدا کہتا ہے کہ میں بھی اس کے ارادے میں دخل نہیں دیتا۔خدا کہتا ہے کہ فَمَنۡ شَآءَ فَلۡیُؤۡمِنۡ وَّ مَنۡ شَآءَ فَلۡیَکۡفُرۡ (18:29) ہم دخل نہیں دیتے اور پھر یہ جو دخل کی بات بھی ہے تو زمانہ بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہوتا ہے' آج سے پچاس سال پہلے کے دور کا انسان ہے' عمر کے اعتبار سے خواہ وہ کتنا ہی آگے کیوں نہ چلا گیا ہو لیکن زمانے کے اعتبار سے وہ بہت پیچھے رہ جاتا ہے [1]۔Age (عمر) اس نئی نسل کی ہوتی ہے' البتہ ان کو ہدایت کی ضرورت ہوتی ہے' صحیح راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے' صحیح راستہ دکھانے کی ضرورت ہے' ان کی صحیح تعلیم کی ضرورت ہے' ان کی صحیح تربیت کی ضرورت ہے۔یہ سارا کچھ دینے کے بعد جیسا قرآن کہتا ہے کہ اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ (2:147) یعنی یہ بات تو ان تک پہنچایئے کہ غلط اور صحیح راستے کون سے ہیں' ان کی تعلیم و تربیت کیجیے لیکن انہیں اپنے فیصلے آپ کرنے ہوں گے۔اسی لیے قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ فَلَا تُطِعۡهُمَا (31:15) اطاعت والی بات مت کرو۔وَ صَاحِبۡهُمَا فِی الدُّنۡیَا مَعۡرُوۡفًا (31:15)

---

[1] عمر (Age) اور زندگی (Life) میں بڑا فرق ہے۔اسے ہم اپنے سامنے نہیں رکھتے' زندگی عمر بھر نہیں ہوتی۔

بس ان سے دنیاوی معاملات میں نیک برتاؤ کرتے رہو' ان کے ساتھ رفاقت ہے' قاعدے قانون کے مطابق رہو اور اُس کے لیے کہ انداز کیا ہونا چاہیے دوسری جگہ کہا ہے۔قرآن ہر جگہ بات تو یہیں سے شروع کرتا ہے کہ اطاعت اور محکومیت تو صرف خدا کی ہے۔کہا کہ وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ (17:23) حکم یہ ہے کہ محکومیت واطاعت اختیار کرنی ہے تو وہ صرف خدا کے قوانین کی اختیار کرنی ہے۔خدا کے بعد جنہوں نے پرورش کیا تھا وہ ماں باپ تھے جن کے شکریئے کے متعلق ابھی کہا گیا ہے کہ ان کا شکریہ ادا کرو[1]۔کہا کہ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (17:23) ان کی کمی کو پورا کرو' ان کا حسن برقرار رکھو' ان کا توازن برقرار رکھو۔

دیکھیے! قرآن بڑے بڑے اہم معاملوں کے متعلق اصولی حکم دیئے جاتا ہے' زیادہ جزئیات میں نہیں جاتا۔یہ ایسا مسئلہ تھا کہ جس میں وہ جزئیات تک جارہا ہے کہ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (17:23) اگر تمہاری زندگی میں دونوں یا ان میں سے کوئی ایک بڑھاپے تک پہنچ جائے تو ان کو جھڑکا نہ کرو' سختی سے بات نہ کیا کرو' ایسی کوئی حرکت نہ ہو کہ جس سے ان کے عزتِ نفس میں فرق آئے۔گھر کے اندر وہ جگہ جہاں آپ کوڑا کرکٹ پھینکتے ہیں اُس کو نھر کہتے ہیں۔قرآن کہتا ہے کہ ان کو کوڑا کرکٹ پھینکنے کا مقام نہ دینا وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْۤ اٰدَمَ (17:70) ہم نے ہر انسان کو واجب التکریم پیدا کیا ہے' خواہ یہ بوڑھا ہی کیوں نہ ہو گیا ہو لیکن ہے تو انسان۔اگلی چیز یہ ہے کہ تم پر ان کے دو فرض ہیں کیونکہ انہوں نے تمہاری پرورش بھی کی ہوئی ہے۔کریماً کا لفظ بتا رہا ہے کہ اُس نے تکریم کے اوپر زور دیا ہے کہ اس کے خلاف کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جس سے اس کی تکریمِ انسانیت میں فرق آئے۔یہ ہے جس کا قرآن بار بار حکم دے رہا ہے کہ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (17:23) اور یہ انسان کے لیے ہی تھا۔حیوان کا تو رشتہ ہی اُس وقت ختم ہو جاتا ہے جس وقت وہ بچہ دودھ سے الگ ہو جاتا ہے اور اُس کا ماں سے الگ پرورش کا ذریعہ شروع ہو جاتا ہے تو وہ نہ ماں کو پہچانتا ہے نہ باپ کو پہچانتا ہے۔یہاں انسان کے معاملے میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن ان چیزوں کی کتنی تاکید کیے چلا جا رہا ہے۔دوسرے مقام پہ ہے کہ عمر کے تقاضے سے ان کی بعض چیزوں میں ضعف آجاتا ہے' کمزوری آجاتی ہے لیکن تمہارا تو توازن برقرار ہے' تم اپنا توازن کیوں کھو رہے ہو لہٰذا ان کے ساتھ کرختگی سے مت پیش آؤ' جھڑکو نہیں۔اگلی بات یہ ہے کہ کوئی بات ایسی نہ کرو جس سے اس کی تکریمِ انسانیت میں فرق آجائے۔او بابا! انہوں نے تمہاری پرورش اس طرح سے کی تھی جیسے ہم نے ربیمیت کے مطابق کی تھی۔کہا کہ وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (17:24) یہ پرورش دیکھتے ہو کہ مرغی کس طرح سے اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہے' وہ خطرے سے ہی بچانے کے لیے بلکہ سردی سے بچانے کے لیے بھی اپنے پروں کے نیچے لے لیتی ہے۔یہ پروں کے نیچے لینے والی جو بات ہے اس کے لیے یہ خفض کا لفظ ہے کہ وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ (17:24) تو ان کے سامنے

---

[1] ان شکرلی ولوالدیک (31:14) اسے خدا کا اور اپنے ماں باپ کا سپاس گزار ہونا چاہیے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔948)

جھک جھک کر اُن کو اپنے پروں کے نیچے لے لو کیونکہ یہ اب اس قابل ہو گئے ہیں وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا (17:24) جب تم چھوٹے چھوٹے چوزے تھے تو انہوں نے تمہیں اپنے پروں کے نیچے لیا تھا' اب یہ بھی چھوٹے چھوٹے چوزے سے ہی ہو گئے ہیں' اب تم ان کو اسی طرح اپنے پروں کے نیچے لے لو كَمَا رَبَّيٰنِيْ (17:24) جس طرح سے انہوں نے پرورش کی تھی' تم بھی اس طرح سے ان کی پرورش کرو۔

اطاعت اور اتباع میں ایک بنیادی فرق ہے

عزیزانِ من! میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ قرآن نے کہا ہے کہ فَلَا تُطِعْهُمَا..... وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ (31:15) اطاعت کسی کی نہیں کرنا۔ اطاعت تو کسی کے حکم کو ماننا ہے' اتباع کسی کے نقشِ قدم پہ چلنا ہے۔ پیچھے پیچھے چلنے کے لیے تو تاکید یہ ہے کہ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ (31:15) جو میری طرف آ رہا ہے اُس کے پیچھے پیچھے چلو۔ لیکن اطاعت ہو یا اتباع ہو' ان دونوں کے اندر قرآن کا ایک بڑا بنیادی نکتہ مخفی ہے۔ اطاعت کو ہمارے ہاں Obedience (فرمانبرداری) کہتے ہیں' Obey (حکم تسلیم) کرنے کے اندر تو اختیار و ارادہ ہوتا ہی نہیں ہے لیکن عربی زبان کے اندر اطاعت اُس Obedience (فرمانبرداری) کو کہتے ہیں جو اپنی رضا مندی سے کی جائے۔ جبر سے یا رضا مندی کے بغیر جو حکم ماننا ہے اُس کے لیے لفظ اطاعت آتا ہی نہیں ہے۔ جو کھجور پک کر از خود گر جائے عرب اُسے اطاع النحل [1] کہتے ہیں' جسے جھانپل سے مار کر جھاڑا جائے اُس کے لیے عرب اطاع النحل کا لفظ استعمال نہیں کرتے۔ جو Obedience (فرمانپذیری) اس طرح سے کی جائے وہ اطاعت میں آتی ہی نہیں ہے۔ خدا کے لیے بھی اطاعت کا لفظ ہے کہ یہ برضا و رغبت کرنا ہے۔ ساری بنیادی بات ہی یہ ہے' انسان کی تکریم ہی یہ ہے کہ اس کے اختیار و ارادے کو سلب نہ کیا جائے' وہ اپنے اختیار و ارادے سے یہ کچھ کرے۔ اور اسی طرح سے یہ جو اتباع ہے یہ بھی بالجبر والی بات نہیں ہے کہ رسہ باندھ کر اُس کو پیچھے پیچھے گھسیٹا جائے۔ گائے کا جو نوزائیدہ بچہ ہے' آپ نے دیکھا ہو گا کہ آگے آگے ماں جاتی ہے اور بچہ اُس کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا ہوتا ہے تو یہ برضا و رغبت جا رہا ہوتا ہے۔ اُس ماں کے اندر اس کے لیے اتنی کشش ہوتی ہے خواہ وہ ضرورت کی کشش ہی کیوں نہ ہو تو اُس کے لیے یہ بچہ باندھ کر اُس کے پیچھے نہیں چلایا جاتا بلکہ اُس کشش کی بنا پر اُس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہوتا ہے۔ گائے کے بچے کا اس طرح سے جو پیچھے چلنا ہے' صرف اس کے لیے اتباع کا لفظ آتا [2] ہے۔ وہ جو خدا کے راستے کے اوپر آگے جا رہا ہے اُس کی چال اور انداز اتنا دلکش ہونا چاہیے کہ وہ یوں اُس کے پیچھے چلے جس طرح گائے کے پیچھے اُس کا بچہ جا رہا ہے۔ اطاعت تو کسی اور کی کرنی نہیں ہے لیکن اتباع بھی کرنا ہے تو اُس کا کرنا ہے جو میری طرف آ رہا ہو اور پھر

---

[1] اطاع النحل کے معنی ہوتے ہیں کھجوریں پک گئیں (تاج العروس)۔ اب انہیں زور لگا کر توڑنا نہیں پڑے گا۔ وہ ٹوٹنے کے لیے خود ہی آمادہ ہیں (پرویزؒ: لغات القرآن جلد سوم' ادارہ طلوع اسلام لاہور' (196' ص۔ 1095)

[2] عرب اسے بقرۃ متبع کہتے ہیں یعنی اس گائے کو کہتے ہیں جس کا بچہ اس کے پیچھے پیچھے رہتا ہو اور اس کے پیچھے چلنے والے بچے بچھڑے کو تبیع کہتے ہیں (تاج العروس)۔ حوالہ پرویزؒ: لغات القرآن جلد اول' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1960' ص۔ 372)۔

اس انداز سے کرنا ہے جو میں نے ابھی عرض کیا ہے جیسے گائے کا بچہ اُس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ یہ قرآن کے الفاظ کا اعجاز ہے۔ ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک بھی ہے، یہ بھی کہا ہے کہ انہیں جھڑکو بھی نہیں، ڈانٹو بھی نہیں، ان کی تکریمِ انسانیت کے اوپر کوئی حرف نہ آنے پائے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک عدل کا مقام، شہادت کی اہمیت اور اس کی نوعیت

عزیزانِ من! جہاں عدل اور انصاف کا معاملہ آ جائے تو وہاں نہ ماں، نہ باپ، نہ بھائی، نہ بہن۔ یہاں قرآن نے عدل کا ایسا اصول دیا ہے کہ اس سے بلند اصول تصور میں نہیں آ سکتا۔ **Law of Witness** (قانونِ شہادت) کے اندر تو ایک طرف رہا کہ ایسی **Provision** (گنجائش) ہو انسان کے ذہن میں یہ بات نہیں آ سکتی تھی۔ عدل کا دارو مدار شہادت کے اوپر ہوتا ہے۔ یہاں تک تو یہ کیفیت ہے کہ اُس جج نے یا مجسٹریٹ نے ایک واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اور اُس کے سامنے وہ مقدمہ پیش ہو رہا ہو اور گواہی اُس کے خلاف جا رہی ہے۔ جج کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ یہ واقعہ یوں ہے۔ اُس کو یہ فیصلہ لکھنا ہوگا کہ شہادات یہ کہتی ہیں، اس لیے میں یہ فیصلہ دے رہا ہوں۔ یہ شہادت بڑی چیز ہے۔ لیکن قرآن نے شہادت دینے والے کے متعلق کیا قانون مقرر کیا ہے یا کیا خصوصیت مقرر کی ہے، یہاں سے سارا نظامِ عدل بدل جائے گا۔ کہا کہ **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ** (4:135) اے شہادت دینے والو! عدل کا جھنڈا تم نے گاڑنا ہے۔ شہادت دینے کے لیے جاؤ، نہ مدعی کی طرف سے، نہ مدعا علیہ کی طرف سے، نہ ملزم کی طرف سے، نہ مستغیث کی طرف سے۔ کسی کی طرف سے نہیں جاؤ بلکہ **شُهَدَآءَ لِلّٰهِ** (4:135) صرف خدا کے حکم کی تعمیل کے لیے وہاں جاؤ۔ یہاں پہلے ہی دن یہ دو طبقے بن جاتے ہیں: (1) **Prosecution Witness** (شاہدِ استغاثہ)، اور (2) **Defence Witness** (شاہدِ صفائی)۔ قرآن تو دو پارٹیاں بناتا ہی نہیں ہے۔ کہا کہ **شُهَدَآءَ لِلّٰهِ** (4:135)۔ جا کر خدا کی طرف سے شہادت دو اور جو تمہاری شہادت ہے وہ تو کسی نہ کسی کے خلاف تو جائے گی تو کہا کہ **وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ** (4:135) تمہاری اپنی ذات کے خلاف بھی شہادت جائے تب بھی سچی شہادت دو۔ اپنے خلاف بھی سچی شہادت دو۔

عزیزانِ من! عدل کے معیار **(Standard)** کہیں اور سے لا کر تو دکھایئے۔ پھر ذہن میں لایئے کہ جسے ہم کہتے ہیں کہ نظامِ خداوندی اور نظامِ مصطفیٰ ﷺ ہوتا کیا ہے۔ کہا ہے کہ **وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ** (4:135) شہادت دو، وہ تمہارے اپنے خلاف جائے، خواہ تمہارے ماں باپ کے خلاف بھی کیوں نہ جائے۔ اب یہاں کوئی رو رعایت نہیں ہے۔ والدین کے متعلق یہ سارے احکام ہیں کہ ان کی عزت کرو، ان کو اتنا مقام دو، ان پہ اتنا احسان کرو، انہیں جھڑکو نہیں، ڈانٹو نہیں، ان کی تکریمِ نفس کرو لیکن جہاں عدل کا معاملہ آیا ہے تو کہا کہ شہادت دو خواہ وہ ماں باپ کے خلاف بھی کیوں نہ جائے۔ اور آگے ہے کہ **وَالْاَقْرَبِيْنَ** (4:135) خواہ وہ

تمہارے کتنے ہی قریبی کیوں نہ ہوں ان کے بھی خلاف شہادت جاتی ہے تو جائے کیونکہ تم تو اللہ کے گواہ بن کر گئے ہو۔ اِنۡ یَّکُنۡ غَنِیًّا اَوۡ فَقِیۡرًا فَاللّٰہُ اَوۡلٰی بِھِمَا (4:135) کوئی پارٹی امیر ہے یا کوئی پارٹی غریب ہے' تمہیں اس سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ تم تو خدا کی طرف سے گئے ہوئے ہو اور خدا کا حق ان دونوں سے زیادہ فائق ہے۔ اس لیے کہا کہ فَلَا تَتَّبِعُوا الۡھَوٰٓی اَنۡ تَعۡدِلُوۡا (4:135) اپنے ان جذبات کا اتباع نہ کرو جو عدل کے راستے میں رکاوٹیں بن جایا کرتے ہیں۔ وَاِنۡ تَلۡوٗۤا اَوۡ تُعۡرِضُوۡا (4:135) بات کو موڑ توڑ کر بھی نہ کہو' بات میں ابہام نہ ہو' تلبیس نہ ہو' بات ذو معنی نہ ہو' داؤ پیچ نہ ہو۔ دوٹوک بات کرو جیسے وہ وزیر خاں کی مسجد کی پچھلی دیوار ہے۔ قُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِیۡدًا (33:70) کھری' نکھری ہوئی' سیدھی بات کرو۔ موڑ توڑ کر کے بات نہ کرو۔ اَوۡ تُعۡرِضُوۡا (4:135) یہ بھی نہ کرو کہ سمن (Summon) کے اوپر تعمیل ہی نہ ہونے دو' اعراض نہ برتو۔ اس لیے کہ یہ سب چیزیں تم ان لوگوں سے تو چھپا لو گے لیکن فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا (4:135) اس کے اوپر ایک اور بھی ہے جس کو ہر بات کی خبر ہے۔ اگر تمہارا ایمان یہ ہے کہ اس عدالت کے بعد ایک اور عدالت بھی ہے جہاں جا کر اس مقدمے کی اپیل ہو جانی ہے تو وہ عدالتِ خداوندی ہے جو آخرت میں ہونی ہے۔ اُس کا دھیان رکھو کہ اپیل میں اگر تم نے ملزم ثابت ہو جانا ہے تو یہیں کیوں نہیں اس بات کا فیصلہ کر لیتے۔ یہ تو پھر بھی شاید کوئی تھوڑی سزا دے لیکن وہاں تو پوچھو ہی نہیں کہ وہ کیا سزا دے گا۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ والدین کے متعلق جو اتنی تاکید ہے تو اُس تاکید کے باوجود جہاں مقامِ عدل آتا ہے' وہاں کسی کی رورعایت نہیں ہے۔ لیکن میں پھر وہیں آجاؤں جہاں قرآنِ کریم نے والدین کے متعلق باتیں کہی ہیں۔

ہوم لائف (گھریلو زندگی) کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی ہدایت

عزیزانِ من! قرآن کی رو سے ہوم لائف (گھریلو زندگی) یہ ہے کہ گھر کی ایسی زندگی ہونی چاہیے کہ بڑھاپے کی عمر میں جہاں یہ تنہا رہ جاتے ہیں اور Physically (جسمانی طور پر) بھی بہت سی کمزوریاں آجاتی ہیں تو ان میں سے کسی کمزوری کی بنا پر ان کی تکریمِ انسانیت میں کوئی فرق نہیں آنا چاہیے۔ اسی لیے باقی بھی جو رشتہ داریاں ہیں یعنی جسے آپ خاندانی زندگی کہتے ہیں اُس میں ذی القربیٰ بھی اُس نے اسی لیے شامل کیا ہوا ہے لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کی فضا کے اندر جو سانس لینا ہے یہ تو اُس کی باتیں ہیں۔ جب تاکید کی جائے گی کہ صاحب! اتنے سانس لیا کرو اور ایسے سانس لیا کرو تو وہ سانس اس صاف فضا کی تاکید ہے۔ یہ بسیں جو Carbon Monoxide (کاربن مونو اکسائڈ) چھوڑتی چلی جاتی ہیں' تو یہ نہیں کہا گیا کہ ان کے پیچھے منہ لگا کر زور زور سے سانس لیا کرو۔ قرآن کے یہ جتنے بھی احکام یا ہدایات آپ کو ملیں گی تو یہ اُس نظام اور فضا کی ہیں جس میں قرآن کے مطابق یہ چیزیں

ہو رہی ہوں۔ بہرحال یہاں قرآن نے تاکید کی ہے کہ یاد رکھو! ہماری رحیمیت کے ساتھ' ماں باپ کی رحیمیت بھی شامل ہے اس لیے ان میں جب کسی معاملے میں کمزوری پیدا ہو جائے یا کمی پیدا ہو جائے تو اُس کو پورا کرو۔ اور اتباع صرف اس راستے کی کرو جس کا ہر قدم خدا کی طرف اٹھتا ہے۔ کہا کہ ثُمَّ اِلَیَّ مَرۡجِعُکُمۡ فَاُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (31:15) یاد رکھو! تم اپنے ہر عمل کے لیے خدا کے سامنے جوابدہ ہو۔ وہ تمہیں بتا دے گا کہ تمہارے اعمال تمہیں کس مقام پر لے آئے ہیں۔ تمہارے اعمال کے نتائج' خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے متعین ہوتے ہیں۔

ماں باپ کے لیے فرمانِ ربّ

عزیزانِ من! ماں باپ سے یہ کہا گیا کہ ہمارے ہاں سے جو رزق ملتا تھا تو ہم طبقاتی تقسیم نہیں کرتے تھے' غریب اور امیر کے بچے کو یکساں دیتے تھے لیکن جب رزق کی تقسیم تمہارے ہاتھ میں آئے تو تم بھی یہ فرق نہ کرنا۔ آگے چل کر ماں باپ سے کہا کہ ہم نے اتنی تاکید کر دی ہے کہ تمہاری تکریم اور عزتِ نفس قائم رہے لیکن ان کے اوپر جبر نہیں کرنا' اپنے معاملات یہ خود اپنے فیصلے سے کریں گے۔ ہم ان کے اختیار و ارادے میں دخل نہیں دیتے تو تم بھی ان کے اختیار و ارادے میں دخل نہ دو۔ اور ان سے یہ بات کہی گئی کہ جو کچھ تم کرو گے' اُس کے متعلق سوچ لو کہ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ قرآن کے الفاظ میں پھر لقمٰن نے اپنے بیٹے سے کہا کہ یٰبُنَیَّ اِنَّهَاۤ اِنۡ تَکُ مِثۡقَالَ حَبَّةٍ مِّنۡ خَرۡدَلٍ فَتَکُنۡ فِیۡ صَخۡرَةٍ اَوۡ فِی السَّمٰوٰتِ اَوۡ فِی الۡاَرۡضِ یَاۡتِ بِهَا اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیۡفٌ خَبِیۡرٌ (31:16)۔ پچھلی آیت یعنی (31:15) میں تھا کہ ایک ایک عمل جو ہے اُس کا نتیجہ تمہارے سامنے آ جائے گا تو اس آیت میں یہ بات بتائی کہ اے میرے بیٹے! اپنے ذہن میں یہ بات نہ رکھو کہ ہم نے ایسا انتظام کر لیا ہے کہ اس بات کا کسی کو پتہ نہ ہونے پائے' کانوں کان خبر ہی نہ ہو۔ کہا کہ یہ بات نہیں ہے' یہاں تم انتظام کر سکتے ہو لیکن آگے ایک آنکھ اور ہے جو لَطِیۡفٌ خَبِیۡرٌ (31:16) ہے۔ وہ ہے جسے مائیکروسکوپسٹ کہتے ہیں کہ اُس ذرّے کو خواہ چٹانوں کی سختیوں میں چھپا دو' آسمان کی بلندیوں کے اوپر لے جاؤ' زمین کی پستیوں کے اندر لے جاؤ' جہاں جی چاہے لے جاؤ' خدا وہاں سے نکال کر لے آئے گا۔

قرآنِ حکیم کی ساری تعلیم کا مقصد' زندگی کا محور' انسانی ذات کی نشوونما ہے

یہ جو خدا کا نظامِ عدل ہے کہ تمہارے ایک ایک عمل کا' بلکہ دل میں گزرنے والے خیالات تک کا بھی' اپنا نتیجہ خدا کے قانون کے مطابق مرتب ہو کر رہتا ہے' یہ ہے سارا محور قرآن کی تعلیم کا اور دین کا کہ کوئی عمل بھی ایسا نہیں ہے جس کا نتیجہ تمہیں نہ بھگتنا پڑے۔ کہا ہے کہ فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَیۡرًا یَّرَهٗ ۔ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ (99:7-8)۔ یہ چیز سمجھانے کے لیے بھی کوئی

محسوس شے ہی کہنی چاہیے تھی کہ کوئی عمل نتیجہ پیدا کیے بغیر نہیں رہتا۔ اب یہ دونوں عمل تو سامنے آ گئے۔ خیر وہ اعمال ہیں جن سے انسان کی ذات کی نشو و نما ہو جاتی ہے۔ ذات کی نشو و نما کے لیے اُس کے جسم کی پرورش اور نشو و نما نہایت ضروری ہے کیونکہ یہی وہ گھوڑا ہے جس کے اوپر اس سوار نے کم از کم اس دنیاوی زندگی میں سفر کرنا ہے۔ آپ کے ہاں ٹرانسپورٹ یا کمیونیکیشن (Communication) کے جتنے بھی Means (ذرائع) ہیں وہ یہ جسم ہے لہٰذا آپ کے مقاصد کو آگے پہنچانے کے لیے گھوڑا Perfect (مکمل) ہونا چاہیے' اس دنیا کی زندگی کی خوشحالی کے لیے گھوڑے کا توانا ہونا بڑی ضروری ہے۔ اس لیے اس دنیا کی جو طبعی زندگی ہے' اس زندگی کی خوشحالی' فارغ البالی' نشو و نما کا ملنا بڑی اہم چیز ہے لیکن یہ مقصود بالذات نہیں ہے۔ اقبالؒ (1877-1938ء) کیا خوب بات کہہ گیا ہے:

مقام پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیرِ گل کے لیے ہے نہ آشیاں کے لیے

(اقبال: بالِ جبریل)

یہ زندگی مقصود بالذات نہیں ہے۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے آپ کے ہاں کا گھوڑا مقصود بالذات نہیں بلکہ آپ کو صرف منزل تک پہنچانے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ مقصود بالذات یہ ہے کہ انسانی ذات کی' اس کے نفس کی' اس کی Personality کی' اس کی خودی کی نشو و نما ہو۔ انسانی ذات نے مرنے کے بعد آگے چلنا ہے۔ خیر وہ عمل ہے جس سے اُس کی نشو و نما ہوتی ہے' شر وہ عمل ہے جس سے اُس کی تخریب ہوتی ہے۔ اُس میں کمزوری پیدا ہوتی ہے۔

قرآنِ حکیم قدم قدم پر انسانی عقل کو وحی کی روشنی سے منور کرتا چلا جاتا ہے

قرآن کا انداز یہ ہے کہ ایک بات کہتے ہوئے' اپنی مثبت بات بھی کہتا ہے اور غلط یا باطل تصورات جو پھیلے ہوئے ہوتے ہیں' ساتھ ہی ساتھ ان کی تردید بھی کیے جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک گناہ سرزد ہو گیا جسے آپ شر کہتے ہیں' جرم کہہ لیجیے تو وہ گناہ سرزد ہو گیا تو کیا اُس کے بعد انسان دھتکارا گیا؟ راندۂ درگاہ ہو گیا؟ سنورنے کے امکانات ختم ہو گئے؟ کوئی اور Possibilities (امکانات) نہیں رہیں؟ دنیا میں جتنے مذاہب پہلے پھیلے ہوئے تھے' ان کے ہاں تو یہی چیز تھی کہ جیسے عیسائیت نے تو یہ بات کہی کہ ہر بچہ اپنی پیدائش کے ساتھ اپنے اولیں ماں باپ کے گناہ کی آلائش لے کر آتا ہے اور وہ کسی عمل سے دھل ہی نہیں سکتی۔ یہ تورات کا تصور ہے۔ تو یوں نظر آتا ہے کہ جیسے انسانوں کو خدا نے اس طرح پیدا کیا کہ گناہوں کی آلائش ان کے ساتھ دی اور وہ آلائش دھل نہیں سکتی تو جو آلائش والے انسان ہیں' وہ تو جہنم میں جائیں گے۔ تو ایسا ہوا کہ جیسا یہ کچھ کرنے کے بعد خدا کو یہ خیال آیا کہ یہ میں کیا کر بیٹھا' یہ تو جتنے انسان پیدا ہوتے چلے جاتے

ہیں‘ یہ تو سارے جہنم میں جائیں گے تو جنت میں کیا کسی گدھے کو بھیجوں گا۔ یعنی آپ تصور دیکھیے‘ آپ دیکھتے ہیں کہ قدم قدم کے اوپر اس میں کتنا فرق آتا ہے۔ یہ گناہوں کی آلائش عمل کے ذریعے صاف نہیں ہوسکتی تو بیچارے کیا کریں؟ اس کے متعلق ایسا تصور تورات میں پایا جاتا ہے کہ جیسے بیٹے نے پوچھا ہو (یہ میں تمثیلاً عرض کر رہا ہوں) کہ ابا جان! کیا بات ہے آج آپ بہت افسردہ نظر آتے ہیں؟ اُس نے کہا کہ بیٹا! کیا بات کروں وہ (معاذ اللہ معاذ اللہ) ایک غلطی کر بیٹھا ہوں کہ انسانوں کو پیدا کر رہا ہوں اور ہر انسان آلائش کے ساتھ پیدا ہوتا ہے‘ آلائش والا جنت میں جا نہیں سکتا سب جہنم میں جائیں گے‘ اب اس کے لیے کوئی چارہ کار سوجھتا نہیں ہے۔ اُنہوں نے کہا: ابا جی! اس میں افسوس کی کوئی ایسی بات نہیں ہے‘ اس کا حل موجود ہے۔ کہنے لگے کہ میں آپ کا اکلوتا بیٹا ہوں‘ مجھے دنیا میں بھیج دیجیے‘ یہ لوگ مجھے صلیب دے کر میری جان لیں گے اور آپ اعلان کیجیے کہ میرے بیٹے کا جو خون ہے وہ انسانوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ عزیزانِ من! یہ سارا کچھ سن کر آپ کے لبوں پہ مسکراہٹ آجاتی ہے‘ کروڑ در کروڑ انسان مانتے چلے آرہے ہیں اور آج مان رہے ہیں۔ وہ آئے اور انہوں نے ان کو صلیب پہ چڑھا دیا‘ خون ہوا اور خدا نے یہ اعلان کر دیا کہ جو بھی میرے بیٹے کے خون کے کفارے پر ایمان رکھے گا‘ اسے ہم جنت میں داخل کر دیں گے۔ تو اولیں ماں باپ یعنی آدم اور حوا کا گناہ ہر آنے والے پہ لگ رہا ہے۔ آپ سوچ رہے ہیں کہ یہ کیا تصور ہے۔ وہ بیٹے کے صلیب کے بعد کے انسان تو یوں ہوئے اور جو پہلے کے انسان تھے وہ بھی تو اسی طرح سے پیدا ہوئے تھے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ آپ اگر ذرا سا بھی تھوڑے سے ذہنی لیول پہ **Rationally** (استدلال سے) ان چیزوں پر **Think** (سوچ بچار) کریں تو نظر آجاتا ہے کہ انسان کیا مانتے چلے آرہے ہیں۔ یہی چیز ہندوؤں کے ہاں ہے کہ پچھلے جنم کوئی اس قسم کا کرن کر بیٹھے تو اس جنم کے اندر چوہا پیدا ہو گئے یا بلی پیدا ہو گئے یا کتا پیدا ہو گئے یا شودر پیدا ہو گئے۔ اب اس جنم میں جو جی میں آئے وہ کر لیں لیکن چوہا آدمی نہیں بن سکتا‘ شودر برہمن نہیں بن سکتا تو یہاں بھی عمل کا کوئی دخل نہ رہا۔ پچھلے جنم کا کوئی کرن کہ جس کا اس کو علم ہی نہیں ہے کہ میں کیوں مارا گیا اور اس جنم کے اندر کچھ بھی کر لے لیکن وہ فیصلہ تبدیل نہیں ہوسکتا۔

قرآنِ حکیم اپنے ہاں زندگی کا ایک اعلیٰ وارفع تصور پیش کرتا ہے

عزیزانِ من! سنیے‘ قرآن کیا تصور دیتا ہے؟ اُس نے کہا کہ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (4:28) انسان کمزور واقع ہوا ہے‘ اس سے لغزشیں ہوسکتی ہیں‘ لغزشوں کا ازالہ بھی ہوسکتا ہے۔ صحت مند انسان سے بھی کسی وقت کھانے پینے میں غلطی ہو جاتی ہے تو اگر کسی ایک وقت کی غذا سے انسان کی موت ہی اُس وقت واقع ہو جائے تو یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ اُس نے اندر اتنی قوتِ مدافعت رکھی ہوئی ہے کہ وہ اس کا ازالہ کر سکے۔ یہ طبیب اور ڈاکٹر کرتا یہ ہے کہ آپ کے اندر جو قوتِ مدافعت ہوتی ہے وہ اُس کو طاقت دیتا ہے‘ اس کا نام علاج ہے۔ اگر

کسی وقت کوئی ایسی غلطی ہوگئی کہ جس سے یہ جو مرض ہے اُس کا نتیجہ ایسا ہوگیا تو اس کے لیے ایسی **Provision** (گنجائش) رکھ دی گئی کہ اگر اُس کا استعمال کرلیا جائے تو **Power of Resistance** (مدافعت کی قوت) اتنی بڑھ جائے کہ وہ اُس کا ازالہ کردے۔ یہ نہیں ہے کہ ایک دفعہ کی غلطی سے ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ ہوجائے۔ وہ جو میں مثال دیا کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں بھی یہ تعلیم کے اندر جو نصاب رکھا ہوا ہے تو 50% بھی پاس مارکس لے لیجیے تو وہ پاس مارکس ہوجاتے ہیں لیکن **Divisions** اور چیزیں ہیں۔ 56% مارکس بھی پاس مارکس ہوجاتے ہیں۔ اس طالب علم کی اگلی کلاس میں جانے کی جو صلاحیت ہے وہ اتنی ہے کہ یہ جو اس میں کمی رہ گئی ہے وہ صلاحیت اُس کو پورا کردے گی لہٰذا اس کو اگلی کلاس میں **Promote** (ترقی) کردو۔ یہ جو **Provision** (گنجائش) رکھنا ہے کہ اگر کہیں غلطی ہوگئی ہے تو اُس غلطی کے ازالے کے لیے خدا کی طرف سے **Provision** (گنجائش) رکھ دینا جو ہے یہ اُس کی رحمانیت کا تقاضا ہے کہ یونہی راندۂ درگاہ نہ ہوجائے کہ ایک غلطی ہوئی اور ختم ہوگئے۔

گناہ اور جہنم کے سلسلہ میں یہودیت کے تصور کے برعکس قرآنِ حکیم کی تعلیم

یہودیت کے اندر توبہ نہیں ہے' ایک گناہ سرزد ہوا تو جہنم میں گئے۔ اب جہنم میں گئے تو اُس کے بعد تو پھر معاملہ ختم ہوا۔ کونسا انسان ایسا لے آئیں گے جس سے گناہ سرزد نہیں ہوا۔ جہنم میں چلے جاتے ہیں' اُس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ دو تین دن کے بعد ہمارے جو اسلاف ہیں' جو بڑے بزرگ گزرے ہیں ان کو پتہ چلے گا (جیسے وہ حوالات میں دیدیتے ہیں تو بعد میں پتہ چلتا ہے اور وہ ضمانت کے لیے جاتے ہیں) تو تیسرے دن ان کو پتہ چلے گا اور وہاں وہ جائیں گے اور وہاں جا کر خدا سے کہہ کر ہمیں جہنم سے نکال لائیں گے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ مذاہب کیا تھے اور یہ مذاہب کیا ہیں۔ یہاں قرآن نے یہ چیز کہی کہ **مِثْقَالَ ذَرَّةٍ** (99:7) سامنے آئے گا' **مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا** کا بھی آئے گا اور **مِثْقَالَ ذَرَّةٍ** شر کا بھی آئے گا۔ کوئی ایسی چیز نہیں جو ان میں سے ہم کسی کو معاف کردیں اور اُس کا نتیجہ نہ نکلے لیکن اصول ہمارے ہاں یہ ہے کہ وہاں تو نظام ترازو ہوگا' ایک پلڑے کے اندر تمہارے خیر رکھ دیئے جائیں گے یعنی صحت مند قوتیں صلاحیتیں جو صحت کو برقرار رکھنے کی ہیں' دوسرے پلڑے کے اندر تمہارے ہاں یہ **Resistance** (مدافعت) کی **Power** (قوت) بھی رکھ دی جائے گی۔ اُس میں دیکھا یہ جائے گا کہ **فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۔ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ** (101:6) جس کا یہ صلاحیتوں کا پلڑا جھک گیا تو اُسے **Promote** (پاس) کردیا جائے گا **وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ۔ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ** (101:8-9) اور جس کا یہ پلڑا کمزور رہ گیا تو وہ ہے جو نقصان میں رہے گا تو جہاں یہ کہا کہ **مِثْقَالَ ذَرَّةٍ** (99:7) بھی' یعنی بھی جو چیز ہوگی' وہ سامنے آجا گی' اُس کے ساتھ ہی یہ چیز کہی کہ اُس ایک غلط قدم سے یہ نہیں ہوگا کہ ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ ہوجاؤ۔

اپنی غلطی کا اعتراف اپنی اصلاح کا ایک لازمی جز ہے

عزیزانِ من! اس میں ایک بڑی شرط ہے کہ اس کا اعتراف کیا جائے کہ ہاں، مجھ سے یہ غلطی ہوئی ہے' اس کی ندامت ہو اور اس کی ذمہ داری اپنے اوپر لی جائے کہ میں اس غلطی کا ذمہ دار ہوں۔ کہا کہ جو یہ مانتا ہی نہیں ہے کہ میں نے یہ غلطی کی ہے' اُس کی اصلاح ہو ہی نہیں سکتی۔ اصلاح کے لیے پہلی چیز تو یہ ہے کہ کہے: یہ قدم غلط ہے' اُس کو غلط تسلیم کرے گا تو صحیح قدم اٹھائے گا۔ جو غلط راستے پہ چلا جا رہا ہے' ہر مسافر اُسے کہتا ہے کہ غلط راستے پہ جاتے ہو اور وہ آگے سے کہتا ہے کہ ''جا اوئے جا' تیتوں کی❶؟'' پہلی چیز یہ ہے کہ اُس کو اس کا اعتراف ہو کہ یہ راستہ غلط ہو گیا ہے' اُس کو اس کی ندامت ہو کہ مجھ سے بھول چوک ہو گئی ہے' وہ ذمہ داری کو قبول کرے کہ میں اپنے اس Action (عمل) کا ذمہ دار ہوں۔ وہ جو کئی بار بات سامنے آ گئی ہے اور دہرائی جاتی ہے کہ قصۂ آدم و ابلیس ہے، ہی یہ کہ آدم سے بھی ایک لغزش ہوئی اور ابلیس سے بھی ایک معصیت ہوئی۔ آدم سے پوچھا گیا کہ تم نے یہ کیوں کیا؟ اُس نے کہا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (7:23) اے ہمارے نشو و نما دینے والے! مجھ سے بھول ہو گئی' چوک ہو گئی' غلطی ہو گئی' لغزش ہو گئی' میں اس کا ذمہ دار ہوں' مجھے اس کی ندامت ہے۔ کہا کہ کوئی بات نہیں' تم نے ذمہ داری کو قبول کیا ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ یہ تمہاری لغزش تھی تو کوئی بات نہیں' تم ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ نہیں ہو سکتے اب فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38) ہماری طرف سے صحیح راستہ اور غلط راستہ دکھانے کی چیزیں آتی رہیں گی' تم ان پر چلتے چلے جاؤ' اس کے بعد تمہاری یہ جو غلط راستے پہ چلنے کی چیز تھی' اس کا ازالہ ہو جائے گا لیکن شرط یہ ہے کہ تم اس صحیح راستے پہ چلے جاؤ گے۔ ابلیس سے کہا گیا کہ تم نے یہ معصیت کیوں کی؟ کہنے لگا کہ تیرے حکم کے بغیر تو کوئی پتہ بھی نہیں ہل سکتا' تیرے حکم اور منشا کے بغیر میں کیسے معصیت کر سکتا ہوں' میں اس معصیت کا ذمہ دار ہی نہیں ہوں۔ اسے کہا گیا کہ تیری اصلاح قیامت تک نہیں ہو سکتی۔ ابلیس تو کہتے ہی مایوس کو ہیں۔ خدا کا بڑا عجیب نظام عدل ہے۔

لغزش کے سلسلہ میں توبہ کرنے والے کے لیے خدا کی طرف سے رحمانیت کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں

وہ جو چیز تھی کہ اگر کوئی لغزش ہو بھی گئی ہے تو اس کے ازالے کی صورت پیدا ہو سکتی ہے اور صورت یوں پیدا ہو سکتی ہے کہ غلطی کو غلطی مانے' اپنی ذمہ داری کو تسلیم کرے۔ توبہ کے معنی ہی یہ ہیں کہ چورا ہے سے اگر غلط راستے کی طرف قدم اُٹھ گیا ہے اور چلتا گیا ہے' آگے

---

❶ چل بے! تجھے کیا؟

چل کر کہیں محسوس ہوا، معلوم ہوا کہ یہ راستہ غلط ہے جدھر میں آ رہا ہوں تو قرآن نے کہا کہ صحیح راستے پر چلنے کے لیے پہلی بات یہ ہے کہ جتنا غلط راستہ طے کیا ہے، پچھلے پاؤں وہاں پھر لوٹ کر اُسی چوراہے پہ جائے تو یہ جو وہاں سے پچھلے پاؤں لوٹ کر آنا ہے عربی میں اسے توبہ کہتے ہیں۔ وہاں کھڑے کھڑے ہی اگر کہتا رہے گا کہ میں نے غلطی کی جو ادھر آ گیا، یا اللہ! میری توبہ، ہزار بار توبہ، لیکن وہیں کھڑا ہے تو عرب اس کے لیے توبہ کا لفظ استعمال نہیں کرتے اس کے لیے لازم تھا کہ لوٹ کے آئے۔ اب اگر وہ وہاں چوراہے پر آ گیا تو کیا منزلِ مقصود پہ پہنچ گیا؟ نہیں، بلکہ اب اسے یہاں سے صحیح راستے پہ چلنا بھی ہوگا۔ سارے قرآن میں ہے کہ **من تاب واصلح** جو پلٹ کے وہاں آیا اور پھر صحیح راستے کے اوپر چلا تو کہا کہ جو ایک دفعہ غلط راستے پہ چلا ہے، اس کے لیے ہم نے پھاٹک بند نہیں کر دیئے ہوتے، صحیح راستے کے دروازے کھلے ہی رکھتے ہیں کہ ادھر آ تو جا۔ وہ جو میں نے اُس دن کہا تھا وہ بڑی عجیب چیز ہے کہ انسان جب اس راستے کی طرف پلٹ کر آتا ہے جسے اُس نے کہا کہ وہ خدا کی طرف آنے والا ہے تو عربی زبان میں اس پلٹ کے آنے والے کو ''تائب'' کہتے ہیں۔ خدا نے بندے کے متعلق کہا ہے کہ جب یہ ''تائب'' ہوتا ہے تو ہم ''توّاب'' آتے ہیں، وہ ایک قدم پلٹتا ہے تو ہم دو قدم آگے بڑھتے ہیں۔ وہ گلے لگانے کے لیے دو قدم آگے بڑھتا ہے۔ انسان ہے تو غلطی کر سکتا ہے، اس لیے کہا ہے کہ آ جا جلدی سے آ جا ہماری طرف۔ یہ جو غلطی ہوگئی ہے، جو نقصان ہوگیا ہے، اُس کے ازالے کا امکان رکھا گیا ہے۔

عدل کے سلسلہ میں پلڑے کی مثال ایک بڑی واضح مثال ہے

یہ ہے خدا کی رحمانیت۔ اس کے لیے اس نے پلڑے کی مثال دے کر بتایا ہے۔ یہ جھکنے والا پلڑا اور اٹھنے والا پلڑا، بڑی عجیب مثال ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اُس کے برائیوں کے پلڑے میں کچھ نہیں ہوتا، معصوم کا تصور غلط ہے۔ خدا کا جو لغزش کے ازالے کا تصور ہے وہ یہ ہے کہ اُس کا نیکیوں کا پلڑا جھکا ہوا ہو۔ اسی لیے کہا کہ یات بِهَا اللّٰهُ (31:16) ایک ایک ذرہ سامنے لائے گا، کھینچ کر سامنے لائے گا اس لیے کہا کہ یاد رکھو! اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ (31:16)۔ تم اُس سے کچھ بھی چھپا نہیں سکتے لیکن اس کے بعد یہ نہیں ہے کہ اُس کے بعد وہ یونہی فیصلہ کر دے بلکہ پلڑے میں ڈالے گا، ترازو کھڑا ہوگا۔ وہ کانٹا تمہارے سامنے ہوگا تو دیکھ لیجیے گا کہ جو پلڑا جھکے گا تو اُس جھکنے کے بعد تو ہم سے پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے آج کی آیات میں والدین کے متعلق، بوڑھے ماں باپ کے متعلق، فیملی لائف کے متعلق، ان کی تنہائی کے احساس کو مٹانے کے متعلق، تکریم وعزتِ انسانیت کو برقرار رکھنے کے متعلق اور ہر انسان کے متعلق یہ تصور دیا کہ اس باب میں جو کچھ تم کرو گے ہم جانتے ہیں کہ تم کس طرح کر رہے ہو ہم تمہارے دل کے ارادوں تک سے واقف ہیں۔ ہمارا قانون بڑا باریک بین ہے اور

ہر ایک کی حالت سے باخبر ہے۔

انسانی اعمال کا حساب تو ہر سانس میں ساتھ کے ساتھ ہوتا چلا جاتا ہے

ایک ایک چیز جو ہے وہ ہمارے میزانِ عدل میں ہے۔ کہنے کو تو ہم یہ کہتے ہیں کہ آخرت میں جا کر کھلے گی' وہ تو ہر سانس میں اُس کا میزانِ عدل موجود ہے' ہر سانس میں تلتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے اگر تمہارا یہ لغزشوں کا پلڑا کسی وقت بھاری ہو گیا ہے تو کوئی بات نہیں اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (11:114)۔ یہ قرآن کا عجیب اصول ہے کہ یاد رکھو اگر کچھ تخریبی کام ہو گئے ہیں تو تعمیری کام اتنے زیادہ کرو کہ وہ گڑھا بھی بھر جائے اور اُس سے زائد بھی کچھ تمہارے پاس بچ جائے۔ تخریبات کا اور سیئات کا ازالہ حسنات کے ذریعے سے ہوتا ہے لہٰذا اُس سے زیادہ حسنات کا پہلو لاؤ' اس کے بعد کامیابی ہو جائے گی۔ اصلاح کا یہی پہلو ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے۔ اگر معاشرے میں غلطیاں ہو گئی ہیں' نقصانات ہو گئے ہیں تو حسنات اتنے زیادہ تعداد میں کر لو کہ وہ غلطیوں کے پلڑے کو بھی ڈھانپ دے اور تمہارا یہ پلڑا بھی جھک جائے۔

عزیزانِ من! سورۃ لقمان کی آیت 16 تک ہم آ گئے' 17 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

چوتھا باب: سورة لقمٰن (آیات 17 تا 21)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عزیزانِ من! آج نومبر 1979ء کی 2 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة لقمٰن کی آیت 17 سے ہو رہا ہے: (31:17)۔ آغازِ درس سے پہلے میں آپ احباب کی خدمت میں عیدالاضحیٰ کی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اسے قبول فرمائیے۔

جیسا کہ آپ کو یاد ہوگا کہ سورة لقمٰن کی سابقہ آیات میں ان نصائح کا ذکر چلا آ رہا تھا اور وہ ابھی مسلسل چلا آ رہا ہے جو لقمان نے اپنے بیٹے کو کی تھیں۔ میں نے پہلے درس میں یہ عرض کیا تھا کہ لقمان کے متعلق متعین طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کونسی شخصیت تھی حتیٰ کہ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ نبی بھی تھے یا نہیں کیونکہ قرآنِ کریم نے انہیں بالتصریح زمرۂ انبیائے کرامؑ میں شامل نہیں کیا لیکن جو باتیں ان کی طرف منسوب کر کے یا ان کی جو باتیں قرآن نے کہی ہیں، وہ بالکل وحی کے مطابق ہیں۔

اڑھائی ہزار سال سے مسئلہ خیر و شر کی پیچیدگیوں کا قرآنی حل

سابقہ آیات کے تسلسل میں اگلی بات شروع میں یہ کہی ہے کہ **یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاۡمُرۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَانۡہَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ**

(31:17) اے بیٹے اقامتِ صلوٰۃ کا انتظام کرو' معروف کا حکم دو' منکر سے روکو۔ یہ اصطلاحات اس سے پیشتر متعدد بار آ چکی ہیں' بارِ دیگر ان کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ نظامِ صلوٰۃ کے متعلق تو بیس برس سے یہ چیز چلی آ رہی ہے اور قرآنِ کریم کے تو ہر دوسرے تیسرے صفحے پر یہ چیز سامنے آئے گی۔ اسی طرح سے معروف اور منکر بھی ہے۔ معروف ہر وہ بات ہے جسے قرآنِ کریم صحیح اور خیر تسلیم کرے۔ منکر وہ ہے جس کے خلاف قرآن کہے۔ جسے انگریزی میں Good & Evil (خیر و شر) کہتے ہیں اور جو مسئلہ اڑھائی ہزار سال سے علمائے اخلاقیات اور فلاسفروں میں مابہٗ نزع چلا آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ Absolute Good (مطلق خیر) کسے کہتے ہیں' اور Absolute Evil (مطلق شر) کیا ہوتا ہے یعنی مطلق خیر کسے کہتے ہیں اور مطلق شر کیا ہوتا ہے؟ یہ طے ہی نہیں ہو سکا۔ قرآنِ کریم نے تو اس کو دو لفظوں میں بیان کر دیا کہ خدا کی وحی جس چیز کو خیر کہتی ہے وہ خیرِ مطلق ہوتا ہے' جسے وہ شر قرار دیتی ہے وہ منکر ہو جاتا ہے۔ قرآن پر ایمان لانے والوں کے لیے یہ مسئلہ آسان ہو گیا۔ میں ابھی آگے چل کر عرض کرونگا کہ یہ بات یونہی ہے کہ قرآن ماننے والے اس کو بس یونہی مان لیتے ہیں۔ یہ بات یونہی نہیں مانی جاتی لیکن بہرحال جو المعروف اور منکر ہے' اُس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی سند کی رو سے جسے قرآن صحیح Recognize (تسلیم) کرتا ہے وہ صحیح ہے' جسے وہ Recognize (تسلیم) نہیں کرتا وہ غلط ہے۔

قوموں کے لیے الفاظ کے حقیقی مفہوم کی اہمیت کے سلسلہ میں لفظ ''صبر'' کی ایک مثال

آگے یہ کہا ہے کہ وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَاۤ اَصَابَكَ (31:17) اس کا عام ترجمہ یہی ہوتا ہے کہ مصیبت پر صبر کیا کرو۔ اور جب ہم صبر کا لفظ اپنے ہاں بولتے ہیں تو اس کا مفہوم ہمارے سامنے یہ ہوتا ہے کہ جب کچھ نہ بن پڑے' بیچارگی کا عالم ہو' کچھ بن نہ سکے' کچھ ممکن نہ ہو' بے کسی ہو' بے بسی ہو تو اُس موقعہ پہ کہا جاتا ہے کہ بھئی! اب صبر کے سوا چارہ نہیں ہے۔ عام طور پر کسی کی مرگ پر' موت کے بعد یہ کہتے ہیں اس لیے کہ مُردہ کو تو واپس زندہ کر کے نہیں لایا جا سکتا۔ یعنی ایسی بیچارگی کہ جس کا کوئی علاج ہی ممکن نہ ہو تو اُس مقام پر یہ بولا جاتا ہے۔ اور اس سے ورے بھی جس مقام پہ بھی کچھ ایسا ظلم' کوئی ایسی تکلیف' ایسی مصیبت' جس کا کوئی علاج نہ ہو سکے' اُس وقت کہا جاتا ہے کہ صبر کرو۔ ہمارے ہاں کا عورتوں کا طبقہ تو ہے ہی مظلوم طبقہ۔ ان کے ہاں عام طور پہ یہ چیز ہوتی ہے کہ جب بھی کوئی بہن دوسری بہن سے اپنی کوئی مصیبت بیان کرتی ہے تو وہ اس کے سوا کچھ کہہ ہی نہیں سکتی کہ ''اچھا بہن صبر کر' ہن صبر دے سوا چارہ وی کی ہے' ہووی کی سکدا اے[1]؟'' یعنی جہاں یہ ہو کہ ''ہووی کی سکدا اے[2]؟'' تو وہاں کہا جاتا ہے کہ صبر کرو۔ اور اُس کے آگے ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ

---

[1] اچھا بہن صبر کرو۔ اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے' ہو بھی کیا سکتا ہے؟

[2] ہو بھی کیا سکتا ہے؟

الصّٰبِرِيْنَ (2:153) اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو صابر ہوتے ہیں۔ اب سوچیے کہ جہاں یہ کہا جائے کہ ہو ہی کچھ نہیں سکتا' انتہائی بے کسی ہے' مظلومیت ہے' بے بسی ہے' کوئی چارۂ کار نہیں ہے تو یہ ایک ایسی عظیم چیز ہوئی جو کہا کہ اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی اگر کوئی کسی واقعہ کے خلاف چارہ جوئی کریں' ہمت کریں' اُس کا مداوا سوچیں' کوئی اس کا علاج کریں تو پھر ان کے ساتھ تو اللہ نہیں ہوتا۔ اور جو ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے اور رونا شروع کر دے تو اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔

کہتا ہوں کہ آ ہی جائے گا صبر
پھر کہتا ہوں کہ اگر نہ آیا تو؟

''تے فیر ڈوب مر ❶''

قرآنِ حکیم کے مروّجہ تراجم کی وجہ سے غلط نظریات کے پیدا ہونے کا نتیجہ

قوموں کے اندر الفاظ کے جو مفہوم رائج ہو جاتے ہیں' اصل میں الفاظ کے مفہوم یوں نہیں ہوتے بلکہ وہ قوم اپنے اوپر ایسی حالت طاری کر لیتی ہے کہ وہ الفاظ ان کی ان کیفیات کے آئینہ دار بن جاتے ہیں۔ صبر اس تصور کے بالکل برعکس معنی کے لیے بولا جاتا ہے' یکسر اس کے برعکس ہوتا ہے۔ صبر کے معنی ہوتے ہیں کہ ''حصولِ مقصد میں پیہم ہمت کے ساتھ کام کرتے چلے جانا' ثابت قدمی سے کرتے چلے جانا کہ اس میں لغزش نہ آنے پائے' اُس کے اندر استقلال ہو' ایسا نہ ہو کہ کہیں ہار تھک کر بیٹھ جائے' دل چھوڑ دے' ہمت ہار دے' مسلسل یہ کچھ کیے چلا جائے۔'' یہ ہے جس کے لیے عربوں کے ہاں یہ لفظ بولا جاتا تھا اور یہ ہے جس کے لیے یہ لفظ قرآنِ کریم میں آتا ہے۔ آپ دیکھیے کہ یہ الفاظ قوموں کے اوپر جادو کیا کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں قرآن شریف تو سب پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جی! الحمدللہ' میں باترجمہ پڑھتا ہوں۔ بے ترجمہ پڑھتا تو اتنا نقصان نہ ہوتا لیکن باترجمہ پڑھ کر آپ نے یہ کیا کہ صاحب! صبر کرو کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے' اللہ تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اب آپ نے یہ کہہ دیا کہ صاحب! قرآن بھی تو کہتا ہے کہ صبر کرو۔

الصّبرۃ کا قرآنی مفہوم

عربوں کے ہاں یہ چیز ہے کہ ''کسی مقصد کے حصول کے لیے مسلسل' متواتر' استقامت اور ثبات سے مصروفِ کار رہنا' راستے میں کتنی بڑی رکاوٹ کیوں نہ آئے اُس سے اپنے اندر لغزش نہ پیدا ہونے دینا' اپنے اندر کمزوری نہ پیدا ہونے دینا' اُس کو رکاوٹ نہ بننے دینا' وہ اسے صبر کہتے ہیں۔'' اور جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ ان کے ہاں تو ان الفاظ کا مفہوم محسوس طور پہ ہوتا تھا' وہ قوم جو کرتی تھی تو اُس

---

❶ تو پھر ڈوب مرو۔

سے یہ مفہوم واضح ہوتا ہے۔ مثلاً ایک کسان نہایت اچھا صالح بیج لے جا کر مٹی میں دبا آتا ہے اور مہینوں' ہر روز صبح اٹھ کر' وہاں کھیت پہ جاتا ہے' سارا دن محنت کرتا ہے' خون پسینہ ایک کر دیتا ہے' شام کو خالی ہاتھ واپس آ جاتا ہے' دوسرے دن صبح پھر اُسی طرح سے وہاں چلا جاتا ہے۔ آپ دیکھیے کہ کسان کا اپنے مقصد کے حصول میں یہ جو پروگرام ہے' یہ کس قدر سعی پیہم' مسلسل کوشش' پیہم کوشش' کا متقاضی ہے۔ اس میں تھکنا نہیں ہے' ہمت نہیں ہارنا' راستے میں اگر کوئی رکاوٹ آتی ہے تو اُسے دور کرنا ہے۔ وہ کھیتوں میں جا کر کرتا ہی یہ ہے کہ پودوں کے اگنے میں' بڑھنے پھولنے میں' جو رکاوٹیں ہوتی ہیں' وہ ان کو دور کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ سارا کچھ کرنے کے بعد جب اُس کی یہ محنتِ شاقہ' مسلسل پیہم کوشش رنگ لاتی ہے یعنی غلے کا ڈھیر لگتا ہے تو اُس غلے کے ڈھیر کو وہ **الصبرۃ** کہتے ہیں۔ کیا بات تھی اس قوم کی! یہ دکان کے اوپر غلے کا جو ڈھیر تھا وہ اُس کو **الصبرۃ** نہیں کہتے تھے۔ کسان کے کھیت میں فصل کٹنے کے بعد جو غلے کا ڈھیر ہوتا تھا اُس کو عرب **الصبرۃ** کہتے تھے یعنی صبر کا نتیجہ۔ یہ اس لفظ کا دوسرا مفہوم ہے کہ لغزش نہ آنے پائے' دل ڈول نہ جائے' توازن برقرار رہے' اس سعی پیہم کے اندر رکاوٹوں کا مسلسل مقابلہ کرنا' تاکہ کسی وقت بھی آدمی کے اندر لغزش نہ پیدا ہو جائے۔ پہلے زمانے میں لکڑی کی کشتی ہوتی تھی جس کو لے کر وہ پانی میں نکلتے تھے۔ کشتی کے لیے ضروری ہے کہ اُس کا توازن برقرار رہے' پانی میں اگر ذرا سا بھی اُس کا توازن بگڑے تو کشتی کے ڈوب جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ اُنہوں نے سواریاں بٹھائی ہیں اور دیکھا ہے کہ توازن صحیح نہیں رہا تو وہ اُس کا توازن برقرار رکھنے کے لیے ایک طرف پتھر رکھ دیتے تھے۔ ہمارے ہاں تانگے ہوتے تھے۔ اُن کے پیچھے آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ اتنا بڑا پتھر ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ وہ کشتی میں بھی اتنا پتھر ایک طرف رکھ دیتے تھے تاکہ وہ ڈولنے نہ پائے' اُس کا توازن بگڑنے نہ پائے تو یہ شے یا پتھر جو کسی کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے مدد و معاون ہو' عرب اُس پتھر کو **الصابورۃ** کہتے تھے کہ جس سے کشتی کو صبر آ جائے۔ اب آپ اندازہ لگا لیجیے کہ صبر کے معنی کیا ہیں اور جو کہا ہے کہ **اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ** (2:153) اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے کا مطلب کیا ہے اور یہ بھی کہ یہ کون لوگ ہیں جن کے ساتھ اللہ کی نصرت ہوتی ہے؟ نیز عربی لغت کی رو سے اس کے معنی کیا ہوئے؟

میں نے کہا ہے کہ ترجمے کی دو ہی سندیں ہیں: عربی لغت اور قرآنِ کریم (تصریفِ آیات کی رو سے)۔ حضرت جالوت (2:249;2:249) اور طالوت (2:247;2:249) کا واقعہ جنگ ہے اور اس جنگ میں طالوت کے یہ لشکر جاتے ہیں۔ اِن لشکروں کے متعلق کہا ہے کہ ان کے لشکروں کی دعائیں یہ تھیں: **قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا** (2:250) اے ہمارے نشوونما دینے والے! صبر ہمارے دلوں میں انڈھیل دے' بہت زیادہ صبر عطا کر دے۔ **وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا** (2:250) یعنی ہم میں ثابت قدمی پیدا کر دے۔ یہ الفاظ خود صبر کا مفہوم بتا رہے ہیں' صبر کی تشریح قرآن خود کر رہا ہے۔ ہمارے ہاں بھی ثابت قدمی کا لفظ بولا جاتا ہے اور آگے ہے کہ **وَ انْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ** (2:250) اس طرح سے ہمیں اس مخالف قوم کے اوپر غلبہ عطا کر دے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ

ایسی محنت جس میں آدمی کبھی ہمت ہار کر نہ بیٹھ جائے' کمزوری محسوس نہ کرنے لگ جائے مستقل مزاجی اور ہمت سے کوشاں رہے' صبر کہلاتا ہے۔قرآن نے کہا ہے کہ وَ كَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ (3:145) یہ بات کہ تمہیں' اپنے نظام کے مخالفین کا مقابلہ کرنا ہوگا' کوئی نئی بات نہیں۔اقوامِ سابقہ میں بھی یہ ہوا ہے۔نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا ہے کہ انبیاء کے ساتھ ان کی جماعتیں تھیں اور ان جماعتوں کو مخالفین کے مقابلے میں میدانِ جنگ میں آنا پڑا' انہوں نے لڑائیاں لڑیں لیکن وہ اور ان کے ساتھیوں کی کیفیت یہ تھی کہ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (3:145) اس خدا کے راستے میں جو بھی واقعات ان کے سامنے آئے' جور کاوٹیں ان کے سامنے آئیں' ان سے انکے پاؤں میں لغزش پیدا نہیں ہوئی' وَ مَا ضَعُفُوْا (3:145) نہ ہی ان میں کمزوری آئی' وَ مَا اسْتَكَانُوْا (3:145) نہ ہی وہ تھک کر' ہمت ہار کر' بیٹھ گئے۔ان کے لیے کہا کہ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ (3:146) یہ وہ صابرین ہیں جن کو اللہ محبت کرتا ہے۔یہ صابرین کی تشریح کی جارہی ہے کہ کتنا ہی بڑا مقابلہ اور مخالفت کی جنگ آزمائیاں کیوں نہ ہوں' ان میں نہ ہی لغزش آئے' نہ کمزوری آئے' نہ انسان دل چھوڑے۔اور پھر سورۃ البقرۃ میں جہاں یہ الفاظ یا جہاں یہ تشریح آئی ہے' وہ تو اتنی بڑی وضاحت ہے کہ اس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔کہا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ (2:153) اے جماعتِ مومنین! صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ خدا سے استعانت طلب کرو۔صلوٰۃ والی بات تو میں نے عرض کیا ہے کہ میں پہلے کئی دفعہ کہہ چکا ہوں' آج بات صرف صبر پہ مرکوز ہورہی ہیں۔کہا ہے کہ صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ استعانت طلب کرو۔اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (2:153) اللہ صابرین کے ساتھ ہے۔کون ہیں یہ جن سے کہا جارہا ہے' ان کی کیا کیفیت ہے؟ کہا ہے کہ وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ (2:154) اس طرح سے میدانِ جنگ میں مخالفین کا مقابلہ کرتے ہوئے جو جان دیدیتا ہے اُسے مردہ مت کہو۔بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (2:154) وہ تو زندہ ہیں' مردہ تو تم ہو لیکن تمہارے ذہن کا جو موجودہ شعور ہے اُس کی رو سے تم سمجھ نہیں سکتے کہ ان کو کس قسم کی زندگی عطا ہوتی ہے بہرحال اُنہیں مردہ مت کہو وہ حیاتِ جاوداں سے بہرہ یاب ہوتے ہیں لیکن جس طرح تم اس طبعی زندگی کا ادراک حواس (Senses) کے ذریعے کرسکتے ہو' اس زندگی کا ادراک اس طرح نہیں کرسکتے۔وہ محسوسات کی دنیا سے باہر کی چیز ہے۔اس جدوجہد میں بیشتر مواقع ایسے آئیں گے جن میں وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ (2:155)۔

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

کٹھن سے کٹھن منزل کو سر کرنے کے لیے پوری دل جمعی کے ساتھ سرگرم عمل رہنا صبر کہلاتا ہے

اس راستے کے اندر قدم قدم کے اوپر اس قسم کے مواقع آئیں گے جہاں تمہاری ہمتوں کا' تمہارے مقابلہ کرنے کی قوتوں کا ٹیسٹ ہوگا۔ یہ ٹیسٹ خوف سے' بھوک سے' اموال ضائع ہونے سے' جانیں ضائع ہونے سے ہوگا۔ ان تمام چیزوں کے نقصان ہونگے' اس راستے کے اندر یہ مواقع آئیں گے۔ اس کے بعد ہے کہ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ (2:155) کامیابی کا مژدہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ان مقامات میں صبر سے کام لیتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ صبر کے وہی بنیادی معنی ہیں جو میں نے عرض کیے ہیں کہ مسلسل اور پیہم اپنے مقصد کے حصول میں آگے ہی بڑھتے چلے جانا' کہیں رکنا نہیں' تھکنا نہیں' ہمت نہیں ہارنا' پاؤں میں لغزش نہیں آنے دینا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے کہا کہ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ (2:156) ۔ ہمارے ہاں تو مصیبت صرف مصیبت ہی کے لیے آتا ہے۔ عربی زبان میں ہر واقعہ' ہر ہنگامی چیز' ہر حادثہ جو پیش آجائے اُس کے لیے لفظ مصیبت آتا ہے۔ کہا ہے کہ جو بھی اس قسم کا واقعہ ہوگا' کوئی ہنگامہ ہو' اس راستے میں نبرد آزمائیاں ہوں' جو کچھ بھی ہو' المختصر جو بھی اس قسم کی چیزیں ہوں جہاں ٹکراؤ ہوگا' سخت ترین مقابلہ ہوگا' جہاں جانیں تک دیدینے والی ہوتی ہیں' ہر قسم کا نقصان ہوتا ہے' تو یہ صبر کرتے ہیں۔

اِنا لِلّٰہ کے الفاظ کا قرآنی مفہوم

کہا ہے کہ جو اس طرح سے میدانِ کارزار میں جنگ کرتے ہوئے اپنی جانیں تک دیدیں' تو ان کو مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں' تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ نہیں سکتے کہ وہ زندگی کس قسم کی ہے۔ ان کو قدم قدم کے اوپر مقابلہ آئے گا' قدم قدم کے اوپر آزمائشیں ہونگی' نقصانات ہوتے چلے جائیں گے۔ وہ مقابلے میں آگے بڑھتے چلے جائیں گے اور ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ جب بھی کوئی سخت ترین مقابلہ آئے گا تو وہ قالوا با آوازِ بلند کہیں گے کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (2:156)۔ آپ کے ہاں یہ انا للہ موت کی خبر کے وقت پڑھا جاتا ہے کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (2:156)۔ عام طور پہ یہ موت کی خبر پہ ہی پڑھا جاتا ہے۔ وہ جیسا مرنے کے بعد ہم تعزیت کا خط لکھتے ہیں تو اُس میں کہا جاتا ہے کہ اللہ میاں! صبر کی توفیق عطا فرما' میاں! صبر کرو' صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ جب کوئی چارہ ہی نہیں تو اب اور کرنا ہی کیا ہے۔ اسی طرح سے موت کی خبر کے بعد بھی یہ کہتے ہیں کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (2:156) اس سے کم درجے کی بھی کوئی مصیبت آتی ہے تو اُس پہ بھی عام طور پہ یہی کہتے ہیں۔ یہ اس کا صحیح مفہوم نہیں ہے۔

آپ قرآن میں دیکھیں کہ یہ واقعہ کہاں آیا ہے۔ میدانِ کارزار ہے' مقابلہ ہو رہا ہے' مخالفین مقابلے میں ہر قسم کا حملہ کرتے چلے جا رہے ہیں' ان کو راستے میں روک رہے ہیں۔ اس میں مال' توانائیاں صرف ہو رہی ہیں' حتیٰ کہ جانیں تک اس میں تلف ہو رہی ہیں اور جو

تلف ہو رہی ہیں ان کے متعلق کہا کہ وہ مر نہیں رہے لیکن بہرحال کٹ رہے ہیں۔ یہ راستے میں بڑھ رہے ہیں اور مخالف انہیں روک رہے ہیں۔ اور جب مقابلے کی انتہا ہو جاتی ہے تو یہ ان سے کہتے ہیں کہ تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہارے اس مقابلے سے' تمہاری اس مزاحمت سے' تمہارے اس تصادم سے کیا ہم رک جائیں گے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ کیا ہم اپنا رخ بدل لیں گے' ہم دوسری سمت کی طرف چلے جائیں گے' ہم پیچھے ہٹ جائیں گے؟ تم اگر یہ سمجھتے ہو تو ہمارے متعلق غلط سمجھتے ہو۔ اِنَّا لِلّٰهِ (2:156) ہم نے اپنے آپ کو خدا کے اس پروگرام کی تکمیل کے لیے وقف کر دیا ہے' اِنَّآ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ (2:156) لو! چلے ہم اُس کی طرف' روکو! اگر کوئی روکنے والا ہے' آؤ تو سہی۔ کتنا عظیم بلند نعرہ ہے! کیا تم لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ ہم اپنی جانوں کی حفاظت کے لیے' مال کی حفاظت کے لیے' یا کچھ غنیمت کا مال لوٹنے کے لیے یہ کچھ کر رہے ہیں؟ کیا تمہارے ذہن میں ہمارے متعلق یہ تصور ہے کہ ہم یہ کریں گے؟ تم جانتے نہیں ہو کہ ہم کون ہیں اور کس مقصد کے لیے اس میدانِ کارزار میں آئے ہوئے ہیں۔ یہ تصادم اس لیے ہو رہا ہے کہ اِنَّا لِلّٰهِ (2:156) ہم یہ اپنے لیے کچھ نہیں کر رہے' بڑا عظیم نصب العین ہمارے سامنے ہے جس کے حصول کی خاطر ہم یہ کر رہے ہیں اور اس لیے اس راستے میں کوئی رکاوٹ ایسی نہیں ہو گی جس سے ہم دوسری طرف پلٹ کر چلے جائیں' منہ موڑ لیں' رخ موڑ لیں' ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ اِنَّآ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ (2:156) ہمارا ہر قدم اُسی مقصد کی طرف اٹھے گا جو خدا نے ہمارے لیے مقرر کر دیا ہے' تم کر لو جو کچھ کرنا چاہتے ہو۔ آگے کہا ہے کہ اُولٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ (2:157) یہ ہیں جن کے اوپر خدا اور اُس کے فرشتے تہنیت اور تبریک کے پھول نچھاور کرتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق کہا جائے گا کہ صحیح راستے کے اوپر چلنے والے ہیں۔

عزیزانِ من! صابرین کا مفہوم آپ نے سمجھ لیا' دیکھ لیا کہ قرآنِ کریم کی رو سے صبر کسے کہتے ہیں۔ اور اس لیے یہاں سورۃ لقمٰن میں یہ لفظ آیا تھا کہ وَاصۡبِرۡ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ (31:17) جو حادثہ تمہارے سامنے پیش آئے' جم کر اُس کا مقابلہ کرو' آگے بڑھتے چلے جاؤ' لغزش نہ آنے پائے' ہمت مت ہارو' اپنے اندر کمزوری نہ پیدا ہونے دو۔ اس لیے کہ اِنَّ ذٰلِكَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ (31:17) یہ تو بڑی عزیمت چاہتا ہے' بڑی ہمت کی بات ہے۔ ان مواقع کے اوپر اس طرح سے جم کر کھڑے ہو جانا اور ہر مقابلہ میں آگے ہی بڑھتے چلے جانا مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ (31:17) ہے۔ اب آپ سوچیے کہ وہ جو ہمارے ہاں صبر کا مفہوم ہے کہ رونے بیٹھ جانا اور یہ سمجھنا کہ اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا' انتہائی بے بسی کا عالم تو کیا' قرآن تو اس کیفیت کو مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ (31:17) کہے گا۔ عزم کا لفظ تو آپ نے سنا ہو گا کہ ارادے کی پختگی کو کہتے ہیں۔ عزیمت بھی آپ نے سنا ہو گا کہ بڑی ہمت اور استقلال کو کہتے ہیں جیسے صاحبِ عزیمت یعنی بڑی ہمت اور استقلال کے مالک۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب ''اعمال قرآنی'' میں قرآن پر عمل کرنے کے طریق

جب دین مذہب میں تبدیل ہوتا ہے تو پھر ہر چیز کا حلیہ بگڑ جاتا ہے' اس کا مفہوم بالکل برعکس ہو جاتا ہے۔ اب **عزیمة** کے معنی ہیں تعویز اور عزائم القرآن کے معنی ہیں قرآنِ کریم کی آیات جن سے تعویز لکھے جاتے ہیں اور جھاڑ پھونک کی جاتی ہے اور **المعزم** کے معنی ہیں جھاڑ پھونک کرنے والا۔ عزیزانِ من! عمل تو آپ جانتے ہیں کہ کسے کہتے ہیں۔ آپ کے ہاں بھنگ پینے والوں کو ''عملی'' کہتے ہیں۔ پھر آپ کو پتہ ہے کہ مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم (1943-1863) کی کتاب ''اعمالِ قرآنی'' ہے۔ قرآن زور ہی اعمال پہ دیتا ہے' سارا قرآن ضابطہ ہی اعمال کا ہے: **مما یعملون' مما تعملون** ۔ اس میں عمل عمل عمل کی پکار ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ اعمالِ قرآنی میں یہ ہے کہ قرآن کی آیتوں کے تعویذ لکھے ہوئے ہوتے ہیں' ورد لکھے ہوئے ہوتے ہیں' وظیفے لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ عملیات تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ کیا ہوتے ہیں یعنی قرآن کی آیتوں کے ورد اور وظیفے جن' بھوت اور چڑیلیں نکالنے کے لیے لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ آپ اندازہ لگائیے کہ جب قوم کا تصور یا اُس کی ذہنیت بدلتی ہے تو وہ جو قرآن کے الفاظ ہیں ان کا مفہوم کیا رہ جاتا ہے۔ بہرحال یہاں عزم کی بات ہو رہی تھی۔ عزم مستحکم ارادے کا نام ہے' جسے عزیمت کہتے ہیں۔

مذہبی دنیا میں عزم کی نوعیت نیز عمالوں اور العزم کا تذکرہ

آپ کو پتہ ہے کہ ہمارے ہاں اب عزیمت کے معنی تعویذ گنڈہ ہیں۔ اب آپ کہیں گے کہ یہ کیسے ہوا۔ وہ ایسے ہوا کہ ''او ہنوں کس کے گنڈ دیندے نیں[1]'' وہ چونکہ بہت کس کے گانٹھ دیتے ہیں تو اس طرح یہ تعویذ جو ہے کہ جسے بہت سختی سے باندھا جائے تو اس تعویذ کو عزیمت کہتے ہیں۔ جس طرح سے کتابوں کا نام ''اعمالِ قرآنی'' ہے' اسی طرح سے یہ **عَزْمِ الْاُمُوْرِ** کا ترجمہ ہو رہا ہے' عزائم القرآن کتابیں بکتی ہیں اور اُس میں تعویذ لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ جس طرح سے تعویذ کرنے والوں کو عمال کہتے ہیں اسی طرح سے تعویذ لکھنے والوں کو المعزم[2] کہتے ہیں۔

تمدنی زندگی کے سلسلہ میں لقمان کی قابلِ قدر تعلیم

کیا نصائح ہیں جو یہ باپ (القمان) اپنے بیٹے کو کر رہا ہے! اب وہ تمدنی زندگی کی طرف آ رہا ہے۔ کہا ہے کہ **وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ** (31:18)۔ انسان مدنی الطبع (Social Animal) ہے' ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ پڑتا رہتا ہے۔ کہا کہ کوئی انسان

---

[1] اسے سخت گانٹھ دیتے ہیں۔

[2] حوالے کے لیے دیکھیے امام راغب اصفہانی کی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن''۔

انسان کی حیثیت سے تمہارے پاس آتا ہے تو...... تُصَعِّرْ (31:18) کے عام معنی یہی ہیں کہ بے رخی نہ برتو۔لیکن عربوں کے ہاں اس بے رخی کا عجیب انداز تھا۔اونٹ کو ایک بیماری لگتی تھی جس میں اس کی گردن مڑ جاتی تھی اور منہ بھی ٹیڑھا ہو جاتا تھا' غالباً لقوے کی طرح کی کوئی چیز ہوگی۔اگر گردن مڑ جائے اور منہ ٹیڑھا ہو جائے تو اس کے لیے ان کے ہاں ایک ہی لفظ صعر تھا۔قرآن کہتا ہے کہ جب کسی شخص کا معاملہ اتفاق سے یا اُس کی بدقسمتی سے' تمہارے ساتھ پڑ گیا ہے تو وہ تمہارے سامنے آئے یا تمہارے ساتھ بات کرے تو اس طرح نہ ہو جانا جیسا وہ اونٹ ہوتا ہے۔اور آج تو آپ دیکھیے کہ کسی کے ساتھ معاملہ پڑ جائے ''ایہہ کمیٹی داٹور یا ہونداہیگا''تسی ایہدے کولوں کچھ لینا نہیں ہوندا' اینوں چار پیسے دینے ای ہوندے نیں۔اوہنوں ویکھو کس طرح اونٹ وانگوں گردن مڑی ہوئی ہوندی ہیگی اے' جیوں لقوہ ہویا ہونداہیگا اے ❶''۔کسی کے ساتھ آپ کا معاملہ پڑ جائے پھر دیکھو کہ وہ کیا کرتا ہے۔ایک دوست نے مجھے کہا تھا کہ میں تو گھر سے نکلتے وقت دعا یہ کرتا ہوں کہ یا اللہ! کسی آدمی سے واسطہ نہ پڑ جائے''کتے کولوں تے میں فیروی وٹہ مار کے بچ لاں ❷ گا''لیکن آدمی کے ساتھ واسطہ نہ پڑے۔میں نے کہا تھا کہ

آدمی کو خدا نہ دکھلائے آدمی کا کبھی خدا ہونا

انسان کی عقل مندی کا ثبوت اس کی نفسیاتی کیفیات سے ملتا ہے اور انسانی نفسیات کے مختلف پہلو

پہلی چیز یہ ہے کہ آپ کے اچھے بھلے تعلقات ہوتے ہیں' ملنا جلنا سب کچھ ہے' ویسے جاؤ تو بڑی خوشی سے ملیں گے لیکن ذرا کوئی درخواست لے کر یا کوئی کام کرنے کے لیے کہیں جاؤ تو پھر دیکھیے کہ کس طرح گردن مڑ جاتی ہے اور منہ لقوہ ہو جاتا ہے۔وہ سیدھے منہ سے بات ہی نہیں کرتے کہ ''کتھے منہ نوں موچ نہ آجائے ❸''۔

آپ دیکھیے قرآن کس طرح روزمرہ کی باتیں بتا رہا ہے کہ ایک دوسرے سے تعاون کی بات ہے' کبھی تمہارا بھی اُس سے کام پڑ جائے گی' خوشدلی سے پیش آؤ' خندہ پیشانی سے اس کے ساتھ پیش آؤ۔اس طرح سے پیش آنے سے انسان کی آدھی مصیبت ہی ٹل جاتی ہے۔کہا کہ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا (31:18) ذرا سا اقتدار حاصل ہو گیا ہے تو اب ایسا اکڑ کر نہ چلو۔دوسری جگہ ہے کہ گویا تم اس زمین کو پھاڑ دو گے' پہاڑ کی بلندیوں سے اوپر تمہارا سر چلا جائے گا۔تمہیں حاصل کیا ہوا ہے جس کی وجہ سے یہ کیفیت پیدا ہوگئی۔

---

❶ یہ کمیٹی کا مقرر کیا گیا ہوتا ہے۔آپ نے اس سے کچھ لینا نہیں ہوتا' اسے چار پیسے دینے ہی ہوتے ہیں۔اسے ملاحظہ کرو کہ کس طرح اونٹ کی طرح اسکی گردن مڑی ہوتی ہے' وہی جسے لقوہ ہوا ہوتا ہے۔

❷ کتے سے تو میں پھر بھی ڈھیلا مار کر بچ رہوں گا (مگر آدمی سے نہیں)۔

❸ کہیں منہ کو موچ ہی نہ آجائے

انسانی ذہنیت یا اُس کی نفسیاتی کیفیت کے مظاہر اُس کی محسوس حرکات وسکنات ہوتی ہیں۔ جب بھی کسی دوست سے آپ ملتے ہیں تو آپ ذرا بے رخی برت کر دیکھیے تو آپ کے چہرے سے نظر آجاتا ہے کہ کس طرح سے ہو رہا ہے۔ یہ جو نفسیاتی کیفیات کے مظاہر ہیں جس طرح محسوس علامتوں سے جو چیزیں ظاہر ہوتی ہیں قرآن ان تک بھی پہنچتا ہے۔ اصل میں وہ تو تمہاری ذہنیت اور نفسیاتی کیفیت کی اصلاح کرتا ہے، جو اس سے پیدا ہوتی ہے۔ بات کرتا ہے تو ان مظاہر کو سامنے رکھ کر جن کے ذریعے وہ کیفیت آپ کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس لیے کہا کہ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا (31:18) خوشگواری سے پیش آؤ۔

تنگ نظری یا کم ظرفی کی خطرناک بیماری

یہاں (31:18) میں مـرحـاً آیا ہے۔ اصل میں مرحاً اوچھے پن کو کہتے ہیں، اس کو کم ظرفی بھی کہتے ہیں، تنگ نگہی بھی کہتے ہیں۔ ایک چیز ہے کہ کسی بات پہ اترانا، ایک چیز ہے کہ کسی بات پہ خوش ہو جانا۔ انسان اگر کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اس سے انسان کے اندر خوشی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور یہ ایک فطری چیز ہے، انبساط کا عالم اُس کے اندر پیدا ہوتا ہے، اُس کی حرکات وسکنات سے اُس کی نمود بھی ہوتی ہے۔ یہ جو فرحت ہے اس سے قرآن منع نہیں کرتا۔ جہنم میں جانے والوں کے متعلق ہے کہ یہ جو اس طرح سے جن کی کیفیت ہوتی ہے کہ ہر وقت لوگوں سے جلے بھنے ہوئے ہیں، منہ موڑے ہوئے ہیں، اس طرح سے گردن موڑے ہوئے ہیں تو وہاں جانا تو پتہ نہیں کب ہوگا لیکن یہ تو ہر وقت جہنم میں ہوتا ہے ''ہر ویلھے سڑدا بلدا رہندا اے ❶''۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ اہلِ جہنم کی جو کیفیت ہے اُس کی یہ صورت ہے کہ ذَٰلِكُم بِمَا كُنتُمْ تَفْرَحُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنتُمْ تَمْرَحُونَ ❷ (40:75)۔

کسی کے لیے کچھ نہ کرنے کے باوجود تعریف کروانے کی انتہائی خواہش

عزیزانِ من! ایک وہ کام ہیں جو حق کے لیے ہوتے ہیں۔ یاد رکھیے! حق صرف Abstract (غیر محسوس) صداقت کا نام نہیں ہوتا، Abstract Truths (غیر محسوس صداقتیں) جب محسوس شکل میں سامنے آئیں تو اُنہیں الحق کہا جاتا ہے۔ (40:75) میں کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے کوئی محسوس تعمیری کام تو نہیں کرتے مگر ویسے ہی پھولے نہیں سماتے، اکڑے پھرتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ يُحِبُّونَ أَن يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا (3:187) یہ وہ لوگ ہیں جو چاہتے ہیں کہ جو کام یہ کرتے نہیں ہیں ان کا

---

❶ ہر وقت جلتا بھنتا رہتا ہے۔

❷ (ان سے کہا جائے گا کہ) تمہارا یہ حشر، اس لیے ہو رہا ہے کہ، تم بغیر کوئی تعمیری کام کیے، یونہی اتراتے ہوا اور اپنی قوت کے نشہ میں اکڑتے پھرتے تھے (اور یوں بڑھائی حاصل کرنا چاہتے تھے 40:56) (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1105)۔

ذکر کر کے لوگ ان کی خدمت میں سپاس نامے پیش کرتے رہا کریں۔ گویا کوئی اگر اچھے کام کرتا ہے تو اُس کی تعریف کوئی معیوب چیز نہیں ہے۔ کچھ کیا نہ جائے اور اُس نہ کیے جانے کے اوپر دل کی انتہائی خواہش یہ ہو کہ اُس کی تعریف کی جائے تو یہ **تَفۡرَحُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ** (40:75) ہوتا ہے۔ یہ جو قرآن نے یہاں کہا ہے کہ **وَ لَا تَمۡشِ فِی الۡاَرۡضِ مَرَحًا** (31:18) بغیر تعمیری کام کیے ہوئے یونہی پھولے ہوئے اکڑے ہوئے پھرنا اور اُس کے بعد یہ چاہنا کہ لوگ ان کی تعریف کرتے چلے جائیں تو کہا کہ اپنے اندر یہ کیفیت بالکل نہ پیدا کرنا۔ عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ کیا نصیحتیں ہو رہی ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ بالتصریح ابھی معلوم نہیں ہے کہ لقمان نبی ہے جو یہ کہہ رہا ہے لیکن بہرحال یہ سارا کچھ خدا کی ہدایت کے مطابق ہے جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اور بڑی گہری تمدنی چیزیں ہیں۔ یادرکھو کہ **اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرٍ** (31:18) خدا **مختال** اور **فخور** کو پسند نہیں کرتا۔

خیالی بدگمانی کی کیفیت

مختال یعنی خیال کا لفظ تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ یہ وہی ہے جس کا مادہ (**Root**) ''خ ی ل'' ہے، اس کے معنی ہیں ''وہ شخص جو اپنے خیال ہی خیال میں اپنے آپ کو بڑا سمجھتا چلا جائے اور فی الحقیقت ویسا نہ ہو لیکن لوگ بھی خیالی طور پر اُس کو ایسا سمجھ لیں''۔ یہ اس مادے کے معنی ہیں۔ اب دیکھیں کہ عرب کیسے سمجھاتا ہے کہ وہ شخص ایسا نہ ہو اور لوگ خیال ہی خیال میں یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بہت شے ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ کھیتوں میں چڑیاں اور طوطے پکی ہوئی فصل کو کھانے کے لیے آجاتے ہیں تو کھیتوں میں ایک لکڑی یا بانس کھڑا کر کے اُس کے اوپر کالا کپڑا ڈال دیتے ہیں، اس کو انگریزی میں **Scare Crow** (پتلا) کہتے ہیں۔ وہ ان پرندوں کو صرف ڈرانا ہوتا ہے لیکن اُس کے اندر ڈرانے والی بات کچھ بھی نہیں ہوتی، اُس کی شکل ڈراوے والی بنی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ عرب اس چیز کو **الخیال** کہتے تھے۔ یہاں کہا ہے کہ **اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرٍ** (31:18) یہ پسندیدہ نہیں ہے کہ ایسا تو نہ ہو لیکن لوگوں کو ڈرانے کے لیے شکلیں ایسی بنائی ہوئی ہوں۔ ذرا سی کوئی ہمت کر کے وہ اُس کپڑے کو یوں اتار دے تو نیچے سے نظر آجائے کہ صاحب ہیں کیا۔

تا سجدہ اش کردی خدا است

ان کی خدائی کی حقیقت اتنی ہے کہ تم جب تک انہیں سجدہ کرتے چلے جاؤ گے ان کی خدائی قائم ہے۔

چوں یکہ اندر قیام آئی فنا است

تم کھڑے ہو جاؤ تو اس کی خدائی ختم ہو جاتی ہے۔ ان کی خدائی تمہارے سجدوں سے قائم ہوئی ہے، یہ **Scare Crow** (پتلا) ہے، یہ ڈراوے ہیں۔ اپنے خیال میں تم ان کو اُن پرندوں کی طرح جن، بھوت اور پتہ نہیں کیا کچھ سمجھ لو تو اور بات ہے، درحقیقت یہ اس کے سوا کچھ

نہیں ہے کہ ایک لکڑی ہے اور اُس پہ کپڑا پڑا ہوا ہے لیکن اُس نے اپنی شکل ایسی بنا رکھی ہے کہ اس سے ڈر پیدا ہو۔

خیالی طور پر اپنی اماجگاہ میں خوش فہمی کے اندر گرفتار شخص کی کیفیت

کہا ہے کہ یہ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (31:18) ہیں۔ اردو زبان میں ہمارے ہاں فخر کا لفظ تو اچھے معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ یہ چیز قابلِ فخر ہے۔ عربوں کے ہاں بھی بعد میں اچھے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن بنیادی معنی یہ ہیں کہ ایسے گائے بھینس جن کا ''ہوانہ'' تو بڑا سا ہو لیکن وہ پھولا ہوا ہو اور اُس کے اندر دودھ نہ ہو' اگر ہو بھی تو یونہی ذرا سا نکلے۔ اسے وہ **فخار** کہتے تھے۔ ایسا مٹکا جو پکی مٹی سے بنا ہوا ہو لیکن اندر سے خالی ہو' بجائیے تو اندر سے بہت زور سے ٹن ٹن کرے لیکن اس کے اندر کچھ نہ ہو۔ جب تک وہ مٹکا خالی ہوتا تھا اُس وقت تک اُس کو عرب **فخور** کہتے تھے۔

قدم قدم پر اَن گنت بکھرے ہوئے کائناتی حقائق کو سمجھنے کے لیے غور و تدبر ایک گوہر تابدار ہے

قرآن نے کہا ہے کہ اگر کسی شخص کو اتفاق سے تمہارے ساتھ کام پڑ گیا ہے تو اُس سے گردن نہ موڑیئے' منہ ٹیڑھا نہ کیجیے' کل کو تمہارا بھی کسی سے کام پڑے گا۔ اسی لیے وہ تو الناس کو یہ سب کچھ کہتا ہے۔ یہاں تک تو وہ لقمان کی نصیحتوں کی باتیں ہیں۔ وہاں کہا تھا کہ وَاٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ[1] (31:12)۔ حکمت اور غور و تدبر کی چیزیں ہیں' فکر و نظر کی چیزیں ہیں۔ اس حکمت کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ اشیائے کائنات اور نظامِ فطرت پر غور و خوض سے' گہرے تدبر سے' یہ چیز حاصل ہو جاتی ہے۔ وحی کی رو سے بھی جو کچھ دیا جاتا ہے' میں آگے چل کر ابھی بیان کرونگا کہ اُس میں بھی حکمت ہوتی ہے۔ خارجی کائنات پہ غور و فکر سے ایک چیز پیدا ہوتی ہے۔ جیسے حضرتِ ابراہیمؑ کے قصے میں نبوت سے پہلے کے دور میں ان سے یہ کہا گیا تھا کہ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ[2] (6:75) جو انہوں نے کائناتی نظام کے مشاہدات دیکھے تو اُس سے وہ صحیح نتائج کے اوپر پہنچ گئے۔ قرآن نظامِ کائنات پر غور و فکر کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ یہ سارا کچھ لقمان کو اس حکمت کے بعد قرآن نے خود کہا کہ اَلَمْ تَرَوْا (31:20) کیا تم بھی نظامِ کائنات پہ اس طرح غور نہیں کرو گے' دیکھو گے نہیں کہ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ (31:20) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے' وہ سب تمہارے لیے تابع تسخیر کر دیا ہے۔

---

[1] وحی کی روشنی میں' نظام کائنات پر غور و فکر سے' صحیح نتائج تک پہنچنے کی یہی دانشِ نورانی تھی جو ہم نے خصوصیت سے لقمان کو عطا کی تھی (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 947)۔

[2] ہم نے ابراہیمؑ کو کائناتی نظام کا مشاہدہ کرایا تھا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 304)

عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے اتنا عظیم اعلان ہو رہا ہے کہ جس دور میں انسان بڑے بڑے درختوں کے سامنے سجدہ کرتا آیا تھا' بڑے بڑے دریا کے سامنے سجدہ کرتا تھا' پہاڑوں کے سامنے سجدہ کرتا تھا' شیر کے سامنے سجدہ کرتا تھا' اژدھا کے سامنے سجدہ کرتا تھا' یہ شمس وقمر تو پوچھو ہی نہیں کہ اس کے لیے کیا تھے' یہ ان کو معبود سمجھے ہوئے تھا۔ اُس دور میں وہ کہہ رہا ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے وہ ہم نے تمہارے تابع تسخیر کر دیا ہے۔ وَ اَسۡبَغَ عَلَیۡکُمۡ نِعَمَہٗ (31:20) کتنی با فراغت اپنی نعمتوں کی بارش ہم نے تم پہ کر رکھی ہے۔ ارض وسماوات کی تسخیر سے خدا کی نعمتیں حاصل ہونگی۔ وَظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً (31:20) اگر صرف عرب کے لوگوں کو لیا جائے تو پوچھیے کہ یہ کیسی عجیب چیز آتی ہے کہ جو کچھ اس وقت تمہارے سامنے یہ نعمتیں وغیرہ آ گئی ہیں یہ بھی اور جو ابھی زمین کے نیچے چھپی ہوئی ہیں' تیل وغیرہ کی صورت میں وہ بھی۔ یہ تو میں نے ایک عرب قوم کی بات کہی ہے کہ تمہیں کیا پتہ کہ تمہارے پاؤں کے نیچے کس قدر سونے کے سمندر ہیں۔ **اسبغ** کا لفظ بتا رہا ہے کہ اس فراوانی سے ہم نے اپنی نعمتوں کے دریا بہا دیئے ہیں جو ظاہر بھی ہیں اور باطن بھی ہیں۔ اگر پوری انسانیت کو لیا جائے تو ظاہر کی اُس کی نعمتیں تو اُس کے مقابلے میں شے ہی کچھ نہیں ہیں جو ابھی باطن میں تھیں' غیر مرئی تھیں' Visible (مرئی) نہیں تھیں' دیکھی نہیں جاتی تھیں۔ ایٹم (Atom) کی قوتوں کو آپ دیکھیے کہ چاند تک تو پہنچ گئے ہیں اور مریخ تک پہنچنے کے ارادے ہیں اور ابھی تو اُس کا ایک ذرا سا جو ذرہ ہے اُس کی قوت ہی ان کے سامنے آئی ہے۔

تسخیرِ کائنات کے سلسلہ میں دوسروں کے بالمقابل قرآن کریم کی حامل یہ قوم آخر کیوں دسترس حاصل نہ کر سکی؟

عزیزانِ من! نعمتوں کے بعد **ظاهرة وباطنة** کہنا بہت بڑی بات ہے۔ یہ خدا ہی کہہ سکتا تھا۔ اور یہ ہیں وہ نعمتیں جن کے متعلق آپ سے کہا ہے اور آپ ہر نماز کی ہر رکعت کے اندر دعا مانگتے ہیں کہ اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۔ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ (1:5.6)۔ اور قرآن کہتا ہے کہ یہ نعمتیں تسخیرِ ارض وسماوات سے ہونگی۔ آپ دعا مانگ کر چلے آتے ہیں اور نعمتیں وہ چھین کر لے جاتے ہیں۔ خدا کہتا ہے کہ ہماری کیفیت تو یہ ہے' مگر دوسرے لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ وَّ لَا هُدًى وَّ لَا كِتٰبٍ مُّنِيۡرٍ (31:20) خدا ہی کے متعلق جھگڑے نکالتے چلے جاتے ہیں۔ نہ علم ہوتا ہے' نہ صحیح راستے پہ چل رہے ہوتے ہیں' نہ ان کے پاس کوئی روشن راستہ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود مجادلہ کرتے ہیں' جھگڑتے ہیں۔

تحریک طلوع اسلام 50 سال سے مذہب اور دین کے فرق کو واضح کرتی چلی آ رہی ہے: پرویزؒ

یہ خدا کے ساتھ جھگڑنا کیا ہے؟ یہ بڑی غور طلب چیز ہے۔ انہیں علم بھی نہیں ہے' کتابِ منیر کی سند بھی نہیں ہے اور ایک ایک چیز کے

اوپر خدا کو چیلنج دیئے جا رہے ہیں۔ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (31:21)۔ قرآن میں بیسیوں مقامات پہ یہ چیز آئی ہے۔ یہ اتنی عظیم چیز ہے جو قرآن کہہ گیا ہے۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ جب ان لوگوں سے جو خدا کو قدم قدم پہ چیلنج دیتے ہیں' کہا جاتا ہے کہ خدا کی نازل کردہ کتاب کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس مسلک پر چلیں گے جو اسلاف سے ہمارے ہاں مسلسل متواتر چلا آ رہا ہے۔ عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ میں قریباً ہر درس میں اور قریباً پچاس سال سے ہر تحریر میں مذہب اور دین میں فرق کرتا چلا آ رہا ہوں اور بتاتا چلا آ رہا ہوں کہ اسلام دین ہے' مذہب نہیں ہے۔ دو لفظوں میں آج سن لیجیے کہ ان میں کیا فرق ہے۔ جب اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ دعوت دی جائے کہ خدا کی کتاب کا اتباع کرو تو یہ دین ہے اور اُس کے مقابل میں جو ان کا جواب ہے کہ بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (31:21) ہم تو اُسی مسلک پہ چلیں گے جو ہمارے اسلاف سے ہمارے ہاں چلا آ رہا ہے تو یہ مذہب ہے۔ ساری دنیا میں مذہب ہے۔ جتنی مذہب پرست قومیں دنیا میں موجود ہیں ان میں سے کوئی قوم بھی ایسی نہیں ہے جو ما انزل اللہ کا اتباع کر رہی ہو' ان کے پاس تو ما انزل اللہ ہے ہی نہیں۔ ان کے ہاں اتباع ہی اسلاف کا ہے' جس راستے کے اوپر پہلی نسلیں چلی آ رہی ہیں اُسی کے اوپر چلے جا رہے ہیں۔ نہ علم ہے' نہ ہدایت ہے' نہ کتابِ منیر ہے اور اُس راستے پہ چلے جا رہے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ بڑی اہم چیز ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک تقلید پرست قوموں کی حالتِ زار پر مقلد کی تعریف

قرآن کہتا ہے کہ اس طرح اسلاف کے اتباع کا نام تقلید ہے اور یہ بڑے فخر سے اپنے آپ کو مقلد کہتے ہیں۔ گائے بھینس کے گلے میں ایک بٹا ہوا رسہ ڈال دیتے ہیں۔ اُس سے پکڑ کر پھر اُس کو لیے لیے چلتے ہیں۔ اس کو قلادہ کہتے ہیں اور اس عمل (Process) کو تقلید کہتے ہیں۔ اُس گلے میں ڈلی ہوئی رسی کے زور سے جدھر کوئی کھینچ کر لے جائے' اُدھر کی طرف چلے جانا تقلید ہے۔ میں یہاں یہ عرض کر دوں کہ ہمارے ہاں یہ جو لفظ ہے کہ یہ مقلد ہیں اور یہ غیر مقلد ہیں تو غیر مقلد کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ کوئی عقل و فکر سے (Rationally)' کسی سند کے اعتبار سے' وہ کوئی مسلک اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہ دو اصطلاحی الفاظ ہیں۔ مقلد ان کو کہتے ہیں جو آئمہ فقہ میں سے کسی ایک امام کی فقہ کا اتباع کرتے ہیں۔ جو کسی آئمہ فقہ کی تقلید نہیں کرتے بلکہ امام [2] بخاریؒ کی تقلید کرتے ہیں یعنی انہوں نے

---

[1] چنانچہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس ضابطہ ہدایت کا اتباع کرو جسے خدا نے نازل کیا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ نہیں صاحب! ہم تو اسی ڈگر پر چلتے چلے جائیں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 950)۔

[2] امام محمد اسمٰعیل بخاریؒ (60/256-194ھ)

اپنی حدیث کی کتاب صحیح بخاری میں جو لکھا ہوا ہے وہ ان کا اتباع کرتے ہیں' وہ غیر مقلد کہلاتے ہیں۔قرآنِ کریم نے فرق ہی یہ کیا ہے کہ جو ما انزل اللہ کے اوپر چلنے والا ہے' وہ ہے جو دین پہ چلنے والا ہے اور جو اتباع مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ہے وہ ہے جسے وہ مذہب کہہ کر پکارتا ہے۔

تقلید کے مفہوم کو سمجھانے کی ایک دو محسوس اور عملی مثالیں

تقلید کے متعلق ایک محسوس مثال دے کر قرآن نے بات کو واضح کیا ہے۔کہا ہے کہ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا(2:217) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی کتاب کا اتباع کرو تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں' ہمارے پاس اسلاف کا جو مسلک چلا آ رہا ہے' ہم اُسی کا اتباع کریں گے۔یہ کھڑے ہو کر یہ نہیں پرکھیں گے کہ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (2:170) ہمارے پاس یہ راستہ جو مسلسل چلا آ رہا' کیا وہ عقل و فکر پہ مبنی ہے' خدا کی کتاب پہ مبنی ہے' صحیح راستہ بھی ہے یا نہیں؟ یہ کھڑے ہو کر اس کو نہیں سوچیں گے بلکہ جس راستے کے اوپر پہلے سے مسلسل چلے آ رہے ہیں اُس راستے پہ چلتے جائیں گے۔کہا کہ وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً (2:17) تم نے کبھی کسی گڈریئے کو یا چرواہے کو دیکھا ہے' چرواہے کو آپ دیکھیں گے کہ وہ کچھ الفاظ بولتا ہے جس کے معنی کچھ نہیں ہوتے یعنی ''تا تا تا تا' آ ہا ہا ہو ہو'' تو اس کے جو مویشی ہوتے ہیں وہ اس آواز پہ لگے ہوئے ہوتے ہیں۔یہ **دعآءً و ندآءً** ہے اس بولنے والے کی آواز بے معنی ہے اور سننے والے محض ان الفاظ پہ لگے ہوئے ہیں۔کہا کہ یہ ہے جسے تقلید کہتے ہیں۔نہ بولنے والے کو پتہ ہے کہ میں جو الفاظ بول رہا ہوں ان کے معنی کیا ہیں' مگر سننے والے ہیں جو ان الفاظ کے اوپر لگے ہوئے ہیں۔(معاذ اللہ) میں اذان یا کسی چیز کی تنقیص نہیں کر رہا۔مؤذن جب اذان دیتا ہے کہ ''اللہ اکبر اللہ اکبر'' تو اُسے پتہ نہیں ہے کہ اللہ کو جو میں اکبر کہہ رہا ہوں تو اس کے معنی کیا ہیں۔جب مؤذن کہتا ہے کہ ''اشھد الا الہ الا اللہ'' میں اس چیز کی شہادت دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار اس کائنات میں نہیں ہے تو اس کو اس کا کچھ پتہ نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف الفاظ بولتا ہے۔جو سننے والے ہیں' وہ جب یہ سنتے ہیں تو وہ کہتے ہیں' 'بانگ مل گئی اے تے میں چلیاں ❶''۔

عزیزانِ من! یہ لمبا چوڑا قصہ تو ایک طرف رہا اگر یہ کہیں اللہ اکبر کا مفہوم ہی قرآن کی رو سے متعین کرتا تو اس اعلان کرنے والے کو پتہ ہوتا کہ میں کتنا بڑا انقلابی اعلان کر رہا ہوں' سننے والوں کو پتہ ہوتا کہ ہم کس کام کے لیے جا رہے ہیں۔خدا کی کبریائی کو اس دنیا میں مستحکم اور ثبت کرنا اللہ اکبر ہے۔اور وہ جو کہہ رہا ہے کہ ''اشھد الا الہ الا اللہ'' میں شہادت دیتا ہوں تو شہادت تو دیکھی ہوئی چیز کی ہوتی ہے' تو

---

❶ اذان ہو گئی ہے تو لو میں چلا اب نماز پڑھنے۔

کیا یہ اُس کی شہادت ہوتی ہے کہ یہاں خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے؟ نتیجہ اس روش سے یہ ہوتا ہے کہ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (2:17) بلانے والے اور جن کو بلایا جاتا ہے' دونوں اندھے' بہرے' گونگے اور عقل وفکر سے کام ہی نہیں لیتے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کی عقل وفکر کی صلاحیتیں ہی مفلوج ہو جاتی ہیں' ان پر مہریں لگ جاتی ہیں۔ یہ دلیل ہی یہ دیتے ہیں کہ صاحب! یہ اسلاف سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ کبھی کھڑے ہو کر ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے کہ جس راستے پہ جا رہے ہیں وہ صحیح ہے یا غلط ہے۔ محض اس لیے اس پہ چلتے چلے جانا کہ اس روش کے اوپر پیچھے سے لوگ چلتے آ رہے ہیں اس لیے یہ صحیح ہے' درخورِ اعتنا نہیں ہے۔

کسی شخص کا بحیثیت مومن خدا کی آیات پر ایمان لانے کا طریق

عزیزانِ من! قرآنِ کریم تو مومن کی Definition (تعریف) ہی دوسری دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ (25:73) مومن انہیں کہا جاتا ہے' یہ وہ لوگ ہوتے ہیں کہ اور تو اور' جب ان کے سامنے خدا کی آیات بھی پیش کی جاتی ہیں تو لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (25:73) وہ ان پر بھی اندھے اور بہرے ہو کر نہیں گر پڑتے۔ مومن خدا کی آیات کو اس طرح آیات اللہ Accept (قبول) کرتا ہے کہ عقل وفکر کی رو سے' غور وفکر سے (Rationally) اپنے آپ کو Satisfy (مطمئن) کرتا ہے کہ یہ صحیح ہے۔ اس طرح سے جب آیات اللہ کی صداقت کو Accept (قبول) کیا جاتا ہے تو اس صورت میں اسے ایمان کہیں گے۔ جو اس طرح سے کریں گے انہیں قرآن مومن کہتا ہے۔ یہ ہے عمل (Process) جسے قرآن نے ایمان (Conviction) کہا ہے۔ قرآن نے جو کہا ہے وہ محکم' اصولی' کلیے ہیں' یقین ہے لیکن اس یقین کو کیسے Accept (قبول) کیا جاتا ہے کہ واقعی یہی یقینی ہے؟ اسے کس طرح تسلیم کیا جاتا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ اسے آنکھیں بند کر کے' کان بند کر کے نہیں بلکہ آنکھیں کان کھول کر' غور وفکر کی رو سے Accept (قبول) کیا جاتا ہے۔ مومنین کے متعلق یہ بات ہے۔

ایمان لانے کے سلسلہ میں خود نبی اکرمؐ کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد

مومنین کے متعلق سورۃ البقرہ میں جو کہا ہے وہ غور سے سنیے۔ کہا ہے کہ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (2:285) مومن تو ایک طرف' رسول بھی اسی طرح سے اس پر ایمان لایا ہے جو ہم نے اس پر نازل کیا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ مومن وہ ہیں جو خدا کی آیات پر بھی آنکھیں اور کان بند کر کے' اندھوں کی طرح' نہیں گر پڑتے۔ مومن وہ ہے جو ان کو عقل وفکر' غور وتدبر سے Accept (قبول) کرتا ہے۔ قرآن کی پہلے مخالفین کو دعوت ہے' ساری دنیا کو دعوت ہے۔ کہا ہے کہ یہ زندگی کے کچھ اصول ہیں' کچھ نظریئے ہیں' ضابطہ حیات ہے جو میں پیش کر رہا ہوں۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ یہ میرے ذہن کی تخلیق نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف سے ہے'

منزل من اللہ ہے۔لیکن میں تم سے زبردستی نہیں منوانا چاہتا کہ تم بھی مانو کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔کہا کہ میں جو میں پیش کرر ہا ہوں اُس کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (4:175) تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے یہ دلائل ہیں۔ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ (12:108)۔میں بھی ایسا کرتا ہوں اور جو میرا متبع سنت ہوگا وہ بھی یہی کرے گا کہ تمہیں دعوت علیٰ وجہ البصیرت دے گا کیونکہ قرآن کو خدا نے خود ''برھان'' کہا ہے۔کہا ہے کہ میں براہین پیش کرتا ہوں' دلائل کی رو سے پیش کرتا ہوں۔تم مخالفت کرتے ہو تو دھاندلی نہ کرو بلکہ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (2:111) اگر تم سچے ہو تو تم بھی دلائل پیش کرو۔

مذہب میں تو صرف اسلاف پرستی ہوتی ہے: نہ دلائل و براہین اور نہ فہم وفراست

عزیزانِ من! یہ دین کی باتیں ہورہی ہیں جبکہ مذہب میں دلیل آتی ہی نہیں ہے۔جہاں یہ چیز ہو کہ یہ اس لیے صحیح ہے کہ اسلاف سے ایسا ہوتا چلا آرہا ہے تو اس میں عقل وشعور وتدبر وفہم اور دلیل کا واسطہ کیا ہے۔دلیل صرف یہ ہے کہ پہلے سے ہوتا چلا آرہا ہے۔قرآن اپنے دعوے کو یہ کہہ کر پیش کرتا ہے کہ میں ہوں ہی ''برھان''۔مخالفین سے کہتا ہے کہ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (2:111) برھان لاؤ اگر سچے ہو۔انہیں بھی لے لیجیے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق ان براہین کو مان لیا کہ ہاں صاحب! یہ ایک کلیہ ہے' ایک یقینی اصول ہے جو دیا جارہا ہے لیکن وہ تو ان سے بھی کہہ رہا تھا کہ یہ بھی اس کو دیکھ کر' پرکھ کر' ایمان لائیں گے۔

ہر صحیح فارمولا اپنے صحیح ہونے کا ثبوت خود پیش کرتا ہے

اب سوال یہ ہے کہ یہ دیکھا اور پرکھا کیسے جائے گا؟ اس کے لیے کلیہ پیش کیا گیا ہے۔ریاضی میں' یہ جو طاق اعداد (Odd Numbers) ہوتے ہیں یعنی......3,5,7 یہ وہ ہیں جو دو پہ تقسیم نہیں ہوسکتے۔یہ ایک اصول ہے کہ کوئی دو طاق عدد لیجیے تو ان کا مجموعہ ہمیشہ جفت (Even Number) ہوگا۔وہ کہتے ہیں کہ اس کی دلیل کیا ہے؟ قرآن نے کہا کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ (39:39) تم سلیٹ پنسل یا کاپی لے کر ایک طرف بیٹھ جاؤ اور میں اپنی طرف بیٹھ جاتا ہوں اور تم طاق ہندسے (Odd Numbers) لیتے چلے جاؤ اور جمع کرتے جاؤ' تم کوئی ایک ہندسہ ایسا نکال کر بتاؤ جو میرے اس دعوے پہ پورا نہ اترے۔نہ نکال سکو گے تو ماننا ہوگا کہ جو میں نے کہا تھا وہ ٹھیک ہے۔اور وہ اسی طرح سے اپنوں سے بھی کہتا ہے کہ بابا! میں نے جو تمہیں کہا ہے کہ ایسے ہی نہ مان لینا۔مومن بھی اس طرح سے اس کو علیٰ وجہ البصیرت Accept (قبول) کرتا ہے۔یہ کوئی لمبی چوڑی بات نہیں ہے'' تم اپنے ہاں اپنے دعوے کے مطابق کام کرو' میں اپنے دعوے کے مطابق کام کرتا ہوں۔نہ میں تمہارے پروگرام میں دخل دیتا ہوں' نہ تم میرے پروگرام میں دخل دو''۔فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (39:39) ابھی معلوم ہوجائے گا۔میں کہتا ہوں کہ مثلث کے دو ضلعوں کا

مجموعہ تیسرے ضلعے سے ہمیشہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس میں جھگڑے کی کونسی بات ہے' جھگڑے کی بات کیوں کر رہے ہو؟ تم اپنے ہاں مثلثیں بناتے چلے جاؤ' میں اپنے ہاں بناتا چلا جاتا ہوں' قیامت تک بناتے چلے جاؤ تو کہیں اس میں سقم نہیں پاؤ گے۔ اسے یقینی کلیے کہتے ہیں۔ اور یہ ہوتا ہے جو برہان کی رو سے ثابت ہوتا ہے۔ اور برہان ہوتا ہے Pragmatic Test (استنتاجی امتحان)۔ اس پہ عمل کیا جاتا ہے تو پھر پتہ چلتا ہے ورنہ اگر آپ کہتے چلے جائیں کہ مثلث کے جو دو ضلعے ہیں وہ تیسرے سے زیادہ ہوتے ہیں تو اس کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے' دلیل صرف یہی ہے کہ ماپ کر دیکھ لو۔

مذہب ہمیشہ دلیل کا دشمن ہوتا ہے

عزیزانِ من! قرآن یا دین اپنی ہر بات کو دلیل کے زور سے منواتا ہے۔ کہا ہے کہ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ (2:111) وہ دوسرے سے مطالبہ کرتا ہے کہ دلیل لاؤ۔ مذہب وہ ہے جو دلیل کا دشمن ہوتا ہے' دلیل مانگنے والے کے مطابق پہلے ہی فیصلہ کر لیتے ہیں کہ اس کا ایمان ہے ہی نہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ایک واقعہ آپ کے ہاں فقہ کی کتاب کے اندر موجود ہے۔ امیہ کے دور (661-750AD) میں دمشق کی جامع مسجد' سب سے پہلی بڑی مسجد' بنی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد انجینئرز نے اپنے حساب کی رو سے یہ دیکھا کہ اُس کا رخ قبلے کی طرف نہیں ہے بلکہ ذرا ہٹا ہوا ہے۔ یہ Discussion (بحث) شامی میں موجود ہے کہ رخ ہٹا ہوا ہے۔ ان انجینئر زنے یہ کہا کہ اب یہ جو مسجد ہے اس کو تو سیدھا نہیں کیا جا سکتا البتہ اس کے اندر صفوں کی لائنیں ایسی لگا دی جائیں جن کا رخ صحیح ہو۔ اور اس کے بعد یہ کہہ دیا جائے کہ جو اور مسجد بنے وہ اس صحیح رخ پہ بنائی جائے۔ ادھر ہمارے علمائے کرام بیٹھ گئے جنہوں نے کبھی وہ آلہ ہی نہیں دیکھا ہوگا جس کی رو سے انہوں نے ماپ کے بتایا تھا۔ وہاں جو Discussion (بحث وتمحیص) ہوتی ہے اُس کا مدار یہ ہوتا ہی نہیں کہ آلہ کیا کہتا ہے اور عقل کیا کہتی ہے۔ اُس Discussion (بحث وتمحیص) کے بعد وہ ''علمائے کرام'' اس فیصلے پہ پہنچے کہ اگر ہم نے ان انجینئروں کی یہ بات مان لی تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ اس سے پہلے آج تک اس مسجد میں ہمارے اسلاف جو نماز پڑھتے رہے'' تے او ساری نمازاں اوت ای گئیاں ❶'' وہ باطل ہی ہوگئیں کیونکہ وہ غلط رخ پہ پڑھتے رہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اس چیز کو مانیں' انہوں نے ان انجینئروں کے متعلق ہی کہہ دیا کہ یہ غلط ہیں۔ یہ انہیں غلط کہنا زیادہ خیر کی بات ہے۔ اس لیے کہ جسے خیر کہا جاتا ہے وہ اتباعِ سلف کے اندر ہے۔ سو اب جس رخ پہ وہ نمازیں پڑھتے چلے جا رہے تھے اُسی رخ کے اوپر نمازیں پڑھی جائیں گی۔ عزیزانِ من! یہ ہے مذہب۔ دین تو قدم قدم کے اوپر کھڑے ہو کر سوچنے کو کہتا ہے کہ دیکھو! رخ صحیح ہے یا نہیں؟

---

❶ تو ان کی یہ ساری نمازیں بیوقوفانہ انداز میں باطل ہی ہوگئیں۔

آج ہمارے ہاں ان فتوؤں کو قانونی حیثیت سے تسلیم کیا جا رہا ہے

اس سے پہلے تو یہ بحثیں ہمارے ہاں محض نظری ہوا کرتی تھیں یا فتوؤں تک ہوتی تھیں لیکن اب اس نے ایک عملی اور قانونی شکل اختیار کر لی ہے۔ اب ہمارے ہاں یہ ایک (Movement) (تحریک) چلی ہے کہ جتنے غیر اسلامی، غیر شرعی قوانین ہیں انہیں اسلام کے مطابق بنایا جائے۔ یہ بڑی مبارک بات ہے، بڑا اچھا اقدام ہے کہ غیر اسلامی قوانین اسلامی بن جائیں لیکن اسلامی بنانے کے لیے جو Discussions (بحثیں) ہو رہی ہیں اُس کے لیے ہر قانون کے متعلق پوچھا جا رہا ہے یعنی دیکھا یہ جا رہا ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے، آیا یہ اُس کے مطابق ہو رہا ہے یا نہیں۔ ابھی ہم نے دیکھ لیا ہے کہ جب یہ چیز ہو کہ جو کچھ اسلاف سے ہوتا چلا آ رہا ہے اُس کے مطابق جو قانون بنے گا وہ صحیح قانون ہوگا تو اسلاف کے مطابق تو ہمارے ہر فرقے والا اپنے ہاں یہی سند اور دلیل دیتا ہے۔ ہمارے ہاں ابھی دو ہی قوانین بنے ہیں، آپ دیکھیے کہ ان میں کتنا اختلاف ہو رہا ہے۔ اختلاف کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ یہ قرآن کے خلاف ہے بلکہ یہ ہے کہ یہ فلاں کی فقہ کے خلاف ہے۔ اور فقہ تو اسلاف کا مسلک ہے کہ حنفی اس طرح سے مانتے چلے آ رہے ہیں، شافعی اس طرح سے مانتے چلے آ رہے ہیں، شیعہ حضرات اس طرح سے مانتے چلے آ رہے ہیں، اُن کے اسلاف کا یہ مسلک ہے اور ان کے اسلاف کا یہ مسلک ہے۔ کوئی بھی اپنے اسلاف کے مسلک کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس لیے ایک متفقہ علیہ قانون بنانا ہی ناممکن ہو رہا ہے کیونکہ بنیاد اس پر ہے کہ ”جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے اُس میں تبدیلی کرنے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ہے“۔ تقلید کا سب سے بڑا نقص یہ ہوتا ہے کیونکہ بنیاد اس پر ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے اُس میں تبدیلی کرنے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ہے۔ تقلید کا سب سے بڑا نقص یہ ہوتا ہے اور میں نے عرض کیا ہے کہ اس دور میں اس نے ہمارے ہاں ایک عملی شکل اختیار کر لی ہے۔

نبی اکرمؐ کی زندگی کے دوسو سال بعد بنائی ہوئی تاریخ کی حیثیت

آج حکومت یا سیاست کے اسلامی نظام کے متعلق یہی دلیلیں ہیں کہ یہ دیکھیے کہ فلاں دور میں قانون کس قسم کا تھا یا فلاں دور میں کس قسم کا تھا۔ یعنی یہ چیز نہیں ہے کہ جو قرآنِ کریم ہے، وہ کیا متعین کرتا ہے یا وہ کیا بتاتا ہے۔ اول تو ہماری تاریخ کی جو کیفیت ہے وہی ظاہر ہے، وہ خود تاریخ کے معیار پر بھی پوری نہیں اترتی۔ نبی اکرمؐ کی زندگی کے دوسو سال بعد بنائی ہوئی ہماری یہ تاریخ، بغیر کسی Previous Written Record (سابقہ تحریری رکارڈ) کے ہے۔ اسی لیے یہ جو چیز آتی ہے کہ صاحب! فلاں دور میں کیسا نظام تھا تو وہ ہر دور کا الگ الگ نظام تاریخ میں ملتا ہے۔ اور اگر ملے بھی تو وہ تو اُس دور کے تقاضوں کے مطابق وہ نظام تھا جو کسی نے بنایا ہوگا لیکن اس سارے

کی بنیاد اس پر ہے کہ نَتَّبِعُ مَا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا❶ (31:21)۔اب یہاں سے یہ نظر آتا ہے کہ قرآنِ کریم نے جو یہ بات اُس وقت زمانۂ نزولِ قرآن میں جو اہلِ کتاب تھے محض ان کے متعلق ہی نہیں کہی تھی بلکہ خود ہمارے متعلق بھی یہ بات کہی ہے کہ یہ امت بھی وہیں چلی جائے گی جہاں اہلِ کتاب پہلے سے گئے ہوئے ہیں۔ان سے بھی جب کہا جائے گا کہ بابا! قرآن موجود ہے اُس کے مطابق اُس کا اتباع کرو تو یہ بھی جواب میں یہ کہیں گے کہ بَلۡ نَتَّبِعُ مَا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا❶ (31:21)۔ہم اُسی مقام پہ آ چکے ہوئے ہیں۔

تاریخ کی کسی صحیح بات کی سند کو بھی کتاب اللہ کے ترازو میں تولنا ہوگا

سارے قرآن میں جہاں جہاں آپ دیکھیں تو قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ ان سے کہو کہ اللہ تعالیٰ نے جو نازل کیا ہے' اُس کا اتباع کریں۔ان کا جواب یہ ہے کہ نہیں! جو کچھ ہمارے ہاں اسلاف سے ہوتا چلا آ رہا ہے ہم اُسی کا اتباع کیے چلے جائیں گے۔قرآن کہتا ہے کہ اَوَلَوۡ كَانَ الشَّيۡطٰنُ يَدۡعُوۡهُمۡ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيۡرِ (31:21) خواہ شیطان انہیں اُس راستے پہ ڈال رہا ہو جو جہنم کی طرف لے جائے' یہ آنکھیں کھول کر راستہ نہیں دیکھیں گے بلکہ یہی کہیں گے کہ صاحب! اسلاف کا یہ راستہ ہے' ہم اُسی کے اوپر چلتے چلے جائیں گے۔یہ ضروری نہیں کہ آپ جب اس کے متعلق کچھ غور و فکر سے کام لیں تو ہر راستہ غلط ہی نکلے' ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کچھ صحیح باتیں بھی ہوں لیکن اُس کی سند یہ نہیں ہے کہ یہ ہوتا چلا آ رہا ہے' اس لیے ہم اس کو ایسے ہی مان رہے ہیں۔اُس وقت بھی سند یہ ہوگی کہ خدا کی کتاب نے ایسا کہا ہے۔دلیل اُس کی یہ ہوگی کہ ہم نے پرکھ کر دیکھ لیا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے۔خدا کے نظام کے صحیح ہونے کی دلیل تمہارے پاس عملی ٹیسٹ ہے۔اس لیے کہا کہ اعۡمَلُوۡا عَلٰى مَكَانَتِكُمۡ (39:39)۔نظام قائم کر کے اُس کے نتائج بتا دیں گے کہ جو ماننے والے ہیں' اُنہوں نے صرف اتنا کیا کہ اُس کو مان کر اُس بنیاد کے اوپر ایک عمارت بنانی شروع کر دی' وہ عمارت خود بتا دے گی کہ دعویٰ صحیح ہے لیکن وہ بنیاد تو اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ (7:3) ہے۔اور اسی لیے اُس نے کفر اور ایمان کے درمیان مابہ الامتیاز بات ہی یہ کہی ہے کہ مَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ (5:44) جو ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے ہیں انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔اسی سورۃ کی دو آیتیں (45 اور 47) ہیں' جن میں ان کو ظالم اور فاسق کہا گیا ہے۔

عقل و شعور سے محروم ہو جانے کی وجہ جواز

قرآن نے جو بڑی بات کہی تھی وہ یہ ہے کہ اگر انسان عقل و فکر سے کام لینا چھوڑ دے تو اس سے عقل و فکر کی صلاحیتیں ہی مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں۔یہی تو اس حیوان اور انسان میں فرق تھا۔انسان کو عقل و فکر و تدبر کی صلاحیتوں سے نوازا گیا تھا۔اگر انسان اس صلاحیت

---

❶ ہم تو اسی ڈگر پر چلتے جائیں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 950)

کے ہوتے ہوئے اس سے کام لینا چھوڑ دے یا آہستہ آہستہ کام لینا چھوڑ دے تو یہ مفلوج ہی ہو جائیں گی۔ اسی لیے تو قرآن کہتا ہے کہ یہ حیوان ہی نہیں بَلْ هُمْ اَضَلُّ (7:179) بلکہ حیوان سے بھی پست درجے پر آ جاتا ہے کیونکہ حیوان کو تو یہ صلاحیتیں دی ہی نہیں گئی تھیں‘ اس لیے وہ اگر ان سے کام نہیں لیتے ہیں تو وہ تو قابلِ مواخذہ نہیں ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا (7:179) ان کو تو سمجھنے‘ سوچنے‘ دیکھنے بھالنے کی صلاحیتیں دی گئی تھیں اور یہ ان سے کام نہیں لیتے‘ اس لیے یہ كَالْاَنْعَامِ (7:179) ہی نہیں ہیں بَلْ هُمْ اَضَلُّ (7:179) بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔

اگر قدرت انسان کو ارتقائی صلاحیتوں سے نہ نوازتی تو آج اس کا حشر بھی حشرات الارض یا جنگلی جانوروں جیسا ہی ہوتا

یہ تو اللہ کا احسان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کیا‘ اس نے انہیں تقلید پر نہیں رہنے دیا ورنہ سائنس بتا رہی ہے کہ سب سے پہلے جو تخلیق ہوئی تھی‘ وہ ایک جرثومۂ حیات سے آگے بڑھی تھی‘ پھر وہ جو مگرمچھ اور چھپکلیاں تھے اگر اُس اسٹیج کے اوپر آ کر آگے سلسلہ تقلید کا چلتا ’’تے اسی تسی کوڑ کرڑلیاں ہوندے[1] ہیگے‘‘ یعنی اگر اسلاف کے راستے پہ چلتے جاتے تو کوڑ کرڑلی[2] کے آگے کوڑ کرڑلی ہی پیدا ہونی تھی۔ وہ تو میں نے کہا ہے کہ اللہ کا احسان ہے کہ اُس نے تقلید کے بجائے ارتقا کا راستہ رکھا کہ اُس نے اُس چھپکلی کو آگے انسان بنا دیا۔ اگر انسان تقلید کے اوپر چلتے تو آپ کے پہلے انسان تو غاروں میں رہا کرتے تھے‘ درختوں کے اوپر رہا کرتے تھے‘ درختوں کے پتوں سے ستر ڈھانپا کرتے تھے‘ اگر وہاں سے تقلید کا راستہ آگے اختیار کیا جاتا تو آپ سوچ لیں کہ میں اور آپ آج کیسے ہوتے۔

عزیزانِ من! زمانے کے تقاضے قدم قدم پر بدلتے چلے جاتے ہیں۔ قرآن تو بتاتا ہے کہ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (10:64) یہ صرف اللہ کے کلمات ہیں‘ جن میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ باقی جو ہر شے ہے اُس میں ہر زمانے کے تقاضے کے مطابق تبدیلی ہوتی چلی جائے گی۔ قرآن نے واضح الفاظ میں یہ کہا ہے کہ اسلاف نے جو کچھ کیا ہے لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ (2:134) جو اُنہوں نے اچھے کام کیے‘ ان کا کریڈٹ ان کو جاتا ہے۔ ٹھیک ہے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق غور و فکر کیا ہوگا‘ اُنہوں نے کچھ قوانین بھی بنائے‘ انہوں نے فقہیں بھی بنائیں تو ان کا کریڈٹ ان کو جاتا ہے‘ اس کا احترام ہے لیکن قرآن کہتا ہے کہ وہ ان کے لیے ہے

---

[1] تو ہم پھر چھپکلیاں ہی چھپکلیاں ہوتے۔
[2] چھپکلی

لیکن جو کچھ تم کرو گے وہ ہے جو تمہارے لیے ہے۔ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (2:134) ہم تم سے پوچھیں گے ہی نہیں کہ اُنہوں نے کیا کیا تھا۔ ہم سے تو پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا کیا تھا۔ اتباعِ ما انزل اللہ کا جو ہم بار بار حکم دیتے تھے، ہم تم سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ اُنہوں نے یہ کیا تھا یا نہیں کیا تھا بلکہ ہم تم سے پوچھیں گے کہ تم نے کیا تھا یا نہیں کیا تھا۔ اس ''پوچھیں گے'' کو ہم نے مرنے کے بعد کی زندگی پر ڈال دیا ہے جب کہ آج ہم سے پوچھا جا رہا ہے کہ تم کیا کر رہے ہو۔ عزیزانِ من! یہ Negative (منفی) چیز تھی۔ اسے قرآنِ کریم نے یہاں ختم کر کے آگے Positive (مثبت) دیا ہے۔ کہا ہے کہ وَ مَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى وَ اِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (31:22)۔

وقت ہو گیا ہے اس کو ہم آئندہ درس پہ چھوڑ دیتے ہیں۔ سورۃ لقمان کی آیت 21 تک ہم آ گئے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

پانچواں باب: سورۃ لقمٰن (آیات 22 تا 32)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج نومبر 1979ء کی 9 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ لقمٰن کی آیت 22 سے ہو رہا ہے: (31:22)

اسلاف پرستی یا اندھی تقلید کے تباہ کن نتائج

اس سے پہلی آیت یعنی پچھلے درس کی آخری آیت، جو زیرِ غور آئی، اُس میں دو اہم باتیں ہمارے سامنے آئی تھیں۔ اصل میں یہ ایک ہی بات کے دو گوشے تھے۔ کہا ہے کہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (31:21)۔ ایک ہی مرتبہ یہ آیت نہیں آئی بلکہ بار بار دہرائی گئی ہے۔ اس کا عام ترجمہ تو یہی ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم خدا کی

طرف سے نازل کردہ کتاب کا اتباع کرو' اُس کی اطاعت کرو' اُس کے قوانین کے مطابق چلو تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں' ہمارے اسلاف جس طریقے پہ چلتے آئے ہیں ہم اُسی طریقے پہ چلتے جائیں گے۔ قرآنِ کریم نے ان کی اس ذہنیت کی اتنی مذمت کی ہے' اسے باعثِ عذاب بتایا ہے۔ عذاب یہ ہے کہ جہنم کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو سینے میں دل تو رکھتے ہیں لیکن اُس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے' آنکھیں بھی ہوتی ہیں ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے' کان بھی ہوتے ہیں ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یعنی بتایا یہ ہے کہ یہ جو مسلک ہے یا یہ جو ذہنیت ہے کہ جس طریق پہ ہمارے اسلاف چلتے آرہے ہیں' اسلاف سے جو طریقہ ہم نے پایا ہے' کہ ہم اُسی پہ چل کے جائیں گے' یہ کبھی کھڑے ہو کر سوچیں گے نہیں' دیکھیں گے نہیں' پرکھیں گے نہیں کہ کیا یہ صحیح راستہ ہے یا غلط راستہ ہے؟ کہا ہے کہ اس سے ہوتا یہ ہے کہ دو چار نسلوں تک اگر یہ روش متواتر چلی آئے تو اس میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں بالکل مفلوج ہو جاتی ہیں۔ قرآن نے پہلے كَالْأَنْعَامِ (7:179) کہا ہے کہ وہ انسانی سطح پہ رہتے ہی نہیں ہیں' حیوان کی سطح پہ رہتے ہیں۔

عزیزانِ من! پہلی چیز تو یہ ہے کہ حیوان کی سطح اسلاف کا راستہ ہے۔ آج بھی بھیڑ اُسی طرح سے وہ کچھ کرتی ہے جس طرح سے دس کروڑ سال پہلے کی بھیڑ کیا کرتی تھی' ہر بھیڑ آگے جانے والی بھیڑ کے راستے پہ چلتی ہے۔ بھیڑ کا میں نے اس لیے کہا ہے کہ ہمارے ہاں ''بھیڑ چال'' محاورہ ہے ورنہ حیوان جتنے بھی ہیں' وہ اپنے اسلاف کے راستے پہ چلتے ہیں لیکن قرآن نے ان انسانوں کے متعلق جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتے' دلیل یہ دیتے ہیں کہ ہم تو اسی راستے پہ چلیں گے جس راستے پہ متواتر ہمارے بڑے بوڑھے چلتے آرہے ہیں' ان کو كَالْأَنْعَامِ کہنے کے بعد کہا کہ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (7:179) وہ حیوان سے بھی بدتر ہیں۔ وہ حیوان قابلِ مواخذہ نہیں ہیں کیونکہ انہیں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں دی گئی تھی' ایک متعین راستے پر چلنا ان کی فطرت تھا۔ انسان کی تو فطرت ہی کوئی نہیں ہے' اسے تو سمجھنے سوچنے کی صلاحیت دی ہے اور دو راستے دکھائے ہیں۔ کہا ہے کہ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ [1] (90:10)۔ حیوانات کو دو راستے نہیں دکھائے گئے۔ اس کے بعد یہ کہ اس کی طرف وحی کے ذریعے سے قوانین خداوندی بھیجے گئے' ہدایت دی گئی اور اس کے باوجود اگر یہ وہ روش اختیار کرنا چاہتے ہیں اور اُسی پہ مصر اور بضد رہتے ہیں جو حیوانات کی روش ہے یعنی جس طریقے پہ پچھلے چلتے آئے ہیں' اسی پہ چلتے جائیں گے تو کہا کہ یہ كَالْأَنْعَامِ (7:179) نہیں بَلْ هُمْ أَضَلُّ (7:179) ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس ذہنیت کی بڑی مذمت کی ہے۔ **ما انزل الله** کے اتباع میں چلنا' اُس کی اطاعت کرنا دین ہے۔ یہ ذہنیت کہ جس راستے کے اوپر ہم چلتے آرہے ہیں اور جو متواتر ہم تک پہنچ رہا ہے ہم اُسی پہ چلتے جائیں گے' مذہب ہے۔ مذہب میں ہوتا ہی یہ ہے کہ سمجھنے سوچنے کی صلاحیت سلب

---

[1] اس کے ساتھ ہی ہم نے اسے وحی کے ذریعے' صحیح اور غلط راستے' ابھار اور نکھار کر بتا دیئے ہیں (انسانی ذرائع علم اور وحی کی روشنی ...... دونوں) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1451)۔

ہو جاتی ہے۔ان کے ہاں تو **کل بدعۃ ضلالۃ و کل ضلالۃ فی النار** ہر نئی چیز (یعنی اُس راستے سے ہٹی ہوئی جو چلا آ رہا ہے) گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جاتی ہے۔قرآنِ کریم کے اصولوں میں سے یہ ایک بنیادی بات ہے کہ اس نے اس مسلک کی بڑی ہی مذمت کی ہے اور آپ دیکھیں گے کہ اس کا اثر صرف مذہب کے دائرہ تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ جس قوم کی نفسیات یہ ہو جائے اُس کی زندگی کے ہر دائرے میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ دائرے کے اندر سفر کرتی ہے۔کولھو کا بیل سارا دن چلتا رہتا ہے اور شاید پچاس میل کا سفر طے کر لیتا ہو گا لیکن شام کو وہیں کھڑا ہوتا ہے جہاں سے صبح چلا تھا۔

تقلید پرستی کے باعث قوم صراطِ مستقیم کی منزل سے ہی محروم ہو جاتی ہے

قرآنِ کریم نے جو صراطِ مستقیم کی ہدایت کی دعا سکھائی' تمنا سکھائی' آرزو سکھائی' مقصد سکھایا تو وہ صراط سیدھا راستہ ہوتا ہے۔اس سے پہلے جو یونانی تصور چلا آ رہا تھا کہ زندگی **Cyclic Order** (دائروی ترتیب) میں چلتی ہے' چکر میں چلتی ہے' آگے نہیں بڑھتی' قرآن نے اس تصور کو کاٹ کر رکھ دیا۔قرآن تو صراط مستقیم' سیدھے راستے پہ چلاتا ہے۔سیدھے راستے پہ چلنے والے کا جو ہر قدم ہے وہ پچھلے قدم سے آگے بڑھے گا' آگے چلے گا۔وہ یہ تو نہیں ہو گا کہ وہ سفر کرتا رہے لیکن آگے نہ بڑھے۔قرآن تو انسانیت کو آگے بڑھانے کے لیے آیا ہے' وہ اس کو ارتقائی منازل طے کرانے کے لیے آیا ہے اور اسی لیے صراطِ مستقیم کے ساتھ اُس نے خدا کو ذی المعارج بھی کہا ہے یعنی سیڑھیوں والا خدا۔جب اپنے اندر خدائی رنگ رنگنا ہے تو پھر تو سیدھا بھی جانا ہے اور بلندیوں کی طرف بھی جانا ہے اور اگر کیفیت یہ ہے کہ دس ہزار سال پہلے یا ہزار سال پہلے جس مقام کے اوپر ہمارے بڑے بوڑھے کھڑے تھے' اُسی مقام کے اوپر آج ہم کھڑے ہیں تو یہ صراطِ مستقیم نہیں ہے بلکہ یہ **Cyclic Order** (دائروی ترتیب) ہے اور اسی کی مذمت قرآن کرتا ہے۔

ٹیکسلا کے میوزم میں 5 ہزار سال پیشتر رکھی ہوئی اشیا اور آج وہاں کے گاؤں کی حالت

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ اس کا جو اثر ہے' جو نقصان ہے' وہ مذہب کے دائرے تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ زندگی کے سارے گوشوں کو متاثر کر جاتا ہے۔کبھی آپ ٹیکسلا گئے ہوں تو وہاں آثارِ قدیمہ کی ایک بستی ہے جو چار پانچ ہزار سال پہلے کی ہے۔اُس کا ایک میوزیم (عجائب گھر) ہے' میوزیم میں شیلف کے اندر پانچ ہزار سال پہلے جو کچھ اس بستی کے اندر سے روزمرہ کے استعمال کی چھوٹی موٹی چیزیں نکلی تھیں' وہ وہاں انہوں نے لگائی ہوئی ہیں مثلاً عورتوں کے پہننے کے زیورات' ان کے کپڑے' اوزار' ہتھیار' کھانے پینے کی چیزیں' گھر کے اندر کا چولہا چمٹا وغیرہ۔یہ سارا وہاں اُنہوں نے رکھا ہے۔میں نے انہیں دیکھا اور باہر نکلے تو سامنے وہ ٹیکسلا کا گاؤں تھا' اُس بستی میں سے جتنی عورتیں نکل رہی تھیں' اُنہوں نے وہی کچھ پہن رکھا تھا جو میوزیم کے اندر رکھا ہوا تھا۔اُس بستی میں لوہار کی دکان پہ گئے'

ترکھان کی دکان پہ گئے تو جو اوزار اُس میوزیم میں رکھے ہوئے ہیں، وہی ان کی دکانوں میں آج بھی ہیں اور چولہا، توا، چمٹا تو ہمارے گھروں میں بھی وہی تھا جو ٹیکسلا میں رکھا ہے یعنی پانچ ہزار سال پہلے استعمال کی جو چیزیں تھیں وہ آج بھی اسی مقام پہ اسی طرح سے بنتی ہیں۔ دنیا چاند پہ چلی گئی لیکن یہاں ہمارے ہاں توے میں فرق نہیں آیا۔ یہاں ہمارے ہاں وہ جو لکڑی کا گڈا بناتے ہیں وہ بھی وہی ہے جو ٹیکسلا میں رکھا ہوا ہے۔ وہ ترکھان جب گڈا بنا رہا ہوتا ہے تو وہ ساتھ بیٹھا ہوا بوڑھا حقہ پیتے ہوئے کہتا ہے کہ "اوئے بے پیرا! تیرے پیو نے ایتھے مچھل لایا سی یا کیل لائی سی ❶"؟ مچھل لکڑی کی کیل سی ہوتی ہے۔ یعنی مچھل کی جگہ وہاں پہ لوہے کی کیل یا میخ لگاتا ہے تو وہ بوڑھا اُسے بے پیرا اور بے مرشدا کہتا ہے۔ پیرومرشد والے تو وہ ہیں جہاں اُس نے مچھل لگائی تھی، یہ بھی مچھل لگائے۔ جب تک یہ اُس کے طریقے پہ چلے گا تو ٹھیک ہے لیکن اگر اُس نے یہاں مچھل کی جگہ میخ لگا دی ہے تو پھر یہ بے پیرا بے مرشدا ہو گیا۔ آپ کو معلوم نہیں کہ بے پیرا یا بے مرشدا ہونا کتنی بڑی گالی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ

ہوئی لاکھ دنیا اِدھر کی اُدھر ہے
وہی سنگِ در ہے، وہی اپنا سر ہے

تقلید پرست قوم کی حالت: گڑ کی ڈلی اور کڑوے تیل کی جستجو شگونوں کے لیے

یہ قوم پتھر کی چٹانوں کی طرح، بتوں کی طرح، مُردوں کی طرح اُسی مقام پہ کھڑی ہے۔ ایسی قوم کے افراد ممی شدہ لاشیں ہوتی ہیں، یہ جیتے جاگتے متحرک انسان نہیں ہوتے۔ پھر معاشرت کی زندگی کے اوپر اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ یہ جتنی رسومات ہمارے ہاں ہوتی ہیں، وہ وہی چیز ہو رہی ہے جو ہزار سال پہلے ہوتی تھی یا دس ہزار سال پہلے ہوتی تھی۔ کسی شادی بیاہ یا فوتگی کی رسومات آپ دیکھ لیجیے۔ پچھلے دنوں پتہ چلا کہ وہ گڑ کی ڈلی ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ آج کل اول تو گڑ ملتا بھی نہیں ہے، ملے بھی تو وہ ویسا نایاب ہو گیا ہے کہ وہ بہت مہنگا ہو گیا ہے۔ پوچھا کہ کیا وہ گڑ حکیم نے بتایا ہے؟ کہنے لگے کہ نہیں! "او شگن اچ دینا ہیگا"۔ تے اوتھے گڑ ای دتا جاندا اے۔ اوہدے اچ کھنڈ نہیں دتی جاندی"۔ ❷ آپ ان کو لاکھ سمجھائیے کہ صاحب! اس کی بجائے آپ چینی کی بوری دیدیں لیکن وہ یہی کہیں گے کہ "نہیں، صاحب! اے تے شگناں دی گل ہوئی ناں۔ چینی دین نال تے بے شگنی ہوندی ہیگی ❸"۔ یہ وہی ہے جسے قرآن بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا

---

❶ ابے او بے پیرومرشد! سن، تیرے باپ نے کیا یہاں مچھل لگایا تھا یا کیل؟

❷ وہ شگن شگون، فال، نذرانہ میں دینا ہے۔ وہاں تو گڑ ہی دیا جاتا ہے اس میں چینی نہیں دی جاتی۔

❸ یہ تو شگون کی بات ہے۔ چینی دینے سے تو یہ بے شگونی ہو جاتی ہے۔

عَلَيۡهِ اٰبَآءَ نَا (31:21) کہتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں یہی ہوتا ہے اور کبھی آپ حساب لگا کر دیکھیے کہ آپ کی شادی بیاہ یا مرنے جینے پہ حقیقی خرچ کتنا ہوتا ہے اور اس بَلۡ نَتَّبِعُ مَا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَ نَا پہ کتنا خرچ ہوتا ہے۔ دلہن آ رہی ہے دروازے کے اوپر کھڑی ہے تو کہتے ہیں کہ ''نی کوڑا تیل لے آ مرجانی۔ اے تینوں کہندا پیاسی''❶۔ یعنی اُس کے لیے کڑوا تیل چاہیے۔ جس گھر کے اندر بجلیاں چلتی ہوں تو اب تو وہاں مٹی کا تیل نہیں ہوتا تو کڑوا تیل کہاں سے ہو۔ دلہن کھڑی ہے تو اُس وقت ڈھنڈیا پڑ رہی ہے اور وہ اندر اُس وقت تک نہیں جا سکتی جب تک وہ کڑوا تیل نہ ہو۔ یعنی یہ چیزیں جو ہیں یہ بڑی گہری ہیں' یہ ذہنیتوں کے اندر چلی گئی ہوئی ہوتی ہیں۔ اگر کہیں ایسا ہو جائے کہ ایک دلہن کو تیل کے بغیر اندر لے جایا جائے تو کہتے ہیں کہ اللہ خیر کرے ''وہ ہٹی نوں بے شگنوں اندر لے آندا اے❷۔'' عزیزانِ من! یہ محض باتیں نہیں ہیں جو ہمارے ہاں گھروں میں ہوتی ہیں' گھروں میں ہی نہیں' باہر معاشرے میں یہ کچھ ہو رہا ہے۔ یہ ساری چیز وہ ہے جو مذہب میں پیدا کی گئی ہے کہ بَلۡ نَتَّبِعُ مَا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَ نَا (31:21)۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ آج آپ کو کتنی مصیبت پڑی ہوئی ہے۔

احیائے اسلام کے سلسلہ میں کی جانے والی کوشش کی نوعیت

ذرا اوپر کی سطح پر چلیے۔ یہ بڑی خوش کن بات تھی کہ اس دور میں ہمارے ہاں احیائے اسلام کے متعلق کچھ باتیں چلیں' کچھ کوششیں بھی ہوئیں لیکن جتنے لوگ اس کے لیے کوشش کرنے بیٹھتے ہیں' ان کی پہلی تاکید یہ ہوتی ہے کہ آپ غور و خوض کر کے یہ بتائیں کہ اس معاملے کے متعلق امیر کا انتخاب کیسے ہوگا' پارلیمنٹ کا درجہ کیا ہوگا' مشاورت کیسے ہوگی' قانون کیسے بنیں گے۔ اس طے کرنے میں پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ فلاں امام نے اس کے متعلق کیا لکھا ہے۔ یعنی خود تحقیق کر کے نئے سرے سے یہ چیزیں بنانے کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں اور تاکید یہ ہو رہی ہے کہ ہزار سال پہلے کی فلاں کتاب میں کیا لکھا ہے۔ سارے جھگڑے اس پہ ہوتے ہیں کہ ابنِ خلدون (732-808/1332-1406) نے یہ کہا ہے' فلاں یہ کہہ گیا ہے۔ اب ان میں آپس میں بیٹھے ہوئے ٹکراؤ ہوتا ہے' اس ٹکراؤ کو سلجھا رہے ہیں:

ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں

---

❶ کڑوا تیل لے آؤ۔ یہ تجھے کہہ رہا تھا۔

❷ دلہن کو بغیر شگون پورے کیے گھر کے اندر لے آئے ہیں۔

❸ میں آپ سے کہہ رہی تھی کہ اسے (دلہن کو) بغیر تیل کے شگون کے اندر نہ لاؤ۔ آپ دیکھ رہے ہو کہ کیا ہوا ہے۔

یہ سرا **ما انزل اللہ** میں ملے گا۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوششیں اتنی ہیں لیکن Cyclic Order (دائروی نظم) کے اندر ہوتی ہیں' دائرے کے اندر ہوتی ہیں: نشستن و گفتن و برخاستن' ایک قدم آگے نہیں بڑھ رہا' اس لیے کہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ ہزار سال پہلے ان کے ہاں کی کسی مسلمان سلطنت میں کیا طریقہ رائج تھا۔ اوّل تو تاریخ ہی آپ کی ایسی نہیں جو قابلِ اعتماد ہو اور اگر ہو بھی تو وہ اُس دور کے تقاضوں کے مطابق اپنے لیے انہوں نے کوئی راستہ تجویز کیا تھا' آج کے زمانے کے تقاضے بدل گئے' آج کے زمانے کے حالات و کوائف بدل گئے ہیں لہٰذا ان کے مطابق سوچیے کہ کیا کرنا ہے۔

ہمارے ہاں کی آسودہ حالی اور تحقیق کرنے کا معیار

عزیزانِ من! یہاں تو مشکل یہ ہے کہ جب یہ دَور آتے ہیں تو ان میں تو پھر یہ ڈھنڈیا پڑتی ہے کہ دیکھیے فلاں امام نے کیا کہا' فلاں دور میں کیا ہوا' پہلے دور میں کس طرح سے ہوا۔ یہ سارا کچھ جتنا بھی ہے یہ تو نعل بہ نعل' قدم بہ قدم' ایک ایک قدم' اُس کے مطابق ہونا ہے۔ اب یہ ساری تہذیب ہی اُس کے اوپر ہے کہ وہ کیسے ہوتے تھے' کیسے رہتے تھے' کیسے کرتے تھے بلکہ اُس سے آگے جاتے ہیں تو گویا اور بھی سندیں لانی شروع کرتے ہیں۔ ساری زندگی کے اندر تو یہ کچھ ہوتا ہے' کبھی یہ نہیں سوچتے کہ وہ تو ایک مسجدِ نبویؐ جس کے اوپر کھجور کے پتوں کی چھت پڑی ہوئی تھی اور نیچے کچا فرش تھا' وہاں بیٹھ کر یہ سب معاملات سلجھاتے تھے اور آپ Inter Continental میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر اسلاف بننا ہے تو ایسے بنو۔ جو طریقہ آپ اختیار کر رہے ہیں وہ تو اسلاف کے خلاف نہ ہو اور سفر آپ ہوائی جہاز میں کر رہے ہیں' اتنے اتنے بڑے ہوٹلوں میں رہ رہے ہیں' اتنی اتنی بڑی کاروں میں سفر ہو رہا ہے۔ اس میں تو اسلاف کا راستہ یاد نہیں رہتا لیکن یہ کہ تلوار کی لمبائی کتنی ہونی چاہیے' اس کے لیے اسلاف کی تلواریں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ زندگی کے اندر پھر کس قدر تضاد واقع ہو جاتا ہے۔ قرآن صراطِ مستقیم کہتا ہے اور اس کے لیے پھر راستے کے بعد اُس نے آوارہ نہیں چھوڑ دیا بلکہ اُس نے آپ کے لیے ما انزل اللہ ایک کسوٹی دیدی ہے اور اس نے اسی لیے اس کو مکمل بھی کہہ دیا ہے' غیر متبدل کہہ دیا ہے' اس کی حفاظت خود اپنے ذمے لے لیا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے آپ اس کی حفاظت کرتے رہیے' یہ ہمارے تو کسی کام میں آتا نہیں۔ ہم تو **بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا**[1] (31:21) والی بات کریں گے' وہ کتابیں سنبھال کر رکھیں گے' وہ کتابیں دار العلوموں کے اندر پڑھائیں گے' اُس پہ دستارِ فضیلت ہم دیں گے۔

---

[1] نہیں صاحب! ہم تو اسی ڈگر پر چلتے جائیں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔950)۔

ہمارے دار العلوموں کے نو سالہ کورس میں قرآنی حقائق کو سمجھنے کے سلسلہ میں بے رخی کی کیفیت

آپ کو معلوم ہے کہ ان کے ہاں دار العلوموں کا نو سال کا کورس ہوتا ہے۔ نو سال کے اس کورس میں آخری سال میں قرآنِ کریم کی صرف سورۃ البقرہ کی ایک تفسیر پڑھائی جاتی ہے' وہ بھی اسلاف کی تفسیر ہے۔ یہ چیز جو ہے میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ قرآن نے بار بار یہ جو کہا ہے تو اس کا تعلق مذہب سے نہیں ہے بلکہ یہ جو ذہنیت ہے' یہ جو مسلک ہے' یہ جو قوم کے اندر نفسیاتی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ جس طرح سے ہوتا چلا آ رہا ہے اُسی طرح سے ہوتا چلا جائے تو اس سے قوم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔

قرآنِ حکیم کی طرف سے پیش کردہ تعلیم کا انداز

قرآن تو انسان کے لیے ارتقائی منازل بتاتا ہے' وہ تو صراطِ مستقیم پہ چلاتا ہے' دائرے میں نہیں چلاتا۔ اس لیے دین کا مسلک یہ ہے کہ خدا کی کتاب آپ کے پاس آخری سند' حجت' اتھارٹی' کسوٹی ہے' اُسے دیکھیے اور اپنے زمانے کے حالات دیکھیے۔ اور وہ جو قرآن ہے خدائے خبیر و علیم نے قیامت تک ساری نوعِ انسان کے لیے ضابطہ دینا تھا تو اُسے ہونا ہی یہ چاہیے تھا کہ وہ حدود (Limits) مقرر کرتا ہے' **Boundaries** مقرر کرتا ہے لیکن اُس کے اندر کی جزئیات خود نہیں دیتا۔ وہ یہ تو کہتا ہے کہ **اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ** (42:38) باہمی مشاورت سے اپنے معاملات طے کرو لیکن اس مشاورت کی **Detail** (تفصیل) نہیں دیتا۔ وہ **اعدلوا** (5:8) کہتا ہے یعنی عدل کرو لیکن وہ یہ نہیں بتاتا ہے کہ اس عدل کرنے کے طریقے کیا ہوں گے' **Procedure** خود متعین کرو۔ یہ طریقے زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتے جائیں گے اور وہ (حدودِ کار) جو غیر متبدل **Boundaries Lines** ہیں' وہ اپنے مقام پہ رہیں گے۔

عزیزانِ من! یہ سمجھنے کے لیے ہاکی یا فٹبال کے میدان کو دیکھیے تو بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ اُس کی جو **Boundary Line** یا اُس کے لیے جو قواعد و ضوابط مقرر ہوتے ہیں' وہ تو اپنے مقام پہ ہوتے ہیں اور اُس کے بعد یہ دونوں ٹیمیں اس باب میں آزاد ہوتی ہیں' لیکن اس آزادی میں ایک پابندی ہوتی ہے کہ ان گیارہ کھلاڑیوں کے سامنے ایک نصب العین ہوتا ہے' ایک **Goal** (ہدف) ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر کھلاڑی خواہ وہ دائیں پہ ہے یا بائیں پہ ہے' آگے ہے یا پیچھے ہے' وہ کہیں بھی ہے لیکن ہر ایک کی توجہ اُس گول کی طرف ہے کہ میں نے گیند وہاں پہنچانا ہے حتیٰ کہ ان کے ہاں کا جو کیپٹن ہوتا ہے یہ ٹھیک ہے کہ ٹیم کا سربراہ ہوتا ہے تو اُس کے سامنے بھی یہی گول ہوتا ہے کہ میں نے گیند یہاں پہنچانا ہے' وہ بھی ان قواعد کا پابند ہوتا ہے جو **Boundary Lines** (حد کی لائنیں) ہوتی ہیں' اندر کی لائنیں بھی ہوتی ہیں۔ خواہ وہ کیپٹن ہے خواہ وہ **Player** (کھلاڑی) ہے وہ باؤنڈری لائنز جو ہیں وہ ہیں جسے قرآن نے حدود اللہ کہا ہے۔ ان حدود اللہ کو **Cross** (تجاوز) نہیں کرنا بلکہ وہ کہتا ہے کہ ان کے تو قریب بھی نہ جانا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ذرا زور سے گیند لگ جائے اور

وہ باہر چلا جائے **لاتقربو** (2:35) ان کے قریب بھی نہ جاؤ لیکن وہ باؤنڈری لائنز ہیں ان کے اندر آپ کو آزادی بھی ہے اُس میں اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق آپ سب کچھ خود Practice کیجیے۔ Player (کھلاڑی) کو آزادی ہوتی ہے کہ وہ زور سے ہٹ لگائے یا آہستہ ہٹ لگائے یا ذرا دائیں کو کردے یا ذرا بائیں کو کردے تو اُس کو اس کی پوری آزادی ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! یہ ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ غیر متبدل قوانینِ حدودِ خداوندی کے تابع رہتے ہوئے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق جزئیات، Procedure (طریقۂ کار) Process خود طے کیجیے۔ اس پہ جب بھی کوئی قوم آئے گی تو وہ دیکھیے گا کہ کس طرح سے آگے ہی نہیں بڑھتی بلکہ قرآن کہتا ہے کہ وہ تو **امام للناس** ہوجاتی ہے، نوعِ انسانی کی امامت اُس کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔

وحی خداوندی کی مقرر کردہ حدود کو نظر انداز کرنے کی بنا پر اہلِ یورپ کی حالت

مشرق جو مذہب زدہ ہے وہ تو دائرے کے اندر (Cyclic Order) جا رہا ہے، اس میں **مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا** کارفرما ہے۔ مغرب نے آزادی حاصل کی تو اُس نے حدود ہی توڑ دیں یعنی اُس کے لیے کوئی غیر متبدل حدود ہیں ہی نہیں۔ جب غیر متبدل حدود باقی نہ رہیں تو اُس ہاکی کے میدان کا اندازہ لگائیے جس میں دونوں ٹیمیں ان حدود اور ان قیود کا کوئی خیال نہ کریں اور وہ دونوں Sticks (ہاکیاں) ہاتھ میں لیے ہوئے چلیں تو پھر وہی ہوتا ہے جو اقوامِ مغرب میں ہو رہا ہے۔ وہاں حدود کے نہ ہونے نے اس قدر خلفشار مچا رکھا ہے کہ آپ خلفشار کی وسعتوں کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔ قوتیں تو چاند تک پہنچنے کی ہیں، حدود اور قیود کوئی متعین نہیں ہیں تو پھر ظاہر ہے وہی ہوتا ہے جیسے ہاکی کے میدان میں Sticks (ہاکیاں) چلا کرتی ہیں۔

مذہب پرست قوموں کی حالت

جو مذہب پرست قومیں ہیں، ان کے ہاں صورت یہ ہے کہ ہزار دس ہزار پانچ ہزار سال پہلے جہاں سے کوئی قوم شروع ہوئی تھی، اُسی مقام میں چکر لگ رہا ہے، دائرے کے اندر چکر لگ رہا ہے اور ایک قدم آگے نہیں بڑھ رہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن بات تو ایسے کرتا ہے جیسے یہ مذہب کی دنیا کی بات ہے لیکن وہ تو زندگی کے ہر گوشے کو ساتھ لیتا ہے۔ اسی لیے وہ بار بار ان قوموں سے یہ کہتا ہے کہ جب یہ کہیے کہ آپ کے پاس جو سند اور حجت اور کسوٹی ہے، کیا وہ خدا کی کتاب ہے، تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں! اسلاف کا جو مسلک ہے، ہم اس پر چلتے چلے جائیں گے **أَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ** (31:21) آنکھیں بند کیے چلے جائیں گے خواہ ان کو شیطان دھکیل کے جہنم میں ہی کیوں نہ لے جائے۔ یہ قومیں جہنم میں ہی تو ہوتی ہیں جو اپنی سوچ سمجھ سے کام نہیں لیتیں اور خدا کی غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے کام نہیں کرتیں، جہنم اسی کو کہتے ہیں۔ جہنم کے لیے قرآن میں ایک لفظ جحیم ہے، جحیم اُس مقام کو کہتے ہیں جہاں

کوئی چلنے سے رک جائے۔ آپ سوچ رہے ہیں اور یہاں بڑے فخر سے یہ چیز کہی جاتی ہے کہ ہم تو اُسی راستے پہ چلیں گے، جس پہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔ یہ قوم آگے بڑھنے سے رکی ہوئی ہے، حالتِ جمود میں ہے۔

تقلید پرستی کے برعکس ایک دوسرا مسلک: ایسا سہارا جو کبھی نہ ٹوٹے

اب ہم آج کی آیت پہ آتے ہیں۔ کہا ہے کہ وَ مَنۡ یُّسۡلِمۡ وَجۡہَہٗۤ اِلَی اللّٰہِ وَ ہُوَ مُحۡسِنٌ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی ؕ وَ اِلَی اللّٰہِ عَاقِبَۃُ الۡاُمُوۡرِ (31:22)۔ ایک تو وہ مسلک تھا، وہ ذہنیت تھی کہ خدا کی دی ہوئی اقدار واحکام پہ نہیں بلکہ جس مسلک پہ چلے آ رہے ہیں، اُس مسلک پہ چلے جائیں گے۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسرا مسلک ہے اور وہ یہ ہے کہ مَنۡ یُّسۡلِمۡ وَجۡہَہٗۤ اِلَی اللّٰہِ (31:22)۔ اس کا عام ترجمہ یہی ہوتا ہے کہ جو اپنے وجھہ کو خدا کے سامنے جھکا دے ''وجھہ'' کا لفظ بڑا ہی جامع ہے۔ مادے [1] کے اعتبار سے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ''جو چیز کسی کے سامنے سب سے پہلے ابھر کر آئے''۔ لیکن یہ صرف مادے کے بنیادی معنی ہیں۔ یہ لفظ زندگی کے نصب العین کے لیے آتا ہے، یہ لفظ Goal (منزل) کے لیے آتا ہے، Purpose یا مقصد کے لیے آتا ہے۔ جس منزل کی طرف راستہ لے جائے اُس کو وجھہ طریق کہتے ہیں اور پوری کی پوری Personality (شخصیت) یا ذات کے لیے بھی یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ جہاں وجھہ اللہ آتا ہے تو وہاں اس کے معنی خدا کا چہرہ نہیں ہوتے بلکہ ذاتِ خداوندی ہے۔ انسان کی Personality (شخصیت) کے لیے بھی یہ لفظ آتا ہے۔ یہ اتنا جامع لفظ ہے کہ اس میں انسان کے ارادوں سے لے کر اُس کی ہر روش کے لیے یہ جامع لفظ آ جائے گا۔ اگر ہم اسے ''اپنا آپ'' کہیں کہ جو ''اپنے آپ'' کو سپرد کر دیتا ہے تو اس سے کچھ زیادہ بات ہماری سمجھ میں آ جاتی ہے۔ جیسے ہمارے ہاں پنجابی میں کہتے ہیں کہ ''اپنی وجھہ دا حال سناں [2]''۔ یہاں وجھہ کہا ہے کہ وَجۡہَہٗۤ اِلَی اللّٰہِ (31:22) اپنے آپ کو جھکا دے، اپنے اردوں کو، اختیارات کو، آرزوؤں کو، تمناؤں کو، اپنے آپ کو، اپنی ذات کو، اپنی پرسنلٹی کو جھکا دے تو پہلی یہ چیز ماننے کی ہوگئی، نظریہ ہوگیا، Ideology (نظریہ حیات) ہوگئی، Purpose (مقصد) ہوگیا۔ کہا کہ وَ ہُوَ مُحۡسِنٌ (31:22) اور پھر حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی (31:22) یوں سمجھیے کہ اُس نے ایسا سہارا تھام لیا جو ٹوٹنے والا نہیں ہے، بہت مضبوط سہارا تھام لیا ہے۔ عروۃ کے مفہوم کے لیے عربوں کی جغرافیائی زندگی کو سامنے رکھیے، وہ ریگستان ہی ریگستان تھا، سبزے کا کہیں نام نہیں ملتا تھا، ان کے ہاں کہیں چار کھجوروں کے درخت کھڑے ہوں تو وہ ان

---

[1] اس کا مادہ (Root) ''و ج ہ'' ہے۔

[2] اپنی وجھہ کا احوال دو۔

کو جنت کہتے تھے' یہ جو ہمارے ہاں باغ میں نالیاں ہوتی ہیں اس کو وہ جنت کہتے تھے۔ ان کا دارومدار مویشیوں پر تھا۔ مویشی پر زندگی کا مدار ہو اور وہاں ریگستان میں سینکڑوں میل تک سبزے کا نشان ہی نہیں ہے۔ وہاں اس قسم کے درخت کہ جن کی جڑیں پاتال تک گئی ہوں یعنی کھجور اور ببول کے درخت کی جڑیں بہت دور تک جاتی ہیں اور وہاں سے پانی لیتی ہیں۔ ایک تو ان کی جڑیں پاتال تک گئی ہوئی ہوں اور اگلی چیز یہ کہ ان پہ خزاں کا موسم نہ آئے بلکہ بارہ مہینے ان کے پتے سرسبز رہیں۔ جس درخت کی ان کے ہاں یہ کیفیت ہوتی تھی کہ

بہار ہو کہ خزاں' لا الہ الا اللہ ❶

کسی موسم میں اس کے پتے نہیں جھڑتے تھے اور اُس پہ بھروسہ کیا جاتا تھا کہ یہاں اگر ہمیں چارہ نہیں مل رہا تو وہاں چلیے وہاں یہ درخت ہیں' وہاں چارہ ملے گا۔ اس قسم کا جو سہارا ہوتا تھا جو کبھی دغا نہ دے اور کبھی خزاں دیدہ نہ ہو' وہ اُس کو عروۃ کہتے تھے۔ جس نے یہ طریق اختیار کرلیا کہ اپنے سامنے منزلِ مقصود وہ رکھا جو خدا نے متعین کیا ہے' اپنی توجہ اُدھر مرکوز کردی' اپنی آرزوئیں' اپنے مقاصد' اپنے Goal' اپنی Destination اس کے لیے مقرر کردیا تو یوں سمجھ لیجیے کہ اُس کے ہاں ان درختوں کا باغ اگ آیا جن پہ کبھی خزاں نہیں آتی۔ کہا کہ وَإِلَى اللَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (31:22) سارے معاملات' جتنے بھی ہیں' ان کے بارے میں سوچیں' مشورہ کریں' گفتگوئیں کریں' بحث کریں لیکن عَاقِبَةُ الْأُمُورِ آخر الامر وہ یہ دیکھیں کہ خدا اس کے متعلق کیا چاہتا ہے۔

اب یہ دونوں روشیں سامنے آ گئیں۔ ایک یہ ہے کہ یہ **ما انزل اللہ** کی طرف نہیں آئیں گے بلکہ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا کی طرف جائیں گے۔ اور دوسری روش یہ ہے کہ یہ اپنے ارادوں تک کو خدا کے احکام کے سامنے جھکائیں گے اور پھر حسن کارانہ زندگی بسر کریں گے تو یہ وہ قوم ہوگی جس کے شجرِ حیات پر کبھی خزاں نہیں آ سکتی۔ یہاں تو صرف **الوثقیٰ** ہی کہا ہے' دوسری جگہ کہا ہے کہ ایسا درخت جو ہمیشہ پھل بھی دیتا رہے۔ دونوں روشیں سامنے رکھ لیجیے۔ یہ دوسری روش ہے زندگی کا صحیح راستہ۔ جو اس پر چلتا ہے وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهُ ❷ (31:23)۔

---

❶ اقبالؒ: ضربِ کلیم' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996ء' ص 38:

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند بہار ہو کہ خزاں' لا الہ الا اللہ
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں مجھے ہے حکم اذاں' لا الہ الا اللہ

❷ اور جو اس سے انکار کرتا ہے (وہ اپنا نقصان کرتا ہے) تجھے اس کی اس روش سے افسردہ خاطر نہیں ہونا چاہیے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔951)۔

نبی اکرم ﷺ کی حساس خیالی اور وحی کا سہارا اور اس کی اقلیم

عزیزانِ من! (31:32) میں کہا ہے کہ اگر کوئی اس روش سے جو خدا نے بتائی ہے انکار کرتا ہے یا اس کے خلاف جاتا ہے تو کہا ہے کہ اے رسول! تمہیں اس سے افسردہ خاطر ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا بات ہے رسول کی بھی! بڑا نا صح مشفق ہوتا تھا' بڑا ہمدرد معالج ہوتا تھا۔ کئی مقامات پہ یہ آیا ہے کہ تُو تو اس غم میں اپنی جان گھلالے گا کہ یہ لوگ صحیح راستے پہ کیوں نہیں چلتے اور اس کے بعد یہ کہا ہے کہ اگر ہم نے انہیں زبردستی صحیح راستے پہ چلانا ہوتا تو اے رسول! تمہاری رسالت کی' وحی کی' جبریل کی' ضرورت ہی کیا تھی۔ حیوانات بھی تو چل ہی رہے ہیں ان کی طرف کونسی رسالت آتی ہے۔ اس لیے تمہیں غمگین ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ گویا رسول کی یہ صورت نہیں تھی کہ یہ اگر اس کو نہیں مانتے تھے تو یہ ڈنڈا ہاتھ میں لے لیتا تھا کہ ''تہاڈی ایسی دی تیسی' تسی مندے کیوں نہیں ہیگے [1]''۔ قرآن ان سے کہتا ہے کہ تمہیں افسردہ خاطر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ او بابا! مقدم چیز تو یہ ہے جو ہم کہہ رہے ہیں کہ انسان کا اختیار و ارادہ برقرار رہے' جس روش پہ چلنے کو ہم کہہ رہے ہیں' اُس کا مقصد یہ ہے۔ یہ جو انسانوں کی بنائی ہوئی دوسری روشیں ہیں' اس میں ان کے اختیار و ارادے کو سلب کیا جاتا ہے اور یہاں اگر ہماری روش میں بھی تم یہ کہو کہ ان کا اختیار و ارادہ سلب کر کے کسی طرح سے ان کو مار مار کر اس راستے پر چلا دیا جائے تو یہ ہمارا منشا نہیں ہے۔ ان کی ذہنیت اس طرح سے بدلنی ہے کہ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ (2:129) کتاب و حکمت سے ان کی ذہنیت کو بدلو' ان کی نفسیات کو بدلو۔ اس لیے اگر اس کے باوجود یہ اپنی ضد اور ہٹ پہ قائم رہتے ہیں' بات سننا ہی نہیں چاہتے' اپنے آپ کے اندر تبدیلی پیدا ہی نہیں کرنا چاہتے تو تمہیں اس میں غم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ (31:23) یہ جو اشتہاری مجرم بھاگے پھر رہے ہیں یہ بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے' ہماری مملکت کی حدود سے یہ باہر جا ہی نہیں سکتے' انہوں نے یہیں آنا ہے' بھاگے ہوئے مجرم نے یہیں ہماری عدالت میں آنا ہے۔ اس لیے تم کیوں غم کھاتے ہو۔ تھوڑے دنوں کے بعد' تھوڑے عرصے کے بعد' دیکھ لینا کہ کس طرح سے یہ پابجولاں یہاں تھانے میں کھڑے ہونگے۔ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا (31:23) یہاں ان کا اعمالنامہ سامنے رکھا جائے گا کہ یہ تھا جو کچھ تم کرتے تھے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ (31:23)۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ جس باب میں یہ لفظ علیم آتا ہے اُس کے معنی ہوتا ہے کہ ''ہمیں مسلسل متواتر یہ چیز ہے کہ ہمیں علم ہوتا ہے''۔ یعنی یہ چیز نہیں کہ کسی ایک وقت میں علم ہوتا ہے بلکہ مسلسل متواتر ہمیں علم ہوتا ہے۔ کہا کہ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (31:23) یہی نہیں کہ

---

[1] تمہاری ایسی کی تیسی' تم سرِ تسلیم خم کیوں نہیں کرتے۔

جو اعمال سرزد ہو جاتے ہیں ان کا ہی علم ہے بلکہ جو سینے میں گزرنے والے ارادے ہیں ہم تو ان کو بھی جانتے ہیں کیونکہ وہاں جب ''وجھہ'' کہا تھا تو وہ آرزؤں اور تمناؤں کے اوپر بھی صادق آتا ہے۔

انسان کی انسانیت اس کے دل میں گزرنے والے خیالات کی ہی پرتو ہوتی ہے

عزیزانِ من! اصل چیز تو وہی ہے جو سینے میں گزرنے والے خیالات ہوتے ہیں' انسانیت انہی سے بنتی ہے۔ باقی رہ گیا کہ یہ فوری پکڑے کیوں نہیں جاتے تو کہا کہ ہمارا اصول ہے جو ہم نے بتا رکھا ہے کہ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيلًا (31:24) مہلت کا وقفہ ہوتا ہے' جھٹ سے گرفت نہیں کر لی جاتی' ان کو سمجھایا جاتا ہے' وقفہ دیا جاتا ہے' مہلت دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے ارادے سے یہ سب کچھ اختیار کرے جو ہم کہہ رہے ہیں۔ اس کے لیے وقت دیا جاتا ہے کہ اپنے اندر تبدیلی پیدا کر و لیکن اگر یہ نہیں کریں گے تو ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ إِلَىٰ عَذَابٍ غَلِيظٍ (31:24) پھر ہم گھسیٹ کر ان کو یہاں لے آئیں گے' وہ بھاگ نہیں سکیں گے۔ کہا کہ ذرا' ان کی طرف آیئے کہ تم ان سے کہتے ہو کہ ہم خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ ہم تو خدا کو پہلے ہی مانتے ہیں تو یہ کونسی نئی دعوت ہے۔ دنیا میں اب تو کمیونزم کی وجہ سے خدا کی ہستی سے انکار کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا ہے ورنہ باقی یورپ جتنا بھی ہے' وہاں وہ لوگ خدا کو مانتے ہیں۔

خدا کو ماننے اور نہ ماننے میں بھی ایک بنیادی فرق ہے

قرآنِ کریم میں خدا کے ماننے اور ماننے میں بڑا فرق ہے۔ یورپ کا سائنٹسٹ بھی خدا کو مانتا ہے' یورپ کے عام لوگ بھی مانتے ہیں۔ وہ ایسے مانتے ہیں کہ God is Creator of Universe[1]۔ اُس نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ خارجی کائنات میں قوانینِ فطرت یا قوانینِ خداوندی کارفرما ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خارجی کائنات میں Sovereignty Belongs to Allah' اقتدارِ مطلق اسی کا ہے۔ خدا کو تو وہ مانتے ہیں پھر ان کو خدا کو ماننے کی دعوت کیوں دی جاتی ہے؟ یہی نہیں بلکہ اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ اور ایران کے مجوسیوں تک خدا کو مانتے ہیں اور یہ تک کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کتاب موجود ہے جو خدا نے ہمارے پیغمبر کی طرف بھیجی تھی۔ اُنہیں بھی خدا پہ ایمان لانے کی دعوت دی جاتی تھی۔ تو یہ کچھ کیوں تھا؟

عزیزانِ من! یہ بات کئی دفعہ آ چکی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ کبھی کسی سے پوچھیے کہ خدا کے ماننے کے معنی کیا ہیں کہ میں خدا کو مانتا ہوں یعنی کیا مانتے ہو۔ تم کہتے ہو کہ میں خدا کو مانتا ہوں اور وہ کہتا ہے کہ میں نہیں مانتا تو تم دونوں میں کیا فرق ہے۔ کہا کہ أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم (53:23) یہ کچھ الفاظ ہیں' اصطلاحات ہیں' جو تمہارے آباؤ اجداد کی طرف سے چلی آ رہی ہیں اور کچھ تم

---

[1] خدا خالقِ کائنات ہے۔

نے اپنے ہاں گھڑلی ہیں۔ ذرا کھڑے ہو کر بتاؤ کہ اس کے معنی کیا ہیں جو تم کہتے ہو کہ میں خدا کو مانتا ہوں۔ خدا کو ماننے والوں کے متعلق کہا ہے کہ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ (31:25) ان سے بھی پوچھو کہ یہ کائنات کس نے بنائی ہے تو یہ بھی کہیں گے کہ خدا نے ہی بنائی ہے۔ کہا کہ یہاں تک ہی کیوں رہتے ہو۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ **فانی یوفکون (29:61)** جب ہم انسانی دنیا کی طرف آتے ہیں تو وہاں تمہیں کیا موت پڑ جاتی ہے کہ کہتے ہو کہ نہیں صاحب! یہاں تو انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کارفرما ہونگے۔ گویا خدا کا دائرہ خارجی کائنات تک محدود ہو گیا' تمہاری دنیا میں وہ نہیں آتا اور اب خدا کے ماننے کے یہ معنی ہو گئے۔ خارجی کائنات خدا نے بنائی ہے یا کیسے بن گئی ہے' اس بات کو چھوڑ یئے اسے دیکھیے کہ اس کا انسان کی زندگی کے اوپر کیا اثر پڑتا ہے۔

خدا کے نام پر مسلمانوں کو Exploit (سلب و نہب) کرنے کا ایک خطرناک حربہ

کہا کہ بات یہ ہے کہ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (31:25) اکثریت وہی ہے جو علم کی بنا پہ بات نہیں کرتی بلکہ محض ایک بات چلی آئی ہے اور بس دہرا دی جاتی ہے۔ ان سے پوچھو کہ علم کی بارگاہ سے اس کے کیا معنی ہیں۔ اور پھر جب اس کو Exploit (سلب و نہب) کیا جاتا ہے تو وہ پوچھو ہی نہیں۔ رشیا[1] کے خلاف انہوں نے ایک محاذ قائم کرنا تھا اور انہیں یہ معلوم تھا کہ مسلمانوں کے جو ممالک ہیں وہ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک ایک بحرِ ذخار ہے۔ یہ اتنی بڑی طاقت ہے' اتنی بڑی جغرافیائی پوزیشن ہے' یہ کرۂ ارض کی بیلٹ ہے' یہ یہاں سے وہاں تک' ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ انہوں نے یہ حربہ استعمال کیا کہ روس کے متعلق کہا کہ وہ تو خدا کا منکر ہوا اور مسلمانوں سے کہا کہ "Believers in God unite together" یعنی خدا کے ماننے والو! آؤ ہم اکٹھے ہوں۔ روس کے مقابل میں محاذ بنانے کے لیے خدا کے نام کو Exploit کیا جا رہا تھا۔

تھوڑی سی اجازت دیدیں تو عرض کروں کہ یہ خدا استعمال کیسے ہوتا ہے۔ برہمن بیٹھا ہوا روٹیاں پکا رہا تھا' دو چار پکا کر رکھی ہوئی تھیں' ایک کتا آیا' اُس نے وہ دو چار روٹیاں منہ میں لیں اور لے بھاگا۔ اب اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ وہاں کوئی پتھر وغیرہ نہیں تھا' گنیش[2] جی کی مورتی وہاں پاس رکھی ہوئی تھی۔ اُس نے اٹھائی اور زور سے دے ماری' اس کے لگی' اس نے روٹیاں پھینک دیں اور چوں چوں کرتا ہوا چلا گیا۔ اُس نے جا کر روٹیاں بھی اٹھائیں' گنیش جی کو بھی اٹھایا اور اسے کہا کہ ساری عمر تمہاری پوجا کی لیکن کام تم آج آئے ہو۔ ہاں تو روس کے خلاف نعرہ یہ تھا کہ Believers in God unite together[3] خدا کے لیے ہمیں رشیا سے بچاؤ۔

---

1. یہ سابقہ USSR (روس) کی طرف اشارہ ہے۔
2. گنیش: شوجی اور پاربتی کا بیٹا' جسے ہندو دانائی اور مشکل کشائی کا دیوتا مانتے ہیں۔
3. خدا کے ماننے والو! آؤ اکٹھے ہو جائیں۔

جب کیا تنگ بتوں نے' تو خدا یاد آیا

قرآن انسان سے ارض وسما کے خدا کو ماننے کا مطالبہ کرتا ہے

قرآن کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (31:25) یہ کائنات کس نے بنائی ہے تو آگے بڑھ کر کہیں گے کہ خدا نے بنائی ہے۔ان سے کہا کہ یہ تو لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (31:26) ہے۔تم مَا فِي السَّمٰوٰتِ تک ہی کیوں رہتے ہو' ارض کی طرف بھی آؤ' اس کی Sovereignty out of the Universe ہے۔(یعنی اس کا اختیارِ اعلیٰ' خارجی کائنات سے باہر بھی ہے۔وہ ہے لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (53:31)۔ایک لفظ میں ساری بات کہدی کہ یہ سماواتی خدا تو مانیں گے لیکن ارض کے خدا کو نہیں مانیں گے۔قرآن نے دوسرے مقام پہ نکھار کر بات کردی کہ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ (43:84)۔کیا بات ہے قرآن کی! یہ تو ابہام میں رہنے ہی نہیں دیتا ورنہ یہ دو اللہ الگ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔اور پھر الٰہ کے معنی بھی آپ نے سمجھ لیے ہیں کہ جب آپ لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں تو الٰہ کے کیا معنی ہیں۔کہا کہ الٰہ الارض مانو تو پھر خدا کا ماننا ہے' الٰہ السماء ماننے سے بات نہیں بنتی۔تمہاری اپنی زندگی میں' تمہاری معاشی زندگی میں' تمہاری سیاسی زندگی میں' انسانی زندگی میں' بھی اُسی الٰہ کو مانو تو پھر اسے کہیں گے الٰہ الارض' ورنہ یہ بات ہے کہ ہم نے خدا کو مان لیا ہے جو کائنات کا بنانے اور چلانے والا ہے۔

خدا کی ذات اپنی صفات میں لامحدودیت کی حامل ہے' اسے محدود نہیں کہا جا سکتا

کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (31:26) وہ تمہارے اس ماننے کا محتاج نہیں ہے' وہ اس سے مستغنی ہے اور حمید ہے۔تم کہتے ہو کہ خدا کی تعریف ہم بھی گرجوں میں جا کر کرتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ ہم تمہاری ان چیزوں سے مستغنی ہیں۔جب تم نہیں تھے' کائنات تک نہیں تھی اُس وقت بھی وہ غنی الحمید تھا۔خدا کی خدائی اور کائنات اور اُس کے قوانین کا تو یہ اندازہ ہی نہیں کر سکتے' اندازہ لگا ہی نہیں سکتے' وہ محدود ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔تم اپنے دائرے کے اندر کی بات کرو۔وَ لَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ (31:27) خدا کی باتیں ختم ہونے والی نہیں ہیں۔اگر دنیا بھر کے درخت قلمیں بن جائیں' یہ سمندر اور ان کے ساتھ کئی اور سمندر سیاہیاں بن جائیں اور اس کی باتیں لکھنے لگیں تو یہ ختم نہ ہوں۔یعنی بات اُس نے اتنی کہنی تھی کہ جو لامحدود ہے' وہ محدودیت کے اندر آ ہی نہیں سکتا۔دنیا بھر کے شجر' ان کے ساتھ سمندر کتنے بھی اور اکٹھے کیجیے تو یہ محدود ہونگے۔لامحدود محدودیت کے اندر آ ہی نہیں سکتا' محدودیت اپنے ہی دائرے کے اندر اُس کو سمجھ سکتی ہے۔اسی لیے اُس نے کہا ہے

کہ جو کچھ اپنے متعلق ہم تمہیں بتاتے ہیں' وہیں تک رہا کرو' اُس سے آگے تم جا ہی نہیں سکتے۔ اور یہ جو سارا کچھ ہے کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (31:27)۔ جہاں وہ اپنے آپ کو عزیز کہتا ہے تو ساتھ ہی اپنے آپ کو حکیم کہتا ہے۔ یعنی غلبہ استبداد کا نہیں ہے' قہر مانیت کا نہیں ہے' فرعونیت کا نہیں ہے بلکہ یہ Rationally (استدلالی) ہے' Reason (عقل وفکر) پہ مبنی ہے' حکمت پہ مبنی ہے۔ اور اسی لیے اس کائنات کا سلسلہ اس طرح سے چل رہا ہے ورنہ قہر مانیت کی رو سے یہ سلسلہ' یہ نظم ونسق' اس انداز سے نہیں چل سکتا۔ یہ تو پوری کی پوری کائنات Infinite (لامحدود) بتادی۔ اس میں تنوع اتنا ہے کہ ایک پتی کے ساتھ دوسری پتی نہیں ملتی۔

کائنات میں وحدت کا محیر العقول سلسلہ نیز سائنسی انکشافات اور وحی کی راہنمائی

اب ایک آیت سامنے آرہی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لیے تو کتابیں لکھی جائیں' نصاب میں داخل ہو تو پھر کہیں جا کر اس کے مفہوم کا کچھ احاطہ کیا جاسکے۔ قرآن کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ کائنات ہو یا انسانی دنیا ہو' یہ ایک وحدت ہے۔ ہم تو برادری تک ہی رہتے ہیں اور اس میں بھی ہمیں افراد الگ الگ نظر آتے ہیں۔ وہ تصور کچھ اس قسم کا دیتا ہے کہ جیسے پوری انسانیت One invisible whole (ایک ناقابلِ تقسیم وحدت) ہو۔ الفاظ اس کا احاطہ نہیں کرسکتے۔ اقبالؒ (1877-1938) صرف یہی کہہ سکتا تھا کہ

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

آج کی سائنس اس پہ آرہی ہے۔ یہ ابھی ابھی جو خبر آئی ❶ ہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام ❷ کو فزکس (طبیعات) میں نوبل پرائز ملا ہے۔ بات تو وہ پریکٹیکل ہے اور اتنی بڑی سائنس کی ہے کہ ہم بھی نہیں سمجھ سکتے۔ وہ کہہ یہ رہے ہیں کہ اس سے پیشتر طبیعات نے یہ کہا تھا کہ یہ چار بنیادی عناصر ❸ ہیں جن سے یہ کائنات وجود میں آئی ❹ ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے اب آگے جو تحقیق کرنا شروع کیا ہے تو ہم اس

---

❶ یادرہے یہ بات نومبر 1979ء کی 9 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

❷ ڈاکٹر عبدالسلام نوبل پرائز (1926-1996AD)۔ انہیں 1979 میں نوبل پرائز ملا۔

He alongwoth Steven Weingberg and Sheldon L.Glasgow (both U.S) developed theory that the electromagnetism and the "weak" force, which causes radioactive decay in some atomic nuclei, are facets of the same phenomenon.

❸ شروع میں مٹی' ہوا' پانی' آگ چار بنیادی عناصر (Elements) گنے جاتے تھے حالانکہ آج ان میں سے ایک بھی عنصر نہیں گنا جاتا۔

❹ زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے؟ انہی اجزا کا پریشاں ہونا (چکبست)

طرف چلے جا رہے ہیں کہ یہ بات غلط ہے۔ اصل میں یہ ایک ہی وحدت ہے۔ چنانچہ یہ جوان کا کارنامہ ہے تو یہ اس کو چار سے Reduce (کم) کر کے دو تک لے آئے ہیں۔ اور آگے ابھی چلے ہوئے ہیں۔

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ بات عام درس کے اندر کرنا ذرا مشکل ہے۔ ہاں تو یہ ایک وحدت ہے، وہ وحدت اس قسم کی ہے۔ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (31:28) تمہاری پوری انسانیت کی تخلیق اور اس کی بعثت (نشاۃ ثانیہ) میں نظر تو یہ آئے گا کہ ایک ایک فرد الگ الگ سے ہیں لیکن انسانیت ایک وحدت ہے، یہ تمہاری ساری تخلیق اور بعثت كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ، یعنی One Indivisible (ایک ناقابلِ تقسیم) وحدت ہے۔ عزیزانِ من! یہ وحدتِ انسانیت کا جو تصور ہے یہ چودہ سو سال پہلے قرآن دے رہا ہے، دنیا میں کہیں نہیں ملے گا۔ ہمارے ہاں تو زیادہ سے زیادہ تعلق برادر ہڈ کا، عالمگیر برادری تک کا ہی آئے گا۔ یہ کہ یہ انسان کی وحدت ہے، آپ کے دل میں زخم ہو اور میرے قلب میں اُس کی ٹیس پڑے، یہ ہے ناقابلِ تقسیم وحدت۔ سائنس کے انکشافات انسان کے ذہن کو اس طرف لا رہے ہیں۔

کائنات کو مسخر کرنے کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کی ذہنی سطح کے کارنامے اور قرآن کا ناقابلِ تقسیم وحدت کا پیغام

کبھی آپ نے دیکھا کہ لندن میں ایک کمرے کے اندر بیٹھا ہوا انسان وہاں کچھ باتیں کر رہا ہے، آپ اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں اور اُسی وقت یعنی سیکنڈ کا بھی فرق نہیں ہوتا، کہ وہ تمام کی تمام باتیں اپنے سامنے سنتے ہیں، اس کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے، رنگ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ فاصلے کس طرح سے ختم ہو گئے ہیں یعنی وحدت ہو گئی ہے۔ وہ اور یہ جو ہمارا سیٹ ہے ان دونوں میں کوئی تفریق نہیں رہی۔ اور جو چاند کے اوپر گئے ہوئے ہیں، ان کے ساتھ جو رابطہ ہے، یہ کتنی بڑی وحدت ہے۔ مجھے تو یہ واقعہ ہی نہیں بھولتا، میں پھر دہرا دوں، یہ ہمارے ذہنوں میں نہیں آسکتا۔ ہمارے ذہنوں میں کیا آئے گا کہ غنیمت ہے کہ اب ان کو مصیبت پیش آئی کہ یہ لاؤڈ اسپیکر کو استعمال کرنے لگ گئے ورنہ ان کا پہلے کا فتویٰ موجود ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال حرام [1] ہے۔ چاند پہ وہ گئے ہوئے

---

[1] یاد رہے جب ہندوستان میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال شروع ہوا تو "علمائے کرام" سے اس کے جائز یا ناجائز ہونے کے متعلق فتویٰ مانگا گیا۔ دارالعلوم دیوبند کے بہت بڑے مفتی مولانا محمد شفیع مرحوم (1976-1897) نے "عباداتِ مقصودہ" کے لیے اس آلہ کو حرام قرار دیا۔ انہوں نے البدائع المفیدہ فی حکم الصنائع الجدیدہ رسالے میں لکھا تھا کہ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس آلہ کی ماہیت کیا ہے اور وہ کس طرح کام کرتا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے الیگزنڈر ہائی اسکول بھوپال کے سائنس ماسٹر برج نندن لال صاحب سے دریافت فرمایا۔ انہوں نے کہا کہ "برقی قوت کی وجہ سے میں تو کم از کم یہ ماننے میں تامل کرتا ہوں کہ اصل آواز ہے اور اس کا انکار بھی مجھ سے ممکن نہیں کہ ثبوت مشکل ہے"۔ چنانچہ اس تحقیق انیق کے بعد مفتی مولانا محمد شفیع مرحوم (1976-1897) نے عبادات کے لیے لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو حرام قرار دے دیا۔ (حوالہ پرویزؒ: سلیم کے نام، جلد سوم، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 1986، ص ص۔ 15 تا 16)۔

تھے' ان کا رابطہ یہاں زمین کے اوپر کنٹرول اسٹیشن سے تھا۔ یہاں انہوں نے اس سے' وہ جو انجن کے اوپر بیٹھا ہوا تھا' بات کی۔ اس نے کہا کہ جی' میں ہوں' وہ دوسرا نہیں ہے۔ اِنہوں نے کہا کہ ہمیں پتہ ہے کہ وہ انجن پہ نہیں ہے بلکہ وہ سو رہا ہے۔ اُس نے پوچھا کہ جی! یہ تو ٹھیک ہے کہ آپ نے میری آواز سے پہچان لیا ہوگا کہ میں وہ نہیں لیکن آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں یہ بھی پتہ ہے کہ تم ہو' وہ نہیں اور ہمیں پتہ ہے کہ وہ سو رہا ہے' تو آپ کو یہ کیسے پتہ ہے؟ انہوں نے کہا کہ اُس کی جو Heart Beating (دھڑکنِ قلب) ہے اُس کا گراف ہمارے پاس ہے اور یہ اصول ہے کہ سونے والے کی جو Beating (دھڑکنِ نبض) ہوتی ہے وہ جاگنے والے سے کم ہوتی ہے۔ پچھلے دس منٹ سے اس کی Beating (دھڑکنِ نبض) میں فرق آگیا ہے اس لیے ہمیں پتہ ہے کہ وہ سوگیا ❶ ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وحدت کی طرف کس طرح سے انکشافات چلے جا رہے ہیں۔ اس اعتبار سے یا اس نکتۂ نگاہ سے جی چاہتا ہے کہ کچھ اور بھی ہزار برس ہم جی لیں اور دیکھیں کہ کیا کیا انکشافات ہوتے ❷ ہیں۔ لیکن کوئی بات نہیں' یہاں نہیں تو وہاں جا دیکھیں گے۔ یہاں تو پھر بھی ٹی وی سیٹ خریدنا پڑتا ہے ''او تھے تے مفت ای ہونا اے'' ❸۔

عزیزانِ من! جنت میں کوئی چیز نہیں بکتی' کہیں نہیں لکھا کہ وہ خریدی جائے گی۔ کہا ہے کہ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (31:28)۔ کیا ہوگی یہ کیفیت کہ پوری انسانیت One Indivisible Whole (ایک ناقابلِ تقسیم وحدت) ہوگی۔ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌۢ بَصِيرٌ (31:28) بات یونہی افسانے کی نہیں کہہ رہا بلکہ سنتا ہوں' دیکھتا ہوں۔ دیکھ کر کہتا ہوں' سن کر کہتا ہوں کہ تمہاری خلق اور بعثت ایک نفسِ واحدہ ہے۔ کہا کہ تمہیں کیسے سمجھائیں کہ تمہیں تو اختلافات نظر آتے ہیں اور اُس اختلاف کے باوجود وہ اختلاف ہوتا نہیں ہے۔ عزیزانِ من! اب دیکھیے کہ قرآن چودہ سو سال پہلے کے ایک بدو کو بھی سمجھا رہا ہے اور آئن سٹائن (1879-1955) کو بھی سمجھا رہا ہے۔

---

❶ دیکھیے: پرویزؒ: امریکہ کے خلانوردوں کو سلام' طلوعِ اسلام (8:22)' اگست 1969' ص 4۔
❷ خلائی سفر کے انکشافات کی مختصر تاریخ دیکھیے کہ
❸ وہاں کو مفت ہی ہوگا۔

2. دسمبر 1942 کو ایٹم (Atom) توڑا گیا۔ 4۔ اکتوبر 1957ء میں روس نے اسپٹنک (Sputnik.1) نامی مصنوعی سیارہ پہلی بار خلا میں بھجوا کر ایک عالم کو ورطۂ حیرت میں غرق کر دیا۔ 28۔ فروری 1959ء میں امریکا نے پہلا مخبر سیارہ خلا میں بھیجا۔ 12۔ اپریل 1961ء میں روس نے پہلا انسان بردار سیارہ خلا میں بھیجا۔ روسی خلانورد یوری گاگرین (Yuri Gagarin) پہلا انسان تھا جس نے زمین کے مدار (Orbit) کے گرد چکر لگایا اور 21/جولائی 1969ء کو نیل ایلڈن آرم اسٹرونگ (Neil Alden Armstrong) پہلا انسان تھا جس نے پہلی بار چاند کی سطح پر قدم رکھا اور برملا پکار کر کہا کہ "That is one small step for a man, one giant leap for mankind" ''انسان کے لیے ایک معمولی سا قدم مگر بنی نوع انسان کے لیے ایک غیر معمولی جست''

وقت (Time) کے سلسلہ میں آئن اسٹائن اور برگسان کے انکشافات اور قرآن حکیم کے بیان کردہ حقائق

آپ حیران ہونگے کہ یہ آئن اسٹائن (1879-1955) سے آگے تو بڑھے ہیں لیکن ٹائم کے متعلق، وقت کے متعلق، آئن سٹائن کی جو تھیوری ہے، اس کا امام برگسان (1859-1941ء) ہے۔ ہم تو وقت کو اس طرح ماپتے ہیں کہ جیسے ہم گزرا ہوا کل کہتے ہیں، وہ یہ تھا کہ آج سورج ابھی نہیں نکلا تو اُس سے پہلے رات تھی اور اس سے پہلے دن تھا۔ تو ہم نے تو تقسیم کر دیا کہ سورج غروب ہونے تک کل کا دن ہوگیا، کہیں ہم نے کہا کہ رات بارہ بجے سے دوسرا دن شروع ہوا، ہمارے ہاں سورج نکلنے کے بعد دوسرا دن شروع ہوا، پھر یہ جو اگلا دن ہے اس کا ہم نے کچھ نام رکھا، اس کی کچھ تاریخ رکھی۔ تو یہ ہے کہ یہ الگ الگ نظر آتا ہے کہ کل الگ، آج کا دن الگ۔ ان سائنسدانوں نے یہ کہا کہ یہ چیزیں جتنی بھی ہیں یہ تو ہم نے گز کے اوپر گرہوں کے نشان لگا رکھے ہیں، ہم نے اپنی آسانی کے لیئے، ماپنے کے لیئے، وہ نشان لگا رکھے ہیں۔ یہ وقت کا جو گز ہے اُس کے اوپر ہم نے دن اور رات کے نشانات لگا رکھے ہیں۔ درحقیقت یہ اس طرح سے تقسیم ہوا نہیں ہے۔ یہ برگسان (1859-1941ء) کی تھیوری (نظریہ) ہے۔ آئن سٹائن (1879-1955) نے آکر پھر اس کو Prove (ثابت) کیا۔ یہ اس دور کی بڑی بلند تھیوری (نظریہ) گنی جاتی ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ یہ الگ الگ نہیں ہیں، جنہیں آپ دن اور رات کہتے ہو یہ تو تم نے (وقت کے گز پر گروہوں کے) نشان لگا رکھے ہیں۔

یہ پوری کائنات ایک نفسِ واحد کی مانند ہے

عزیزانِ من! قرآن اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (31:28) کہنے کے بعد یہ بات اُس بدو کو بھی اور آئن سٹائن کو بھی سمجھا رہا ہے۔ کہا کہ **الم تر** (31:29) کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ (31:29) یہ دن اور رات جو تم دیکھتے ہو تو یہ نہیں ہوتا کہ جو دن ہے وہ اتنا سا ہوتا ہے اور وہ کہیں چلا جاتا ہے پھر ایک مسماۃ رات ہوتی ہے اور وہ کہیں سے یوں ابھر آتی ہے، پھر وہ کہیں چلی جاتی ہے، پھر یہ دن ہوتا ہے اور یہ کہیں سے آجاتا ہے۔ **الم ترا** کا یہ لفظ ایسے ہوتا ہے کہ کبھی آپ نے دیکھا ہے کہ یہ سایہ کس طرح سے بڑھتا ہے، یہ دھوپ کس طرح سے گھٹتی ہے، کہاں جاتی ہے؟ یہ سایہ جو اس طرح سے بڑھ رہا ہوتا ہے تو یہ دھوپ کہاں جاتی ہے اور جب دھوپ آرہی ہوتی ہے تو یہ سایہ کہاں چلا جارہا ہوتا ہے؟ ہمارے نزدیک روشنی اور سایہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ یہ جو دھوپ یا روشنی آرہی ہوتی ہے اور سایہ کہیں جارہا ہوتا ہے تو نہ وہ آرہی ہوتی ہے اور نہ وہ جارہا ہوتا ہے۔ ایسی چیز جو اس طرح کسی کے اندر داخل ہوجائے کہ وہ درحقیقت داخل نہ ہو اور ہمیں داخل ہوتی نظر آئے اُس کے لیے **ولج** کا لفظ آتا ہے۔ کہتا ہے دن اور رات میں نہ وہ جاتا ہے اور نہ وہ آتی ہے بلکہ وہ یوں ایک دوسرے کے اندر جاتے ہیں کہ تمہیں نظر آتا ہے کہ جیسے آجا رہے ہیں۔

یہ کائنات بھی ایک وقت تک کے لیے ہے اور خدا کا قانون الحق ہے

عزیزانِ من! ان لفظوں پہ برگسان (1859-1941) جھوم اٹھا تھا کہ یہ قرآن کے الفاظ ہیں۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ سورج غروب ہوگیا جبکہ وہ تو کہیں غروب ہی نہیں ہوتا۔ وہ تو ہماری آنکھیں ہیں جو وہاں تک اُس کو دیکھ رہی ہوتی ہیں' وہ ہماری بینائی کی حد ہے۔ وہ ذرا سا Curve (خطِ منحنی) کے نیچے جاتا ہے تو اُدھر والی جو آنکھیں ہیں وہ تو اُس کو دیکھ رہی ہوتی ہیں' وہ تو اُسی طرح سے ہوتا ہے' یہ کہیں جاتا نہیں ہے' کہیں آتا نہیں ہے یہ تو بس يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ (31:29) ہے۔ وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ کیا کہہ گیا ہے۔ یہ سمجھانے کے لیے کہ یہ اختلافات تمہاری نگاہ کے پیدا کردہ ہیں یا تم نے سمجھنے کے لیے یہ پیدا کر رکھے ہیں' ورنہ یہ ایک نفسِ واحدہ کی طرح ہے۔ درخت کی پتیاں تمہیں الگ الگ نظر آتی ہیں۔ خزاں کے موسم میں کوئی پتی نہیں ہوتی' بہار آتی ہے تو پھر تمہیں ایسا نظر آتا ہے کہ ایک ایک پتی الگ الگ نکل رہی ہوتی ہے جبکہ وہ پورا درخت One Unit (ایک وحدت) ہوتا ہے۔ دن اور رات یعنی جسے ٹائم (زماں) کہتے ہیں یہ ہمارے ہاں اس وقت فلسفے اور سائنس میں بڑا ہی اہم مسئلہ ہے کہ یہ الگ الگ چیز نہیں ہے [1]۔ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ (31:29) اور اس کے اندر جو اتنے اتنے عظیم الشان کُرّے ہیں' وہ **بغیر عمد ترونھا** (13:2) ہیں یعنی بغیر کسی ایسے ستون کے ہیں جنہیں تم کسی طرح سے آنکھوں سے دیکھ نہ سکو' وہ اس پہ نہ دیکھے جانے والی کشش سے چلے جا رہے ہیں۔

عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے افلاک کا بطلیموسی نظام (Ptolemaic System) تھا اور یہ جو چلنا (Motion) کا تصور تھا' یہ ان کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا' وہ زمین کو ساکن مانتے تھے' گھومنے والی مانتے ہی نہیں تھے' وہ چپٹی مانتے تھے' گول مانتے ہی نہیں تھے۔ یہ قرآن کے نزول کا وہ دور ہے جہاں وہ یہ کہہ رہا ہے کہ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى [2] (31:29)۔ یہ ساکن نہیں ہیں' یہ سب چل رہے ہیں۔ اس سے یہ ہوا کہ کیا یہ ہمیشہ کے لیے یہ کچھ ہوگا؟ کیا یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی طرح چلتے رہیں گے؟ یہ بھی آپ کے ہاں ایک بہت بڑا مسئلہ آ گیا ہوا ہے۔ اب تو ان مناظروں کی اہمیت نہیں رہی لیکن ہمارے بچپن کے زمانے میں ان کو بڑی اہمیت تھی۔ آریہ سماج مادے کو قدیم مانتی تھی۔ اس پہ بڑے مناظرے ہوا کرتے تھے۔ آج پوری سائنس اس پر آ رہی ہے کہ اسکے اندر Eternity (ابدیت) ہو ہی نہیں سکتی۔ آج تو مادے (Matter) کے وجود سے ہی انکار ہو رہا ہے' اب تو صرف Energy (توانائی)

---

[1] جو احباب اس موضوع پہ دلچسپی رکھتے ہیں' ان کے لیے یہ کتاب بڑی ہی کارآمد اور پُرازمعلومات ہے۔

Hewking, Stephen W.(1989). A Brief History of Time from the Big Bang to Black Holes. Toronto: Bantam Books.

[2] چاند اور سورج کو مسخر کر رکھا ہے۔ ان میں سے ہر ایک' ایک معیادِ مقررہ تک کے لیے' برابر چلا جا رہا ہے (13:2)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 952)

پہ آ گئے ہیں ❶ ۔لیکن بہر حال قرآن نے یہ جو کہا ہے کہ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ (31:29) یہ سب چلے جا رہے ہیں مگر اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (31:29) ہیں، ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ ایک مدت کے لیے ہیں۔ کہا کہ اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (31:29)۔ باتیں ہم باہر کی کر رہے ہیں، بتا تمہیں یہ رہے ہیں کہ جس طرح سے ہمارا قانون وہاں کارفرما ہے اسی طرح تمہاری زندگی میں بھی کارفرما ہے۔ کائنات کی طرف مت دیکھو، اپنے آپ کی طرف دیکھو، ہم تمہاری باتیں کر رہے ہیں۔ ہم یہ سب اس لیے کہہ رہے ہیں کہ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ (31:30) الحق صرف خدا کی ذات ہے، صرف اُس کے قوانین ہیں، ابدیت انہی کو ہے، کسی اور شے کو نہیں ہے۔ جو نظریہ ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آ جائے اُسے الحق کہتے ہیں۔ اور وہ الحق ہے یعنی اُس کا دیا ہوا ہر نظریہ ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آ جاتا ہے۔ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ (31:30) اُس کے سوا کوئی بھی تصور اپنے ذہن کے اندر لاؤ، وہ الحق نہیں ہوسکتا، وہ باطل ہوتا ہے، تخریبی ہوتا ہے، مٹ جانے والا ہوتا ہے۔ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (31:30) اور وہ الحق تمہاری دنیا میں اُس صورت میں ثابت ہوسکتا ہے کہ تمہاری دنیا اور تمہاری زندگی کے اندر ''علوّ'' اور کبریائی یا جو حاکمیت اور اقتدار ہے، یہ صرف اُس کی ذات کا ہوگا۔ پھر وہ تمہاری دنیا میں الحق بن کر آ جائے گا۔ اور اس کے ان قوانین کے علاوہ کسی اور کے قوانین کو بھی لو، وہ باطل ہونگے، مٹ جانے والے ہونگے۔ تاریخ کے اوارق کو دیکھو کہ کتنے کتنے بڑے دساطیر بنائے گئے، ضوابط بنائے گئے، لوہے کی لاٹوں پہ کندہ کرائے گئے، پتھر کی چٹانوں پر کندہ کرائے گئے۔ وہ ان چٹانوں کے اوپر زمانہ قدیم کی یادگاریں بن کر رہ گئے لیکن قانون زندہ و باقی نہ رہا۔

---

❶ سر جیمز جینس اپنی کتاب The Mysterious Universe (پراسرار کائنات) میں لکھتا ہے کہ یہ تمام مادی کائنات سوائے لہروں (Waves) کے اور کچھ نہیں۔ یہ لہریں دو قسم کی ہیں (1) محصور لہریں (Bottled up Waves) جنہیں ہم مادہ (Matter) کہتے ہیں اور (2) آزاد لہریں جنہیں روشنی (Light) کہا جاتا ہے۔ آئن اسٹائن (1879-1955) کے بقول مادہ چند مربوط حوادث (Inter- related Events) یا منجمد خیالات (Condensed Thoughts) کا مجموعہ ہے۔ یہ شے (Thing) ہے ہی نہیں بلکہ عمل (Action) ہے یا حوادث (Events) کی عمارت، برٹرینڈ رسل (1872-1970ء) نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ''مادہ (Matter) ایک سہل سا فارمولا ہے جسے اس لیے وضع کر لیا گیا ہے کہ کسی ''مادی حادثہ'' کے متعلق بتایا جاسکے کہ یہ کس طرح وقوع پذیر ہوگیا حالانکہ اسمیں مادہ کہیں ہوتا ہی نہیں اور Ouspensky (اوسپنسکی (1878-1947) کے الفاظ میں یہ محض ایک Condition (حالت) ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں آدمی اندھا ہے تو یہ اندھا پن (Blindness) کوئی مادی شے نہیں بلکہ ایک Condition (حالت) ہوتی ہے۔ (ماخوذ از پرویزؒ: انسان نے کیا سوچا؟ ادارۂ طلوع اسلام، کراچی، 1956، ص ص۔ 50 تا 51)۔

خدا کے قانون کے الحق ہونے کے سلسلہ میں کشتی کی مثال

زندہ اور پائندہ قانون اُسی کا ہے جو ہمیشہ تک ہے اور ہمیشہ تک رہے گا۔ الحق وہ ہے اور اُس کے سوا جو بھی ہے' وہ باطل ہے۔ یہ ہے وَ اَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الۡعَلِیُّ الۡکَبِیۡرُ (31:30)۔ آپ کو یاد ہے کہ قرآنِ کریم نے کشتی کی مثال دی تھی۔ کہا تھا کہ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ الۡفُلۡکَ (31:31) ذرا کشتی کو دیکھو تو سہی۔ ایک سوئی پانی میں ڈالو تو وہ سیدھی نیچے چلی جاتی ہے۔ ہزاروں ٹن وزن کا لوہے کا جہاز بط کی طرح پانی کے اوپر تیر رہا ہوتا ہے' خالی جہاز نہیں بلکہ بھرا ہوا' لدا ہوا ہوتا ہے۔ کہا کہ اگر ایک خاص پیمانے تک اس کا وزن ہو تو وہاں تک وہ تیرتا رہتا ہے' تیرتا ہی نہیں رہتا بلکہ موجوں کے تلاطم میں ہچکولے بھی کھاتا ہے۔ اگر وہ وزن ہمارے قانون کے مطابق ہے تو تلاطم یا طوفان اس کا کچھ نہیں بگاڑتا' وہ موجوں کے ساتھ ہنستا کھیلتا ہوا چلا جاتا ہے۔ جونہی تم نے اس کے وزن میں' توازن میں' ذرا بگاڑ پیدا کیا تو کہا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ کشتیاں کس طرح سے ڈوبتی ہیں۔ جتنی کشتیاں بھی ڈوبتی ہیں تو تحقیق کے بعد پتہ چلتا ہے کہ چودہ کی کشتی تھی لیکن اُس میں چالیس بٹھا دیئے تھے' ایک طرف زیادہ بیٹھ گئے تو یہ کیفیت پیدا ہوگئی۔ اُس نے کہا کہ تم تو روز دیکھتے ہو کہ ایسی چیز جو بظاہر محیر العقول نظر آتی ہے کہ لوہے کا جہاز سامان سے لدا ہوا' طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے' چلا جا رہا ہے بشرطیکہ وہ ہمارے قانون کے مطابق چل رہا ہو لیکن اگر اُس میں تم نے ذرا ادھر اُدھر کچھ کیا تو آپ دیکھیے کہ وہ کس طرح سے ڈوبتا ہے۔ جہاز تو ایک طرف رہا' وہ بط جیسی کشتی ڈوب جاتی ہے۔ کہا کہ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِنِعۡمَتِ اللّٰہِ لِیُرِیَکُمۡ مِّنۡ اٰیٰتِہٖ[1] (31:31) بات تو ہم کشتی کی کرتے ہیں لیکن اس سے تمہاری توجہ ہم ایک اور بات کی طرف مبذول کراتے ہیں۔ یہ جو تمام چیزیں ہیں کہ یہ کشتی کیوں اس طرح سے چلتی چلی جاتی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ قانون کے مطابق اگر اس میں وزن ہے تو وہ ڈولا نہیں کرتی بلکہ سیدھی چلتی جاتی ہے' وہ طوفانوں میں بھی اسی طرح سے چلی جاتی ہے' اُس میں استقامت ہوتی ہے۔

زندگی کی کشتی کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے استقامت کے ساتھ خدا کے قانون کو اپنانا ہوتا ہے

کہا کہ ہم بات تمہیں کشتی کی مثال سے سمجھا رہے ہیں اور یہ **من آیتہٖ** (31:31) ہے یعنی قانون خداوندی کی کارفرمائی ہر گوشے میں نظر آسکتی ہے۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ (31:31) لیکن یہ آیات جو ہم نے کہی ہیں کہ جس سے تم کسی مقصد تک پہنچ جاؤ گے' انہی کو نظر آسکتی ہیں جو لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوۡرٍ (31:31) ہیں۔ یعنی اس کے لیے بڑے استقامت کی ضرورت ہے۔ کشتی کو تلاطم انگیزیوں کے اندر

---

[1] خدا کے اس قانون کی رو سے' کشتیاں (اور بڑے بڑے جہاز) کس طرح' اس کے پیدہ کردہ سامانِ زیست کو لیے سینۂ بحر پر رواں دواں چلے جاتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 953)۔

سلامتی سے ساحل تک پہنچنے کے لیے بڑی ہی استقامت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر وہ قانون کی پابندی ایک سیکنڈ کے لیے بھی چھوڑ دے تو وہ گھڑا م سے ڈوب جاتی ہے اور اگر استقامت سے اُس کے مطابق چلتی چلی جائے تو شکور ہو جاتی ہے یعنی اُس کی محنتیں بار آور ہو جاتی ہے۔ ان باتوں کے اندر ان لوگوں کے لیے نشانات یعنی آیات ہیں جو اس قدر استقامت کے ساتھ ان چیزوں کو دیکھتے ہیں اور اس طرح سے اپنی روشِ زندگی رکھتے ہیں کہ حوادثِ زمانہ کے کتنے ہی طوفان کیوں نہ آئیں وہ ڈولتے نہیں ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ ان کے ہاں **صبوراً** اس پتھر کو کہتے تھے جو کشتی میں ایک طرف اس لیے رکھ دیتے تھے کہ اُس کا وزن برابر رہے' اُس کا توازن قائم رکھنے کے لیے جو پتھر رکھا جاتا تھا اُس کو وہ صبر کہتے تھے۔ کہا کہ حوادثِ زمانہ سے جن کا توازن نہ بگڑے' یہ ہیں جو شکور ہوتے ہیں اور ان کی محنتیں بار آور ہوتی ہیں۔ لیکن یہ قوانین خارجی کائنات میں ہوتے ہیں۔ کیا بات ہے کہنے والے کی! کہ

یا رب درونِ سینہ دلِ باخبر بدہ

با اضطرابِ موج سکونِ گہر بدہ

اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو نوازا تھا۔ کہتا ہے کہ طوفان آتے رہیں' تلاطم خیزیاں آتی رہیں' موج در موج اٹھتی چلی جائیں لیکن اُس سیپ کے اندر موتی کا جو سکون ہوتا ہے' وہ قائم رہے۔

خدا کے قانون کو مسلسل' زندگی بھر' دھوکا دینے والوں کا انجام

کہا ہے کہ اس سینے میں اس قسم کا دل دیدے کہ حوادثِ ارض و سماوات کی تلاطم خیزیوں میں یہ جو دل ہے وہ نہ ڈولے۔ یہ ہے جسے قرآن نے صبار کہا ہے کہ **لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ** (31:31)۔ وہ نہایت مستقل مزاجی سے' فطرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کی اَن تھک محنت بھرپور نتائج مرتب کرتی ہے۔ یہ تو کشتی کی کیفیت ہے کہ اگر قانون کے مطابق اُس کا وزن ہے تو وہ چلے جا رہی ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ وہ جب جی چاہے اپنی روش میں تبدیلی پیدا کر لے۔ اگر ایسا ہو تو نظامِ کائنات ایک دن کے لیے بھی چل نہ سکے۔ اور دوسری طرف انسان ہے جو ایک اصول پر قائم ہی نہیں رہتا' ہر آن بدلتا رہتا ہے۔ مثلاً تم کشتی والوں کی مثال کو لو۔ کشتی تو ایک اصول کے مطابق چلتی رہتی ہے اور ان میں بیٹھنے والے انسانوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ **وَإِذَا غَشِيَهُم مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ** (31:32) اگر کہیں کشتی ہچکولے کھانے لگی اور دیکھا کہ ڈوبنے لگی ہے تو خدا کو پکار رہے ہیں: ''مولا بچالے' علی مولا بچالے' بارھویں والے بچالے' پتہ نہیں کتنی جماعت والا ہے''۔

جب تنگ کیا بتوں نے تو خدا یاد آیا

کہا کہ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ (31:32) لیکن جب کشتی ساحل پہ پہنچ جاتی ہے "تے کتھوں داخدا' تے کتھوں دیاں نذرنذرانیں ❶"۔ میراثی کا بیل گم ہوگیا' پہلی قبر پہ گیا اور کہا کہ گیارھویں والے! اگر میرا بیل مل جاتا ہے تو میں گیارہ روپے کی نیاز دونگا۔ آگے چلا گیا۔ سترھویں والا آگیا کہ میں سترہ کا نیاز دونگا۔ نیاز مانتا چلا گیا۔ ایک نے کہا کہ "یار! تیرا بیل تے ایناں پیساں دانہیں' تے توں منتاں ڈیڑھ سوروپے دیاں من لیاں ہیگیاں۔ کہن لگا کہ سنگی ہتھ پے جان دے' ساریاں نوں دھوکا دیاں گا ❷" یہاں کہا ہے کہ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ (31:32) جب وہ بخیریت ساحل پر اتر آتے ہیں تو ان میں سے بعض کی کیفیت تو خیر پھر بھی ایسی ہوتی ہے کہ وہ میانہ روی اختیار کر لیتے ہیں لیکن باقی کھلے بندوں ہمارے قانون سے سرکشی برتنے لگتے ہیں۔ ان کے لیے کہا کہ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ (31:32) لیکن یہ کچھ وہی لوگ کرتے ہیں جو محنت سے جی چراتے ہیں اور فریب کاری اور دغا بازی پر ان کا گزارہ ہوتا ہے اور اس طرح چاہتے ہیں کہ قوانینِ خداوندی پر پردے پڑ رہیں' وہ لوگوں کے سامنے آنے ہی نہ پائیں۔ پھر سن لیں' عزیزانِ من! کہ یہ کون لوگ ہیں جو پھر اس طرح سے انکار ہی نہیں بلکہ ہمارے قانون سے سرکشی برتنے لگ جاتے ہیں۔ ایک تو یہاں کفور آیا ہے۔ **کفور** کے معنی ہیں کہ "جو کچھ بھی ہاتھ میں آئے وہ اُس کو ڈھانپ کے رکھے"۔ دوسرا لفظ ختار آیا ہے یہ **ختار** بڑی عجیب چیز ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کہ "مسلسل دھوکا دیئے چلے جانے والا"۔ اس کے لیے تو ان کے ہاں بہت الفاظ ہیں لیکن اس کے معنی یہ ہیں کہ زندگی بھر دھوکا دے کر تھک جانے والا۔ کہتا ہے کہ اُسے ان قوانین پہ آنے سے موت پڑتی ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ لقمٰن کی آیت 32 تک آگئے' 33ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے اور پھر آگے سورۃ السجدۃ شروع کر دیں گے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

---

❶ کہاں کا خدا اور کہاں کی نیاز اور کہاں کے نذرانے!!

❷ اے یار! تمہارا بیل تو اتنی رقم کا نہیں ہے۔ تم نے تو 150 روپے کی نیاز دینے کا کہہ دیا ہے۔ وہ کہنے لگا کہ بس بیل کی گردن میرے ہاتھ آنے دو' سب کو جل دے جاؤں گا۔

چھٹا باب: سورۃ لقمٰن (آیات 33 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من ! آج نومبر 1979ء کی 16 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ لقمٰن کی آیت 33 سے ہو رہا ہے:

(31:33)۔

کسی مشکل حالت میں خدا کو یاد کرنے یا اسے ماننے کی نوعیت

پچھلی آیت میں کہا یہ گیا تھا کہ لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ خدا پر ایمان کا دعویٰ بھی ہے لیکن اُس کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ اگر کبھی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں تو پھر تو پوچھیے نہیں کہ کس خشوع وخضوع کے ساتھ خدا کی طرف جھکتے ہیں' اُس کا نام لیتے ہیں' نیازیں مانتے ہیں' سب کچھ کرتے ہیں لیکن جونہی وہ مصیبت رفع ہو جاتی ہے تو اُس کے بعد پھر کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ اُس نے کہا کہ خدا کا ماننا یہ نہیں ہے۔ قانون کی اطاعت تو ہر حال میں کی جانی چاہیے۔

خدا کو ماننے کے حقیقی معنی دراصل اس کے قانون کے مطابق چلنا ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ ماننے کا جو لفظ ہے اس سے انسان بڑی خود فریبی میں مبتلا رہتا ہے کہ میں خدا کو مانتا ہوں یا میں خدا کا منکر نہیں ہوں۔ مانتا ہوں کے کیا معنی ہیں؟ ایک کہتا ہے کہ میں مانتا ہوں' دوسرا کہتا ہے کہ میں نہیں مانتا تو دونوں میں کیا فرق ہے؟ ماننے کے معنی یہ ہیں کہ میں خدا کے قوانین کو زندگی کا ضابطہ تسلیم کرتا ہوں' میں یہ مانتا ہوں میرا ایمان ہے کہ انہی کی اطاعت سے انسان اپنے نصب العین تک پہنچ سکتا ہے۔ خدا کا نہ ماننا یہ ہے کہ میں اُس کے احکام وقوانین کو صحیح نہیں مانتا اور میں اُس کے مطابق چلنا نہیں چاہتا تو

یہ دونوں میں فرق ہو گیا۔ خدا کے قوانین کے ماننے کے معنی یہ ہیں کہ انسان کا ہر عمل' ہر کام' ہر ارادہ' ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے اور وہ اٹل ہوتا ہے' وہ اَن مٹ ہوتا ہے۔ اس کا یہ قانون ہے کہ سنکھیا کھانے سے ہلاکت ہو جاتی ہے تو قانون کے ماننے کے بھی یہ معنی ہیں کہ اسے تسلیم کیا جائے کہ اس قانون کی اطاعت کا یہ نتیجہ نکلے گا اور وہ میرے حق میں یوں تعمیری اور خوشگوار ہوگا۔ اس کے انکار کے معنی یہ ہیں کہ اگر میں اُس کے خلاف چلوں گا' اُس سے سرکشی برتوں گا تو اُس کا نتیجہ میرے حق میں تخریبی ہوگا اور مجھے اُس کا نقصان ہوگا۔ یہ خدا کی بات نہیں انسان کی اپنی بات ہے۔ اُس سے یہ ہوتا ہے۔ اگر کسی کا اس پر یقین ہے کہ اُس کے قوانین کی خلاف ورزی سے میرا یہ نقصان ہوگا تو پھر وہ اس چیز سے احتیاط برتے گا کہ وہ اُس کے خلاف نہ چلے کیونکہ ہر صاحب ہوش انسان اپنے نفع کی سوچتا ہے' نقصان کی نہیں سوچتا۔ یہ تو ہمارے ہاں عام طور پہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ تو پاگل ہو گیا ہے کہ اس کو اپنے نفع و نقصان کا بھی خیال نہیں رہتا یعنی جسے اپنے نفع و نقصان کا خیال نہ رہے تو دنیا اُسے پاگل کہتی ہے۔

انسانی زندگی کے لیے خدا تعالیٰ کی طرف سے ملنے والا قانون پوری نوعِ انسانی کے لیے ہوتا ہے

یہاں خدا کے ماننے یا نہ ماننے کے معنی یہ ہیں کہ میں اگر اُس کے قوانین کے خلاف چلوں گا تو میرا نقصان ہوگا' اُس کے مطابق چلوں گا تو میرا فائدہ ہوگا اور یہ ایک اٹل حقیقت ہے جس کے خلاف ہو نہیں سکتا' میں اس سے بچ نہیں سکتا۔ پچھلی آیت کے تسلسل میں یہ کہا کہ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (31:33)۔ یہ قوانین ساری انسانیت کے لیے ہیں' اس لیے یہاں ساری نوعِ انسانی کو مخاطب کیا گیا ہے' ان میں سے مومن وہ ہوں گے جو ان قوانین کی صداقت اور حقانیت پر یقین رکھتے ہیں اور جو اس کے خلاف جاتے ہیں وہ ہیں جنہیں آپ غیر مومن یا کافر کہیں گے لیکن یہ قوانین ساری انسانیت کے لیے ہیں۔ جس طرح کہ سنکھیا ایک مسلمان کھائے یا ایک ہندو کھائے تو اُس کا نتیجہ یکساں ہوتا ہے۔ یہ پوری انسانیت کے لیے ہیں۔ اسی لیے یہاں يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ کہہ کر مخاطب کیا ہے کہ یہ پوری انسانیت کے لیے ضابطۂ قوانین ہیں۔ یہ جنہیں آپ Physical Laws (طبعی قوانین) کہتے ہیں' جو طبعی زندگی سے متعلق ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ انسانوں کے لیے ہوتے ہیں۔ اسی لیے يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ کو مخاطب کر کے کہا کہ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ (31:33)۔ یہ اتقوا' تقویٰ سے ہے۔

متقی اور تقویٰ کا حقیقی مفہوم

اُس دن میں نے عرض کیا تھا کہ سورۃ البقرہ کی جو دوسری آیت میں هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (2:2) ہے' اس میں ہمارے تصور کی رو سے تو متقی کا تصور یہی ہے کہ وہ خدا کی عبادت کرنے والا ہے' خدا کے احکام ماننے والا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اس سے تو اعتراض پڑتا ہے

کہ جو پہلے ہی متقی ہے' صحیح راستے پہ چل رہا ہے تو اس کے لیے ہدایت اور راہنمائی کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہدایت دینے کی ضرورت تو غیر متقیوں کو ہے' جو پہلے سے متقی ہے اُس کو ہدایت دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ متقی کا ہمارا تصور ہے لیکن عربی زبان اور قرآن کی رو سے تقویٰ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ''راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلنے والا'' جو چاہتا ہے کہ زندگی کے راستے کی خطرناک نقصان دہ گھاٹیوں سے بچ کر چلوں' وہ متقی ہے اور اُسے یہ کتاب بتائے گی کہ راستہ کونسا ہے جس میں خطرات نہیں آتے۔ بات صاف ہوگئی اور جو یوں بچ کر چلنا ہی نہیں چاہتا' جیسا میں نے کہا تھا کہ جو خودکشی کرنے کے لیے دریا پہ جاتا ہے اُسے کہنا کہ آگے نہ جانا' وہاں پانی گہرا ہے وہ تمہیں ڈبو دے گا' تو وہ تو گیا ہی ڈوبنے کے لیے ہے۔ یہاں کہا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمۡ (31:33) اس کی احتیاط برتو' ایسا راستہ نہ اختیار کرو جس میں خطرات ہوں اور اُس میں تمہارا نقصان ہو جائے۔ یہاں پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس کی احتیاط برتو اور ایسا راستہ اختیار نہ کرو جس میں خطرناک گھاٹیاں ہوں۔

خدا کے خشیت وخوف سے ڈرنے کا تصور قرآنی تعلیم کی روشنی میں

اگلی چیز ہے کہ وَاخۡشَوۡا یَوۡمًا لَّا یَجۡزِیۡ (31:33)۔ یہاں وَاخۡشَوۡا آیا ہے۔ وَاخۡشَوۡا تو عموماً خوف کو کہتے ہیں مگر خوف تو عام لفظ ہے' دوسرا لفظ خشیت کا ہوتا ہے' خشیتِ باری تعالیٰ بھی ہمارے ہاں بولتے ہیں۔ اس کے معنی بھی ڈرنے کے کیے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں عام تصور یہ ہے کہ خدا سے ڈرو اور خدا سے ڈرو کا لفظ تو صبح سے شام تک ہم بولتے ہیں۔ وہ مومنوں کے متعلق کہتا ہے کہ مومن وہ ہیں کہ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (2:277) ان کو خوف ہوتا ہی نہیں ہے۔ وہ جو پھر یہ خوف بتا رہے ہیں' خواہ وہ خوف خدا ہی کا کیوں نہ ہو' وہ تو پھر بڑا ہی سخت قسم کا خوف ہوتا ہے۔ جہاں اور کوئی خوف کام نہ دے تو وہاں یہ کہتے ہیں ''میاں! خدا توں تے [1] ڈر''۔ خدا کہتا ہے کہ مومن کا منتہا یہ ہے کہ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ (2:277) خوف اور تو رہا ایک طرف حزن بھی نہیں ہوگا' وہاں دل کی افسردگی بھی نہیں ہوگی۔ جہاں ہر بات قاعدے قانون کے مطابق ہو تو وہاں ڈرنے کی بات نہیں' وہاں احتیاط کی بات ہے۔

اصل بات تو مکافاتِ عمل کی ہوتی ہے' ڈر نہیں ہوتا

ڈرا تو مستبد حاکم سے جاتا ہے۔ ڈرو اس سے کہ اگر تم نے سنکھیا کھایا تو ہلاک ہو جاؤ گے' ڈرو اس سے کہ اگر آگ میں ہاتھ ڈالا تو ہاتھ جل جائے گا' ڈرو اپنے اس عمل کے نتیجے سے۔ جسے خدا کا خوف کہتے ہیں وہ خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کے جو تباہ کن نتائج ہوتے ہیں' ان کے احساس اور احتیاج کا نام ہوتا ہے۔ وہ ڈرنا نہیں ہوتا' ڈر سے تو انسانیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ احتیاط ہے یہ تو خشیت کا لفظ ہے۔

---

[1] میاں! خدا سے تو ڈرو۔

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن سمجھنا ہے تو قرآن کے یہ جو مفردات (Derivatives) میں' یہ جو الفاظ ہیں ان کے بنیادی معنی پہلے سمجھیے کہ مادے (Root) کے اعتبار سے عربوں کے ہاں اس کا کیا Concept (تصور) تھا۔ وہ عجیب وغریب قوم تھی' عجیب زبان تھی جو بنائی ہے! قرآن کی حامل یہی زبان ہوسکتی تھی۔

خشیت کا قرآنی مفہوم

یہ خشیت کیا چیز ہوتی ہے کہ جس سے احتیاط برتنے کا کہا ہے؟ عربوں کے ہاں پانی نایاب چیز ہے' کہیں کہیں چشمہ اور چشمے کے کنارے پہ کوئی نخلستان تھا اور وہیں کوئی کھیتی ہوتی تھی۔ ہمارے ہاں بھی اگر کوئی کسان بڑی محنت سے اپنی کھیتی بوئے' احتیاط برتے اور وہ خشک ہوجائے تو کتنا بڑا نقصان ہے۔ عربوں کے ہاں خشیت اس کو کہتے تھے کہ ہرے بھرے درخت اور سرسبز کھیتی کا اس طرح خشک ہوجانا کہ پھر اُس کے بعد سرسبز ہی نہ ہو۔ کہا کہ اس کی احتیاط برتو' ایسا چلن اختیار نہ کرو کہ تمہاری ہری بھری کھیتیاں اس طرح سے خشک ہوجائیں کہ پھر وہ سرسبز ہو ہی نہ سکیں۔ اگر آپ اسے ڈر کہنا چاہتے ہیں تو سوچ لیجیے' یہ اپنے اُس ہونے والے نقصان کا احساس ہے اور اُس کسان یا زمیندار کے لیے اس سے بڑی چیز کیا ہے کہ اتنی محنت کی' اتنی قیمت کا بیج ڈالا' اتنا وقت صرف کیا اور اُس کے بعد کسی بے احتیاطی یا کسی اور وجہ سے کھیتی خشک ہوجائے اور ایسی خشک ہوجائے کہ پھر ہری بھری نہ ہو تو اسے خشیت کہتے ہیں۔ کہا کہ وَاخْشَوْا يَوْمًا (31:33) اُس حادثے سے محتاط رہو' احتیاط برتو۔

اعمالِ انسانی کے ظہورِ نتائج کے وقت کو قرآنِ حکیم نے یوم بھی کہا ہے

یوم کے معنی تو دن ہوتا ہے لیکن عربی زبان میں یہ دن ہی نہیں ہوتا بلکہ کسی بات کی نمود کا جو وقت ہوتا ہے وہ بھی یوم ہوتا ہے اور ہزار ہزار' پچاس پچاس ہزار سال کا جو مرحلہ ہوتا ہے جسے آپ ٹائم (زمان) کی Age (عمر) کہتے ہیں وہ بھی عربی زبان میں یوم ہی کہلاتی ہے۔ اُس وقت سے ڈرو جو تمہارے اعمال کے نتائج کو محسوس طور پہ سامنے لے آئے۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ یہ اعمال تو بہت پہلے سے نتیجہ خیز ہونے شروع ہوجاتے ہیں۔ ہر عمل جب سرزد ہوتا ہے تو اپنا نتیجہ مرتب کرنا شروع کردیتا ہے۔ پہلی Stages (منازل) وہ ہوتی ہیں جن میں وہ غائب ہوتا ہے یعنی تمہاری نگاہوں کے سامنے نہیں آتا' محسوس شکل میں نہیں آتا لیکن وہ بن رہا ہوتا ہے۔ اگر تم اس درمیان میں اُس کا ازالہ کرلو' اُس کی تدبیر کرلو' اُس کا علاج کرلو تو وہ رک جاتا ہے۔ اگر یہ نہ کرو تو بڑھتا چلا جاتا ہے اور بڑھتے بڑھتے پھر وہ وقت آجاتا ہے جب وہ محسوس شکل میں تمہارے سامنے آجاتا ہے۔ درد شروع ہوجاتا ہے' بخار حرارت کی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ یہ فوری طور پہ نہیں آتا۔ ڈاکٹر تمہیں بتاتا ہے کہ میاں! یہ تو اتنے عرصے سے شروع ہوا تھا' تم نے لاپرواہی برتی اور تم اسے یہاں اس اسٹیج پہ آج لے آئے ہو۔ یہ جو کسی عمل کے محسوس شکل میں نمودار ہونے کی اسٹیج ہوتی ہے' یہ ہے جسے يَوْمًا لَّا يَجْزِىْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَلَا

مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا (31:33) کہا ہے یعنی یہ حالت کہ کوئی کسی کے کام نہ آ سکے' نہ باپ بیٹے کے کسی کام آ سکے اور نہ بیٹا باپ کا ہاتھ بٹا سکے۔

انسان کے لیے اس کی انفرادیت کی اہمیت اور اس کی کیفیت

قرآن کی رو سے اب یہاں انفرادیت (Individuality) شروع ہوتی ہے۔ اسے ذہن میں رکھیے کہ یہ جو انفرادیت ہے یہی ہے جس کا نام انسان ہے۔ ہر فرد Individual (منفرد) ہوتا ہے' اپنے عمل کا آپ ذمہ دار ہوتا ہے اور اُسی کو اُس کا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔ جو آگ میں انگلی ڈالتا ہے' اُس کا درد اُسی فرد کو ہوتا ہے۔ ماں باپ' بہن بھائی کتنے ہی اُس کے اردگرد کیوں نہ ہوں' بلائیں لے لیں' ''بھاویں ماں اوہدے صدقے واری جاوے ❶۔'' گلے سے لگالے' سب کچھ کرے لیکن اُس کا درد اُسی کو ہوتا ہے۔ علاج کیا جائے گا تو اُس درد کو افاقہ ہوگا' شفا ہوگی۔ وہ بھی اُسی کو کرنا ہوگا۔ یہ نہیں ہوگا کہ انگلی اُس کی جلے' علاج ماں اپنا کرائے اور آرام اُس کو ہو جائے۔ ماں بچے کی قریب ترین ہمدرد ہوتی ہے' وہ اُس کے درد کے احساس سے تڑپ رہی ہوتی ہے لیکن درد اُس کا نہیں بٹا سکتی' علاج بھی اُسی کا ہی ہوگا کسی دوسرے کا نہیں ہوگا۔ اسے Individuality (انفرادیت) کہتے ہیں۔ سائیکولوجی (علمِ نفسیات) پھر پھرا کر دو اڑھائی ہزار سال کے بعد اس پوائنٹ (نکتے) کے اوپر آئی ہے کہ ہر فرد ایک الگ Individual (فرد) ہوتا ہے' اُس کی Individuality (انفرادیت)' اُس کی فردیت ہوتی ہے۔ جسے آپ ''میں'' ❷ کہتے ہیں تو ہر فرد الگ ''میں'' ہوتا ہے اور قرآن نے جب یہ کہا ہے کہ تم یہاں جتنے جی کرے جتھے بناؤ لیکن ہمارے پاس آؤ گے تو **ولقد جئتمونا فردا** (6:94) تم اپنی Individuality (فردیت) لے کر آؤ گے۔ کہا ہے کہ اُس وقت کی احتیاط برتو جب تمہارے یہ اعمال' جو اس وقت غیر محسوس نتائج مرتب کر رہے ہیں' اُس وقت ان کا نتیجہ محسوس شکل میں سامنے آ جائے گا۔ اُس وقت یاد رکھو کہ نہ باپ بیٹے کے کام آ سکے گا' نہ بیٹا باپ کے کام آ سکے گا۔ قریب ترین جو رشتہ تھا وہ بتا دیا کہ اس میں کوئی اُس درد کو بٹا نہیں سکے گا۔ احساس کرو اس چیز کا کہ ہری بھری کھیتیاں خشک ہو جائیں گی اور کوئی کسی دوسرے کا درد نہیں بٹا سکے گا۔

خدا کا وعدہ دراصل خدا کا وہ اٹل قانون ہوتا ہے جو کبھی اپنا نتیجہ نہیں بدلتا

کہا ہے کہ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (31:33) یہ جو قانون ہم بتا رہے ہیں' یہ خدا کا وعدہ ہے۔ خدا کا وعدہ یہ ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ ایسا ہوگا یا ہم ایسا کریں گے تو یہ قانونِ خداوندی ہے۔ یاد رکھیے! اگر ہنگامی طور پہ کوئی ایسی بات کہے تو وہ حکم ہوتا ہے لیکن وہی حکم اگر مسلسل

---

❶ خواہ ماں اس کے صدقے واری جائے' قربان ہو ہو جائے۔

❷ I- am- ness

متواتر اُسی شکل کے اندر قائم رہے تو وہ قانون ہوتا ہے۔ حکم احکام جسے آپ کہتے ہیں وہ عام طور پر بادشاہت میں یا ملوکیت میں آتا ہے کہ اب یہ حکم دیدیا' دوسرے وقت میں دوسرا حکم دیدیا' وہ بدلتا رہتا ہے۔ قانون بدلتا نہیں ہے۔ یہ قانون ہے کہ سنکھیا کھاؤ گے تو ہلاکت ہوگی۔ اسی کو الحق کہا ہے کہ یاد رکھو! وہ قوانینِ خداوندی حقیقت ہیں' وہ Reality (حقیقت) میں ایسے ہیں' وہ ہو کر رہے گا' وہ اٹل ہیں' غیر متبدل ہیں۔ ہم جو کہہ رہے ہیں تو یونہی تمہیں ڈرانے کے لیے نہیں کہہ رہے بلکہ یہ یقینی چیز ہے۔ ان قوانین کی خلاف ورزی کرو گے تو ہری بھری کھیتیاں بھی خشک ہو جائیں گی۔

کسی بات کو واضح انداز میں بیان کرنے کا قرآنی طریق

قرآن ایک چیز کو اُس کے تضاد سے (By Jxtaposition) واضح کرتا ہے اور یہ بھی آج فلسفہ بنا ہے کہ کسی چیز کے تضاد سے کسی چیز کو زیادہ واضح کرنا۔ قرآن کا انداز یہ ہے کہ یہاں قوانین کی خلاف ورزی سے کھیتوں کے خشک ہونے کا کہا ہے اور (14:24) میں اس کے متضاد اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ (14:24) کہا ہے کہ ذرا غور کرو کہ خدا کس طرح مثال دے کر تمہیں بات سمجھاتا ہے۔ یہ ایسی بنیادی چیز ہے کہ اس سے پورا اسلام سامنے آ جاتا ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ (14:24)۔ بنیادی چیز زندگی کا نظریہ ہوتا ہے' Concept of Life (تصورِ حیات) ہوتا ہے' آئیڈیالوجی ہوتی ہے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں کلمہ کہتے ہیں اور لفظ کلمہ تو ہم روز دہراتے رہتے ہیں مثلاً کلمہ طیبہ لیکن کیا کبھی ذہن میں آیا ہے کہ یہ ہے کیا جو ہم کہتے ہیں؟

کلمہ طیبہ اسلام کی ایک ایسی آئیڈیالوجی ہے جس کی کوئی مثل ہی نہیں

یہ کلمہ نظریۂ حیات ہے' یہی آئیڈیالوجی ہے۔ یہاں اُس نے کہا ہے کہ جو کلمہ طیبہ ہے اُس کی مثال یہ ہے۔ طیب کے معنی پھل دیدینے والا درخت ہوتا ہے' خبیث وہ ہوتا ہے' جو درخت پھل نہیں دیتا۔ یہ کلمہ طیبہ جو ہم کہتے ہیں وہ یہ ہے: **لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ**۔ اس تصور یا اس آئیڈیالوجی کو جو آپ طیبہ کہتے ہیں تو کیا کبھی اس کا پھل بھی آپ نے آج تک دیکھا ہے؟ اُس کلمہ کا مفہوم ہی ہمارے سامنے نہیں ہوتا تو اُس کا پھل ہمارے سامنے کیا آئے گا۔ کہا ہے کہ كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ (14) طیب آئیڈیالوجی کی مثال ایک طیّب درخت کی طرح ہے۔ اب جب درخت کے لیے طیّب کا لفظ آ گیا تو وہ بات سمجھ میں آ گئی کہ عرب کس درخت کو طیّب کہتے تھے۔ یہاں قرآن نے آگے خود بتا دیا ہے کہ طیّب درخت کونسا ہوتا ہے۔ کہا کہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ (14:24) اُس کی جڑیں زمین میں پاتال تک گئی ہوئی ہوتی ہے' اُس کی جڑیں اس قدر محکم ہوتی ہے کہ تیز سے تیز جھکڑ بھی اُس کو وہاں سے اکھیڑ نہیں سکتا۔ یہ ہے قرآن کا دیا ہوا نظریۂ حیات۔ آگے کہا کہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (14:24) شاخیں اس کی آسمان میں جھولے

جھول رہی ہوتی ہیں۔ ارض کے اندر مستحکم ہے یعنی اس مادی زندگی کے اندر اُس کی جڑیں ہوتی ہیں اور اُس کی جو پھل لانے والی شاخیں ہوتی ہیں وہ سمآء کے اندر ہوتی ہیں۔ اگر ارض کے اندر ہی رہے، زمیں گیر ہی رہے تو وہ نظریۂ زندگی قرآنی نہیں ہے۔ اُس کی شاخوں کو سمآء یعنی بلندیوں کی طرف جانا چاہیے۔ شجرِ طیّب کا نتیجہ یہ ہے کہ تُؤۡتِیۡۤ اُکُلَهَا (14:25) وہ اپنا پھل دیتا ہے کُلَّ حِیۡنٍۭ بِاِذۡنِ رَبِّهَا (14:25) رب کے قانون کے مطابق، نشوونما دینے والے کے قانون کے مطابق، وہ اپنا پھل دیتا ہے اور ہر موسم میں پھل دیتا ہے۔

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے اپنے پمفلٹ [1] میں لکھا تھا کہ اسلام چلا ہوا کارتوس کبھی نہیں ہوتا، یہ ہر موسم میں پھل دیتا ہے، اس میں پھل دینے کی صلاحیت ہے، یہ کبھی شجرِ خبیث نہیں ہوتا۔ ابھی میں عرض کروں گا کہ یہ کس طرح سے پھل دیتا ہے یعنی خود بخود دے دیئے جائے گا یا خود ہمیں بھی کچھ کرنا ہوتا ہے؟ یہ بات آگے آئے گی۔ اُس نے یہ کہا کہ یہ تو خدا کے قوانین کے مطابق جو زندگی آپ بسر کریں گے خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی نظام کے تابع ہو، وہ اُس آئیڈیالوجی کے مطابق ہوگی جس کی مثال اُس درختِ طیّب کی ہے جس کی جڑیں پاتال میں ہیں، بے حد مضبوط ہیں اور اُس کی شاخیں بلندیوں کی طرف، خدا کی طرف، چلی جارہی ہیں، وہ ہر موسم میں اپنا پھل دیتا ہے اور اگر اُس کے خلاف جاؤ گے تو سنو! وَاخۡشَوۡا (31:33) ہری بھری کھیتیاں بھی خشک ہو جائیں گی۔ آپ نے دیکھا کہ اُس نے تضاد سے کس طرح معنی سمجھائے ہیں اسی لیے کہا کہ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ (31:33) یہ ایک حقیقت ہے، یاد رکھو! ایسا ہوتا ہی ہے اور ایسا ہی ہوگا۔

انسان ہمیشہ مفادِ عاجلہ سے دھوکا کھاتا ہے

اب کون سی چیز ہے جو انسان کو اس سے بہکاتی ہے؟ کہا کہ فَلَا تَغُرَّنَّکُمُ الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا (31:33) یہ دنیاوی زندگی کے قریبی مفاد ہیں جو انسان کو دھوکا دے دیتے ہیں۔ شیطان کے متعلق قرآن نے کہا ہی یہ ہے کہ تمہارے سوئے عمل کو، تمہاری غلط باتوں کو، یہ خوشنما بنا کر دکھاتا ہے۔ اگر وہ باتیں اُسی شکل میں انسان کے سامنے آجائیں جیسی وہ ہیں تو پھر انسان دھوکا نہیں کھاتا۔ یہ تو مقدس نگاہ فریب نقاب ہوتا ہے جس سے انسان دھوکا کھاتا ہے، وہ انہیں مزین بنا کر دکھاتا ہے۔ ہر بات اپنے فائدے کے لیے کرتا ہے اور کہتا یہ ہے کہ تمہارے فائدے کے لیے میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں، میں تو تمہارے فائدے کے لیے اپنی جان مار رہا ہوں۔ وہ پھر اس کو تمہارے لیے مزین بناتا ہے کہ اس میں تمہارے لیے یہ فائدہ ہے، یہ فائدہ ہے۔ یہ جو شیطان کا ان غلط چیزوں کو مزین بنانا ہے یہ ہے جسے کہا ہے کہ دھوکا دیتا ہے، اس کے دھوکے میں نہ آجانا۔ وَلَا یَغُرَّنَّکُمۡ بِاللّٰهِ الۡغَرُوۡرُ (31:33) دیکھنا!! دھوکے دینے والے بہت سے ہوں گے۔ ان کے دھوکے میں نہ آجانا۔ اِنَّ اللّٰهَ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ (31:34) ہر حال میں یہ دیکھنا کہ خدا کا قانون کیا کہتا ہے کیونکہ وہ اٹل ہے، وہ حق ہے جبکہ یہ

---

[1] اس پمفلٹ کا نام ہے: کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟

شیطان دھوکا دے رہا ہے' دھوکے میں نہ آ جانا۔ یہ کہ ان غلط اعمال کے تباہ کن نتائج محسوس شکل میں کب سامنے آئیں گے' قرآن نے اس کو ساعۃ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ گھڑی [1] ہے' جو ہم کہتے ہیں کہ خدا کرے بُری گھڑی نہ آئے۔ ہمارے ہاں بھی یہ لفظ اسی کا ترجمہ کیا ہوا ہے۔ ویسے عربی زبان والے' ماڈرن انگلش میں' ساعۃ Watch (واچ) کو بھی کہتے ہیں۔ السَّاعَةِ یعنی وہ لمحہ' وہ وقت' جب یہ تباہی محسوس شکل میں سامنے آتی ہے' اُسے الساعۃ کہتے ہیں۔

انسانی زندگی نظروں سے تو اوجھل ہوتی ہے مگر ختم نہیں ہوگی

عزیزانِ من! یہ اس دنیا میں بھی ہوتا ہے اور ویسے 'اس دنیا' تو کہنا ہی نہیں چاہیے کیونکہ زندگی ایک جوئے رواں ہے۔ آپ اپنی پہچان کے لیے اس نہر کے نام رکھ لیجیے کہ مغل پورہ کی نہر' گلبرگ کی نہر اور فیروز پور والی نہر مگر نہر نہ تو گلبرگ کی' نہ مغلپورہ کی اور نہ فیروز پور کی ہوتی ہے۔ یہ تو محض پہچان کے لیے نام ہیں:

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود

زندگی تو مسلسل ہوتی ہے' یہ زندگی اور آخرت کی زندگی دو زندگیاں نہیں ہیں۔ الساعۃ یہاں ہو تو یہاں وہ نتائج محسوس شکل میں سامنے آ جائیں اور اس کے بعد مستقبل میں آ جائیں تو بات تو ایک ہی ہے۔ مستقبل تو ہمارے پیمانے کے مطابق ہے۔ یہ وہی ہے جو میں نے کہا تھا کہ وقت کے گز کے اوپر ہم نے گرہیں لگائی ہوئی ہیں۔ زندگی کے گز میں تو گرہ ہوتی ہی نہیں ہے' اس میں Future (مستقبل) کا تو سوال ہی نہیں ہوتا۔ الساعۃ وہ ہے کہ جب انسان کے اعمال اپنا نتیجہ غیر مرئی (Invisible) طور پر مرتب کر رہے تھے تو جب وہ نتیجہ محسوس شکل میں سامنے آتا ہے تو وہ الساعۃ ہے۔ یہ الساعۃ تمہارے اعمال کے مطابق کب آئے گی؟ کہا کہ اِنَّ اللّٰـهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ (31:34) اس کا علم خدا کے حساب کے مطابق ہوتا ہے اور اُسی کو اس کا علم ہوتا ہے۔ یہ چیز الساعۃ کے متعلق کہی تھی۔ یہ جو میں نے کہا ہے کہ آہستہ آہستہ وہ نتائج مرتب ہو رہے ہوتے ہیں اور اُس کے بعد ایک وقت آتا ہے کہ جب وہ محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں' وہ الساعۃ ہے۔

نتائج مرتب ہونے کے سلسلہ میں دو محسوس مثالیں

اب آگے دو مثالیں ہیں۔ کہا ہے کہ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ (31:34)۔ بارش کو دیکھیے۔ بارش بننا تو بہت پہلے سے شروع ہوا ہوتا ہے'

---

[1] ''گھڑی کے اس تصور'' پر مفکر قرآن علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے بھی کیا خوب کہا ہے:

یہ گھڑی محشر کی ہے' تو عرصۂ محشر میں ہے ۔ پیش کر غافل' عمل کوئی اگر دفتر میں ہے! (بانگِ درا)

جب سورج کی تمازت یا گرمی یا حرارت سمندر سے بھاپ کی صورت میں کشید کر کے پانی اوپر لے جاتی ہے تو وہاں سے اس سلسلے کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ ایک پروسیس (عمل) ہے۔ اُس کے بعد وہ اوپر جاتی ہے' پھر وہ بادل بنتی ہے' پھر ہوائیں اڑاتی ہیں' پھر جہاں ٹھنڈک اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ بھاپ پانی کی شکل اختیار کرتی ہے' پانی ہوا سے زیادہ وزنی ہوتا ہے' وہ نیچے گرتا ہے۔ کہا کہ یہ بارش جس وقت ہوتی ہے تو یہ اُسی وقت نہیں بن جاتی بلکہ یہ بہت پہلے سے بننی شروع ہوتی ہے۔ اب دوسری مثال لیجیے۔ کہا کہ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ (31:34) رحم مادر کے اندر جنین ایک دن میں نہیں بن جاتا بلکہ وہ تو ایک اولیں جرثومے سے لے کر ایک پورے بچے کی شکل میں بڑی منازل طے کرتا ہے۔ تمہارے سامنے وہ جو بچہ جیتا جاگتا پیدا ہو کر آتا ہے تم تو اس وقت اس بچے کو دیکھ رہے ہوتے ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ کن منازل اور مراحل سے گزر کر یہ محسوس شکل اختیار کرتا ہے۔

آیت یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ کے سلسلہ میں پیدا ہونے والے الجھاؤ اور ان کی حقیقت

اس یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ آیت کے متعلق ذرا آگے چل کر اسی درس میں بتاؤں گا کہ اس کی وجہ سے کتنے الجھاؤ پیدا کیے جا رہے ہیں' کتنی غلط فہمیاں پیدا کی جا رہی ہیں۔ کہا ہے کہ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا (31:34) کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا۔ اسی طرح کہا کہ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ (31:34) کوئی شخص نہیں جانتا کہ اُس کی موت کہاں واقع ہوگی۔ آگے کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ (31:34) خدا ہی ہے جو علیم بھی ہے اور خبیر بھی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اس آیت کے متعلق کتنی غلط فہمیاں پیدا کی جا رہی ہیں۔ اس آیت کے متعلق مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ خدا نے پانچ چیزیں ایسی گنائی ہیں جن کے متعلق کہا ہے کہ ان کا علم صرف خدا کو ہوتا ہے' کسی انسان کو اس کا علم نہیں ہو سکتا۔ اور وہ پانچ چیزیں یہ ہیں: (۱) علم الساعۃ' (۲) بارش کب ہوگی' (۳) جنین' (۴) انسان کل کیا کرے گا' (۵) انسان کی موت کہاں واقع ہوگی؟ کہنے والے تو یہ کہہ کر چلے گئے لیکن ہمارے لیے ایک مشکل پیدا کر گئے۔ آج Scientific Discoveries (سائنسی انکشافات اور تحقیقات) یہاں تک پہنچی ہیں کہ بارش کا جو پروسیس (عمل) ہے یعنی سمندر سے بھاپ بن کر اڑنے سے لے کر آخر تک' وہ انہوں نے کمپیوٹر کے ذریعہ سے Calculate (نکالنا) کرنا شروع کر دیا ہے' اس سے Exact (صحیح) علم آ جاتا ہے۔ اور وہ تو اب بارش جہاں برسانا مطلوب ہوتا ہے وہاں برسا بھی دیتے ہیں۔ وہاں تو دو مملکتوں کے درمیان جن کے بارڈر (سرحدیں) قریب قریب ہیں وہاں Theft of Rain (بارش کی چوری) کے مقدمات ہو رہے ہیں کہ ''میرا مینہ چرا کر لے گئے ہیں''۔ پنجابی میں جیسے کہتے ہیں کہ ''ایہہ ساڈا بدل اڑند کے لے گئے نیں۔ اے اگلے

منڈیاں نوں پتہ اے کہ بسنت اچ اک تے گڈی کٹی جاندی سی' تے اک اڑند کے لے جاندے سن ❶۔'' وہاں یہ چیز ہوتی ہے کہ ''ایہہ ساڈا بدل اڑند کے لے گئے نیں'' ❷۔ یعنی میں نے کہا کہ وہاں یہ کیفیت ہے۔ جنین کے متعلق ان کے ہاں کی سائنس اب یہاں تک پہنچی ہوئی ہے کہ رحم مادر کے اندر ذرا بچہ بننا شروع ہوتا ہے تو اُس کا سیکس (تذکیر) تک بتا دیتے ہیں کہ بچہ ہوگا یا بچی ہوگی۔ ان حجروں میں رہنے والوں کو کیا معلوم کہ دنیا کیا کہہ رہی ہے' کہاں پہنچ رہی ہے' ان کے کیا تقاضے ہو رہے ہیں۔ مجھ سے پوچھیے کیونکہ وہ سائنسدان میرے پاس آتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ کہو! تمہارے ہاں تو تمہارے خدا کا ان پانچ چیزوں کے متعلق اتنا بڑا دعویٰ ہے کہ ان کا علم صرف خدا کو ہی ہے جبکہ یہ علم آج تو ہمارے سامنے آ گیا ہوا ہے۔

عزیزانِ من! یہ بہت بڑا اعتراض ہے۔ ملّا کے نزدیک تو ماتھے کی شکنیں اور منہ کی جھاگ اور آنکھوں کی سرخی کے سوا کوئی جواب ہی نہیں ہوتا۔ ان کے پاس ایک ہی چیز تھی اور وہ کفر کا فتویٰ ہے لیکن قرآن کی حقانیت اس طرح سے تو نہیں منوائی جا سکتی۔ آپ بھی سوچیے کہ اگر خدا کا یہ دعویٰ ہو کہ ان پانچ چیزوں کا جو علم ہے وہ صرف خدا کو ہے' کسی انسان کو اس کا علم ہو ہی نہیں سکتا تو آپ اس کا کیا جواب دیں گے؟

قرآن فہمی کے سلسلہ میں ہماری بدقسمتی' ہماری غلط سوچ ہے

اگر یہ چیز محض کسی مفسر کی تفسیر میں ہوتی تو پھر بھی ہمارے لیے یہ کہنا آسان تھا کہ یہ اُس کا قیاس تھا اور اُس نے یہ بات کہہ دی ہے۔ بدقسمتی ہماری یہ ہے کہ جو کچھ ان مفسروں نے اس میں کہنا تھا انہوں نے قال رسول اللہ پہلے لگایا اور رسول اللہ کی طرف منسوب کر دیا۔ یہ بخاری شریف کی حدیث ہے جس میں یہ کہا گیا ہے۔ آپ اسے غور سے سنیے گا جو میں اب کہہ رہا ہوں کہ قرآن نے یہ نہیں کہا۔ قرآن کہتا ہے کہ إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ (31:34) جو الساعۃ ہے یہ خدا کے قانون کے مطابق ہوگی۔ یہ جو بارش اور ارحام ہے اس کے متعلق قرآن نے یہ نہیں کہا کہ اس کا علم صرف خدا کو ہے اور انسانوں کو نہیں ہے۔ یہ بڑی اہم چیز ہے جو میں آپ سے عرض کر رہا ہوں۔ بخاری شریف کی حدیث کی بنا پر ہزار برس سے ہمارے ہاں یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ یہ پانچ چیزیں ہیں جن کا علم انسان کو نہیں ہو سکتا بلکہ صرف خدا کو ہے۔ آپ قرآن کی آیت نکال لیے' اس میں کہیں یہ نہیں لکھا ہوا۔ وہاں لکھا ہے کہ یُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ (31:34) وہ اپنے قانون کے مطابق بارش برساتا ہے اور جانتا ہے کہ ارحام میں کیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ تم نہیں جان سکتے۔ وہ بھی جانتا ہے'

---

❶ یہ ہمارے بادل کو اُڑا کر لے گئے ہیں۔ یہ اس نئی نسل کے بچوں کو علم ہے کہ بسنت کے موسم میں ایک تو گڈی کاٹی جاتی تھی اور ایک اسے ''اُڑا کر'' لے جائی جاتی تھی۔

❷ یہ ہمارا بادل اُڑا کر لے گئے ہیں۔

تم بھی جان سکتے ہو۔ یہ کہاں کہا ہے کہ اس کا علم صرف خدا کو ہے؟ سوال یہ ہے کہ ایک چیز جو واقعہ کے خلاف جاتی ہے اُس کو چھوڑ دیجیے لیکن قرآن میں یہ نہیں ہے کہ تم نہیں جان سکتے اور صرف خدا کو اس کا علم ہے۔ ہم جو چیز نہیں جان سکتے وہ اگلے دو لفظوں میں آئی ہے اور وہ چیز ہے جو آج کا سائنسدان بھی مانتا ہے اور قیامت تک اُس کو مانے گا۔ اس کے فوراً ہی بعد کہا ہے کہ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا (31:34) کوئی فرد' کوئی شخص' یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں کل (Future) کو کیا کروں گا۔ یہ ہے وہ چیز۔ اسی طرح آگے کہا کہ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ (31:34) کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری موت کہاں ہوگی۔ کہیے دنیا بھر کے مفکرین اور سائنٹسٹ کو کہ اس کو جھٹلا کر دکھائیں۔ جھٹلانا تو ایک طرف رہا' جوں جوں یہ فلسفہ اور سائیکالوجی (علم نفسیات) اور آگے بڑھ رہے ہیں' ان کی تائید ہوتی چلی جا رہی ہے۔

اختیار وارادہ کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس کا مستقبل Determine (متعین ومقرر) نہیں ہوتا

اب سوال یہ ہے کہ کوئی کسی کے متعلق یا اپنے متعلق کیوں نہیں بتا سکتا؟ کہ میں ''کل'' کیا کروں گا؟ آپ مچھلی کو خشکی پہ رکھیے تو ہر شخص بتا دے گا کہ یہ کہیں ذرا سی چھلانگی تو پانی کی طرف چلی جائے گی۔ انسانی بچہ کدھر ہاتھ مارے گا یہ کوئی بھی نہیں بتا سکتا۔ یہ اس لیے ہے کہ اسے ذرا سا اختیار وارادہ دیا جاتا ہے۔ اختیار دینے کے معنی یہ ہیں کہ اُس کا Future Determine (مستقبل متعین ومقرر) نہیں ہوتا' اُس کا مستقبل جامد نہیں ہوتا' طے شدہ نہیں ہوتا۔ اُس کے سامنے ہمیشہ دو Possibilities (امکانات) ہوتی ہیں۔ اب یہ ان میں سے کون سی Possibility (امکانیت) اختیار کرے گا' یہ کوئی نہیں کہہ سکتا' کوئی نہیں بتا سکتا۔

دنیا کا کوئی شخص بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ مکھی اڑ کر کہاں بیٹھے گی

جو صاحب اختیار ہے اُس کے Future (مستقبل) کے متعلق کوئی کچھ کہہ ہی نہیں سکتا۔ صرف اُس کے Future (مستقبل) کے متعلق کہا جا سکتا ہے جو صاحب اختیار نہیں ہے اور ایک روش پر چلنے کے لیے مجبور ہے۔ گوشت اور گھاس رکھا ہوا ہو' اور بکری کو لاؤ تو بچہ بھی کہہ دے گا کہ یہ گھاس کھائے گی۔ یہ اس وجہ سے اُس نے بتا دیا ہے کہ اُس بکری کے لیے کوئی Choice (اختیارِ انتخاب) نہیں ہے کہ جی چاہے گھاس کھائے اور جی چاہے تو گوشت کھائے۔ وہ تو گھاس ہی کھاتی ہے۔'' میں نے تو یہ کہا تھا کہ کیا تم انسان کے متعلق یہ کہتے ہو کہ ہم اس کے Future (مستقبل) کا بتا سکتے ہیں؟ اُس نے کہا کہ دس سائنٹسٹ ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے ہوں' وہ نہایت آسانی سے بتا سکیں گے کہ ہزار برس کے بعد سورج گرہن کس دن' کس وقت' کتنے حصے میں لگے گا اور وہ ان کے ہاں کی Calculation (جمع تفریق ہو بہو صحیح) ہوگی۔ اور انہی کے سامنے اگر میز پہ مکھی بیٹھی ہوئی ہو تو وہ دس کے دس بھی زور لگا لیں لیکن وہ یہ نہیں Exact

بتا سکیں گے کہ یہ اڑ کر اس کے بعد کہاں بیٹھے گی''۔ ہمارے ہاں منجم ہیں' ستارہ شناس ہیں' فالیں بتا رہے ہیں' نجوم دکھا رہے ہیں۔ زندہ اور صاحب ارادہ کا مستقبل Determine (متعین ومعلوم) نہیں ہوسکتا۔ سچ کہا تھا اقبالؒ (1877-1938ء) نے کہ

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تُو تابعِ ستارہ نہیں

(بالِ جبریل)

ستارے کے متعلق تو انجم شناس ہزار برس پہلے کہہ سکتا ہے کیونکہ وہ خاکِ زندہ نہیں ہے' خاکِ مردہ ہے اسے اختیار وارادہ نہیں دیا گیا۔

زندگی کی تمام تر لطف اندوزیوں کا راز انسان کے اختیار وارادہ کا رہینِ منت ہے

عزیزانِ من! یہ چیز ہے کہ مستقبل (Future) کے متعلق اور تو اور خود انسان بھی اپنے متعلق Definitely (قطعیت کے ساتھ) نہیں کہہ سکتا کہ میں واقعی کل صبح یہ کروں گا۔ تو خاکِ زندہ ہے' صاحب ارادہ ہے' تو ہر آن اپنا ارادہ بدل سکتا ہے۔ عزیزانِ من! زندگی کا تو سارا لطف ہی اس میں ہے کہ اپنے لیے کل کے متعلق پتہ نہ ہو۔ اگر ہم میں سے کسی کو بھی پتہ چل جائے کہ آئندہ جو میری زندگی ہے اُس میں کیا کیا میرے متعلق ہونا ہے اور کیسے کیسے وہ ہونا ہے تو آدمی ایک دن جی نہیں سکتا اور چیخ مار کر جنگل کو نکل جائے۔ اُس کی یہ بڑی رحمت ہے کہ اُس نے انسان کو اُس کے Future (مستقبل) سے آگاہ نہیں کیا۔ زندگی کی ساری کیفیتیں اور ساری رنگینیاں' جتنی بھی ہیں' یہ اسی چیز کے اندر ہیں کہ انسان کو Future (مستقبل) کے متعلق پتہ نہیں ہوگا۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا

زندگی کا یہ نشاطِ کار اسی میں ہے کہ کل کا پتہ نہیں ہے۔ اگر پہلے ہی پتہ ہو کہ میں نے امتحان میں فیل ہی ہو جانا ہے تو اُس لڑکے کی مت ماری ہوئی ہے کہ راتوں کو جاگ جاگ کر محنتیں کرتا پھرے۔ اور اگر پہلے ہی پتہ ہے کہ پاس ہونا ہے تو سارا دن کرکٹ کھیلتا رہے۔

سعیِ بے حاصل انسانی زندگی میں رنگینی پیدا کر دیتی ہے

عزیزانِ من! اگر انسان کو معلوم ہو جائے کہ ''کل'' کیا ہونا ہے تو زندگی اجیرن ہو جائے' زندگی گزارنا مشکل ہو جائے' ساری Activities (سرگرمیاں)' ساری مشینری' بالکل جامد ہو جائے اور کوئی کچھ کرے ہی نہیں۔ یہ انسان کے لیے کتنی بڑی رحمت ہے کہ اُس کے ''کل'' کے متعلق اُس کو کچھ پتہ نہیں ہے۔ ساری دوڑ دھوپ' جو کچھ اُس مریض بچے کے لیے ہو رہی ہوتی ہے اسی لیے ہوتی ہے کہ یہ پتہ نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ کیا بننا ہے۔ میں اپنا واقعہ سناتا ہوں۔ انڈیا اور پاکستان کے درمیان ہاکی کا میچ ٹی وی پر دکھایا جا رہا تھا۔ ویسے

ہی اُس میں ایک دلچسپی ہوتی ہے اور یہ جو چیز ہوتی ہے کہ جب آدمی کسی کی Side (طرفداری) لے کر دیکھنا شروع کرے تو وہ اس جذب وانہاک سے اُسے دیکھ رہا ہوتا ہے کہ آنکھ تک نہیں جھپکتا کہ پتہ نہیں سٹروک کس طرف لگ جائے اور مجھے پتہ نہ چلے اور گول ہو جائے۔ میچ ختم ہو گیا' پتہ چل گیا کہ پاکستان نے پانچ گول لیے تھے اور انڈیا نے دو گول کیے اور پاکستان تین گولوں کی برتری سے میچ جیت کر وہاں سے چلا آیا۔ اُسی میچ کی ریکارڈنگ جب دو تین دن کے بعد ٹی وی پر چلی تو میں دس منٹ تک بیٹھ کر بھی نہیں دیکھ سکا۔ کیوں نہیں دیکھ سکا؟ کہتے ہیں کہ ''مینوں پتہ اے کی ہونا اے۔''❶ جب انسان کو یہ معلوم ہو کہ ابھی دسویں منٹ پہ یہ گول ہونا ہے' پھر پندرھویں منٹ کے اوپر اُنہوں نے کیا تھا اور یہاں سے پنلٹی کارنر لگی نہیں تھی' آخر میں جا کر پانچ ان کے تھے اور دو ان کے تھے۔ اگر آپ کو یہ پتہ ہو تو اُسی میچ کو دیکھنے کو آپ کا جی ہی نہیں کرتا۔

بس ہجومِ نا اُمیدی' خاک میں مل جائے گی
وہ جو اِک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

(غالب)

لیکن اگر اُسی سعی کے متعلق معلوم ہو جائے کہ یہ بے حاصل رہنی ہے تو کوئی بھی پھر وہ کوشش نہیں کرتا۔ انسان سعیٔ بے حاصل میں ایک لذت محسوس کر رہا ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! اگر ایک گھنٹے کے میچ کے Future (مستقبل) کا آپ کو پتہ لگے تو اُس میں لذت نہیں رہتی۔ اگر آپ کو اپنی زندگی کے سارے میچز کا علم ہو جائے تو زندگی میں کوئی لذت باقی نہ رہے۔ یہ اُس کا کتنا کرم ہے کہ Future (مستقبل) کا علم ہمیں نہیں دیا۔ وہ یہ کہتا ہے کہ وَمَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌ مَّاذَا تَکۡسِبُ غَدًا (31:34) کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل (مستقبل میں) کیا کرے گا اور اگلی چیز ہے کہ وَمَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌۢ بِاَیِّ اَرۡضٍ تَمُوۡتُ (31:34) موت کب واقع ہوتی ہے یہ بھی اُس کا بڑا احسان ہے کہ یہ معلوم نہیں ہونے دیا ورنہ اگر یہ Definite (یقینی) ہو جائے کہ میری عمر اتنے سال اتنے دن اتنے مہینے اتنے وقت کی ہے اور اُس وقت میں نے مر جانا ہے تو انسان کا جینا دشوار ہو جائے۔ یہ تو خدا کا احسان ہے کہ ہمیں اس کا ذاتی تجربہ ہو ہی نہیں سکتا کہ موت کیا ہے۔ موت کے متعلق متعین طور پر جب علم ہو جاتا ہے کہ اس وقت وہ موت آ جانی ہے تو وہ لمحات جو درمیان میں ہوتے ہیں وہ انسان پہ کس طرح گزرتے ہیں۔ ذرا سی مثال کی رو سے نظر آتا ہے کہ جو پھانسی پانے والا مجرم ہے اُسے بتایا جائے کہ تمہیں منگل کی رات کو پھانسی دی جائے گی۔ عزیزانِ من! یہ جو جمعہ سے منگل تک کے دن ہیں تو مرنے والا مرنے سے پہلے مر جاتا ہے۔ اس کے لیے موت کا وقت متعین ہو جاتا ہے' تو اس کے لیے ایک ایک لمحہ موت کا ہوتا ہے۔

---

❶ مجھے معلوم ہے کہ کیا ہونا ہے۔

یہ سسک سسک کے مرنا غمِ ہجر میں بلا ہے

عزیزانِ من! اگر ہر انسان کو یہ معلوم ہو کہ مجھے کس وقت موت آ جانی ہے تو پہلے تو ہم جینے کی لذت ہی کو رو رہے تھے کہ باقی نہیں رہے گی' اس کے بعد تو پوچھو نہیں کہ انسان کے اوپر کیا قیامت گزرے۔ یہ اُس کی بڑی رحمت ہے کہ اُس نے یہ نہیں بتایا۔ زندگی کی ساری Activities (سرگرمیاں) اسی چیز کے لیے ہیں کہ یہ نہیں بتایا۔ اب یہ ہیں وہ دو چیزیں جن کے متعلق کہا کہ کوئی نفس' کوئی انسان' یہ نہیں جان سکتا۔ یہ ایک حقیقت ہے۔

حضرت صاحب کی پیشین گوئیوں کے بالمقابل قرآنِ حکیم کا ارشاد

آپ کو معلوم ہے کہ یہ چھاتی پہ ہاتھ رکھ کر کہتے ہیں کہ کیا کہتے ہو کہ 'نہیں جان سکتے' حضرت پیشین گوئیاں کرتے ہیں: اگلے سال یہ ہوگا' تمہیں یہ چیز ہوگی' تمہارے ہاں لڑکا ہوگا' سزا ہو جائے گی' یہ کچھ ہو جائے گا۔ اور پھر یہ پیشین گوئیاں کرنے والے عام انسان نہیں رہتے بلکہ یہ مقربینِ بارگاہِ خداوندی کہلاتے ہیں' اولیائے کرام کہلاتے ہیں۔ اور اُس کے بعد آگے چلیے تو وہ قادیان کے پیغمبر ❶ بن جاتے ہیں جن کا سارا دارومدار پیشین گوئیوں پہ ہے۔ اب بھی ان کے ہاں ان کے اخبار دیکھیے وہ سارا مدار ہی اس پہ چلتا ہے کہ وہ جو فلاں جگہ زلزلہ ❶ آیا ہے تو حضرت صاحب نے سو برس پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ ان کے دعویٰ نبوت کی صداقت کی دلیل یہ ہے کہ ان کی پیشین گوئی پوری ہوگئی۔ قرآن کہتا ہے کہ وَمَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌ مَّاذَا تَکۡسِبُ غَدًا (31:34) کوئی نہیں جان سکتا کہ ''کل'' کو کیا ہوگا جبکہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت صاحب نے بتا دیا تھا اور پورا ہو کر رہا۔ عزیزانِ من! سوچیے کہ انہیں کیا کہا جائے گا' مگر آپ کے ہاں انہیں اولیاء اللہ کہا جاتا ہے' مقربین بارگاہِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ وہ اپنے ہاں اس کو نبی تک مانتے ہیں۔ کسی وقت بیٹھ کر سوچیے کہ اس کے بعد جو قرآن نے یہ کہا ہے کہ مستقبل کے متعلق کوئی کچھ نہیں جان سکتا اور پھر موت کے متعلق تو خاص طور پہ کہا ہے۔ لیکن یہ پھر بھی کہتے ہیں کہ انہوں نے پہلے بتا دیا تھا کہ ''سچے کی زندگی میں جھوٹا مر جائے گا''، یعنی ایک پادری تھا اور اُس کے متعلق آپ نے پہلے فرما دیا تھا کہ وہ اتنے دن بعد مر جائے گا تو دیکھیے وہ مر گیا۔ اس چیز کو اچھالتے ❶ ہیں' ایسا کہنے والے کو ولی اللہ ہی نہیں' نبی تک مان رہے ❶ ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ کوئی نہیں جان سکتا۔ اب تو ان کو تو آپ قادیانی کہہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جھوٹا ❶ پیغمبر تھا لیکن آپ اپنے ہاں جنہیں آپ

---

❶ یہ اشارہ مرزا غلام احمد قادیانی (1835-1908AD) کی طرف ہے جس کی پیشین گوئیوں کا اُن کے متبعین راگ الاپتے رہتے ہیں اور ان کا اخبار بھی۔ ان کی چند ایک پیشین گوئیوں کے لیے دیکھیے:

Mirza Tahir Ahmad (1998). Revelation, Rationality,Knowledge and Truth. UK, Surrey: Islamic International Publications LTD.

بڑے بڑے اولیاءاللہ کہتے ہیں، بزرگ کہتے ہیں، حضرت جی کہتے ہیں، ان کے متعلق آپ یہی کچھ مانتے ہیں۔ وہ جب کہہ دیتا ہے کہ ''جا تیرے گھر منڈا ہو جائے گا'، تے کناں خوش ہو کے آ جاندے ہیگے نیں کہ حضرت صاحب نے کہہ دتا اے جی [1]!''۔ پوچھا کہ جی! حضرت صاحب نے کیسے کہہ دیا؟ کہا کہ جی! وہ جو ہر شخص کی تقدیر کی تختی عرش کے اوپر لٹکی ہوئی ہوتی ہے، یہ اُس کو دیکھ آتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ شخص کچھ نہیں جان سکتے، وہ کہتے ہیں کہ ہم خود نہیں جانتے بلکہ وہ تختی پڑھ آئے ہیں ''او فرشتہ جیہڑا چوکیدار رکھیا ہویا او ذرا ایوں نوں ہویا تے اسی جھٹ تختی پڑھی۔'' [2]

عزیزانِ من! یہ قوم ہے اور اسلام کا دعویٰ ہے اور ساتھ قرآن کا دعویٰ بھی رکھے ہوئے ہے یاللعجب !!! ان آیات کے دو معنی نہیں ہو سکتے۔ یہ عام لوگوں کی باتیں نہیں کرتے بلکہ جن کو پہنچے ہوئے لوگ کہتے ہیں ان کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ پیشین گوئیاں کرتے ہیں جبکہ قرآنِ کریم برملا کہتا ہے کہ **وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًاؕ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ** (31:34) کوئی اشخاص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل (مستقبل میں) کیا کرے گا اور نہ ہی یہ بتا سکتا ہے کہ اس کی موت کس جگہ واقع ہوگی۔ ان کے متعلق تو علیم و خبیر صرف خدا ہے۔

عزیزانِ من! پھر سوچیے کہ کیا یہ قوم کبھی اس قرآن پہ آ سکتی ہے؟ بہرحال سورۃ لقمان آج ختم ہوئی۔ [3]

---

[1] جاؤ! تمہارے گھر لڑکا پیدا ہوگا سن کر کتنے خوش و خرم گھر لوٹ آتے ہیں کیونکہ حضرت صاحب نے یہ کہہ دیا ہے۔

[2] وہ فرشتہ جو چوکیدار رکھا ہوا تھا، وہ ذرا اِدھر کو ہوا تو ہم نے فوراً وہ تختی پڑھ لی۔

[3] اس کے فوراً بعد (اسی تاریخ کو) سورۃ السجدۃ شروع کر دی گئی تھی۔ اس کے لیے دیکھیے اسی کتاب کے اگلے ابواب۔

سُــورَةُ السَّجْدَةِ

پہلا باب: **سورة السجدة** (آیات 1 تا 4)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عزیزانِ من! سورۃ السجدۃ شروع ہوتی ہے ❶۔ یہ 21 واں پارہ ہے اور 32 ویں سورۃ ہے: (32:1)

لفظ ریب کا قرآنی مفہوم

یہ سورۃ شروع ہوتی ہے: **الٓمّٓ تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ لَا رَیۡبَ فِیۡهِ مِنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ** (32:1-2) ۔ یہی کچھ سورۃ البقرۃ میں کہا گیا ہے کہ **ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ فِیۡهِ** (2:2)۔اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے کہ اس میں شک کی کوئی بات نہیں ہے۔''شک'' بھی عربی زبان کا ہی لفظ ہے۔قرآن میں جہاں قرآن کے متعلق آیا ہے وہاں ''ریب'' ہی آیا ہے۔بعض باتیں تو ایسی ہوتی ہیں کہ شک ہو یا یقین ہو۔آپ کے دل پہ اُس کا کوئی اثر نہیں ہوتا جیسے کہ یہ شک کی بات ہے کہ بارش کل ہوگی یا نہیں ہوگی۔بعض شک ایسے ہوتے ہیں کہ دل پہ چمٹ جاتے ہیں جیسے کہ اگر کوئی خبر آئے کہ فلاں جگہ حادثہ ہوا ہے اس قسم کا اسکوٹر تھا اور آپ کا بیٹا کسی اسکوٹر کے اوپر گیا ہوا ہو تو اُس وقت بھی آپ ایک بیم ورجا میں ہوتے ہیں' شک ویقین کے اندر ہوتے ہیں کہ پتہ نہیں وہ ہے یا کوئی اور ہے۔آپ دیکھتے ہیں کہ اس شک میں اور اُس شک میں کیا فرق ہے۔یہ شک جس سے دل میں اضطراب پیدا ہو' عربی زبان میں اُسے ریب کہتے ہیں۔یہاں کہا کہ یہ وہ حقیقت پر مبنی کتاب ہے کہ ایک تو اس میں ہر بات یقینی ہے' کوئی شک ہی نہیں ہے اور اس سے دل کے سارے اضطرابات رفع

---

❶ سورۃ لقمان کے ختم ہونے کے بعد نومبر 1979ء کی 16 تاریخ کو ہی سورۃ السجدۃ کا یہ درس شروع کر دیا گیا تھا۔

ہو جائیں گے' کوئی الجھن یا اضطراب باقی نہیں رہے گا۔ دوسرا یہ کہ **مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ** (32:2) یہ کسی ایک فرد یا خاندان یا گروہ کا رب نہیں ہے بلکہ کائنات کا رب ہے جس کی طرف سے یہ چیز آ رہی ہے۔ اُس نے تو ربوبیت کا ذمہ لیا ہے۔ **اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ** (32:3) یہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے خود ہی اس کو بنا لیا ہے' خود گھڑ لیا ہے' کہتے ہیں کہ یہ انسانی فکر کی تخلیق ہے۔ حالانکہ **بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ** (32:3) یہ تو الحق ہے اور جو الحق (The Truth) ہے یہ تو کوئی انسان نہیں کہہ سکتا۔ یہ تیرے رب کی طرف سے عطا ہوئی ہے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ **لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِیْرٍ مِّنْ قَبْلِکَ لَعَلَّهُمْ یَهْتَدُوْنَ** (32:3) تو اس کے ذریعے سب سے پہلے اس قوم کو اس کے غلط اعمال کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرے جس کی طرف تجھ سے پہلے کوئی آگاہ کرنے والا نہیں آیا تاکہ یہ زندگی کی صحیح روش اختیار کر لیں۔ اس طرح اس رسول کو یہ الحق دیا ہے کہ یہ قوم جس کے پاس اس سے پہلے کوئی صاحبِ کتاب نہیں آیا اُس کو یہ صحیح راستہ دکھا دے۔ یہ خدا کی طرف سے دیا گیا ہے۔

نبوت کے سلسلہ میں عربوں کی تاریخ

قرآن میں کئی مقامات میں یہ ہے کہ یہ عرب جن کی طرف رسول اللہ ﷺ آئے تھے اُس سے پہلے ان میں کوئی نبی نہیں تھا۔ ذکر حضرتِ ابراہیمؑ اور حضرتِ اسماعیلؑ کا آ رہا ہے کہ انہوں نے خانۂ کعبہ کی تعمیر کی۔ حضرتِ اسماعیل علیہ السلام کو وہاں بسایا اور اُس کے بعد عربوں کی ساری تاریخ کے اندر کسی نبی کا ذکر ہی نہیں آتا اور نہ ہی یہ عرب اس کے مدعی تھے ورنہ دنیا کی ایسی قومیں جن کی تاریخ ہی کوئی نہیں ہے وہ بھی کسی نہ کسی کو اپنے ہاں کا ایشور کا اوتار سہی یا نبی سہی کچھ نہ کچھ مانتے ہی ہیں۔ ان سے بات کیجیے تو تاریخ ان کے ہاں نہیں ہے' کوئی واقعہ ان کے ہاں کا بتا دیجیے۔ دس ارب سال سے پہلے کی تو بات ہی کوئی نہیں کرتا کہ ہمارا جو مذہب ہے یا دھرم ہے اس کے لیے فلاں بانی تھا' فلاں اوتار تھا۔ یہ عرب اس کا دعویٰ ہی نہیں کرتے تھے۔ قرآن نے کہا کہ ان کی طرف یہ رسول آیا ہے اور انہی میں سے ہے' حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ذریت میں سے ہے تاکہ یہ ان کو غلط راستے کے خطرات سے آگاہ کر دے اور صحیح راستے کی راہنمائی کر دے۔ یہ اس خدا کی طرف سے ہے کہ **اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ** (32:4) جس نے یہ خارجی کائنات یعنی ارض و سما کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے تخلیق کیا۔ عربی زبان میں سمآ ہر بلندی کو کہتے ہیں اور ارض ہر پستی کو کہتے ہیں۔

ارض وسمآ کی اصل حقیقت' اور تورات کا بیان' یوم کا مفہوم اور جمعہ کی چھٹی کا معاملہ

یہ جو بلندی اور پستی ہے۔ یہ بھی ہمارے ہاں کے **Relative Terms** (اضافی اصطلاحات) ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ تم یہی سمجھتے ہو کہ یہ جو تمہاری ارض ہے یہ نیچے ہے' یہ سمآ اوپر ہے جبکہ ہر ارض کا ایک سمآ ہوتا ہے اور ہر سمآ کی ایک ارض ہوتی ہے۔ یہ جو ہمیں اوپر نظر آتے ہیں اُنہیں ہم نیچے نظر آ رہے ہیں' ہم سے نیچے جو ستارہ ہوگا وہ ہمیں آسمان کہے گا' وہ ہمیں فلک نشین کہے گا۔ قرآن چودہ سو سال پیشتر کہتا ہے کہ ہر سمآ کی ایک ارض ہوتی ہے۔ آگے کہا کہ **فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ** (32:4) یہ سب چھ دنوں میں پیدا کیا۔ اب تورات ہمارے ہاں بھی آ گئی۔ اُس میں یہ ہے کہ خدا نے زمین کو' سورج کو' چاند کو' چھ دنوں میں پیدا کیا' دن یہی چوبیس گھنٹے والا جو سورج کے نکلنے سے شروع ہوتا ہے اور اُس کے بعد خدا تھک گیا تو ساتویں دن اُس نے آرام کیا۔ یہ جو **Saturday** ہے تو یہودیوں کے ہاں اس دن کاروبار نہیں کرتے' یہ چھٹی کو **Holiday** اسی لیے کہتے ہیں کہ یہ مقدس دن ہے جس دن خدا نے کام کاج چھوڑ کے تھک کے چھٹی کی "تے اس آرام نال ستا"[1]۔ ان کے ہاں سبت کو کوئی کام نہیں کرتے' سبت کی چھٹی ہوتی ہے۔ ایک دن کی چھٹی کا یہ تصور' یہ ٹھیک ہے کہ تمدن میں' معاشرت میں' تو ہوسکتا ہے لیکن یہ قرآن کا **Concept** (تصور) نہیں ہے۔ اب آپ پوچھیں گے کہ ہم جمعہ کے دن کی چھٹی کا جو کہتے ہیں تو یہ کیا ہے۔ قرآن میں اتفاق سے ایک سورۃ ہے' اس کا نام سورۃ الجمعہ ہے۔ اُس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ **اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ** (62:9)۔ جب جمعہ کے اجتماع کے لیے پکارا جائے' کام کاج چھوڑ کر اس کی طرف آ جایا کرو۔ یعنی جمعہ والے دن کام کاج ہو رہا ہے تو اُس کو چھوڑ کر اس کی طرف آنا ہے' آگے ہے کہ **فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ** (62:10) اور جب صلٰوۃ ختم ہو جائے تو جا کر پھر کاروبار کیا کرو۔ یہاں شریعتِ حقہ آئی' انہوں نے کہا کہ صاحب! اتوار کی جو چھٹی ہے وہ تو **Chirsitianity** (عیسائیت) کی چھٹی ہے' ہفتے کی یہودیوں کی ہے اور مسلمان کی چھٹی جمعہ کو ہوگی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ چھٹی نہ کرو لیکن یہ کیوں کہتے ہو کہ شریعت کا فیصلہ ہے کہ جمعہ کی چھٹی کرو۔ بہر حال یہاں **(ستة ایام** (32:4) ہے۔ اب یہ جو علم الارض وغیرہ والے جو سائنسدان ہیں وہ Determine (مقرر و متعین) کر رہے ہیں کہ ایام کے معنی **Period** ہوتا ہے' مراحل ہوتے ہیں' طبقات ہوتے ہیں۔ وہ یہ Determine (مقرر و متعین) کر رہے ہیں کہ یہ مختلف Periods

---

[1] تو بڑے آرام وسکون سے سویا۔

ہیں' ادوار ہیں جن میں یہ خارجی کائنات اس شکل میں آئی ہے جس شکل میں آج یہ تمہارے سامنے ہے۔ یہاں خلق کا لفظ ہے یہاں امر کا لفظ نہیں ہے۔

لفظ امر اور خلق کا مفہوم نیز عرش کے سلسلہ میں خدا کے متعلق پیدا ہونے والا تصور

آپ کو پتہ ہے کہ امر اور خلق میں کیا فرق ہے۔ کہا کہ **اَللّٰـهُ الَّـذِیْ خَـلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ** (32:4) جب یہ ہماری اسکیم اس محسوس شکل میں آئی تھی تو وہاں سے پھر یہ بڑے بڑے طویل المیعاد مراحل تھے جن میں سے گزر کر یہ اس شکل میں آئی ہے جس میں تم دیکھ رہے ہو۔ آگے کہا کہ **ثُـمَّ اسْتَـوٰی عَـلَی الْعَرْشِ** (32:4)۔ ترجمہ کیا کہ پھر خدا اپنے عرش کے اوپر چلا گیا۔ یہ تورات کا تصور تھا اور ہمارے ہاں بھی خدا کو عرش کے اوپر کہتے ہیں۔ عزیزانِ من! خدا کا اس قسم کا جو تصور ہے وہ تو **Finite** (محدود) ہو جاتا ہے۔ آپ اُسے کوئی جگہ بھی بتا دیجیے خواہ سات آسمانوں کے اوپر ہی سہی اُس پہ اگر آپ بٹھا دیجیے گا تو وہ تو محدود ہو گیا۔ یہ تصور غلط ہے۔ وہ **Time & Space** (زمان و مکان) کی حدود کے اندر نہیں آتا اس لیے اُسے کسی خاص مقام کے اندر **Space** (مکان) کے اندر محدود نہیں کیا جا سکتا۔ عربی زبان میں عرش کے معنی **Controlling Centre** ہوتا ہے۔ جس کو آپ اپنے ہاں تخت کہتے ہیں۔ پہلے تو وہ ہوتا ہے کہ سچ مچ کا وہ تخت ہوتا تھا جس پہ بادشاہ بیٹھتا تھا اور نہ جسے **Thrown** کہا جاتا تھا اُس کے معنی سچ مچ کا وہ تختہ نہیں ہوتا بلکہ وہ مملکت کی اتھارٹی ہوتی ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ اس معنی میں آتا تھا۔ کہا کہ اُس نے یہ سارا کچھ تخلیق کیا اور اُس کے بعد اس نے ان میں قوانین نافذ کیے اور ان پہ جو کنٹرول تھا اُس کو اپنے ہاتھ میں رکھا۔ اس طرح خدا زندہ خدا' پائندہ خدا' ساتھ چلنے والا خدا ہوا۔

یورپ کے سائنٹسٹ (سیکولرازم کے حامیوں) کے نزدیک کائنات کا تصور

عزیزانِ من! Contemporary (عصر حاضر کے) علم کے اوپر بھی نگاہ ہونی چاہیے پھر قرآن سمجھ میں آتا ہے۔ یورپ کے سائنٹسٹ (سیکولرازم کو ماننے والے) خدا کو تو مانتے ہیں لیکن ماننے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اُس نے اس کائنات کو بنایا جیسے ایک گھڑی کو بنا دیا جاتا ہے کہ آٹھویں دن جس میں چابی دی جاتی ہے۔ چابی دینے والا جب چابی دے دیتا ہے تو پھر وہ اپنے ہاں جا کر سو جائے یا کاروبار کرے اُس کو گھڑی سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور گھڑی اُس چابی کے زور سے آٹھ دن خود بخود چلتی رہتی ہے۔ یہ بھی یورپ کے سائنٹسٹ کا ایک نظریہ ہے کہ یہ جو کائنات ہے اُس خدا نے اس کو بنانے کے بعد اس میں اتنی چابی دے دی ہے کہ یہ اب اُس چابی کے زور پر چلتی چلی

جارہی ہے اوراس کائنات کے لیے پھر اُس خدا کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔قرآن نے کہا کہ یہ نہیں ہے کہ اُس نے تخلیق کرکے اور چابی دے کے خود کہیں الگ ہوکے جاکے بیٹھ گیایا سوگیا۔کہا کہ **اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ** (32:4) اس طرح کا سوار کہ جواپنا بیلنس (توازن) ایسے قائم رکھے کہ اپنے مقام سے ہلے بھی نہیں۔اس طرح کا کنٹرول یا بیلنس جو ہے اس کائنات کا کنٹرول پھر اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔اس کائنات کی وسعتیں' اس کی گہرائیاں' اس کی پہنائیاں' انسان کے تصور میں بھی نہیں آسکتیں۔یہ تو یورپ کے علم الافلاک والوں سے پوچھو۔ جیمز جینز (James Jeans) کی کتاب "The Mysterious Universe" (پراسرار کائنات) پڑھ کر دیکھیے۔اس پوری کی پوری کائنات کا جو کنٹرول ہے وہ خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی ذات کے متعلق شفیع المذنبین کے تصور کی حقیقت

جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے تو اُس کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے تمہیں مدد ملے گی' حمایت ملے گی' تم کامیاب ہوسکو گے۔کہا کہ **مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا شَفِيْعٍ** (32:4) یادرکھو! اُس کے سوا کوئی کارساز نہیں ہے۔اب یہاں لفظ ''شفیع'' آ گیا کہ کوئی شفیع نہیں ہے۔ہمارے ہاں شفیع المذنبین کا تصور موجود ہے۔ شافع روزِ حشر کے الفاظ تو آپ نے سن رکھے ہیں' یہ حضورِ نبی اکرم ﷺ سے متعلق بولے جاتے ہیں' آپ نے شفاعت بھی سن رکھا ہوگا' اس کے معنی سفارش کیے جاتے ہیں اور شفیع اور شافع کے معنی سفارش کرنے والا کیے جاتے ہیں۔کوئی حاکم جو یہاں کا ہوٗا سے Condemn (مذمت) کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ وہ تو سفارش پہ چلتا ہے یعنی جس کی سفارش پہنچ گئی اُس کے حق میں فیصلہ ہوگیا۔یہ اس حاکم کے متعلق بدترین عیب ہے۔پھر سفارش کرنے والے کے متعلق روز یہ چیز ہوتی ہے۔اور سفارش تو عام طور پہ اسی کی ہوتی ہے جس کا حق نہیں ہوتا' اُس کا کام سفارش سے چل جاتا ہے۔یعنی جب انتہائی طور پہ بگڑا ہوا معاشرہ ہوتا ہے اُس میں یہ چیز ہوتی ہے کہ یہاں تو سب کام سفارش سے چلتے ہیں۔اب اس طرح سے آپ سوچیے کہ سفارش کرنے والے یا سفارش ماننے والے' ان دونوں کا' کیا تصور آپ کے ذہن میں آتا ہے اور اگر یہ جو چیز ہے کہ (معاذ اللہ) حضورِ نبی اکرم ﷺ سفارش کرنے والے ہیں اور خدا ان کی سفارش مان کر ان کو جنت میں بھیج دینے والا ہے تو یہ سارا نظامِ عدل' یہ قانونِ مکافاتِ عمل کام نہیں کرتا۔ اُس کا کہنا ہے کہ **مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ - وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ** (99:7-8) یہ وہ میزانِ عدل ہے' جس میں عملِ انسانی کا ایک ایک ذرہ اپنا اپنا نتیجہ پیدا کرتا ہے' **مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ. فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ** (101:7-8) جس کا تعمیری پلڑا جھکا ہوا ہوگا وہی ہے جس کے حصے میں جنت آئے گی یا

خوشگواریاں آئیں گی' **وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ - فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ** (101:8-9) جس کا وہ پلڑا ہلکا ہوگا وہ جہنم میں چلا جائے گا۔ یہ سارا کچھ نظامِ عدل جو قرآنِ کریم نے بتایا ہوا ہے تو یہ سارے کا سارا درہم برہم ہوجاتا ہے اگر یہ چیز ہو کہ مذنبین کی سفارش رسول اللہ ﷺ کریں گے اور خدا یہ سفارش مان کر ان مجرمین اور مذنبین اور جہنم میں جانے والوں کو جنت میں بھیج دے گا۔ یہ ساری چیزیں آپ کی روایات میں لکھی ہوئی ہیں کہ یہ نظامِ عدل' نامۂ اعمال' خدا کی عدالت' یہ سارا کچھ فیصل ہو چکے گا' جنت والے جنت میں چلے جائیں گے' جہنم والے جہنم میں چلے جائیں گے اُس کے بعد عدالت کا وقت بھی ختم ہوجائے گا اور وہ حاکم یعنی اللہ تعالیٰ بھی جانے لگیں گے تو وہ جاتے جاتے ادھر اُدھر نگاہ ماریں گے کہ شاید کوئی ادھر اُدھر کی بات ہو تو وہ وہاں دیکھیں گے کہ ایک شخص وہاں میدان کے اندر ہے اور وہ سجدے میں پڑا ہوا ہے' وہ ٹھہر جائیں گے کہ پتہ لو یہ کون شخص ہے' معلوم ہوا کہ وہ حضورِ نبی اکرم ﷺ سجدے میں گرے ہوئے ہیں۔ پوچھا کہ میرے محبوب! کیا بات ہے آپ کیوں سجدے میں گرے ہوئے ہیں؟ کہنے لگے کہ میری امت جہنم میں ہو اور میں جنت میں چلا جاؤں یہ تجھ سے تو ہوسکتا ہے کہ تیرے بندے جہنم میں جائیں اور آپ عرش پہ بیٹھ جائیں لیکن میں تو یہ نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ بیٹھ گئے' مسکرائے' فرشتوں کو حکم دیا کہ ان کو نکال لاؤ۔ وہاں سے نکالا اور جنت میں بھیج دیا۔ کہا: اب ٹھیک ہے؟ کہا: نہیں جی ابھی سارے نہیں نکلے۔ کہا: اور نکال لو۔ یہ ہے سفارش' یہ ہے جسے حضورؐ کے متعلق کہتے ہیں کہ آپؐ شفیع المذنبین ہیں اور یہ عقیدہ اس حد تک گہرائی میں گیا ہوا ہے کہ کسی شخص کو بدترین گالی دینی ہو تو اُسے کہتے ہیں کہ تجھے رسول کی شفاعت نصیب نہ ہو۔

لفظ شفیع کا مفہوم

لفظ شفیع کا مادہ ''ش ف ع'' ہے۔ یہ شُفع کا لفظ تو آپ نے سنا ہوگا یعنی وہ جو ساتھ والا مکان ہوتا ہے' تو کسی کے ساتھ جو کھڑا ہوتا ہے اُسے عربی زبان میں شفیع کہتے ہیں۔ عدالت کی زبان میں قرآن کے اندر موجود ہے کہ ملزم جس کا مقدمہ پیش ہوگا اُسے پکڑ کر لانے والے بھی ہونگے اور شہادت دینے والا اُس کا شفیع بھی اُس کے ساتھ کھڑا ہوگا یعنی اُس کی **Defence** میں جو شہادت دینے والا ہوگا' صفائی کا گواہ۔ قرآن نے اس لفظ کے معنی شہادت کیے ہیں۔ یعنی ہمارے سمجھانے کے لیے وہ عدالت کا ایک نقشہ پیش کرتا ہے' اُس عدالت کے نقشے میں ایک صفائی کا گواہ ہوتا ہے جو ملزم کے ساتھ ہوتا ہے۔ شفیع کے معنی ہیں کہ کسی کے حق میں سچی گواہی دینے والا' شفاعت کے معنی ہیں کہ ملزم کی صفائی میں سچی شہادت دینا۔ اس کے معنی سفارش بالکل غلط ہیں۔ وہ تو سمجھانے کے لیے ہے ورنہ انسان کے ارادوں تک کے اعمال نتیجہ خیز ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ تو یہ کہتا ہے کہ ہر ایک کا اعمال نامہ اُس کی گردن میں لٹکا ہوا ہے' آج وہ لپیٹا

ہوا ہے اور ظہورِ نتائج کے دن وہ کھل کر سامنے آ جائے گا۔ اور وہ یہ نہیں ہوگا کہ کسی کو وہاں عدالت میں کہا جائے گا کہ چارج شیٹ پڑھ کر سناؤ بلکہ **اِقْـرَاْ کِتٰبَـکَ** (17:14) اُسی ملزم سے کہا جائے گا کہ اپنا اعمال نامہ پڑھ۔ کہیں مرزا اسداللہ خاں غالب (1797-1869ء) کی طرح تم وہاں یہ نہ کہہ دو کہ

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پہ ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

انسان سے کہا ہے کہ **اِقْرَاْ کِتٰبَکَ** (17:14) لو! اپنا نامۂ اعمال خود پڑھ لو اور اُس کے بعد کہا کہ **کَفٰی بِنَفْسِکَ الْیَوْمَ عَـلَیْکَ حَسِیْبًـا** (17:14) تمہارا حساب کرنے کے لیے باہر سے کسی محاسب کے بلانے کی ضرورت نہیں۔ خود تمہاری اپنی ذات' تمہارے خلاف' محاسبہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس لیے آج اپنا فیصلہ بھی آپ ہی کر۔

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

تمہارے ہاتھ تمہارے خلاف گواہی دیں گے' تمہارے پاؤں تمہارے خلاف گواہی دیں گے' تمہاری زبانیں تمہارے خلاف گواہی دیں گی۔ مکافاتِ عمل اور نتائجِ اعمال کا تو حقیقت میں یہ نقشہ ہے۔ قرآن تو بات سمجھانے کے لیے ہمیشہ محسوس شکل میں ایک چیز لاتا ہے۔ اُس نے ہمیشہ عدالت کا نقشہ سامنے پیش کیا ہے کہ عدالت ہے' منصف ہے' ایسا منصف ہے کہ جس پہ کسی کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا' ملزم کو پکڑ کر لاتے ہیں' ملزم کو **Defence** (دفاع) کا پورا موقع دیا جاتا ہے۔ یعنی وہاں اس طرح سے باتیں قرآنِ کریم بتا رہا ہے ایسے جیسے کہ خدا پوچھ رہا ہے کہ کیا یہ جو قانون ہے اس قانون کو بتانے والے تمہارے پاس آئے تھے یا نہیں؟ اُنہوں نے بتایا تھا یا نہیں کہ یہ قانون ہے؟ یعنی خدا تو علیم ہے اور اُس کو سب کچھ پتہ ہے۔ وہاں اُس نے یہ کہہ کر یہ کہا کہ **Ignorance of Law is no excuse**[1] کہ قانون کا علم نہیں تھا اس واسطے اس کو معاف کر دو۔ وہ کہتا ہے کہ پوچھے گا کہ بتاؤ! اس قانون کا علم دینے والے تمہارے پاس پہنچے تھے یا نہیں؟ ان سے کہا جائے گا کہ تم نے یہ بات ان تک پہنچائی تھی یا نہیں؟ بتاؤ کہ جو کچھ تم اپنی **Defence** (دفاع) میں کہنا چاہتے ہو' جو تم کہہ رہے ہو اس کے لیے تمہارے پاس کوئی گواہ ہے؟ یہ ہے جسے وہ کہتا ہے۔ وہ صفائی کا جو گواہ ہے' جو اس کے حق میں شہادت دے گا وہ اسے شفیع کہتا ہے یعنی ساتھ کھڑا ہونے والا۔ یعنی وہ ایسے کہتا ہے جیسے جو صحیح صحیح **Fair Trial** (بے تعصب سماعت) ہے' وہ ہو رہا ہے'

---

[1] قانون سے ناواقف ہونا کوئی بہانہ نہیں ہوتا۔

اُس طرح سے مقدمے کے بعد پھر وہ فیصلہ سناتا ہے۔ اُس میں یہ چیز آتی ہے جسے آپ شفیع یا شافع کہتے ہیں۔ اور یہ اُس نے کہا کہ **مَا لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ مِنۡ وَّلِیٍّ** (32:4) یہ بھی نہیں ہے کہ وہاں تمہارا کوئی ایسا کارساز آ کر متاثر کر سکے۔ **وَّ لَا شَفِیۡعٍ** (32:4) تمہارے حق میں غلط گواہی دینے والا بھی کوئی نہیں آ سکے گا۔ **اَفَلَا تَتَذَکَّرُوۡنَ** (32:4) جو ہم کہہ رہے ہیں کیا وہ بات تمہاری سمجھ میں آئی۔ کہا کہ یہ ہے وہ خدا جس نے خارجی کائنات کو پیدا کیا' پیدا کر کے کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھا۔ یہ بات تو خارجی کائنات کی ہے کہ جہاں مکافاتِ عمل کا سوال ہی نہیں ہے' اُن میں سے کوئی شے بھی خدا کے قانون کی خلاف ورزی کی جرأت کر ہی نہیں سکتی کیونکہ اُس میں استطاعت ہی نہیں رکھی گئی' ان کو دو راستے نہیں دکھائے۔

کائنات کے اندر انسان کا مقامِ بلند ہونے کی وجہ

یہ تو صرف انسان کے متعلق کہا ہے کہ **وَھَدَیۡنٰہُ النَّجۡدَیۡنِ** (90:10) اس کو دو راستے دکھا دیئے ہیں۔ یہ جنہیں دو راستے دکھائے ان کے متعلق اب آگے بات آنی تھی کہ یاد رکھو کہ یہ بات نہیں ہے کہ وہ عرش پہ جا بیٹھا ہے اور تم اب نیچے جو جی میں آئے کرتے رہو تو یہ سوال نہیں ہے۔ عرش کو تم عدالت کی کرسی سمجھو' وہاں وہ متمکن ہے' تمہارا مقدمہ پیش ہوگا اور اگر ذہن میں یہ ہو کہ کوئی بہت بڑا با اثر جا کر حاکم کو متاثر کر دے گا تو سنو! **مَا لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ مِنۡ وَّلِیٍّ** (32:4) کوئی اس بات کی جرأت نہیں کرے گا کہ تمہارے حق میں آ کر غلط گواہی دے کر تمہارے حق میں فیصلہ کر دے۔ یہ بھی نہیں ہے اور سنو! **وَّ لَا شَفِیۡعٍ** (32:4) ایسا گواہ بھی وہاں نہیں ہوگا۔ اس طرح سے ایک ایک ذرہ نتیجہ خیز ہوگا۔

عزیزانِ من! سورۃ السجدۃ کی آیت 4 تک ہم آئے ہیں۔ میں اگلی آیات کی اہمیت کو واضح کردوں تا کہ آپ انہیں مس (Miss) نہ کریں۔ یوں تو قرآن کی کونسی آیت ہے جو عظیم و جلیل نہیں ہے لیکن بعض آیات کے اندر اُس نے حقائق کو اس طرح سے سمو کر' مرتکز حیثیت میں رکھا ہے کہ وہ کتنے ہی انسانی علم کے شعبے ہیں' کائنات کے کتنے حقائق ہیں' انسان کی ذات سے کتنی معلومات ہیں' جو بعض اوقات ایک ایک آیت کے اندر آ گئی ہوئی ہیں۔ ہمارے سامنے اگلی آیت یہ آ رہی ہے بلکہ دو آیتیں آ رہی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ شاید ایک ایک آیت کے لیے ایک ایک درس ہو۔ تو سورۃ السجدۃ کی آیت 5 سے ہم آئندہ درس لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

دوسرا باب: سورة السجدة (آیات 5 تا 9)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج نومبر 1979ء کی 23 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ السجدۃ کی آیت 5 سے ہو رہا ہے: (23:5)۔

سورۃ السجدۃ کی جلیل المرتبت آیت

جیسا کہ میں نے سابقہ درس کے آخر میں عرض کیا تھا کہ یہ آیت اور اس کے ساتھ ایک اگلی آیت ہے جو بڑی جلیل المرتبت ہے اور ساتھ ہی میں نے کہا تھا کہ یوں تو قرآنِ کریم کی کونسی آیت ہے جو جلیل المرتبت نہیں ہے لیکن بعض آیات میں بڑے بلند حقائق کو سمٹا کر چند الفاظ میں مرتکز کر دیا جاتا ہے' اس اعتبار سے ان آیات کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہ آیت جو میرے سامنے آ رہی ہے' میں سمجھتا ہوں کہ اربابِ فکر و نظر کے لیے اور بالخصوص مغرب کے سائنٹسٹ کے لیے اس بات کے ثابت کرنے کے لیے یا ثابت ہونے کے لیے کہ یہ قرآن کسی انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہے' اس کا سرچشمہ واقعی ماورائے ادراکِ انسانی ہے' یہ ایک ہی آیت کافی ہو سکتی ہے۔ چودہ سو سال پہلے جس زمانے میں قرآن نازل ہوا' اُس زمانے میں عرب میں ہی نہیں' ساری دنیا کے دانشوروں کے ذہن میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی جو اس آیت میں کہی گئی ہے۔ چودہ سو سال پہلے ہی نہیں' ابھی اٹھارویں صدی تک بھی دنیا میں کوئی انسانی فکر یہ بات تصور میں بھی نہیں لا سکتی تھی۔ اُس کے بعد جب سائنس کے انکشافات ہوئے ہیں تو یہ آیت ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آ گئی ہے۔ آج جو سائنس کے

انکشافات ہیں وہ اُس کی تصدیق کررہے ہیں کہ بات یہی تھی جو اس نے کہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو قرآن نے کہا ہے کہ **سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَ فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ** (4:53) ہم عالمِ انسانی میں اور خارجی کائنات میں اپنی چھپی ہوئی حقیقتوں کو بے نقاب کرتے چلے جائیں گے اور ہر حقیقت جو بے نقاب ہو کر سامنے آئے گی وہ اس امر کا ثبوت ہوگی کہ قرآن واقعی حقیقت پر مبنی ہے۔ اس کے مبنی بر حقیقت ہونے کے لیے یا یہ بات سامنے آنے کے لیے انفس اور آفاق کے اندر جو حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں، ان کا منکشف ہونا، ان کا **Discover** (بے نقاب) ہونا، بڑی بنیادی شرط ہے۔

انسانی علم کتابِ فطرت لکھتا نہیں ہے بلکہ اسے پڑھتا ہے

اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس کتاب کے حقائق اس طرح سے واضح ہو کر یہ ثابت کریں گے کہ یہ واقعی ایک حقیقت ہے، افسانہ نہیں ہے، فکرِ انسانی کی تخلیق نہیں ہے۔ اور اس کا ذریعہ انفس اور آفاق میں چھپی ہوئی حقیقتوں کا بے نقاب ہونا ہے۔ کم از کم آفاق کی دنیا میں آج آپ اسی کو **Scientific Discovery** (سائنسی انکشاف) کہہ لیجیے۔ سائنس ان حقیقتوں کو ایجاد نہیں کرتی بلکہ وہ **Discover** (بے نقاب) کرتی ہے یعنی اُس کے اوپر جو پردہ پڑا ہوا ہوتا ہے اُس کو اٹھا دیتی ہے۔ ایف جے شین کے الفاظ میں یہ ہے کہ ہم کتابِ فطرت کو لکھتے نہیں ہیں بلکہ ہم کتابِ فطرت کو پڑھتے ہیں ❶۔

صدیوں سے رائج ایک غلط العام تصور: ہر چیز پہلے دن سے مکمل شکل میں پیدا کر دی گئی

چودہ سو سال پہلے ہی نہیں، اُس سے بھی بہت پہلے تک، کائنات کی تخلیق کے متعلق مذہبی کتابوں میں دیکھیے، تورات کو یہ پوزیشن حاصل ہے کہ وہ بہت قدیمی ہے، دیگر مذاہب کی کتابوں کو بھی لیجیے تو ان سب میں یہی بات سامنے آتی ہے کہ خدا نے کہا ''کُن'' جیسا کہ

---

❶ **F.J.Sheen** نے اپنی کتاب **Philosophy of Religion (1948)** میں لکھا تھا کہ ''سائنس کتابِ فطرت (**Book of Nature**) کو پڑھتی ہے، اسے لکھتی نہیں''۔ لیکن اس کتاب فطرت کے مطالعہ کرنے والوں کا اعتراف ہے کہ سائنس محض سطحِ کائنات کی کتاب خوانی ہے اس کی کنہ و حقیقت کا علم اس کے اندر ہے ہی نہیں، نہ ہی ہو سکتا ہے چنانچہ ریڈنگ یونیورسٹی کا طبیعات کا پروفیسر ڈاکٹر جیمز آرنلڈ کروتھر لکھتا ہے کہ ''نظامِ فطرت اپنی گہری بنیادی سادگی میں اس قدر تحیّر انگیز ہے کہ دنیائے سائنس میں کسی موضوع پر حرفِ آخر، آخری انسان کے لیے ہی چھوڑ دینا پڑتا ہے''۔ **(Mason, F,(Ed): The Great Design (1934), P,52)**۔

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: انسان نے کیا سوچا؟ طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، 2002، ص ص۔ 89 تا 100۔

ہمارے ہاں ہے کہ **کُن** کہتے ہی یہ کائنات وجود میں آ گئی۔ یعنی جس طرح سے جو چیزیں آج ہمیں نظر آتی ہیں: یہ چاند یہ ستارے یہ پہاڑ یہ دریا یہ درخت یہ مویشی یہ حیوانات اور انسان بھی' خدا نے حکم دیا اور یہ سب چیزیں اسی شکل میں پیدا ہو گئیں اور اسی شکل میں اُسی طرح سے پہلے دن سے آج تک چلی آ رہی ہیں۔ چودہ سو سال پہلے ہی نہیں بلکہ دو تین سو سال پہلے تک بھی تخلیقِ کائنات کا تصور یہی تھا۔ یہ آیت بڑی ہی مشکل ہے اور میں کوشش کرونگا کہ آپ کو عام فہم میں الفاظ میں سمجھا سکوں۔

مجھے افسوس یہ ہے کہ میرے بار بار کہنے کے باوجود قرآن کے نسخے آپ کے سامنے نہیں ہوتے' یہ الفاظ دیکھنے نہایت ضروری ہیں اور اگر یہ دونوں ذرائع ابلاغ یعنی کان اور آنکھ دونوں اکٹھے ہو جائیں تو ان کا اثر بڑا گہرا پڑتا ہے۔ آپ صرف کانوں سے سنتے ہیں' آنکھوں سے قرآن کو نہیں دیکھتے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ کچھ دو تین سو سال پہلے تک بھی یورپ کے جو سائنٹسٹ بھی تھے بلکہ سائنٹسٹ تو کم ہی تھے مفکر زیادہ تھے' ان کے ہاں بھی تصور یہی تھا کہ دنیا میں جتنی چیزیں موجود ہیں' وہ اسی شکل میں سامنے آ گئیں۔ خود آدمی کے متعلق تو یہ بہر حال تورات میں موجود ہے' دنیا کی ہر کتاب میں موجود ہے کہ خدا نے پہلے ایک آدمی کو پیدا کر دیا اور پھر اُس کے بعد اُس کی پسلی سے عورت کو پیدا کر دیا۔ یعنی آدمی عورت جیسے آج نظر آتے ہیں اسی طرح سے پیدا کر دیئے گئے تھے۔ ساری کائنات کے متعلق یہ چیز چلی آ رہی تھی کہ یہ اسی طرح سے پہلے حکم کے ساتھ اُسی شکل میں یہ چیزیں وجود میں آ گئیں جس شکل میں یہ آج ہمارے سامنے ہیں۔

دو تین سو سال پہلے خارجی کائنات اور انسان کی تخلیق کے متعلق سائنس کی تحقیق کا آغاز

اسے ذہن میں رکھیے کہ کل تک مذاہب کی دنیا کا یہ علم' فکر کی دنیا کا مسلمہ تھا۔ کوئی دو تین سو سال پہلے اس کے اوپر تحقیقات ہونی شروع ہوئیں۔ اُس تفصیل میں تو میں نہیں جا سکوں گا۔ یہ بات **Discover** (بے نقاب) ہوئی جسے **Theory of Evolution** (نظریہ ارتقا) کہتے ہیں۔ سائنس نے یہ **Dicover** (بے نقاب) کیا کہ یہ جو بھی خارجی کائنات انسانوں سمیت ہے یہ پہلے دن سے اسی شکل میں سامنے نہیں آ گئی تھی بلکہ ہر شے کا آغاز بڑی **Crude** (خام سی) شکل میں' بڑے پست درجے میں' ہوا یعنی اُس کی ابتدا اس طرح سے ہوئی تھی۔ پھر وہاں سے ہر شے جس کی ابتدا اس طرح کے پست درجے کے نقطہ سے ہوئی تھی وہ ہزاروں لاکھوں سال کی منزلیں طے کرتی ہوئی **Evolve** کرتی یعنی بنتی اور اُبھرتی ہوئی موجودہ شکل میں پہنچی' یہ تخلیق **By Revolution** (انقلاب سے) نہیں ہوئی

بلکہ **By Evolution** (ارتقا سے) ہوئی ہے۔ **Evolve** ہونے یعنی بننے اور ابھرنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایک شے جو پست درجے کی ہے اُس میں سے کوئی دوسری شے اُس سے بہتر نکلے اور وہ آگے بڑھے اور اس طرح سے رفتہ رفتہ بتدریج مختلف منازل طے کرتے ہوئے وہ آگے پہنچے۔ چنانچہ یہ جو **Theory of Evolution** (نظریہ ارتقا) تھی ویسے تو ڈارون (**Darwin:1809-82**) کی طرف منسوب کی جاتی ہے اُس سے پہلے بھی تھی اور اس کے ساتھی بھی تھے۔ اس کے اوپر اس دوسو سال میں بہت زیادہ کام ہوا ہے۔ ایک ایک شے کے متعلق خود یہ جو ہمارے ہاں کی محسوس کائنات جسے ہم یہ زمین اور اجرامِ فلکی کہتے ہیں' جسے یہ خارجی کائنات کہتے ہیں' گرانقدر تحقیق ہوئی ہے۔ میں کبھی اس طرف آؤنگا تو بتاؤں گا کہ اس کے متعلق بھی تحقیق ہوئی ہے اور وہ کس طرح سے قرآن کی ایک ایک آیت کی تصدیق کیے جاتی ہیں۔

کوئی شے بھی By Revolution (انقلاب سے) وجود میں نہیں آئی

آج وہ اصول ہمارے سامنے آتا ہے جو انہوں نے بیان کیا ہے کہ ہر شے کی ابتدا یعنی آغاز بہت پست ترین نقطے سے ہوا ہے اور پھر وہ شے مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی' ہزار ہزار سال کا ایک ایک مرحلہ طے کرتی ہوئی' **Evolve** کرتی ہوئی' آگے بڑھتی ہوئی' اس مقام تک پہنچی ہے جو ہمارے سامنے ہے' جو آج ہمیں نظر آرہا ہے۔ یوں یہ شے بتدریج یہاں تک پہنچی ہے' اس طرح سے یہ شے بنی ہے' پہلے ہی دن اسی طرح سے **By Revolution** (انقلاب سے) وجود میں نہیں آگئی تھی۔ پہلا نقطۂ آغاز کیسے ہوا؟ اس کے متعلق نہ سائنس کچھ کہہ سکی ہے' نہ کہہ سکے گی لیکن یہاں سے سائنٹسٹ نے بات شروع کی ہے کہ ہر موجود شے کا نقطۂ آغاز جس کو وہ اب تک **Discover** (بے نقاب) کر سکے ہیں وہ کیا تھا اور پھر وہ مختلف مراحل میں سے جو گزرے ہیں ان مراحل کو بھی **Discover** (بے نقاب) کرتے گئے ہیں۔ وہاں تو ایک ایک شعبے کے متعلق اس قسم کی ریسرچ ہو رہی ہے۔ آپ حیران ہونگے کہ ایک ایک سائنٹسٹ کی پوری عمر ایک کیڑے کی زندگی کے متعلق ریسرچ کرنے میں گزر جاتی ہے' ایک ایک پتے کے اوپر ان کی زندگی گزر جاتی ہے۔ فلکیات والے الگ ہیں' زمین والے الگ ہیں' بائیالوجی والے الگ ہیں یہ تمام شعبے موجود ہیں اور یہ اُس میں اسی چیز کے اوپر لگے ہوئے ہیں کہ کس شے کا نقطۂ آغاز کیا تھا اور وہ کن مراحل میں سے گزری ہے اور اس کے بعد اس طرح سے وجود میں آئی۔ یہ ریسرچ کل کی بات ہے اور ہم بات کر رہے ہیں چودہ سو سال پہلے کی کہ جب ساری دنیا میں وہ تصور تھا کہ یہ ساری کائنات ہر شے

آدم تک خدا نے حکم دیا اور اسی شکل میں یہ وجود میں آ گئی۔

خدا کی دو دنیاؤں کا ذکر: عالمِ امر اور عالمِ خلق

آپ کو یاد ہوگا میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ یہ یاد رکھنے کی باتیں ہیں، محض سن کر بھلا دینے کی نہیں ہیں۔ قرآن نے ایک عالمِ امر کہا ہے اور ایک عالمِ خلق کہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا، میں نے بتایا تھا کہ یورپ کا ایک بہت بڑا مفکر ہے اس کا نام Andrew Seth Pringle - Patison(1856-1931AD) ہے۔ اُس نے یہ کہا تھا کہ عربی زبان ہمارے مقابلے میں بڑی Advantageous (فائدہ مند) پوزیشن میں ہے، بلکہ وہ تو مسلمانوں سے کہتا تھا کہ جس زبان میں ان کی کتاب ہے، اُس اعتبار سے یہ قوم ہمارے مقابلے میں بڑی **Advantageous** (فائدہ مند) پوزیشن میں ہے کہ ہماری زبان میں **Creation** یا تخلیق کے لیے ایک ہی لفظ **Creation** ہے جبکہ ان کے ہاں اس کے لیے دو الفاظ ہیں: عالمِ امر ہے اور عالمِ خلق ہے [1] اور اُس نے کہا ہے کہ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ خود یہ زبان بتا رہی ہے کہ ان لوگوں کا ذہن کہاں تک پہنچا ہوا تھا۔ قرآن نے یہ دونوں لفظ کیوں استعمال کیے ہیں؟ سمجھنے کے لیے تو مثال انسانوں کی ہی دی جائے گی ورنہ یہ کہنا کہ خدا کے ذہن میں یہ تصور تھا، یہ **Imagination** تھا، سمجھنے کے لیے تو بات انسانوں کی ہے۔ کسی آرکیٹکٹ نے کوئی چیز بنانی ہو یا تخلیق کرنی ہو تو پہلے اُس کے ذہن میں اُس کا ایک تصور آتا ہے، ایک نظریہ آتا ہے، ایک نقشہ آتا ہے، ایک اسکیم ہوتی ہے جبکہ وہ چیز فی الواقعہ موجود نہیں ہوتی، اُس کی محسوس شکل نہیں ہوتی۔ لیکن اُس کے تمام خطوط، اُس کا نقشہ، وہ ساری اسکیم اُس خالق کے ذہن میں ہوتی ہے۔ اب اُس کے بعد جب وہ چیز مکمل کرتا ہے اور پھر وہ ڈرائنگ کے اعتبار سے اپنی اسکیم کو کاغذ پہ بھی لے آتا ہے پھر اُس کے بعد جب وہ اس کی تعمیر شروع کرتا ہے تو یہاں سے وہ تخلیق کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ یعنی کسی اسکیم کا محسوس شکل میں آنے کا جو مرحلہ ہے،

---

[1]. Pringle - Pattison deplores that the English language possesses only one word.'Creation'. to express the relation of God and the Universe of extension on the one hand, and the relation of God and the human ego on the other. The Arabic language is, however, more fortunate in this respecta, It has two words khalq and Amr to express two ways in which the creatine activity of God reveals to us, Khalq is creation, Amr is direction (Iqbal, Allama Muhammad: The Reconstruction of Religious Thought in Islam, (Edited and Annotated by M.Saeed Sheikh), Iqbal Academy Pakistan, Lahore, 1986, P.82).

وہ ہے جسے تخلیق کہا جائے گا' خلق کہا جائے گا۔ پہلا حصہ جو اس کا ہے وہ عالمِ امر ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی چیز بھی جو قاعدے قانون کے مطابق وجود میں آئے گی اُس کے لیے یہ عالمِ امر یعنی اسکیم کا جو عالم ہے' نقشہ بنانے کا جو مرحلہ ہے' یہ کتنا اہم مرحلہ ہے۔ اور یہیں سے یہ بات سامنے آجائے گی کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ یہ کائنات By Chance (اتفاقاً) کسی طرح سے وجود میں آ گئی۔ تو جو چیز اس طرح سے کسی اسکیم کے ماتحت' سوچے سمجھے تصور کے مطابق' تخلیق یا محسوس شکل میں سامنے آئے اُس کو بائی چانس (اتفاقاً) نہیں کہا جا سکتا۔ پہلی چیز تو یہی ہے جو قرآن نے اس تصور کو کہ ہر چیز پہلے ہی دن سے مکمل شکل میں پیدا کر دی کو کاٹ کر رکھ دیا ہے اس لیے کہ

تیرا پتہ نہ پائیں تو لاچار کیا کریں

عالمِ امر کے متعلق انسانی سوچ کی بے چارگی

کسی چیز کا جو Beginning (آغاز) ہے' یعنی یہ کہ وہ عدم سے وجود میں کیسے آتی ہے' اس کے متعلق ذہنِ انسانی کچھ کہہ ہی نہیں سکتا۔ اس لیے ان سائنس دانوں نے یہ کہا کہ 'Somehow' (کسی نہ کسی طرح سے) یہ وجود میں آ گئی۔ قرآن 'کسی نہ کسی طرح' سے نہیں کہتا' اس لیے کہ اس کے ہاں ایک عالمِ امر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ یونہی بائی چانس (اتفاقاً) وجود میں نہیں آ گئی بلکہ اس کے خالق نے اس کے متعلق پہلے ایک اسکیم مرتب کی' ایک تصور تھا' ایک نظریہ تھا' ایک نقشہ تھا' پورا ڈیزائن تھا' وہ اس کے سامنے تھا۔ پھر اُس کے مطابق اُس نے اس کی تخلیق کی ابتدا کی' گویا یہ بات بائی چانس (اتفاقاً) نہیں ہوئی بلکہ اُس اسکیم کے مطابق ہوئی۔ ہم اس مقام پہ آج کھڑے ہیں' علمِ انسانی اس مقام تک آج پہنچا ہے۔

14 سو سال پیشتر نظریہ ارتقا کی وضاحت اور لفظ تدبیر کا مفہوم

اب آیئے اس طرف جو چودہ سو سال پہلے اس کتاب نے کہا ہے۔ **اَللّٰـهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا** (32:4) ارض و سماوات اور اس کے درمیان جو کچھ ہے وہ اللہ نے تخلیق کیا۔ اس سے اگلی آیت یہ ہے کہ یہ جو خدا نے پیدا کیا تو کیا یہ اُسی طرح سے ہے کہ اُس نے **کن** کہہ دیا اور ہر شے اپنی اس شکل میں جس میں آج موجود ہے وہ وجود میں آ گئی؟ کہا کہ نہیں۔ خلق کے بعد یہ بات جو آگے کہی ہے وہ فوراً کہا کہ یہ تخلیق تو وہ مرحلہ ہے جس میں کوئی شے محسوس شکل پر تمہارے سامنے آتی ہے' بات اس سے بہت پہلے شروع ہوتی ہے۔ اس تخلیق کے لیے خدا نے کیا کیا تھا اور کیا کر رہا ہے؟ وہ تو آج بھی اس سے غافل نہیں ہے کہا ہے۔ کہ **يَزِيْدُ فِي**

الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (35:1)۔اس میں تو اضافے ہوتے رہتے ہیں۔یہ کیسے وجود میں آئی اور وہ کرتا کیا ہے؟ عزیزانِ من! ایک ایک لفظ پہ غور کیجیے گا۔کہا ہے کہ **يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ** (32:5)۔امر تو میں نے آپ کو بتا دیا کہ وہ ایک اسکیم مرتب کرتا ہے۔تدبر کا لفظ تو آپ نے سنا ہی ہوگا' تدبیر بھی آپ نے سنا ہی ہوگا۔اس کے عام معنی غور وفکر کیے جاتے ہیں لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ عربی زبان تو بڑی وسیع زبان ہے۔اُس کی وسعتوں کے اندر سے وہ ایک لفظ کا انتخاب کرتا ہے اور خود اُس لفظ کا انتخاب یہ بتاتا ہے کہ یہ واقعی کوئی انسانوں سے بلند فکر ہے جس نے ان سینکڑوں لفظوں میں سے اس مقصد کے لیے ایک خاص لفظ کا انتخاب کیا ہے۔عربی زبان میں غور وفکر کے لیے ہزاروں الفاظ تھے' قرآنِ کریم میں اس کے لیے متعدد الفاظ ہیں: فکر' عقل' شعور' علم۔یہاں تدبر کا لفظ ہے **یدبر الامر** (32:5)۔سنیے اور جھوم جائیے عربی زبان کی وسعت پہ اور قرآن کے انتخاب پہ۔یہ جو ''د ب ر'' مادہ ہے اس کے معنی ہوتے ہیں کہ کسی شے کا آخری حصہ' کسی شے کا انجام' آخر میں جو چیز آئے۔تدبر کہتے ہیں کہ کسی شے کے آخر تک' نقطۂ تکمیل تک' کی جو پوزیشن ہے اُس کو سامنے رکھ کر شروع سے بات کرنا۔عزیزانِ من! آپ غور کرتے ہیں کہ قرآن شے کیا ہے!

این کتابے نیست چیزے دیگراست

آغاز سے تکمیل تک کے تمام مراحل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ارض سے سما کے سفر کی روئداد

لفظِ تدبر سے ساری بات حل ہو جاتی ہے۔دیکھنا یہ ہے کہ انجامِ کار اس شے نے بننا کیا ہے۔وہی اسکیم کامیاب ہو سکتی ہے جس میں اسکیم بنانے والا یہ دیکھے کہ آخر میں اس نے بننا کیا ہے۔یعنی وہ ابتدا پہ نہ پہنچے بلکہ وہ یہ دیکھے کہ اس نے آخر الامر بننا کیا ہے اور اُسے سامنے رکھ کر پھر اس اسکیم کو چلائے۔اُس کا جو الامر ہے' اُس کی جو تخلیقِ کائنات کی اسکیم ہے' وہ اس کے آخری نقطۂ تکمیل کو سامنے رکھ کر اس کی ابتدا کرتا ہے۔سمآ کے معنی آسمان اور ارض کے معنی ہم زمین لیتے ہیں تو یہ بھی معنی ہیں لیکن بنیادی طور پر سمآ بلندی کو کہتے ہیں اور ارض پستی کو کہتے ہیں۔کہا کہ وہ پہلے ایک تدبیر کرتا ہے' اسکیم مکمل کرتا ہے اور وہ اسکیم بلندی کے اوپر طے ہوئی ہوتی ہے لیکن جب وہ اُس کو تخلیق میں لانا چاہتا ہے' اُس کی تخلیق کا آغاز کرتا ہے کہ امر محسوس شکل میں سامنے آ جائے' تو وہ امر جو سمآ کی بلندیوں میں طے ہوئی تھی اُس کو ارض سے شروع کرتا ہے' پست تریں نقطہ سے شروع کرتا ہے۔عزیزانِ من! آپ غور فرما رہے ہیں کہ قرآن کیا کچھ کہے چلے جا رہا ہے۔نقطۂ

آغاز سے یعنی وہ پست تریں درجے سے اُس کو شروع کرتا ہے۔ **ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ** (32:5) پھر پست تریں نقطہ سے جو وہ شے آغاز ہوئی ہے وہ اسے بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ یہاں لفظ **یَعْرُجُ** ہے۔ اس کے معنی بلندی کے ہیں لیکن یہاں پھر اس انتخاب کی داد دیجیے اور جھوم جایئے۔ کہا یہ ہے کہ پھر اس نقطۂ آغاز سے وہ شے بلندیوں کی طرف چڑھنا شروع کرتی ہے۔ دو باتیں یاد رکھیے! ان میں ایک تو یہ ہے۔ قرآنِ کریم میں کائنات کے متعلق، خود خدا کے متعلق کہا ہے کہ اُس کا یہ جو نظام ہے، وہ صراطِ مستقیم ہے یعنی سیدھا راستہ ہے۔

کائنات کو صرف دائروی گردش میں محدود کرنے کا تصور فکرِ قرآنی کے خلاف ہے

آپ کو یاد ہوگا میں نے ایک درس میں بتایا تھا کہ حکمائے یونان سے لے کر آخر تک وہ کائنات کے متعلق کہتے تھے کہ یہ Cyclic Order (دائروی نظم) میں گردش کر رہی ہے یعنی یہ گردش میں تو ہے لیکن آگے نہیں بڑھ رہی بلکہ کسی ایک ہی چکر کے اندر گردش کر رہی ہے، جہاں سے شروع ہوئی ہے آخر میں وہیں آ کر پہنچتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ

می نہ سزد خدائے را

یہ تو پھر بیکار سی بات ہے کہ کسی شے کو گردش دیئے چلے جانا اور وہ آگے نہ بڑھے۔ اُس نے اسی لیے Cyclic Order (دائروی گردش) کی بجائے صراطِ مستقیم کہا ہے۔ ایک چیز تو اس میں یہ ہوگئی کہ اُس نے آگے بڑھنا ہے لیکن صرف آگے ہی نہیں بڑھنا بلکہ **یَعْرُجُ اِلَیْهِ** (32:5) سیدھا بھی جانا ہے اور بلند بھی ہوتے چلے جانا ہے۔ اب اس بلندی کے متعلق لفظ آ گیا۔ جیسا میں نے کہا تھا کہ خود لفظِ تدبر میں یہ چیز موجود تھی کہ اُس چیز کا جو نقطۂ تکمیل ہے، اُس کو سامنے رکھ کر اُس اسکیم کو مرتب کرنا۔ کہا کہ یہ شے اپنے پست تریں نقطہ سے آگے بڑھ رہی ہے لیکن آگے ہی نہیں بڑھ رہی بلکہ **یَعْرُجُ اِلَیْهِ** (32:5) بلند بھی ہو رہی ہے۔ اور بلندی کے لیے میں نے کہا کہ اس لفظ کا مادہ ''ع ر ج'' سے ہے جس کو ہم عام طور پر عروج کہتے ہیں۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کہ سیڑھیوں کی طرح اوپر چڑھنا، بتدریج بلند ہونا، Gradually (درجہ بدرجہ) جانا، درجہ سیڑھی کے ایک ڈنڈے کو کہتے ہیں۔ لفظِ عروج جو ہے اُس میں ضروری ہے کہ بلندیوں کی طرف چڑھے لیکن مدارج کی رو سے چڑھے۔ اسی لیے معراج سیڑھی کو کہتے ہیں۔ خدا کے متعلق جہاں اُس نے کہا کہ **اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ** (11:56) میرا خدا خود صراطِ مستقیم پہ ہے، اُس کے ساتھ ہی کہا کہ وہ ذی المعارج ہے یعنی وہ سیڑھیوں والا خدا ہے۔

ارتقائی منازل کے لیے قدرت کا ایک ایک دن پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے

عزیزانِ من! پوچھو یورپ کے سائنٹسٹ سے کہ وہ کس طرح ان چیزوں پہ جھومتا ہے! وہ شے سیدھا بھی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ اونچا بھی چڑھتی جاتی ہے' غبارے کی طرح اونچا نہیں چڑھتی یا ہوائی جہاز کی طرح فوراً اونچا نہیں چڑھتی بلکہ وہ بتدریج مراحل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے اور اوپر جاتی ہے۔ خدا ذی المعارج ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو رفیع الدرجات (40:15) کہا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ جو سیڑھی کا ایک ایک ڈنڈا ہوتا ہے' زینہ ہوتا ہے' اُس کو عرب درجہ کہتے ہیں۔ گویا عروج کے لفظ کے اندر یہ بات آ گئی کہ اُس نے بلندیوں کی طرف جانا ہے لیکن بتدریج جانا ہے' یکلخت نہیں جانا ہے۔ Evolution (ارتقا) کے تو معنی ہی یہ ہیں' اُس کے اندر ارتقا تو ہے' اُس میں بلند ہونا تو ہے لیکن وہ جس طرح یکلخت اپنی آخری شکل میں وجود میں نہیں آ گئی تھی بلکہ نقطۂ آغاز سے وجود میں آئی ہے اور آہستہ آہستہ اُس نے تکمیل تک پہنچنا ہے۔ اسی طرح سے وہ شے اپنی تکمیل تک پہنچتی ہے اسے بلندیوں کی طرف جانا کہا ہے' اُس کا عروج کہا ہے۔ یہ شے یکلخت بلند نہیں ہو جاتی بلکہ بتدریج بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور وہ جو مراحل ہیں **فِی یَوْم** (32:5) جن میں وہ بتدریج گزرتی ہے یوم کے معنی Period یا مرحلہ یا منزل ہوتے ہیں۔ کہا کہ **كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ** (32:5) وہ ایک ایک مرحلہ تمہارے حساب وشمار سے ہزار ہزار سال کا ہے۔ اور دوسری جگہ کہا ہے کہ **خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ** (70:4) پچاس پچاس ہزار سال کا ایک ایک مرحلہ ہے۔ وہ سیڑھی کا ایک زینہ تمہارے حساوشمار سے پچاس پچاس ہزار سال کا ہے جس میں یہ شے اس طرح سے بتدریج بلند ہوتی ہوئی اُس نقطے تک پہنچتی ہے جو اس اسکیم میں اس کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔

کسی منزل کے حصول کے لیے Direction (سمت) کی اہمیت

اب اس ارتقا (Evolution) میں بتدریج جانا بھی ہے۔ اس کے لیے لفظ ہے **الیہ**۔ یہ جو **الیہ** ہے اس میں Direction (سمت) ہے کیونکہ کسی شے تک پہنچنے کے لیے Direction (سمت) کا ہونا نہایت ضروری ہے' ڈائریکشن (سمت) بڑی اہم چیز ہے۔ Chesterton, Gilbert Keith (1874-1936) کی ایک کتاب ہے: An Essay on Heretics اس نے اس کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے کہ یہ لفظ جس کو ترقی کہتے ہو' جس کو پروگریس کہتے ہو' یہ بے معنی ہو جاتا ہے تاوقتیکہ آپ پہلے ڈائریکشن (سمت) کا تعین نہ کریں اور ڈائریکشن (سمت) بے معنی ہوتی ہے تاوقتیکہ آپ Destiniation یا نصب العین کا تعین نہ کریں۔ یہ "الٰی

''جو ہے وہ ڈائریکشن (سمت) ہے۔ الیہ کی اس ''ہ'' نے بات واضح کر دی کہ یہ وہ نقطۂ تکمیل ہے جو اس کے لیے طے کیا گیا تھا۔ یہ اس شے کے آگے بڑھنے اور بلند ہونے کی جو ڈائریکشن ہے' اُس نقطۂ تکمیل کی طرف ہے۔ یہ اُدھر بلند ہوتی ہوئی چلی جاتی ہے' بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اسی لیے ہمارے ہاں ترقی کے لیے لفظ ارتقا کہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ رقی کے معنی بھی بلند ہونا ہے لیکن قرآن نے جو بلندی کے لیے عروج کا لفظ استعمال کیا ہے تو یہ ہے جو صحیح طور پہ اس چیز کو Depict (ظاہر) کرتا ہے کہ اُس نے بتدریج بلند ہونا ہے۔ سائنس کی Discoveries (انکشافات) یہ کہتی ہیں کہ لائف (زندگی) کا نقطۂ آغاز (پہلا جرثومہ) جو ہے وہاں سے اس کی تشکیل کا آغاز ہوتا ہے۔ ہزار ہا سال میں کہیں ایک مرحلہ طے ہوتا ہے' یعنی وہ جرثومہ آگے بڑھتا ہے۔ اس آگے بڑھنے کے لیے قرآنِ کریم نے یہ بات کہی ہے کہ ہر شے کے زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کے لیے حرکت اور جدوجہد ضروری ہے۔ حرکت ضروری ہے' سخت کوشی ضروری ہے' اس لیے کہ یہ ارتقا کا کچھ اس قسم کا سلسلہ ہے کہ ہر شے کے راستے میں موانعات آتے ہیں' رکاوٹیں آتی ہیں' مخالفتیں ہوتی ہیں اور ان کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا ہے۔ جو شے یہ ثابت کر دیتی ہے کہ ان ٹکراؤ کے مقابلے میں وہ ان پہ غالب آنے کی صلاحیت رکھتی ہے وہ زندہ رہتی ہے اور جب راستے میں اُس مانع چیز کو وہ توڑ دیتی ہے تو ایک قدم آگے بڑھتی ہے۔ اسے ارتقا کہتے ہیں۔ یہ جو Evolution (ارتقا) کی تھیوری (نظریہ) ہے' یہ اُس کی بنیاد ہے۔ وہ جو پرانے زمانے کے Fossils (آثارِ متحجرہ) ہیں' جو نیچے زمین میں' برفوں میں' دبے ہوئے پنجر نکلے ہیں' وہ بڑے بڑے عظیم الجثہ جانوروں کے ہیں اور اُس کے بعد وہ اس ہسٹری میں بتاتے ہیں کہ کونسی ایسی تھی' جس میں اس کی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ موانعات کا مقابلہ کر سکے۔ وہ یا تو وہیں ٹھٹھر کر' جامد ہو کر' رہ گئی' جسے قرآن نے جحیم یا جہنم کہا ہے اور یا اُس کے اوپر موت وارد ہو گئی۔ یہ جو ان اشیاء کے Fossils (متحجرات) ہیں جن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں رہی' حرکت جدوجہد اور موانعات کے اوپر غلبہ پانے کی صلاحیت نہیں تھی۔ وہ یا جامد ہو کر رہ گئیں یا ختم ہو گئیں۔ اور جن میں یہ صلاحیت موجود تھی وہ ہیں جو آگے بڑھیں کہ ''اوا ک ڈنڈا اتے چڑھ گئی''[1]۔

ہم نے جیسے علامہ اقبالؒ کو صرف شاعرِ مشرق کے الفاظ میں ہی محدود کر رکھا ہے

موضوع کچھ خشک ہوتا جا رہا ہے اس لیے اس میں تھوڑی سی لطافت پیدا کی جائے اور ہمارے لیے تو لطافت اور رعنائیوں کے لیے

---

[1] وہ ایک منزل تو آگے بڑھی۔

بڑا ذخیرہ موجود ہے کیونکہ اقبالؒ (1877-1938AD) جو موجود ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ ہم اسے صرف شاعرِ مشرق ہی کہہ سکے، ہم اس سے زیادہ اُس کو سمجھ ہی نہیں سکے۔ ارتقا جیسی تھیوری اور شعریت کو ملا کر رعنائی اور لطافت پیدا کرنا آسان کام نہیں ہے۔ آپ پہلے یہ دیکھیے کہ اقبالؒ کے کلام میں کتنی رنگینیاں، رعنائیاں، دلکشیاں اور دلفریبیاں ہیں۔ یہ مسئلہ اتنا مشکل ہے کہ میں اسے نثر میں بیان کر رہا ہوں تو کہہ رہا ہوں کہ خشکی پیدا ہو رہی ہے۔ ٹکراؤ، حرکت، حرارت، جدوجہد اور ٹکراؤ کے بعد اگر کامیابی ہوئی ہے تو ایک قدم آگے بڑھنا ہے۔ یہ نظم 'ارتقاء' بانگِ درا میں ہے۔ کہا کہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مُصطفویؐ سے شرارِ بُولہبی

تعمیری قوتوں اور تخریبی قوتوں کا یہ ٹکراؤ شروع سے چلا آ رہا ہے۔ یہی ارتقا ہے۔

حیات شُعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرِشت اس کی ہے مشکل کشی، جفا طلبی

یعنی جہاں زندگی ہے تو اس زندگی کی خصوصیت یہ ہے کہ شعلہ مزاج ہے، اُس کے اندر حرارت ہے، یہ غیور واقع ہوئی ہے، بے حمیت واقع نہیں ہوئی، بزدل واقع نہیں ہے بلکہ شور انگیز واقع ہوئی ہے، اس کی سرشت مشکل کشی ہے، جفا طلبی ہے۔

سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی
کشاکشِ زم وگرما، تپ و تراش وخراش
زخاکِ تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی

سیاہ رنگ کے پتھر یا ریت کو آئینہ بننے کے لیے اِن اِن مرحلوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔

مقامِ بست وشکست و فشار وسوز وکشید
میانِ قطرۂ نیسان و آتشِ عنبی

عزیزانِ من! اس کو سمجھنے کے لیے بھی شعریت کی تاریخ سامنے رکھنی پڑتی ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ بہار کا موسم ہوتا ہے' بارش ہوتی ہے تو ایک قطرہ ایسا ہوتا ہے جو ایک سیپ کے اندر جاتا ہے اور وہ سیپ اُس قطرے کو اپنے اندر بند کر لیتی ہے پھر اُس کے اندر وہ قطرہ ہزار ہزار مراحل گزرنے کے بعد گہر بن جاتا ہے۔ اس نے جو کہا ہے کہ قطرۂ نیسان کو شراب بننے کے لیے کتنے مرحلوں میں سے گزرنے کی ضرورت ہے کہ یہ قطرۂ نیسان شراب بن جائے۔ یہ پہلے شاعر کا شعر تھا انہوں نے وہاں سے بات لی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ

طاق را سرسبز کن اے ابرِ نیسانِ بہار

نیسانِ بہار کے بادل! تو یہ جو انگور کی بیل ہے اس پہ برس' کھیت میں برسنے سے کیا فائدہ!

قطرہ گرمے می تواند چرا گوہر شود

یہ تیرا ایک قطرہ اگر شراب بن جائے تو اس نے موتی بن کر کیا لینا ہے تُو وہاں اپنے آپ کو کیوں ضائع کر رہا ہے۔

اِسی کشا کشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی
''مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند' آفتاب می سازند''

شراب کو کشید کرنے والے جو انگور کے دانے کو توڑتے ہیں تو انگور کے اندر رس ہوتا ہے' مٹھاس ہوتی ہے' نشہ نہیں ہوتا۔ یہ ارتقا کی پچھلی منزل ہے۔ وہ جب تک ٹوٹتا نہیں اگلی منزل میں نہیں پہنچتا' ٹوٹنے کے بعد جب اگلی منزل میں پہنچتا ہے تو وہی اُس کا جو شیرہ ہے وہ شراب بن جاتا ہے۔

آپ غور فرما رہے ہیں کہ فطرت نے اس اقبالؒ کو کیا صلاحیتیں دی تھیں۔ وہ Evolution (ارتقا) کی تھیوری (نظریہ) بیان کر رہا ہے۔ یہ قرآن کی آیت ہے کہ اگر حیات میں حرکت' حرارت' ٹکراؤ' تصادم' موانعات پہ غلبہ پانے کی صلاحیت ہو تو ہر ٹکراؤ کے بعد اگلا قدم پچھلے قدم سے آگے بڑھتا ہے اور اوپر چڑھتا ہے۔ یہ ہے:

مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند' آفتاب می سازند

قرآن کہتا ہے کہ **ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ** (32:5)۔آپ نے ایک ایک لفظ پہ غور کیا کہ تدبر کہا' امر کہا' سما کہا' ارض کہا' **یَعْرُجُ اِلَیْہِ** کہا۔**الیہ** نے Direction (سمت) متعین کی۔''الیٰ'' کے معنی ہی ڈائریکشن (سمت) ہوتا ہے۔ اور بات صحیح ہے کہ جب تک سامنے Destination (نصب العین) نہ ہو' منزل متعین نہ ہو' اُس وقت تک سمت بے کار ہے۔ اور Destination (نصب العین) ہو اور اُس کی طرف سمت نہ متعین کی گئی ہو تو پھر بھی آپ وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ صراطِ مستقیم اس لیے ضروری ہے۔ یہ ہے ''الیہ''۔ پہلے لفظ تدبر ہے' تدبر کے معنی ہی یہ ہیں کہ آخری نقطۂ تکمیل کو سامنے رکھ کر کسی شے کی ابتدا کرنا۔ یہ الیہ ہے۔ ہر شے اس پروسیس عمل' اس ذریعے سے اپنے اُس Destination (نصب العین) کی طرف چلی جا رہی ہے' بڑھتی جا رہی ہے' بلند ہوتی ہوئی چلی جا رہی ہے' اس کا ایک ایک مرحلہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہے۔ کہا کہ یہ جو عمل ہے یہ کون کر رہا ہے۔ کہا کہ **ذٰلِکَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ** (32:6) یہاں اس آیت میں چار صفات آ گئیں۔ یہ غیب کیا ہے؟ یہ شہادت کیا ہے؟ جو شے بھی نقطۂ آغاز سے شروع ہوئی ہے اُس ایک بوند یا نقطے کے اندر' وہ شے بننے کی Potentialities (صلاحیتیں) یا ممکنات موجود ہیں جس کے لیے اُس کا آغاز ہوا ہے۔ یہ چیز ابھی مشہود طور پر سامنے نہیں آئی بلکہ اُس کی صلاحیتیں اندر چھپی ہوئی ہیں' مضمر ہیں۔ اس کو Potentialities (صلاحیتیں) کہتے ہیں جو Actuality (بارز حالت میں) میں ابھی نہ آئی ہوئی ہوں بلکہ اُس میں وہ کچھ بننے کی صلاحیت ہو۔ جب تک وہ صلاحیت مشہود نہیں ہوتی' محسوس طور پہ سامنے نہیں آتی اُسے غیب کہا جاتا ہے۔ اس آیت میں کہا کہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کسی شے میں بننے کی صلاحیت کیا ہے اور اُسے شہادت کا بھی علم ہے کہ وہ کیا بن گئی ہے۔ یعنی اس شے نے آخرالامر کیا بننا ہے' یہ بھی اُسے پتہ ہے اور کتنا بن چکی ہے' یہ بھی اُس کو پتہ ہے۔ اس لیے جب اُس کو یہ معلوم ہے کہ یہ جو یہ کچھ بن چکی ہے اس کے لیے یہی نقطۂ آخری نہیں بلکہ اس میں بہت کچھ بننے کی ابھی صلاحیتیں ہیں تو وہ اس شے کو وہاں کھڑا نہیں رہنے دے گا بلکہ وہ اُس کو آگے وہاں تک چلائے گا جہاں تک کہ یہ غیب مشہود نہ ہو جائے' غیب شہادت نہ بن جائے۔

لفظ عزیز کے ساتھ رحیم کا استعمال کیوں؟

اس آیت میں کہا ہے کہ **عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ** (32:6)۔ یہاں عزیز کے ساتھ رحیم آیا ہے ورنہ عام طور پہ حکیم آیا کرتا ہے۔ کہا کہ ذرۂ ناچیز کو پہاڑ بنانے کے لیے بڑے غلبے اور قوت کی ضرورت ہے' پھر ان کو اس طرح سے اُس لائن کے اوپر

چلانے کے لیے' ارتقا کے راستے کے اوپر آگے لے جانے کے لیے' بڑی قوت اور غلبے کی ضرورت ہے تو خدا العزیز بھی ہے لیکن اُس کا غلبہ سامانِ نشو ونما بہم پہنچانے کے لیے ہے اور وہ بھی بغیر کسی قسم کی کوشش اور سعی وتاب کے ہے۔ یہ رحمت ہے کہ ہر شے کو سامانِ نشو ونما پہنچا تا چلا جاتا ہے۔ اور پھر اُس کو اُس ڈائریکشن (سمت) کے اوپر چلانے کے لیے اُس کے پاس قوت بھی موجود ہے۔ یہ اُس خدا کی اسکیم ہے جو اس طرح سے اس کائنات کے اندر کارفرما ہے۔ یہاں تک ہم نظریۂ ارتقا کے اُس حصے تک پہنچے ہیں جو یورپ کے سائنسدانوں کا حال ہی میں Discover (بے نقاب) کردہ ہے۔

انسانی زندگی کی ارتقائی سوچ کے سلسلہ میں ایک غلط نگہی آج پوری نوع انسانی کے لیے عذاب کا باعث بنی ہوئی ہے

اب اس مقام پہ پہنچنے کے بعد انہیں ایک بہت بڑی غلطی لگی اور یہی وہ غلط نگہی ہے جس کی وجہ سے دنیا آج جہنم میں گرفتار ہے۔ نظریۂ ارتقا میں انہوں نے حیوانات کو دیکھا کہ موجودہ شکل میں کوئی حیوان جو موجود ہے وہ اُس کی آخری منزل ہے' اُس کے بعد آگے ارتقا نہیں ہے۔ وہ Natural Laws (قوانینِ فطرت) یا جو Physical Laws (طبعی قوانین) ہیں' ان کے ماتحت زندہ رہتا ہے' زندہ رہنے کے بعد انہی قوانین کے تابع ایک دن ختم ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے اور سلسلۂ ارتقا کی زنجیر کی یہ آخری کڑی ہوتی ہے۔ یورپ کے ان مکتشفین کی یہ غلط نگہی تھی کہ انہوں نے انسان کو بھی انہی حیوانات میں سے ایک حیوان سمجھ لیا سوائے اس کے کہ یہ شکل و صورت یا دماغ میں ان سے ذرا آگے بڑھا ہوا ہے لیکن انہوں نے انسان کو اُسی کیٹیگری (قسم) کے اندر رکھا۔ کہا یہ کہ انسان کی زندگی بھی یہی فزیکل زندگی ہے' طبعی زندگی ہے' جسم کی زندگی ہے۔ جس طرح سے دوسرے حیوانات عام قانونِ طبعی کے مطابق زندہ رہتے ہیں' یہ بھی اُسی طرح سے کھاتا پیتا سوتا ہے' افزائشِ نسل کرتا ہے' جس طرح سے ایک دن طبعی قوانین کے تابع ان پہ موت آتی ہے تو وہ ختم ہو جاتے ہیں' اسی طرح سے انسان بھی طبعی قوانین کے مطابق زندہ رہنے کے بعد انہی قوانین کے مطابق ایک دن مر جاتا ہے اور اُس کے بعد یہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ہے وہ غلط نگہی۔ چھوٹے لوگوں کی غلطیاں کچھ چھوٹا سا اثر پیدا کرتی ہیں لیکن یہ جو بڑے بڑے لوگ ہوتے ہیں کہ دماغ ہو بہت بڑا اور گردن ہو ٹیڑھی' تو ان کی غلطی کے جو نتائج ہوتے ہیں وہ بڑے ہی ضرر رساں اور تباہ کن ہوتے ہیں۔

انسان کو زندگی گزارنے کے لیے کہا گیا ہے‘ نہ کہ عمر بسر کرنے کے لیے

ان مفکرین کی بات اتنی سی تھی کہ انہوں نے انسان کو بھی حیوانات کے زمرے میں شامل کر لیا اور اب اُس کے بعد آپ دیکھیے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ انسان کے متعلق کہا کہ یہ صرف Physical Laws (طبعی قوانین) ہیں جن کے تابع اس نے زندگی بسر کرنی ہے‘ اس سے آگے کچھ بات نہیں ہے‘ اس نے صرف یہ زندگی جینا ہے اس کے بعد اور کچھ نہیں ہے۔ اب انسان کے لیے زندگی کا نصب العین یا مقصد یا Destiny تو موت ہو گئی۔ اور حیوانات کے مقابلے میں اس کو قوتیں اتنی دیں کہ وہ شیر جو اتنی بڑی قوتوں کا مالک درندہ ہے اُس سے بڑا حیوانات میں سمجھیے کہ کوئی صاحبِ قوت نہیں تو وہ بھی ایک وقت میں کسی ایک کمزور حیوان کو چیر پھاڑ سکتا ہے اور کیا کر سکتا ہے لیکن یہ کم بخت (انسان) تو ہیروشیما[1] کے اوپر ایک بم گرا دیتا ہے۔ اور وہ تو بات پرانی ہے کہ ایک شہر کو تباہ کرتا ہے اب تو یہ کہہ رہا ہے کہ اگلا بم ایسا بھی آ سکتا ہے جو کرۂ ارض کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔ زندگی ہو عام حیوانوں کی اور قوتیں اس کی یہ ہوں تو آپ سوچ لیجیے کہ پھر آپس میں حشر کیا ہونا ہوا۔ اب یہ ساری قوتیں ایک دوسرے انسانوں کے خلاف صرف ہو رہی ہیں‘ اس نے صرف ہی یہاں کرنی ہیں‘ اس کے سامنے اور تو کوئی نصب العین ہی نہیں ہے‘ اگلی منزل ہی کوئی نہیں ہے‘ یہاں خاتمہ ہو گیا ہے۔ اتنی قوتوں کا مالک کہ جس کے سامنے اس فزیکل لائف کے آگے کوئی اور منزل ہی نہیں ہے تو اُس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے جو کچھ ہو رہا ہے۔

تہذیبِ مغرب کی تعریف کے متعلق ہمارے ہاں کی پیدا کردہ سوچ کی نوعیت

یہ جسے آپ کہتے ہیں کہ تہذیبِ مغرب تباہیاں لے آئی اور یہ کہ تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی‘ تو اس تہذیبِ مغرب کے متعلق ہم ہی نہیں‘ یورپ والے بھی یہی چلا رہے ہیں۔ جب تہذیبِ مغرب کہا جاتا ہے تو ہمارے سامنے تو یہی آتا ہے اور ہمیں وعظوں میں اور منبروں میں بتایا ہی یہ جاتا ہے کہ جی! وہ کھڑے ہو کر پیشاب کرتے ہیں‘ پتلون پہنتے ہیں‘ شیو کر لیتے ہیں‘ شراب پیتے ہیں‘ ناچ کرتے ہیں‘ ان کی میمیں اسکرٹ پہنتی ہیں۔ یہ ہمارے ہاں تہذیبِ مغرب کا تصور ہے۔ یہ تہذیب نہیں ہوتی بلکہ تہذیب تو زندگی کے متعلق ایک نظریہ ہوتا ہے جس کے مطابق اپنی زندگی اور معاشرہ اور سیاست اور معیشت تمام عمارتیں استوار ہوتی ہیں۔ یہ تہذیبِ مغرب جس کی تباہیاں ہم گنا رہے ہیں‘ وہ لائف کا یہ Concept (تصور) ہے کہ انسان کی زندگی بھی ایک حیوان کی

---

[1] بحرِ ہانشو کے ساحل پر واقع جنوبی جاپان کا وہ پہلا شہر جسے اگست 1945ء کی 6 تاریخ کو ایک ایٹم بم گرا کر مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا۔

زندگی ہے اور طبعی موت مرنے کے بعد اور کچھ نہیں رہتا' یہیں کی زندگی ہے۔ تو **Law of Jungle** (جنگل کا قانون) تو ہونا ہی ہوا کیونکہ حیوان کی طرح جو ہوا کہ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔ یعنی جو بھی کسی طرح سے قوت حاصل کرلے پھر وہ جو جی میں آئے باقی انسانوں کے ساتھ کرتا چلا جائے۔ یہ جو یورپ کا زندگی کے متعلق یہ نظریہ ہے' یہ سارے مظاہر اس نظریئے کے نتائج ہیں' یہ اس کی شاخیں ہیں۔ یہ ہے اصل شے جسے تہذیبِ مغرب کی بنیاد کہیں گے۔ یہ اقبالؒ (1877-1938ء) نے 1907ء میں کہا تھا کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا' ناپائدار ہوگا

30 سال کی عمر میں تہذیبِ مغرب کے متعلق علامہ اقبالؒ کی سوچ اور لادینیت کی وضاحت

عزیزانِ من! یہ اُس زمانے میں کہا تھا کہ جب یہ 30 سال کا نوجوان تھا۔ یورپ میں اس کی تعلیم ہو رہی تھی' وہاں خود اس تہذیب کا مشاہدہ کر کے اُس نے یہ کہا تھا۔ اُس نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ اسکرٹ پہنتی ہیں اور ناچ کرتی ہیں بلکہ اُس نے دیکھا یہ کہ زندگی کا جو تصور ان لوگوں نے اپنے ذہن میں رکھا ہے اُس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ اپنے ہی خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی اِس لیے کہ جو آشیانہ شاخِ نازک پہ بنے گا ناپائدار ہوگا۔

اور پھر اس تہذیب کے سارے محاصل کا مشاہدہ کرنے کے بعد کہا:

یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد

یورپ اپنے تلوار سے آپ ہی بسمل ہوگیا

زیرِ گردوں رسمِ لادینی نہاد

اب یہاں وہ ایک لفظ ''لادینی'' لایا ہے اور یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ دین کیا ہوتا ہے اور لادینی کسے کہتے ہیں۔ وہ رسمِ لادینی یہ تھی

درنگاہش آدمی آب و گل است

انہوں نے سمجھا کہ یہ آدمی بھی اسی طرح سے ہے جس طرح پانی اور مٹی سے اور حیوان بنے ہوئے ہیں بس یہی ہے رسمِ لادینی۔ کہا کہ

کاروانِ زندگی بے منزل است

عزیزانِ من! یہ ہے لادینی۔ اگر منزل متعین ہو تو وہ دین ہوتا ہے۔

خالقِ کائنات اپنی ہر تخلیق کا آغاز پست ترین سطح سے کرتا ہے اور بلند ترین سطح تک لے جاتا ہے

اس کے برعکس، قرآن کی یہ اسکیم جو پست تریں نقطے سے شروع ہوئی تھی بڑھتی چلی آ رہی تھی، قرآن نے اس کے متعلق انسان کی بابت کیا کہا ہے؟ وہ پہلے جو تھا وہ خارجی کائنات کے متعلق تھا کہ وہ اس طرح سے چلی آ رہی ہے۔ اور اُس کے بعد جو ''الیہ'' کہا تھا کہ جو اس کے لیے ہم نے نقطۂ تکمیل مقرر کیا تھا، ہر شے وہاں تک چلی آ رہی ہے۔ آم کی گٹھلی کے اندر Potentialities (صلاحیتیں) یہ ہیں کہ وہ ایک پودا اُگے، پھر درخت بنے، پھر اُس میں خوشے آئیں، پھر اُس کے اندر آم لگیں اور جب آم لگ جائیں تو یہ اُس کی انتہا ہے، وہ اپنے آخری نصب العین تک پہنچ گئی۔ اسکیم نے یہی اُس کے لیے رکھا تھا۔ شیر کا نصب العین تھا کہ شیر بن جائے، شیر کا بچہ پیدا کرے، شیر کا بچہ از خود بغیر کسی تعلیم و تربیت کے یا کسی اسکول کالج میں گئے یہ کچھ بن جائے، نہ ہی اُس کی طرف کوئی رسول آتا ہے، نہ کوئی کتاب آتی ہے بلکہ وہ از خود اپنے نقطۂ تکمیل تک پہنچ کر شیر بن جاتا ہے۔ لیکن بس شیر ہی بنتا ہے اس سے آگے کچھ نہیں ہوتا، دس لاکھ سال پہلے بھی وہ شیر کا بچہ شیر بن کر ختم ہو جاتا تھا، آج بھی وہ وہاں پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اُس کے لیے نقطۂ تکمیل ہی یہ ہے۔ اگلی آیت ہے جو بتا رہی ہے کہ دین کیا ہے۔

قدرت نے انسان کو انسانیت کی ایک نئی منزل سے روشناس کرایا

یہ آیت انسان کو حیوانات کے زمرے سے نکال کر ارتقا کی دوسری منزل میں پہنچا رہی ہے۔ کہا ہے کہ **الَّذِیٓ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَہٗ** (32:7) وہ خدا ہے جس نے ویسے تو ہر شے کو موزوں تریں انداز میں پیدا کیا ہے، اس کا بہترین حسن و توازن قائم رکھتے ہوئے پیدا کیا۔ یہ بات نہیں ہے کہ اُس نے باقی جو کائنات یا باقی چیزیں تھیں وہ ٹھیکے پہ بنوالی ہیں ''تے آپ او بندا بنڑ ودا رہیا اے (ا)'' کہا کہ **الَّذِیٓ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَہٗ** (32:7) اپنی اپنی جگہ ہر شے ایک احسنِ تقویم میں ہے، ہر شے میں ایک خاص اعتدال ہے، اُس کے اندر ایک حسن ہے۔ **وَ بَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِیۡنٍ** (32:7) انسان کی تخلیق کی جو ابتدا ہوئی ہے وہ بھی ان باقی حیوانات کی طرح جمادات سے ہی ہوئی ہے، غیر نامی مادے (Inorganic Matter) سے ہوئی ہے، بے جان مادے سے ابتدا ہوئی ہے۔ اب میں یہاں بیچ کے مراحل نہیں گناؤں گا کہ پھر بات دوسری طرف چلی جائے گی۔ یہ نظریۂ ارتقا بتا رہا ہے اور قرآن نے دیگر مقامات پہ بتایا ہے کہ

جن جن منازل میں سے یہ حیوانات گزرے ہیں انہی منازل میں سے انسان کا بچہ (جنین) رحمِ مادر تک گزرتا ہے۔ **وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ . ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ** (32:7) پھر وہ منازل طے کرتا ہوا اُس کو اس منزل میں لے آتا ہے جہاں اس کی افزائش عورت اور مرد کے اختلاط سے (By Procreation) ہوتی ہے، یہ تو حیوانی سطح ہے۔ یہاں سے اس کے بعد گاڑی دوسری پٹڑی پہ پڑتی ہے، یہاں سے انسانیت شروع ہوتی ہے، یہاں سے انسان اور حیوان میں فرق شروع ہوتا ہے، یہیں سے دین شروع ہوتا ہے، یہاں سے وحی اور رسول اور ہدایت کی ضرورت شروع ہوتی ہے۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ **وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ. ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ** (23:12.13)۔ یہ ساری منازل ہیں۔ اس کے بعد پھر جس طرح سے جنین رحمِ مادر میں ہوتا ہے یہاں سارے مرحلے گنائے ہوئے ہیں۔ میں ان کو چھوڑتا ہوں کہ یہ حیوانات میں اور انسانی بچے میں مشترک ہیں۔

1. اور آپ خود وہ بندہ بنا تا رہا ہے۔

انسان کے لیے اطوار کی صورت میں تخلیقِ نو کی نعمت خدائی توانائیوں کا ایک کرشمہ

یہاں تک اُس کو بنانے کے بعد حیوان کا جو بچہ تھا اُس کو تو اسی چیز پہ چھوڑ دیا کہ یہ اس کا آخری نقطہ تھا۔ انسان کی صورت میں کہا کہ **ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا آخَرَ** (23:14) یہاں پہنچنے کے بعد اُس کو ایک دوسری طرح کی مخلوق بنا دیا۔ **فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ** (23:14)۔ جیسے وہ اپنے شاہکار کو پیش کرنے کے بعد تھوڑی سی برکت والی بات کہتا ہے، تحسین (Appreciation) والی بات کہتا ہے، دوسری جگہ خلق جدید (32:10) بھی کہا ہے۔ اس کے متعلق اس نے یہ کہا ہے کہ **وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا** (71:14) اس کے بعد یہ انسان یکلخت انسان نہیں بن گیا بلکہ یہ درجہ بہ درجہ ہوا۔ اب اطوار کا جو ترجمہ طور ہے، بڑا جامع لفظ ہے:

بدلے کچھ ایسے طور سے بے طور ہو گئے
تم تو شباب آتے ہی کچھ اور ہو گئے

خَلْقًا آخَرَ (23:14) کچھ اور ہو گئے۔ یہ ہے جامعیت۔ بتایا نہیں کہ کیا ہو گئے بلکہ یہ کہا کہ کچھ اور ہو گئے۔ **اَطْوَارًا** یہ ہوتا ہے کہ اگلا جو طور ہے، جسے اُس نے طور سے بے طور کہا، انسان کا یہ جو اگلا طور ہے کہا کہ وہ **خَلْقًا آخَرَ** ہے یعنی تخلیق کا جو پہلا سلسلہ چلا آ رہا تھا، یہ اُس سے بالکل مختلف ہے۔ کیسا خوبصورت انداز ہے اس کے کہنے کا کہ یہ کچھ اور ہو گیا۔ آگے کہا کہ **ثُمَّ سَوّٰىهُ** (32:9) یہاں حیوان تک مشترک لانے کے بعد **سَوّٰىهُ** کہا۔ تخلیق کے مراحل میں خدا نے اپنے آپ کو کہا ہے کہ **الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ**

(59:24) یعنی خالق تو جیسا میں نے مثال کے طور پہ بتایا تھا کہ کمہار جو چاک پہ بیٹھا ہوا ہوتا ہے اُس کے پاس مٹی کا تھوبہ (تودہ) ہوتا ہے' اُس نے اپنی اسکیم کے ماتحت اُس میں سے صراحی بنانی ہوتی ہے یا پیالہ بنانا ہوتا ہے تو ان سب کے لیے وہ اسی قسم کی مٹی ہوتی ہے جو چاک کے اوپر یوں تھپ کر رکھ دیتا ہے۔ وہ اُس چاک کو گھماتا ہے اور اس میں سے بہت سی مٹی کو وہ چھانٹتا چلا جاتا ہے' تراشتا چلا جاتا ہے' خراشتا چلا جاتا ہے' الگ کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کو باری کہتے ہیں۔ اس کی تخلیق کا اگلا درجہ **الْبَارِئُ** ہے' اسی کو سٰوہ کہتے ہیں کہ جو حشو و زوائد اس میں ہوں ان کو الگ کرتا چلا جاتا ہے۔ الگ کرنے کے بعد وہ المصور ہے یعنی پھر وہ فارم (Form) دیتا ہے جس فارم (Form) میں اس کو لانا مقصود ہوتا ہے یعنی پیالہ بنا دیتا ہے' صراحی بنا دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ **ثُمَّ سَوّٰىهُ** (32:9) پھر ہم نے اس کے حشو و زوائد کو الگ کر کے ایک خاص اعتدال پہ پیدا کیا۔ اب وہ بات آئی جہاں حیوان سے اختلاف آتا ہے' پٹڑی بدلتی ہے۔ کہا کہ **وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ** (32:9) اور اُس میں اپنی توانائیوں کا ایک شمہ ڈال دیا۔ اب اس میں ایک خدائی توانائی (Divine Energy) پیدا ہوگئی۔

انسان خدا کی ذات کا حصہ نہیں' ذات کے حصے بخرے نہیں ہوسکتے

یاد رکھیے! یہ جو چیز ہے یہ بڑی غور طلب ہے۔ یہ چیز جسے کہتے ہیں کہ انسان کی جو روح ہے' وہ روحِ خداوندی کا ایک حصہ ہے تو یہ بڑا غلط اور قرآن کے خلاف تصور ہے۔ اگر وہ اُس کا کوئی حصہ اپنے میں سے (اُسے ذات کہہ دیجیے یا روح کہہ دیجیے) ذرا ذرا سا بھی انسانوں کو دینا شروع کرتا تو مدت کا ختم ہو چکا ہوتا۔ جس کُل کی کیفیت یہ ہو اگر اُس میں سے ذرا برابر بھی الگ ہو جائے تو وہ ناقص ہو گیا۔ کوئی ذات اپنا کوئی حصہ دوسرے کو نہیں دیتی' ذات ایک **Indivisible Whole** (ناقابلِ تقسیم وحدت) ہوتی ہے' اس کے حصے بخرے نہیں ہوتے' وہ اس میں سے کوئی چیز نہیں دیتا۔

لفظ روح کا قرآنی مفہوم انسان کا اختیار و ارادہ ہے یعنی یہ اس کا صاحبِ مشیّت ہونا ہے

یہ جو روح کا لفظ ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے اس کا یہ مفہوم ہی عربی زبان میں نہیں ہے۔ روح ہمارے ہاں **Soul** یا **Spirit** کو کہتے ہیں' مر جاتا ہے تو پھر کہتے ہیں کہ روح نکل گئی۔ پھر مسئلے پیدا ہوئے کہ پھر روح رہتی کہاں ہے۔ پوچھیے نہیں کہ اس پہ پھر کیا کچھ افسانے گھڑے گئے۔ یہ روح اس معنی میں قرآن کے اندر ہے ہی نہیں۔ انسان کی روح کا لفظ ہی قرآن میں نہیں ہے' یہ **Concept** (تصور) ہی نہیں ہے۔ البتہ توانائی (**Energy**) ہے' وہ توانائی جسے قرآن نے روح کہا ہے۔ ایک چیز ہے جو کائنات میں اوپر خدا کو

حاصل ہے اور نیچے کائنات میں انسان کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہے اور وہ ہے اس کا صاحبِ ارادہ وصاحبِ اختیار ہونا۔ دوسری جگہ یہی کہنے کے بعد کہا ہے کہ **وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ** (90:10) ہم نے جو اپنی توانائی میں سے اس کو توانائی بخشی، وہ یہ تھا کہ اس کو دو راستے دکھا دیئے۔ حیوانات میں کسی کو دو راستے نہیں دکھائے بلکہ ان کے لیے ایک ہی راستہ متعین ہے، وہ اُس پر چلنے کے لیے مجبور ہیں۔ یہ جو **مایشآء یامن یشآء** ہے کہ ہم اپنے اختیار کے مطابق یہ کرتے ہیں، ہم وہ کرتے ہیں تو سارے قرآن میں یہ خدا کے لیے ہے۔ اور نیچے انسان سے کہا گیا ہے کہ **اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ** (41:40) تمہاری بھی ایک مشیت ہے، محدود دائرے میں ہی سہی، ہماری مشیت بڑے دائرے میں ہے اور تمہاری مشیت بھی تمہارے دائرے میں ہے۔ ہم اپنی مشیت کے مطابق کام کرتے ہیں، تم اپنی مشیت کے مطابق کام کرو۔ یہ ہے وہ خدا کی روح جسے کہا جاتا ہے: صاحبِ مشیت ہونا، صاحبِ ارادہ ہونا، صاحبِ اختیار ہونا، دو راستوں میں سے ایک اختیار کرنا اور دوسرے کو چھوڑ دینا۔

انسان کو اختیار وارادہ کے استعمال کرنے کے لیے حواسِ خمسہ اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت ملی ہے

یہ بہت بڑی چیز ہے جو انسان کو ملی ہے۔ اسے **Divine Energy** (خداوندی توانائی) کہیے، یہ لفظ توانائی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اُس نے یہ جو اپنی توانائی تھی یا جو خصوصیتِ کبریٰ تھی، اُس میں سے کچھ حصہ اس کو دیا۔ اور پھر اس کے لیے یہ کیا کہ **وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ** (32:9) اس کو یہ حواس (Senses) یعنی دیکھنے کی، سننے کی صلاحیتیں دیں۔ دیکھنے اور سننے کی صلاحیتیں تو حیوانات میں بھی تھیں لیکن آگے ایک اور صلاحیت دی جو **وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ** (32:9) کی خصوصیت تھی۔ سمع وبصر کے بعد کہا کہ **وَالْاَفْئِدَةَ** (32:9) پھر ایک ایسی شے بھی دی جو فیصلہ کرتی ہے، ارادہ کرتی ہے، اس کے لیے جو اُس ہے، فیصلہ کن چیز۔ حیوانات کے سامنے دو راستے نہیں ہوتے اس لیے فیصلے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انسان کے لیے کہا کہ تمہیں سمع اور بصر دیں، یہ حیوانات کو بھی دیں، وہ بھی دیکھتے سنتے ہیں لیکن اگلی چیز یہ ہے کہ جو کچھ انسان دیکھتے سنتے ہیں یا باہر سے ان تک جو اطلاعات پہنچتی ہیں تو اس کے بعد وہ ایک فیصلہ کرتے ہیں۔ اس فیصلہ کن قوت کے لیے ہمارے ہاں تو کیا، انگریزی میں بھی اس کے لیے لفظ نہیں ہے کہ یہ فیصلہ کن قوت کیا ہے۔ انہوں نے اس کے لیے ایک لفظ Mind وضع کیا تھا لیکن آگے چل کر اس کا تعلق دماغ سے ہو گیا۔ یہ دماغ کی بات نہیں ہے بلکہ یہ قوتِ ارادہ ہے۔ قرآن نے تو اس کو نفس ہی کہا ہے، ہمارے ہاں اسے ذات کہا جاتا ہے، انگریزی زبان میں **Personality** کہا جاتا

ہے یعنی کوئی شے جو ان اطلاعات کے بعد اس کے لیے فیصلہ کرتی ہے۔ اور یہی فیصلہ کن قوت ہے جو اس کے لیے Responsibilities (ذمہ داریوں) کا تعین کرتی ہے کیونکہ اس نے خود فیصلہ کیا ہے۔ شیر اگر کسی دوسرے حیوان کو چیر پھاڑ کر کھا جاتا ہے تو وہ گناہ نہیں کرتا یا جرم نہیں کرتا کیونکہ وہ تو اس کی ضرورت کے مطابق ہے' اس کی فطرت کے اندر ہے لیکن انسان جب دو راستوں میں سے ایک اختیار کرتا ہے کہ جی چاہتا ہے تو اُس کو شوٹ کر دیتا ہے' جی چاہتا ہے تو اُس کو معاف کر دیتا ہے تو یہ خدائی چیز ہے۔ کہا کہ یہ جو فیصلہ کرنے والی چیز ہے' یہ ہے جو انسان کو دی ہے۔ اور یہاں پھر ایک نکتہ دیدیا۔ **وَ بَدَ اَخَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ** (32:7) اُسی طرح سے اس کی ابتدا جامد مادہ (Inorganic Matter) سے ہوئی۔ کہا کہ **ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ** (32:9)۔ یہاں یہ تھرڈ پرسن پروناؤن (ضمیر غائب) ہے' یعنی غائب کی ضمیر ہے۔ اُس کی نسل پھر اس طرح سے اختلاف سے آگے بڑھائی۔ اور **ثُمَّ سَوّٰهُ** (32:9) پھر اُس سے حشو و زوائد الگ کیے۔ **وَنَفَخَ فِیْهِ** (32:9) پھر اس میں ہم نے یہ توانائی پھونکی۔

یہ آدمِ خاکی' حیوان سے انسان' اختیار و ارادہ کی سرفرازی کے بعد' بنانا کہ اسے مخاطب کیا جائے

عزیزانِ من! جب توانائی پھونکی تو سوچے سمجھے اور جھومے **وَ جَعَلَ لَكُمُ** (32:9) اور تمہیں ہم نے انسان بنا دیا۔ یہاں ہٗ (ضمیرِ غائب) کی جگہ **کُمْ** (ضمیر مخاطب) آیا ہے' ضمیر مخاطب کی آئی ہے' یہ سیکنڈ پرسن پروناؤن ہے یعنی اب یہ مخاطب کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ کائنات میں کسی دوسری شے کو خدا نے مخاطب نہیں کیا۔ اس کے لیے کہا کہ **جَعَلَ لَكُمُ** (32:9)۔ ساری آیتوں میں ہٗ (ضمیر غائب) چلا آ رہا ہے یعنی تھرڈ پرسن چلا آ رہا ہے کیونکہ یہ ابھی اس قابل نہیں تھا کہ اس کو مخاطب کیا جاتا لیکن اب یہ اس قابل ہو گیا ہے کہ اس کو مخاطب کیا جائے۔ کہا کہ **جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ** (32:9) یہ ہے جو اصل شے ہے۔ اس کو ''کم'' کہہ کے پکارا گیا کہ تم اب تخاطب کے قابل ہو۔

کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ !!

کسی شخص کو تُو کہنے سے پہلے اسے اپنی ''میں ❶'' کو ثابت کرنا ہو گا

اگر خدا کسی کو مخاطب کر کے بلائے تو یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ یہ جو چھوٹا سا حاکم ہے اگر اسے از راہِ تلطف وہ مخاطب کرتا ہے تو

---

❶ I -am -nessایا I

پھر پوچھیے نہیں کہ وہ کہاں آسمان پہ چڑھتا ہے۔ خدا ''کم'' کہہ کر بلاتا ہے۔ ہم بھی خدا کو مخاطب کرتے ہیں۔ ایک یہودی [1] کی کتاب ہے جس کا نام ہے: **I & Thou**۔ اُس نے کہا ہے کہ تم خدا کو کہتے ہو کہ ''تُو یہ کر'' یعنی مخاطب کرتے ہو۔ اُس نے کہا ہے کہ وہی شخص کسی کو ''تُو'' کہہ سکتا ہے کہ جو پہلے اپنے آپ کو ''میں'' کہے۔ جس کا ''میں'' ثابت نہیں ہے اُس کو حق نہیں ہے کہ دوسرے کو ''تُو [2]'' کہے۔ کائنات کی کوئی شے اپنے آپ کو ''میں'' نہیں کہہ سکتی اس لیے وہ خدا کو ''تُو'' نہیں کہتی۔ انسان یہ کہہ سکتا ہے بشرطیکہ یہ **نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ** (32:9) کا حامل ہو۔ اگر اُس کے اندر یہ چیز نہیں ہے اس توانائی کو وہ **Exercise** (استعمال) نہیں کرتا، وہ صاحبِ ارادہ نہیں ہے، اپنے فیصلے آپ لینے کے قابل نہیں ہے تو وہ ''کم'' کہنے کے قابل نہیں ہے اور اُسے حق نہیں ہے کہ وہ خدا کو مخاطب کرے۔

ہماری دعا اس لیے قبول نہیں کہ ہم میں ''میں'' نہیں

ہم لاکھوں کی تعداد میں اُس کو پکارتے ہیں تو وہ کیوں ہماری بات نہیں سنتا؟ اس لیے کہ وہ کہتا ہے کہ پہلے اپنے آپ کو ''میں'' تو ثابت کرو پھر تمہیں ہمیں مخاطب کرنے کا حق پہنچے گا۔ تم ''میں'' نہیں ہو تو ہمیں کیا مخاطب کرو گے۔ اس لیے وہ تمہاری دعا نہیں سنتا۔ میں نے کہا تھا کہ ''الیہ'' سے اُس نے سمت کا تعین کیا ہے۔ اشیائے کائنات کے لیے اُس نے کہا ہے اُس اسکیم کے اندر جو سمت متعین تھی وہ ہے اس کی **Destination** (نصب العین، منزل)، وہ ڈائریکشن (سمت) اُس کو اُس طرف لے جا رہی ہے اور بس وہیں ختم کر دیتی ہے۔

انسان کی منزل انسان کا خدا ہے

انسان کے متعلق کہا ہے کہ ہم تمہیں ڈائریکشن (سمت، نصب العین، منزل) دے رہے ہیں اور تمہاری منزل یہ ہے کہ **اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى** (53:42) تمہارا جو منتہٰی ہے، تمہاری جو **Destination** ہے، تمہاری جو منزل ہے، وہ خدا ہے۔

شعلهٔ درگیر زد برخس و خاشاکِ من

کہا کہ ایک لفظ جو رومی نے بول دیا ہے تو اس نے دنیا کا خس و خاشاک میرے سامنے پھونک کر رکھ دیا جب اُس نے کہا:

مرشدِ رومی کہ گفت منزلِ ما کبریا است

مومن اس سے ورے کہیں ٹھہرتا ہی نہیں ہے۔

---

[1] اس کا نام بیوبر مارٹن (1878-1965)

[2] Thou (کُم) **Buber Martin: I and Thou (1950)**

یورپ کے سائنٹسٹ ہوں یا اہلِ تصوف' ان دونوں کی دنیا میں ''میں'' کا اپنا الگ وجود کہیں باقی نہیں رہتا

عزیزانِ من! یہاں پھر ایک بڑی چیز آ گئی۔ کہا ہے کہ **اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی** (53:42)۔ یورپ کے سائنٹسٹ نے غلطی کی جو کہا کہ یہ حیوان ہی ہے' موت سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ وہ ایک Extreme End (انتہائی کنارے) پہ چلا گیا۔ ہمارے ہاں کے تصوف نے غلطی یہ کی کہ اُس نے کہا کہ انسان کا منتہٰی یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو خدا کی ذات میں مدغم کر کے ختم ہو جائے۔ وہاں بھی وہ ختم ہو گیا اور ان کے ہاں یوں ختم ہو گیا۔ ''میں'' یہاں رہی' نہ ''میں'' وہاں رہی۔ قرآن نے ''فی ربک المنتھٰی '' نہیں کہا کہ تمہارا منتہا خدا کے اندر ہے بلکہ سمت دی ہے کہ **اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی** (53:42)۔ صفاتِ خداوندی اپنے اندر منعکس کرتے چلے جایئے۔ خدا کے اندر جا کے جذب ہو جانا یا فنا ہو جانا غیر قرآنی تصور ہے' وحدتِ وجود کا تصور تھا' یہودیوں کا تصور تھا' عیسائیوں کا تصور تھا' ہندوؤں کا تصور تھا' ویدانت کا تصور تھا۔ قرآن کا یہ تصور نہیں ہے۔ قرآن کا منتہٰی یہ ہے کہ

بخود محکم گذر اندر حضورش
مشو ناپید اندر بحرِ نورش

منزلِ مومن

خدا کے سامنے کھڑا ہو کر بھی تُو اپنے آپ کو ''میں'' کہے تو یہ ہے تیری منزل لیکن اُس کی صفات اپنے اندر پیدا کرتا چلا جا کیونکہ اُس نے اپنی ایک روح کا شمہ تمہیں دیا ہوا ہے۔

عزیزانِ من! اب یہاں سے مغرب اور اسلام یا قرآن دو مختلف راستوں پر جا پڑے۔ یہاں گاڑی نے یہ وہ کانٹا بدلا کہ یہ اور رخ پہ جا پڑے' اس کی سمت دوسری متعین ہو گئی۔ یہ جو سمت ہے اس میں انسانیت کو اپنی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے لیے کیا کرنا ہو گا' کن منزلوں میں سے گزرنا ہو گا؟ یہ سارا کچھ ہے جو قرآن دیتا ہے' اسی کا نام الدین ہے' اسی کو الاسلام کہتے ہیں۔ اس حصے کو ہم آئندہ درس پر چھوڑ دیتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

تیسرا باب: سورۃ السجدۃ (آیات 10 تا 13)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج نومبر **1979**ء کی **30** تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ السجدۃ کی آیت **10** سے ہو رہا ہے:

(32:10)۔

تجدیدِ یادداشت

موضوع میں تسلسل ہے۔ تجدیدِ یادداشت کے لیے دو ایک اشاروں میں یہ عرض کر دوں کہ پچھلی آیات میں قرآنِ کریم نے ایک تو یہ کہا تھا کہ جو کچھ تمہیں کائنات میں انسانوں سمیت نظر آتا ہے' یہ ایسا نہیں تھا کہ اسی شکل میں پہلے دن سے یہ وجود میں آ گیا تھا بلکہ اس کی ابتدا بڑے پست تریں نقطے سے ہوئی تھی۔ ہر شے اپنی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے موجودہ شکل میں پہنچی اور یہی صورت انسان کی ہے۔ اگلی بات میں نے یہ عرض کی تھی کہ یورپ کے سائنسدان بھی اور مفکرین بھی اس ارتقا میں یہاں تک پہنچے بلکہ اس دور میں تو اس کی ابتدا ہی انہوں نے کی۔ ان کی ایک بنیادی غلطی ہو گئی۔ اُنہوں نے یہ سمجھا کہ جس طرح سے باقی حیوانات اور باقی اشیائے کائنات میں ہے مثلاً حیوانات کہ ان کی زندگی طبعی زندگی ہے' وہ **Physical Laws** (طبعی قوانین) کے تابع زندہ رہتے ہیں اور انہی **Laws** (قوانین) کے مطابق ان کے جسم کی طبعی مشینری چلنے سے جب بند ہو جاتی ہے تو زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ انسان کے متعلق بھی انہوں

نے یہی سمجھا کہ اس طبعی کائنات میں طبعی زندگی ہے یہ Physical Laws (طبعی قوانین) کے تابع زندہ رہتا ہے اور آخر میں انہی Laws (قوانین) کے تابع اس کی موت واقع ہو جائے گی اور جب موت واقع ہو جائے گی تو انسان کا خاتمہ ہو جائے گا۔

میں نے عرض کیا تھا کہ اس نظریۂ زندگی کے ماتحت وہاں جو تباہیاں آرہی ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ زندگی کا اس سے آگے کوئی بلند مقصد نہ ہو اور زندگی Physical Laws (طبعی قوانین) کے تابع چلے' حیوانوں کے مقابلے میں انسانوں میں بے انتہا قوت آئے اور مقصدِ حیات وہی حیوانی زندگی کا ہو تو پھر جو کچھ ہو سکتا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ قرآن نے یہ کہا کہ یہاں پہنچ کر یہ تمہاری غلط نگہی ہے جو تم سمجھتے ہو۔ انسان ان Physical Laws (طبعی قوانین) کے مطابق تو وہی ہے جو حیوانی زندگی میں ہے لیکن یہ جب وہاں سے آگے بڑھا ہے تو اس ارتقا کے نظریئے میں ایک تبدیلی واقع ہوئی ہے' اس میں ایک اور چیز بھی ہے جو طبعی زندگی کے قوانین کے تابع نہ وجود میں آئی ہے اور نہ ان کے ماتحت سرگرمِ عمل ہے اور انسان کی طبعی موت کے ساتھ وہ مرتی بھی نہیں ہے۔ درحقیقت انسان اُس چیز کا نام ہے' اس چیز کے لیے قرآن نے ''نفس'' کا لفظ استعمال کیا ہے' جسے آپ روحِ خداوندی کہتے ہیں' اقبالؒ (1877-1938) خودی کہہ کر پکارتا ہے' اسے پرسنلیٹی (Personality) کہتے ہیں' انسانی ذات کہتے ہیں۔ اسے کچھ بھی کہہ لیجیے' نام کچھ بھی رکھیے' حقیقت یہ ہے کہ انسان کی اصل زندگی اُس چیز کا نام ہے اور اس کا طبعی جسم' اُس چیز کی نشو ونما' پرورش' تزکیہ' اُسے آگے بڑھنے کے لیے ذریعہ کا کام دیتا ہے۔ یہ جو اس کا ذریعہ ہے یہ موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ جیسے آپ سفر کرنے کے بعد ٹکٹ گیٹ پہ کھڑے ہوئے کلکٹر کو دیدیتے ہیں اور آپ باہر آجاتے ہیں۔

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ یہ ذریعہ تو ختم ہو جاتا ہے اور جو اصلِ حیات ہے' جسے آپ خودی یا ذات کہتے ہیں' وہ آگے چلتی ہے۔ یہ ہے فرق۔ یہ جو فرق تھا اس کو نمایاں طور پر ہمارے دور میں اقبالؒ (1877-1938AD) نے پیش کیا ہے' اُس کی ساری عمر اسی پیغام میں صرف ہوئی ہے۔ جہاں بھی آپ دیکھیں گے کہ وہ فرنگ پہ تنقید کرتا ہے' تہذیبِ مغرب کی تنقیص کرتا ہے' ہمیں تنذیر دیتا ہے کہ یاد رکھیے گا! اُس تصور میں الجھ کر نہ رہ جانا' اسلام یا قرآن دوسرا تصورِ حیات پیش کرتا ہے۔ اقبالؒ (1877-1938AD) کا جو فلسفۂ خودی ہے وہ یہی بات ہے۔ وہ مسلمان سے یہ کہتا ہے کہ تم اس تصور میں' اس فریب میں نہ آجانا جو فرنگ کی تہذیب نے پیدا کیا ہے کہ انسان سوائے اس آب و گل کے اور کچھ نہیں اور کاروانِ زندگی بے منزل ہے۔ یہ تصور غلط ہے' یہ اسلامی نہیں ہے' یہ قرآن کے خلاف ہے۔ اسی کو سیکولر

(Secular) کہتے ہیں۔ اسلام کا یا قرآن کا تصور یہ ہے کہ زندگی اس زندگی سے آگے چلتی ہے اور اصل میں زندگی تو اسی کا ہی نام ہے۔ یہ یہاں تک تو آپ سمجھیں گے کہ یہ بحث کچھ علمی سی' نظری سی' Theoretical سی' Academic سی ہو رہی ہے۔ یہ بنیادی نقطہ ہے۔ اس دنیا کا نظم و نسق' نظامِ حیات' اقوامِ عالم' تمدنِ انسانیت' ان سب کا' دار و مدار اس تصور کے فرق پر ہے۔ تصور اگر وہی ہے جو مغرب کا ہے تو یہ دنیا جہنم بنی رہے گی اور جہنم کی آگ کے شعلوں میں تیزی ہوتی چلی جائے گی۔ اگر تصور یہ آئے گا کہ جو قرآن نے دیا ہے تو میں آگے چل کر عرض کروں گا کہ یہ دنیا یہیں سے جنت بن جائے گی۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ زندگی تو حقیقت میں وہ ہے جو آنے والی ہے۔ ویسے تو سارے قرآن میں حیات بالآخرت' ایمان بالآخرت اسی کا ہی نام ہے۔ ایک آیت میں ان دونوں زندگیوں کے متعلق قرآن نے اس انداز سے فرق کیا ہے کہ انسان جھوم جھوم جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے من جانب اللہ ہونے کا ثبوت اس کی تعلیم اور اس کے حقائق ہیں

جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ میرے نزدیک قرآن کا جو منزل من اللہ یا انسانی فکر سے ماورا سرچشمے سے آنا ہے' وہ اس کی معنویت اور اس کی تعلیم اور اس کے حقائق ہیں لیکن جہاں تک اس کے اسلوبِ بیان' اس کے الفاظ' کا تعلق ہے وہ بھی کچھ کم معجزہ نہیں ہے۔ عربی زبان کی وسعت اور قرآن کا انتخاب تو میں آپ کو بار بار بتاتا ہوں۔ کہا کہ **وَ مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ (29:64)** یہ جو قریبی زندگی ہے' یہ جو ہمارے سامنے کی زندگی ہے' یہ تو عارضی دلچسپیاں ہیں' اس کی کوئی مستقل Value (قدر و منزلت) نہیں ہے' یہ ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ آگے کہا کہ **وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (29:64)** اصلِ زندگی جو ہے وہ تو اس کے بعد شروع ہوتی ہے۔ **الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ (29:64)** یہاں لفظِ حیات ہے اور اس کو آخرت کے لیے کہا ہے کہ یہ **لَهِيَ الْحَيَوَانُ (29:64)** مادہ دونوں کے لیے ایک ہی ہے۔ وہاں پہلے **حیٰوۃ** کہا ہے یہاں **حیوان** کہا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا میں نے بتایا تھا کہ عربی زبان میں باب ہوتے ہیں جسے عام طور پہ وزن کہا جاتا ہے۔ یہ عجیب و غریب زبان ہے۔ یہ عرب بالکل اَن پڑھ لوگ تھے' پتہ نہیں یہ کہاں سے یہ باتیں لے آئے تھے۔ وزن ان کے ہاں یہ ہوتا ہے مثلاً ''**فَعِيْلٌ**'' کے وزن پہ ''رحیم'' آتا ہے۔ ہر باب کے وزن کے بدلنے سے بنیادی معنی وہی رہتے ہیں لیکن ان معنوں کے اندر تخصیص ہو جاتی ہے' وسعت ہو جاتی ہے' استثنیٰ ہو جاتا ہے اور وہ کچھ کا کچھ بن جاتا ہے۔ **حیٰوۃ** عام وزن کے اوپر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس میں حرکت ہو نمود ہو۔ انہوں نے سانپ کو دیکھا کہ اُس کو یوں کیجیے تو زندہ سانپ اس طرح سے پڑتا ہے تو اُس سانپ کو حیۃ کہتے تھے' وہاں سے انہوں نے حیٰوۃ کا لفظ لیا۔ میری بیٹیو! حیا کا لفظ بھی یہیں سے ہی

ہے۔توحیٰوۃ تو یہ ہوگئی۔اب ''باب'' بدلا تو حیوان **''فَعَلان''** کے ''وزن'' پہ ہے۔ یہ جو **فَعِیْلٌ** کا وزن ہے اُس میں یہ چیز ارتقائی طور پر آتی ہے اُسی طرح درجہ بہ درجہ تسلسل سے' قاعدے قانون کے مطابق کہ جو پیچھے سے چلا آرہا ہے' جو چیز اُس کے مطابق ہوگی وہ **''فَعِیْلٌ''** کے وزن کے اوپر آتی چلی جائے گی۔اور اگر کہیں کسی جگہ کسی شے کے اس ارتقا کے اندر **Emergence** (فجائیت) ہوگی کہ اُس کڑیوں کو توڑ کر اُس کے خلاف کوئی یکا یک نمودار ہو جائے تو یہ ''فعلان'' کے وزن پہ ہوگا۔ یہ آج کی جو **Evolution** (ارتقا) کی تھیوری والے مغرب والے ہیں انہوں نے خود یہ چیز کہی ہے کہ **Evolution** (ارتقا) کی جو کڑیاں ہیں وہ کڑی در کڑی چلی آتی ہے لیکن درمیان میں آ کے کہیں ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شے ایسی نمودار ہو جاتی ہے جو پچھلی کڑیوں کی پیدا کردہ نہیں ہوتی' ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کیسے ہو جاتی ہے اس کا نام **Emergent Evolution** (فجائی ارتقا) رکھا ہے اور اس پہ بڑا **Work** (کام) ہو رہا ہے کہ معلوم کیا جائے کہ یہ کیسے ہوتا ہے۔ ابھی تک یہ طے نہیں پایا کہ یہ کیسے ہوتا ہے۔تو ایک تو **Progressive Evolution** (درجہ بہ درجہ ارتقا) ہے کہ جو درجہ بہ درجہ چلی آرہی ہو اور اُس میں کسی مقام پر **Emergent Evolution** (فجائی ارتقا) آتی ہے کہ جو یکلخت نمود میں آجاتی ہے۔ یورپ کے یہ سائنٹسٹ اس مقام پہ پہنچے ہیں۔ یہ **Progressive Evolution** (فجائی ارتقا) اور **Emergent Evolution** (بتدریج ارتقا) ان کے ہاں دونوں الگ الگ سائنسز ہوگئی ہیں:

اگر یہاں کی زندگی' زندگی ہے تو اس کے بعد کی زندگی' زندگی کی زندگی ہے

عزیزانِ من! یہ جو ''فعلان'' کا وزن ہے کہ کوئی چیز جو ایمرجنسی کے طور پر' ہنگامی طور پہ' نمودار ہو جائے اور پچھلی کڑیوں کا لازمی اور **Physical** (طبعی) نتیجہ نہ ہو بلکہ اُس کے خلاف کوئی چیز یونہی نمودار ہو جائے تو وہ الفاظ ''فعلان'' کے وزن پر آئیں گے۔ **حیــــوان ''فعلان''** کے وزن کے اوپر ہے۔ یعنی یہ **اَلْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ** تو Physical Laws (طبعی قوانین) کے تابع چلی آتی ہے' اس کے بعد ایک زندگی شروع ہوتی ہے جو Emergent Evolution (فجائی ارتقا) کے تابع آئے گی اور وہ ہے جو اصلِ حیات ہے۔ وہ فرانسیسی ڈاکٹر موریس بکائے ❶ جس کا میں ذکر کیا کرتا ہوں' اس کی کتاب ہے: "The Bible, The Qur'an & Science" (بائبل' قرآن اور

---

❶ **Dr, Maurice Bucaille (1911.1989) Bucaille, Maurice: The Bible, The Qur'an And Science, Islamic Book Service, Lahore, 1998.**

سائنس)۔ یہ مقام ہے جہاں آ کر وہ جھوم اٹھتا ہے کہ کیا زبان ہے' کیا کتاب ہے۔ وہی مادہ ہے محض اس کے ''باب یا وزن'' کے بدل دینے سے وہ اتنا بڑا مسئلہ حل کر کے رکھ دیتا ہے۔ کہتا ہے یہ تو حیات ہی ہے اور وہ جو اس کے بعد کی ہے کہ **اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (29:64)** وہ **Emergent Evolution** (فجائی ارتقا) سے ایک زندگی آتی ہے۔ اور وہ زندگی زندگی کہلانے کی مستحق ہے۔

قرآن نے کہا ہے کہ **لو کانوا یعلمون (29:64)** اگر تم علم کی بارگاہ سے پوچھو گے تو پھر یہ بات سمجھ میں آئے گی کیونکہ یہ کفر اور اسلام میں بنیادی فرق ہے' سیکولرازم میں اور قرآن میں بنیادی فرق ہے۔ اس لیے میں اس کو زیادہ وضاحت سے بیان کر رہا ہوں کہ بات ہماری سمجھ میں آئے کہ ان دونوں کے اندر یہ فرق ہے کیا؟ آگے چل کر میں عرض کرونگا کہ عملی زندگی پر اس کا کیا فرق پڑتا ہے۔ ابھی تو یہ دیکھیے کہ علمی دنیا کے اندر یہ چیز ہے جو قرآن نے چودہ سو سال پیشتر بیان کی ہے۔ آج ان کے ہاں سائنسی انکشافات' **Scientific Discoveries** ہوئی ہیں کہ یہ کس طرح اُس کے مطابق ہوتا چلا آ رہا ہے۔

قرآن کے حقائق کو سمجھانے کے لیے اقبال کا اسلوب

ہمارے ہاں اقبالؒ **(1877-1938)** نے اس چیز کو اپنی شاعری میں اپنے پیغام کا موضوع بنایا۔ اصل میں اسلام اور کفر میں یہی مابہ الامتیاز ایک چیز ہے' اسی کو موضوع بنانا چاہیے تھا۔

میں یہاں اتنا عرض کر دوں کہ میں جو اکثر و بیشتر قرآن کی آیات کی وضاحت میں اقبالؒ **(1877-1938)** کا شعر لے آیا کرتا ہوں تو اس میں شبہ نہیں کہ اقبالؒ کی فکر سے میں نے بھی اپنے ہاں کی جو بھی بصیرت حاصل کی وہ اس سے متمیّز ہے۔ اس لیے کہ ہمارے دور میں اگر نگاہ پیچھے تک دوڑائیں تو صدیوں تک بھی' جیسی گہری نگاہ قرآن پہ ان کی تھی' وہ بہت کم کہیں اور ملے گی۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ وہ جو کچھ قرآن سے سمجھا' اُس کو آگے سمجھانے کا اسلوب ان کو فطرت نے عطا کیا تھا اُس کی مثال نہیں ملتی۔ شاعری کو انہوں نے ان حقائق کی وضاحت کے لیے اختیار کیا تھا کہ ایک تو ہمارا مشرق والوں کا مزاج کچھ واقعی شاعرانہ ہوا ہے' شاعری سے بات میں دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ دوسری چیز یہ تھی کہ جو **Abstrat Truth** (بسیط حقائق) ہوتے ہیں' جو غیر محسوس حقائق ہوتے ہیں مثلاً نظریۂ ارتقا تو اب یہ ایک بہت بڑا **Truth** (حقیقت) ہے لیکن محسوس طور پہ بات سمجھ میں نہیں آتی لہٰذا ان چیزوں کو تشبیہات کے ذریعے سمجھایا جاتا ہے اور تشبیہ

محسوسات کے ذریعے دی جاتی ہے۔ تو جیسی جتنی برجستہ وہ تشبیہ ہوگی ویسا ہی عمدگی سے وہ حقیقت یا وہ **Truth** سمجھ میں آجائے گا۔ یہ انداز قرآن نے خود اختیار کیا ہے۔ سورۃ ال عمران کی پہلی آیتوں میں آپ دیکھیے' اُس نے کہا ہے کہ قرآن کی آیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے' ایک محکمات ہیں اور ایک متشابہات ہیں۔ محکمات تو قوانین ہیں' احکام ہیں۔ ان کو تو انہی الفاظ میں بیان کیا جانا چاہیے تھا' ہر لفظ کا وہی معنی جو حقیقت میں ہے لیکن حقائق کو اس طرح سے بیان نہیں کیا جاسکتا بلکہ حقائق کو تشبیہات کے ذریعے سمجھایا جاسکتا ہے۔ قرآن نے تو اس قسم کے حقائق کو بیان کیا ہے اور خود قرآن میں بھی تشبیہات کے ذریعے ان کو بیان کیا ہے۔

محکمات اور متشابہات کی اصلیت اور ان کی اہمیت

محسوس شے سے تشبیہ دیجاتی ہے تو بات جلدی سمجھ میں آتی ہے۔ اس زندگی میں ہمارا ذہن' ہماری فکر محدود فکر ہے' یہ محسوسات کی خوگر ہے اُسی سے زیادہ اچھی طرح بات سمجھ میں آتی ہے۔ اقبالؒ (1938-1877) نے قرآن کے ان حقائق کو تشبیہات کے ذریعے سے واضح کیا اور وہ تشبیہات اتنی خوبصورت ہوتی ہیں اور اتنی سہل الفہم ہوتی ہیں کہ وہ بات کرتا ہے تو کھٹ سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ مثلاً یہ بات کہ یہ زندگی بھی ضروری زندگی ہے لیکن اصلِ حیات اس کے بعد آکر شروع ہوتی ہے۔ اقبالؒ کے ہاں فرنگ' تہذیبِ مغرب یا خالی عقل اور اس کے مقابلے میں عشق' یہ جتنی چیزیں وہ کہتا ہے' وہ یہی بات سمجھانے کے لیے ہے کہ ان کا تصورِ حیات سیکولر (**Secular**) ہے' وہ صرف **Physical Life** (طبعی زندگی) پہ **Believe** (یقین) کرتے ہیں۔ قرآن کا تصورِ حیات اس سے آگے چلتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک یہ زندگی اُخروی زندگی کا دیباچہ ہے

قرآن اس زندگی کو بھی اہمیت دیتا ہے لیکن جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ ہمیں منزل تک پہنچنا ہوتا ہے تو گھوڑے کو طاقتور اور توانا رکھنا بڑا ضروری ہوتا ہے' وہ منزل تک پہنچانے کا ذریعہ ہے لیکن وہ مقصود بالذات نہیں ہے۔ قرآن نے بھی یہ کہا ہے کہ الحیٰوۃ الدنیا بھی ہے لیکن زندگی کہلانے کی مستحق وہی ہے جو اس کے بعد شروع ہونے والی زندگی ہے۔ اقبالؒ (1938-1877) کہتا ہے کہ

زمیں خاکِ درِ میخانہ ما
فلک یک گردشِ پیمانۂ ما

زمین محض ایک ذریعہ ہے' اصل مقصد تو مے خانہ ہے' مے خانے کی مٹی نہیں ہے۔ آپ اُس مے خانے میں جا کر مٹی کو نہیں چاٹتے۔

اسی طرح فلک ہمارے پیالے کی ایک گردش ہے' اصل مقصد نہیں ہے۔ کائنات ایک ذریعہ ہے' اصل مقصد نہیں ہے۔

حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است

جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

(اقبالؒ: پیامِ مشرق)

ہمارے سوز و ساز کی جو داستان ہے وہ بڑی دراز ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ یہ تو ہمارے افسانے کی کتاب کا دیباچہ ہے' یہ تو Preface ہے۔ اب آپ نے دیکھا کہ بات کیسے سمجھ میں آئی۔ سمجھ میں بھی آئی اور دل سے واہ واہ بھی نکلی۔ سمجھ کے معنی یہ ہیں کہ بے ساختہ واہ واہ نکلے۔

جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

کتاب کا مضمون سمجھنے کے لیے دیباچہ بھی بڑا ضروری ہوتا ہے لیکن اگر کوئی صرف دیباچہ پڑھ کر رکھ دے اور آگے چلے ہی نہیں تو اُس نے کتاب کو خاک پڑھنا ہے۔ وہ تو اصلِ کتاب کو سمجھنے کے لیے ایک پہلی اسٹیج ہوتی ہے:

جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ اقبالؒ (1877-1938) کی ساری عمر اسی چیز میں گزری ہے' ان کا سارا پیغام اس پہ ہے۔ اس کے اوپر تو کتابوں کی کتابیں لکھی جائیں۔ بہرحال میں نے یہی انداز اختیار کیا ہے۔ میری کتابوں میں آپ دیکھیں گے کہ وہاں کہیں کوئی قرآن کی بیان کردہ مشکل **Abstract truth** (غیر محسوس صداقت) کوئی حقیقت آتی ہے تو وہاں اقبالؒ کا کوئی شعر' کوئی قطعہ میری مشکل کو حل کر دیتا ہے اور زبان سے واہ واہ نکلتی ہے۔ یہی چیز ہے جس کو وہ کہتا ہے کہ

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن

قدم اٹھاؤ! یہ مقام انتہائے راہ نہیں

(اقبالؒ: ضربِ کلیم)

راستہ تو یہ بھی ہے' اسی سے ہی جانا ہے۔ اب دیکھا کہ انتہائے راہ کہہ کر کیا بات کر دی! یہ جو یہاں موت واقع ہوتی ہے اس موت

کے بعد ہوتا کیا ہے؟ ایک تشبیہ اور سن لیجیے:

بگوشم آمد از گردوں دمِ مرگ

موت کے وقت میرے کان میں آسمان سے ایک آواز آئی۔ یہ موت جو ہے بظاہر خاتمہ نظر آتا ہے

شگوفہ چوں فرو ریزد برے ہست

درخت کا شگوفہ گر پڑتا ہے تو اس کے پیچھے پھل ہوتا ہے۔ اس شاخ کو رونا نہیں چاہیے کہ تیرا شگوفہ گر گیا ہے کیونکہ اس کے گرنے کے بعد تو اس پہ پھل آتا ہے۔ زندگی کو شجرِ حیات کا شگوفہ کہا اور اصلِ حیات کو شگوفہ گرنے کے بعد پھل کہا۔ شگوفہ گرے نہیں تو پھل ہی نہیں آتا' اُس کے گرنے سے ہی پھل ہوتا ہے۔ اور گرنے سے نقصان نہیں ہوتا۔ اگلی منزل شگوفے سے آگے ہوتی ہے لیکن شگوفے کے بغیر پھل نہیں آسکتا اور اس کے گرنے سے پہلے نہیں آسکتا اور اس کے گرنے سے ماتم شروع نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ تو اس چیز کی علامت ہے کہ پھل نکلا ہے۔

نہ تُو زمیں کے لیے ہے' نہ آسماں کے لیے

جہاں ہے تیرے لیے' تُو نہیں جہاں کے لیے

خودی کی' ذات کی' نشو ونما کے لیے انسان کا یہ جسم ایک ذریعہ ہے۔

انسانی جسم اور انسانی ذات کی پرورش اور نشو ونما کے الگ الگ پیمانے ہیں

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن

نہ سیرِ گُل کے لیے ہے نہ آشیاں کے لیے

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

اب یہاں اقبالؒ (1938-1877) نے کہا ہے کہ ''مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن''۔ **Physical Laws** (طبعی قوانین) کے تابع، طبعی نظریۂ ارتقا کے ماتحت جسم کی ہی نشو ونما ہوتی ہے' **Physical** (طبعی) غذاؤں کے ذریعے سے جسم کی پرورش ہوتی ہے لیکن یہ جو دوسری شے ہے جسے خودی کہا گیا ہے' قرآن کہتا ہے کہ اس کی پرورش اقدار یا **Values** کے ذریعے ہوتی ہے۔ اب یہ اقدار یا

Values کیا چیز ہے۔ دین جب مذہب میں بدلتا ہے تو الفاظ وہی ہوتے ہیں لیکن ان الفاظ کی حقیقت بدل جاتی ہے۔ یہ ہماری اگلی نسل نے تو دیکھا ہی نہیں ہوگا کہ گھی کسے کہتے ہیں۔ بہرحال ہماری زندگی تو اُس گھی کھانے میں ہی گزری ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ اسے گھی کہتے تھے' آہستہ آہستہ اُس کے بعد کچھ اور بننا شروع ہوا' پہلے تو وہ بناس پتی کہلایا' بناس پتی ہندی میں Vegetable (سبزی ترکاری) کا ترجمہ ہے۔ یہ Vegetable (سبزی ترکاری، نبات) سے کوئی چیز بنی۔ اب اس Vegetable کے ساتھ انہوں نے Vegetable (سبزی ترکاری، نبات) گھی کا لفظ استعمال کرلیا۔ اب گھی وہ بن گیا۔

خدا کا دین مذہب میں کچھ اس طرح بدلا جس طرح بناس پتی یا ڈالڈا کو گھی کی شکل میں بدلا ہے

اب یہاں سے حق و باطل کی آمیزش شروع ہوئی۔ وہ Vegetable (سبزی ترکاری، نبات) سے جو بنتا تھا وہ گھی نہیں تھا' گھی ہمارے ہاں ایک اور چیز تھی' وہ فطرت کی دی ہوئی ایک چیز تھی' وہ گائے بھینس کے دودھ میں ملی ہوئی ایک روغنیت ہوتی تھی' وہ مکھن ہوتا تھا اور مکھن کو گرم کرتے تھے اور اس میں سے ایک شے نکلتی تھی' اس کا نام گھی تھا۔ پہلے تو یہ Vegetable (گھی) ہی شروع ہوا' اب اُس کے ساتھ اُس کی آمیزش شروع ہوئی۔ یعنی پہلے تو یہ مذہب تھا اور اب آمیزش شروع ہوئی تو صلوٰۃ کو نماز کہنا شروع کیا۔ اُس وقت تک بھی جو ڈالڈا (گھی) تھا وہ کچھ پست درجے کی چیز تھی' بازار میں کوئی لینے بھی جاتا تھا تو ایسے ڈھانپ کر چوری چوری لاتا تھا جیسے اسمگل کیا ہوا ہو' کسی کو پتہ نہ چلے کہ ڈالڈا (گھی) آیا ہے۔ بچوں کو تاکید کی جاتی تھی کہ بیٹا! باہر کسی کو نہ بتانا کہ ابا ڈالڈا (گھی) لائے ہیں۔ آہستہ آہستہ انہوں نے پھر یہ کہا کہ صاحب! یہ ڈالڈا یا بناسپتی ہے۔ اس کے بعد جس سے شرم آتی ہے یہ بیچ سے ہی نکل گیا اور اس کا نام ہی گھی ہوگیا۔ اب یہ گھی ملز کہلاتی ہیں' یہ خالص ڈالڈا آپ کے ہاں گھی کہلاتا ہے جس کے لانے سے آپ کو شرم آتی تھی۔ اور اب وہ ڈالڈا گھی ہی ہوگیا بلکہ گھی ہوگیا اور اب بناسپتی بھی اس کو کوئی نہیں کہتا' سب گھی ہی کہتے ہیں۔ اب یہ گھی ہوگیا ہے۔

اب آپ سوچیے دین اور مذہب میں فرق۔ اگر کتاب میں کسی نے لکھا ہوا ہو کہ جو گھی ہے وہ انسان کو بڑی توانائی دیتا ہے' تندرستی دیتا ہے' صحت دیتا ہے' اُس کے یہ یہ خواص ہیں' یہ یہ خوبیاں ہیں اور گھی ہو یہ جو ڈبے سے نکلتا ہے' اس کے کھانے سے تو انسان کو الٹا تپ دق ہو جاتی ہے۔ اب یہ جو کتاب کا پڑھنے والا ہوگا وہ یا تو کہے گا کہ یہ کتاب میں غلط لکھا ہے کیونکہ ہم نے تو گھی کو کھا کر دیکھا ہے۔ ہزار سمجھایئے کہ بابا! یہ گھی نہیں ہے۔ وہ کہے گا کہ صاحب! دیکھیے ڈبے کے اوپر گھی لکھا ہوا ہے اور ہم بازار سے گھی کہہ کر لاتے ہیں اور اماں ہمیں پکا کر

بھی دیتی ہے۔ عزیزانِ من! دین اس طرح سے مذہب بن جاتا ہے کہ جو کچھ قرآن میں دین کے متعلق لکھا ہوا تھا وہ موجودہ مذہب کے متعلق ہم چسپاں کرتے ہیں تو وہ اس پہ فٹ ان نہیں ہوتا۔ یہ گھی نہیں ہے یہ بناس پتی ہے۔ خالص گھی جو ہے وہ واقعی جسم میں توانائی دیتا ہے' گھی حلال کی کمائی سے خرید کر لائیے یا چوری کا گھی لائیے تو گھی کے خواص وہی ہوتے ہیں۔ طبعی طور پہ دونوں کے خواص واثرات ایک ہی ہوتے ہیں۔

اگر انسانی صحت کے لیے غیر متبدل طبعی قوانین ہیں تو انسانی ذات کے لیے بھی غیر متبدل اقدار ہیں

آپ نے غور فرمایا کہ جہاں تک Physical Laws (طبعی قوانین) کا تعلق ہے وہ اس میں فرق نہیں کرتا کہ آپ گھی اپنے پیسے سے خرید کر لائے ہیں یا چوری کر کے لائے ہیں۔ یہ اپنے پیسے کا گھی اور چوری کے گھی کا فرق جو پڑتا ہے وہ انسان کی ذات اور خودی پہ پڑتا ہے' جسم پہ نہیں پڑتا۔ قانون یہ ہے کہ جس طرح سے خالص گھی جسم کو توانائی اور صحت دیتا ہے' یہ اپنی کمائی سے لایا ہوا گھی بھی اسی طرح انسانی ذات کو توانائی بخشتا ہے۔ اسے Value کہتے ہیں۔ یعنی اپنی کمائی سے جو خریدنا ہے یہ Physical Laws (طبعی قوانین) کی بات نہیں' یہ طبعی ترازو میں نہیں تولا جاسکتا کہ اس میں اور اس میں کیا فرق ہے۔ میں عام الفاظ میں سمجھا رہا ہوں ورنہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ''اقدار'' کیا ہیں۔ گھی کا خالص ہونا Physical Law (طبعی قانون) ہے' جسم کو توانائی بخشتا ہے' کسی طریقے سے گھی کو لائیے اس کے اثرات وخواص وہی ہونگے۔ لیکن Value یہ ہے کہ اگر گھی چوری کا یا دوسرے کے استحصال سے یا دوسرے کی محنت کی کمائی کے نچوڑ سے آپ لے آئیں گے تو جسم کی پرورش تو ہو جائے گی لیکن آپ کی جو ذات ہے اُس میں اضمحلال اور کمزوری واقع ہو جائے گی۔ اور اگر یہی گھی آپ اپنی کمائی کا' اپنی محنت کا' دوسرے کی محنت کا استحصال کیے بغیر' لے کر کھائیں گے تو جسم کی پرورش بھی صحیح ہو جائے گی اور انسان کی ذات کی پرورش بھی صحیح ہو جائے گی۔ یہ جو چیز ہے' اسے اقدار کہتے ہیں' یہ Laws (قوانین) ہوتے ہیں اور یہ وحی کے ذریعے سے ملتے ہیں' منزل من اللہ ہوتے ہیں' ان کا سرچشمہ ذاتِ خداوندی کا علم ہوتا ہے۔ Physical Laws (طبعی قوانین) تو اس کائنات کے اندر' ہمیں مل جاتے ہیں' Scientific Discovery (سائنسی انکشاف) سے ان کو معلوم کیا جاسکتا ہے لیکن یہ جو Values (اقدار) ہیں' یہ وحی کے ذریعے ہی ملتی ہیں۔ Values (اقدار) عام قوانین کے ذریعے سے بھی پیدا نہیں کی جاسکتیں' نہ ان کا Injection کسی کے اندر کیا جاسکتا ہے۔

انسانی ذات کی نشو ونما کا تمام تر انحصار قرآنی اقدار پر منحصر ہے

آپ یہ چیز تو قانون کے ذریعے سے کر سکتے ہیں کہ کسی دوسرے کی چوری نہ کریں لیکن آپ قانون کے ذریعے سے کسی کو اس پہ آمادہ نہیں کر سکتے کہ آپ کسی محتاج کی بھی مدد کریں۔ اس کا تعلق Values (اقدار) سے ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ اس دنیا میں جو زندگی ہے اُس زندگی کے معنی یہ ہیں کہ صحت کے لیے گھی کا خالص ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ تو مومن اور کافر دونوں کے لیے یکساں ہے ''سردار جسونت سنگھ پہلوان گھیو کھائے گا تے تاں وی' جے ساڈا بھولو کھائے گا تے تاں وی او گھیو دواں اچ اکو ای اثر کرے گا[1]''۔ لیکن جو چوری کا کھائے گا اور جو اپنی محنت کا کھائے گا اس کا اثر اس کے آگے جا کر ہوگا۔ اس دنیا کی زندگی یہ ہے کہ یہ جتنے طبعی قوانین' زندگی کی پرورش وآسائش کے لیے ضروری ہیں تو وہ سامان بھی اس کے لیے ضروری ہے وہ بھی ہونا چاہیے لیکن جو اقدار ہیں جو آپ کو وحی کے ذریعے ملی ہیں' قرآن کے اندر ہیں' ان اقدار کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں' وہ ساتھ رکھیں۔ گھی خالص تلاش کریں' یہ صحت کے لیے بڑی ضروری چیز ہے لیکن اپنی کمائی کا لائیں کیونکہ یہ بات انسان کی خودی کی پرورش کے لیے بڑی ضروری ہے اور ذات نے ہی آگے چلنا ہے۔

اب بات یہ ہوگئی کہ یہ جو Present (موجودہ زمانہ) ہے' جو سامنے ہے' اسے عربی زبان میں ''الدنیا'' کہتے ہیں۔ یہ بھی بڑا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم میں دعا ہے کہ **رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً** (2:201)۔ پہلی دعا یہ سکھائی گئی ہے لیکن بات یہیں ختم نہیں کی گئی۔ اگلی چیز جسے آپ Future (آنے والا وقت) کہتے ہیں اسے عربی میں آخرت کہتے ہیں۔ طبعی موت کے بعد جو زندگی آگے چلتی ہے' وہ ہے جسے Future (آنے والا وقت) کہتے ہیں۔ اُس زندگی کی جو پرورش ہے' اُس کی جو نشو ونما ہے' اُس زندگی کے جو حسنات ہیں' وہ ہیں **وبِالْاٰخِرَةِ حَسَنَةً** (2:201)۔ وہ آپ کے ہاں اقدار کے ذریعے سے ہوگی۔ اب یہ ہوا اسلام یعنی اس دنیا کے طبعی ذرائع' سامان کو نہایت خالص عمدگی کے طریقے سے حاصل کرنا اور اس کے حاصل کرنے میں اور اس کے استعمال کرنے میں اقدار کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ اب آپ کو معلوم ہے کہ مغربی تہذیب اور مغربی نظریۂ حیات کے تابع اقدار نہیں آتیں۔ اس لیے ان کا ذریعہ یہ ہے My Country, right or wrong [2]' رائٹ آر رانگ (صحیح یا غلط) کا تصور اقدار سے ہے۔ My Country فزیکل چیز ہے۔ مجھے

---

[1] اگر پہلوان سردار جسونت سنگھ کھائے گا تو بھی اور اگر ہمارا بھولو پہلوان کھائے گا تو بھی وہ گھی دونوں میں ایک ہی اثر مرتب کرے گا۔

[2] میرا ملک' میری مملکت' صحیح یا غلط' جو بھی ہے بہر حال یہ ''میری'' ہے۔

اپنی مملکت کی، مجھے اپنی قوم کی فکر کرنی چاہیے، مجھے اپنی ذات کی فکر کرنی چاہیے، مجھے اپنی کرسی کی فکر کرنی چاہیے تو یہ ساری فزیکل لائف (طبعی زندگی) ہے۔ اس کی پرواہ نہیں ہے کہ وہ کس طرح سے حاصل ہو اور کیسے حاصل ہو۔ اس چیز کا تعلق اقدار سے ہے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ بات جو پہلے بالکل نظری سی نظر آتی تھی محض Academic سی نظر آتی تھی اس کا زندگی کے اوپر اور دنیا کے نظام پہ کتنا بنیادی اثر پڑتا ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ اس دنیا میں اس انداز سے رہے، یہ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن اقدار ہر وقت انسان کے سامنے رہیں۔ یہ ہوئی مومن کی زندگی۔

ذات کی نشو ونما کے لیے قرآنی اقدار کی کہانی اقبالؒ کی زبانی

اِسے اقبالؒ ایسے سمجھاتا ہے:

ماننِد سحر صحنِ گلستاں میں قدم رکھ

رات کی تاریکیوں کے بعد وہ نمودِ سحر، وہ کہکشانی روشنی، وہ ایک مرمریں سا غبار، اس سے ہر چیز میں زندگی کی نمود ہو جاتی ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ اس دنیا کے اندر کیسے زندگی بسر کر:

ماننِد سحر صحنِ گلستاں میں قدم رکھ
آئے تہِ پا گوہرِ شبنم تو نہ ٹوٹے
ہو کوہ و بیاباں سے ہم آغوش، و لیکن
ہاتھوں سے ترے دامنِ افلاک نہ چھوٹے!

(اقبالؒ: ضربِ کلیم)

سحر کے ہاتھوں سے دامنِ افلاک چھوٹ ہی نہیں سکتا، اس کی نورانیت کا منبع اور مرکز تو وہی افلاک ہوتا ہے، وہ وہاں کا سورج ہوتا ہے وہ وہاں کی روشنی ہوتی ہے۔ اگر اُس سے اپنا تعلق منقطع کر لے تو سحر کی نورانیت باقی نہیں رہتی۔ سحر آتی اس طرح سے ہے کہ گوہرِ شبنم اس کے آنے سے ٹوٹتا ہی نہیں ہے:

ہو کوہ و بیاباں سے ہم آغوش، و لیکن
ہاتھوں سے ترے دامنِ افلاک نہ چھوٹے!

یہ مومن کی زندگی ہے: ''ہو کوہ و بیاباں سے ہم آغوش''۔ یہاں تک دونوں برابر ہیں: یورپ کا **Materialist** یا جسے آپ مادہ پرست کہتے ہیں اور مردِ مسلمان۔ یہاں تک یہ دونوں ایک سے ہیں۔لیکن ''ہاتھوں سے ترے دامنِ افلاک نہ چھوٹے''۔ یہ اختصاص ہو گیا مردِ مومن کی زندگی گا۔

یورپ کی مادہ پرست سوچ اور مومن کے نزدیک تسخیرِ کائنات کی سوچ میں ایک بنیادی فرق ہے

عزیزانِ من! ''مانندِ سحر صحنِ گلستان میں قدم رکھ'' سحر کی تشبیہ میں ساری باتیں آ گئیں۔ یہ ہے عروج۔ اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسانی خودی کے اندر' انسانی ذات کی جو نشو و نما ہوتی ہے وہ ہے عروج جو قرآن کے لفظ میں **ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ** (32:5) ہے۔ اب آ گئے ہم اس کی طرف۔ میں نے کہا تھا کہ جو ''الیٰ'' ہے' وہ بڑا **Significant** ہے' اس کی بڑی اہمیت ہے' وہ ڈائریکشن (سمت) دیتا ہے کہ اب ارتقا کی **Direction** (سمت) کونسی ہوگی۔ طبعی زندگی کا جو ارتقا ہے اس کی ڈائریکشن (سمت) **Sound mind in sound body** (متوازن جسم میں متوازن دماغ) میں ہے۔ یورپ کے یہ مادہ پرست یہاں تک ہی گئے تھے۔ اس کے بعد ڈائریکشن (سمت) یعنی الیہ کے لیے قرآن نے کہا ہے کہ **اِنَّ اِلٰـى رَبِّکَ الْـمُـنْتَهٰـى** (53:42) تمہارا جو اب نصب العین ہے' تمہاری جو **Destination** ہے' وہ یہ ہے کہ تم نے اس زندگی کے بعد' اُس طرف آگے جانا ہے۔ یہ ہے **یعرج**۔ میں نے کہا تھا کہ یہاں لفظ عروج استعمال ہوا ہے اس میں بلندی کے معنی ہیں لیکن یہ وہ بلندی ہے' جس کی طرف بتدریج جایا جائے' جیسے سیڑھیاں چڑھتے ہیں۔ معراج کے کہتے ہی سیڑھی کو ہیں۔ کہا ہے کہ درجہ بدرجہ ارتقائی طور پر اوپر چڑھتے جاؤ **اِنَّ اِلٰى رَبِّکَ الْمُنْتَهٰى** (53:42) اُس طرف تمہارا رخ ہونا چاہیے۔ یہ ہے **اِنَّـا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ** [1] (2:156) یہ خدا بن جانا نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف جانا ہے۔ یہ بندۂ مولا صفات ہونا ہے' یہ صفاتِ خداوندی کا حدِ بشریت کے اندر اپنے ہاں منعکس کرتے جانا ہے۔ ان صفاتِ خداوندی کو اقدار کہتے ہیں۔ ''چھوٹا جیہا رب بن جانا''۔ یہ چیز وہ **Destinition** (منزل) ہے' وہ منبع ہے' وہ مرکز ہے جس کی طرف رخ کرنا' اوپر کی طرف جانا' اور پھر ابھرتے ہوئے چلے جانا ہے:

---

[1] ہمارا ہر قدم اسی کی طرف اٹھے گا (9:59)۔ وہی ہمارا مقصود و منتہیٰ ہے اور ہم ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کریں گے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص 57)۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

اجازت دیں تو ایک غزل کا شعر عرض کروں۔ ہمارے ہاں کے بعض غزل گو شاعر بھی بعض اوقات بڑی بڑی حقیقتیں بیان کر جاتے ہیں۔ مجھے وہ تشبیہ اس اعتبار سے پسند آئی کہ اُس میں عروج والی بات ہے اور اُس مرکز کی طرف جانے والی بات ہے۔ وہ مرکزِ حسن و زیبائی منزل ہے' اُس کی طرف عروج سے اوپر جانا ہے:

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن!
بھولتا ہی نہیں عالم تیری انگڑائی کا!

(عارف بٹالوی: تراش' اتحاد پریس' لاہور' ص۔ 371)

بات خالص غزل کی ہے لیکن اس کے اندر جو معنی پیدا کر گیا ہے وہ کسی کسی کا کام ہے۔

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن !
بھولتا ہی نہیں عالم تیری انگڑائی کا !

وہ تو انسانی خودی کی انگڑائیاں ہیں جو اس مرکز کی طرف مائلِ پرواز ہوتی ہیں۔

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تُو ہے

(اقبالؒ: بانگِ درا)

عزیزانِ من! اسے قرآنِ کریم کی ایک آیت کے اندر بیان کیا گیا ہے۔ عظیم آیت ہے اور کونسی آیت عظیم نہیں ہے۔

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

وہ تو حسنِ پیکر ہے، سر سے پاؤں تک حسن کا مجسمہ ہے۔ جہاں بھی جا کر نگاہ ٹکتی ہے، وہ کہتا ہے کہ تمہارے بجھ جانے کا یہی مقام ہے۔

کائنات کی وسعتیں لامحدود ہونے کے باوجود محدود ہیں

قرآن نے کہا ہے کہ **یَامَعۡشَرَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ اِنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ اَنۡ تَنۡفُذُوۡا مِنۡ اَقۡطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ فَانۡفُذُوۡا لَا تَنۡفُذُوۡنَ اِلَّا بِسُلۡطٰنٍ** (55:33)۔ قرآن ارض اور سما اس **Outer Universe** (خارجی کائنات) کے لیے استعمال کرتا ہے، اس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ علم الافلاک والوں سے پوچھیے۔ وہ کہتے ہیں کہ صاحب! ان کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے باوجود وہ کہتے ہیں کہ کائنات محدود ہے، اس کی آخری حد کا تصور نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ ہے محدود۔ اور محدود ہی نہیں وہ اسے **Expanding Universe** [1] کہتے ہیں کہ یہ بڑھتی ہوئی چلی جا رہی ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کی حدود کیا ہیں۔ قرآن اسے اقطار کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ **اَقۡطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ** (55:33) سے اگر تم آگے جانے کی استطاعت رکھتے ہو تو آگے بھی جا سکتے ہو لیکن **لَا تَنۡفُذُوۡنَ اِلَّا بِسُلۡطٰنٍ** (55:33) اس کے لیے خاص قوت کی ضرورت ہے اور وہ قوت تمہیں وحی خداوندی کی رو سے مل سکتی ہے۔ وہ فرانسیسی ڈاکٹر مورس بوکائے [2] **(Mourice Buccaille: 1911-1989)** جس کا میں ذکر کیا کرتا ہوں، ان آیتوں پہ آ کر وہ وجد میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ اپنے دور کے تمام سائنسدانوں اور مفکرین سے پکار کر کہتا ہے کہ خدا کے لیے بتاؤ کہ چودہ سو سال پیشتر یہ باتیں کونسا فکرِ انسانی کہہ سکتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اگر **اقطار** کے معنی حدود سے آگے کے نہ بھی لو لیکن یہ جو **Space** (خلا) کے **Conquerer** (تسخیر کرنے والے) ہیں، یہ عرب کی حدود سے اور ان کے ہاں کی **Atmosphere** (فضا) کی حدود سے تو یہ بھی آگے چلے جا رہے ہیں۔ اور یہ تو **اَقۡطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ** سے بھی آگے کی بات کہہ رہا ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ چیز **سلطٰن** یعنی ایک خاص قوت سے ہے۔ **سلطٰن مبین** قرآن ان اقدار کو کہتا ہے جو وہ وحی کے ذریعے دیتا ہے۔

---

[1] **Eddington, Sir, Arthurs: The Expanding Universe (1933)**
Eddington, Sir, Arthus S: The Expanding Universe, Cambridge University Press, 1946 (Total page 130)

[2] اس کی اس کتاب کا نام ہے: **The Bible, The Qur'an, And Science**

قرآنی زبان کی بلاغت کی ایک مثال

ڈاکٹر مورس بوکائے (1911-1989) سے کہا ہے کہ آگے جانے سے پہلے دو ایک چیزیں ضروری ہیں۔ کہا ہے کہ **ان استطعتم** (55:33)۔ اس میں بھی ایک شیرینی ہے جو میں بیان کیا کرتا ہوں۔ اس آیت میں ''**اِن** '' آیا ہے ''**اِن**'' حرفِ شرط ہے' جسے ہم ''اگر'' کہتے ہیں کہ اگر تم میں یہ استطاعت ہے کہ تم چلے جاؤ۔ انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ'' **If** '' ہوگا۔ عربی زبان میں جو حرف شرط ہیں وہ بہت سے ہیں' یہ ''**اِن**'' اکیلا ہی نہیں ہے۔ 'اگر یہ کرو' جب کہا جا رہا ہے' اگر وہ ممکن ہے تو اس کے لیے اور لفظ ہے اور اگر بین بین ہے کہ ہو بھی سکتا ہے' نہیں بھی ہو سکتا تو اور حرفِ شرط ہے اور اگر ناممکن ہے تو اور حرفِ شرط ہے۔ اوہ میرے اللہ! یہ قوم اور یہ زبان! ''**اِن**'' وہاں آتا ہے جو ان کے نزدیک بظاہر ناممکن ہو لیکن درحقیقت ہو سکتا ہے۔ یہاں **ان استطعتم** ہے۔

آگے نکلنے کے لیے لفظ نفذ کا استعمال کیوں؟

عزیزانِ من! قرآن یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ جو شرط کے حروف ہیں ان میں سے بھی یہ چن کے جو لایا ہے تو اس کے معنی ہیں **'It is possible**[1] اور نہ یہاں وہ حرف ''**لو**'' لاتا۔ اور ساتھ لفظ **نفذ** آیا ہے۔ عربی زبان میں 'آگے نکل جانے' کے لیے سینکڑوں الفاظ تھے۔ **نفذ** کے معنی ہیں کہ ''کسی چیز میں چھید کر کے آر پار ہو جانا جیسے تیر کسی چیز کو چھید کر کے اگلی طرف آر پار ہو جائے۔'' اسے **نفذ** کہتے ہیں کہ اس ارض وسماوات کے اندر سے بھی تمہیں نکل کر جانا ہوگا:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

انہیں بھی Conquer (تسخیر) کرنا ہوگا۔ عزیزانِ من! سوچیے کہ قرآن ایک لفظ کے اندر کیا کہہ جاتا ہے! اگر وہ باہر باہر سے چلا جائے یا یونہی ان کو چھوڑ کر چلا جائے تو یہ لفظ نہیں آئے گا۔ یہ لفظ آئے گا جب وہ ان کو چھید کر ان میں سے آر پار چلا جائے گا۔ یہ جو Physical Universe (طبعی کائنات) ہے' یہ اس میں سے چھید کر کے پار جانے والی بات ہے۔ **لَا تَنۡفُذُوۡنَ اِلَّا بِسُلۡطٰنٍ** (55:33) لیکن اقدار کے ذریعے سے جو طاقت آئے گی تو پھر یہ صورت ہوگی۔ یہ آپ کے ہاں کی جو Physical Universe (طبعی کائنات) ہے اس میں سے اس کو چھید کر پار نکل جانا ہے۔ اور **اَقۡطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ** تک تو یہ ستاروں کی دنیا ہوئی' وہ تو اس

---

[1] یہ ممکن ہے۔

سے آگے جاتا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جسے اس ❶ نے کہا ہے کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

حصولِ منزل کے لیے پروگرام کے ساتھ عشق ہونا ضروری ہے

سلسلہ ارتقا میں ہر اگلی کڑی تک پہنچنے کے لیے مخالف قوتوں کے ساتھ تصادمات نہایت ضروری ہوتے ہیں' ٹکراؤ ضروری ہوتا ہے اور ان ٹکراؤ کا مقابلہ وہی کرتا ہے جس کی منزل اُس سے آگے ہو اور اُس منزل تک پہنچنے کے لیے اُس کے دل کے اندر عشق ہو۔ اُسی صورت میں وہ ٹکراؤ مول لے گا' ورنہ جہاں اُس کے سامنے ٹکراؤ آئے گا وہ کہے گا کہ "کی لوہڑا اے مینوں پتھراں نال ٹکر لین دی' ٹھیک اے ایتھے پے جاندے آں چنگے بھلے ہیگے آں" ❷۔ لیکن جسے اپنی منزل کے ساتھ عشق ہوگا وہ پھر اس ٹکراؤ کی پرواہ نہیں کرے گا' ٹکراتا چلا جائے گا' بڑھتا چلا جائے گا۔ اس کے لیے منزل کے ساتھ' مقصد کے ساتھ' نصب العین کے ساتھ' محبوب کے ساتھ' عشق کی ضرورت ہے:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

یہاں بھی ایک امتحاں ہے اِسے پاس کرو گے تو اگلی کلاس میں جاؤ گے اور اگلی کلاس منتہیٰ نہیں ہے' ابھی تو تم F.A ایف اے میں پہنچے ہو:

قناعت نہ کر عالمِ رنگ وبو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تُو شاہیں ہے' پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکان اور بھی ہیں

[اقبالؒ: بالِ جبریل]

---

❶ یہ اشارہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877.1938) کی طرف ہے۔

❷ ان پتھروں سے ٹکراؤ کی مجھے کیا ضرورت ہے۔ ٹھیک ہے' یہیں لیٹے رہتے ہیں' اچھے بھلے تو ہیں۔

یہ ہے **اَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی (53:42)**

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی

انسان کی ارتقائی حدود کی اگلی منزل کے متعلق برگسان کا نقطہ نظر

یورپ کے مفکرین بھی اب اس پہ پہنچ رہے ہیں۔ برگسان (1859-1941) ان کے اندر خاص فکر کا فلاسفر تھا۔ اُس نے خودی کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ انسانی ارتقا کی اگلی منزل انسان کا ان حدود سے آگے بڑھ جانا ہے جو مادی فطرت نے اس کے اوپر اس وقت عائد کر رکھی ہیں۔ اس کی کتاب کا نام ہے: **"The Two Sources of Morality & Religion"**۔ **Physical Universe** (طبعی کائنات) کے جو Distances (فاصلے) ہیں وہ تو میلوں سے ماپے جاتے ہیں۔ یہ جو نئی زندگی ہے اُس کا ایک نیا سفر ہے' اس کی ایک نئی منزل ہے تو وہ جو فاصلے ہیں وہ تو ان چیزوں سے نہیں ماپے جاتے' وہ تو محسوسات کے دائرے سے آگے بڑھ جانے والی بات ہے۔

خدا کا قُرب حاصل کرنے کے لیے اس کے قانون کے آگے جھکنا ہوگا

عشق کی منزلیں میلوں اور گزوں سے نہیں ماپی جاتیں' اس سے جو حرارت پیدا ہوتی ہے وہ تھرمامیٹر سے معلوم نہیں کی جاتی بلکہ اس کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔ یوں تو نظر آتا ہے کہ کہیں بہت آگے ہے لیکن وہ جو **اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی (53:42)** ہے وہ تو کہتا ہے کہ میں تو تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہوں۔ آپ نے غور فرمایا۔ قُرب کی یہ کیفیت ہے' زندگی کی اور منازل ابھی اتنی طے کرنی ہیں۔ کہا ٹھیک ہے میں تو یہاں ہوں لیکن تُو مجھ سے دور ہے' آ تو تمہیں قریب آنے کا طریقہ بتاؤں۔ **وَاسْجُدْ (96.19)** ان اقدار کے سامنے جھک جاؤ۔ **وَاقْتَرِبْ (96:19)** اور میرے قریب آ جاؤ۔ ان دو لفظوں میں سارا پروگرام ہے۔ میں تو موجود ہوں لیکن **وَاسْجُدْ** کے بغیر ممکن نہیں۔ **وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ (57:4)** جہاں بھی ہو میں وہاں موجود ہوں لیکن تم میرے قریب نہیں ہو۔ اُس کا طریقہ یہ ہے کہ واسجد (96:19) ان اقدار کے سامنے جھکتا چلا جا' ان کی اطاعت کیے چلا جا۔ **وَاقْتَرِبْ (96:19)** میں دور نہیں ہوں بس صرف تیرے جھکنے کی دیر ہے تو میرے بہت قریب ہو جائے گا۔

تُو اے اسیرِ مکاں! لا مکاں سے دور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں

یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری کہ حیات
خدنگِ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں
فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے
قدم اٹھا' یہ مقام آسماں سے دور نہیں

[اقبالؒ: بالِ جبریل]

خدنگ تیر کو کہتے ہیں' خدنگِ جستہ اُس تیر کو کہتے ہیں جو کماں سے نکلا ہوا جا رہا ہو۔

اب آپ دیکھتے ہیں کہ میرا' آپ کا اور اس درخت کا یا پول کا' **Distance** (فاصلہ) ماپنے سے کتنا ہے؟ یہ میری نگاہ کا ایک رشتہ ہے جو کہیں محسوس نہیں ہوتا' کہیں نظر نہیں آتا' وہ اس سے اتنا قریب ہے کہ یہ دور ہی نہیں۔ وہ جس کا رشتہ برابر ہے' ہمیں پتہ ہی کچھ نہیں کہ وہ رشتہ ہے کونسا!

یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری کہ حیات
خدنگِ جستہ ہے لیکن کماں سے دُور نہیں

یہ ہے **وَاسْجُدْ وَ اقْتَرِبْ (96:19)** ایک سجدہ کر اور قریب آ جا۔

خدا انسان کو جیسا بنانا چاہتا ہے قرآن اس کو وہ کچھ بنا دیتا ہے

عزیزانِ من! یہ ہے جسے آپ اسلام کا نظام' قرآن کا نظام' مسلمان کی زندگی' مومن کی زندگی کہیں گے۔ وہ جو قرآن کے متعلق اُس نے کہا ہے اُس نے ایک مصرع میں سمٹا کر رکھ دیا ہے کہ قرآن کرتا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

جس طرح خدا چاہتا ہے کہ تُو بن جائے تو قرآن تمہیں اس طرح کا بنا دیتا ہے۔

اب ہم عملی زندگی پہ آ گئے کہ یہ سارا کچھ جو ہم نے بیان کیا ہے: یہ بلند نصب العین' زندگی کی اگلی منزل' عروج' بتدریج بڑھتے چلے جانا' یہاں زندگی ختم نہیں ہوتی اور یہ سب کچھ' اقدار کے ذریعے ہوگا۔

مومن کے لیے قضائے اکبر بھی کچھ حیثیت نہیں رکھتی

اب قرآن نے اپنے ہاں جتنے بھی اصول' قوانین' احکام' ڈائریکشن (ہدایات)' جو کچھ دی ہیں' وہ سب اقدار (Values) ہیں۔ زندگی کا جو اگلا سفر ہے' وہ Values (اقدار) کے زور پہ آگے چلتا ہے۔ وہ جو قرآن نے **سلطٰن** کہا تھا کہ اگر یہ پیدا ہو جائے تو تم **اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (55:33)** سے بھی آگے نکل سکتے ہو تو وہ ان اقدار کی پیروی سے ہوگا۔ یہ ہے **واسجد (96:19)**۔ ان کی اطاعت سے انسان کی ذات میں اتنی نشو ونما پیدا ہو جاتی ہے' اتنی پختگی پیدا ہو جاتی ہے کہ اُس کے بعد موت بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑتی۔ قرآن نے کہا ہے کہ قضائے اکبر یعنی موت کا سخت تریں جھٹکا بھی مومن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا' یہ تو صرف اس کے جسم کا کچھ بگڑ رہا ہوتا ہے' مومن تو اس سے اور آگے ہوتا ہے۔

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی

وہ جو میں نے کہا تھا کہ ہمارے ہاں ایک چیز چلی آتی ہے کہ بہار کے موسم میں بادل آتا ہے' اُس سے بارش ہوتی ہے' اُس کا ایک قطرہ سمندر کی سیپ اپنے آپ کو کھول کر اپنے اندر لے لیتی ہے اور پھر بند ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اس سیپ کے اندر وہ پانی کا قطرہ گوہر بن جاتا ہے' اس کی نشو ونما اس طرح سے ہوتی ہے کہ وہ گوہر بن جاتا ہے۔ بنتا تو مادی سیپ کے اندر ہے لیکن وہ بنتا ایسے ہے کہ وہ صدف سمندر کی تلاطم خیز موجوں کے طوفانوں سے مسلسل ٹکراتی چلی جاتی ہے اور گوہر اس کے اندر پر سکون بیٹھا ہوا ہوتا ہے۔

یا رب درونِ سینہ دلِ باخبر بدہ
با اضطرابِ موج سکونِ گہر بدہ

انسانی خودی کا قطرہ جب گوہر کی شکل اختیار کر جائے تو پھر وہ حیاتِ جاوید سے ہم کنار ہو جاتا ہے

عزیزانِ من! یہ جو باہر کی زندگی کے اضطراب ہیں جسے آپ دیکھ رہے ہیں کہ مومن ان کے اندر ہوتا ہے کہ ہر قسم کے ٹکراؤ' ہر قسم کی مخالفتیں' ہر قسم کے تصادمات اور تزاحمات ہوتے ہیں' یہ ساری چیزیں ہوتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تو سمندر کی موجیں ہیں تمہاری جو صدف ہے' وہ تو اس سے متاثر ہونی چاہیے اور وہ ہوتی ہیں لیکن اس کے اندر تمہارا جو قطرۂ گوہر ہے' وہ تو پر سکون ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ اگر وہ قطرۂ آب گوہر بن گیا ہے تو اس کے بعد وہ سیپ پھٹتی ہے اور پھر وہ گوہر بھی سمندر میں آجاتا ہے تو یہ جو اضطراب ہے وہ اس گوہر کا کچھ نہیں بگاڑ

سکتا کیونکہ اب وہ پختہ ہو گیا ہے:

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صَدف کیا کہ جو قطرے کو گُہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نِگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تُو موت سے بھی مر نہ سکے

[اقبالؒ: ضربِ کلیم]

یہ پختگی اقدار کی اطاعت سے ہوتی ہے، قرآن کی اطاعت سے ہوتی ہے۔

وہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہ جو آپ کے ہاں کی خارجی کائنات کی یا معاشرے کے نامساعد حالات کی تلاطم خیزیاں ہیں، اگر وہ قطرۂ نیساں اس صدف کے اندر ہے تو یہ اس کا کیا بگاڑ سکتی ہیں، کچھ بھی نہیں۔ اب اگلی آیت پہ آ جایئے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ کہنے کو تو ابھی اتنا کچھ باقی ہے لیکن ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔

انسان کے ہر عمل کا نتیجہ اس کی ذات پر اثر انداز ہوتا ہے

یہ جو اس چیز سے انکار کرتے ہیں کہ موت کے بعد بھی انسان کی زندگی آگے چلتی ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ انکار محض کوئی فلسفیانہ بات نہیں ہے جس پہ وہ انکار کرتے ہیں۔ اس نے کہا یہ ہے کہ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پہ پڑتا ہے۔ جو اقدار کے مطابق اعمال ہوتے ہیں ان سے اس کی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے، نشو و نما یافتہ ذات آگے بڑھتی ہے اور اس کی جو اگلی منزلیں ہیں وہ جنت کے مناظر ہیں۔ یہ ساری تشبیہات ہیں۔ جو ان اقدار کے خلاف جاتے ہیں، اس سے ان میں اضمحلال اور انتشار واقع ہوتا ہے، قرآن اس کو **Disintegration** کہتا ہے۔ اس کے بعد ان دونوں میں جو فرق ہے کہ یہ ذات جو اس طرح سے **Disintegrate** (مضمحل) ہوئی آگے جاتی ہے، وہ ہے جسے جہنم کی زندگی کہتے ہیں۔

اگر انسان اپنے ہر عمل' یہاں کے مکافات یا اپنے اُس عمل کے نتیجے' جسے آپ قانون کی سزا کہتے ہیں' کا کچھ انتظام کر لے تو وہ اسے کے عواقب سے بچ سکتا ہے۔ انسان کے بہت سے اعمال ایسے ہیں جو محسوس شکل میں سامنے آتے ہی نہیں ہیں' مثلاً آپ کی اس چیز کی نیت کہ جہاں کہیں بھی آپ ملیں تو آپ کا گلا کاٹ دونگا' اب اتفاق ایسا ہے کہ آپ ایسی جگہ ملتے ہی نہیں ہیں تو یہ نیت قانوناً جرم نہیں ہے' اس سے آپ کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کر رہے' آپ کسی گرفت میں ہی نہیں آسکتے' آپ پہ مقدمہ ہی نہیں چل سکتا' کوئی سزا ہی نہیں مل سکتی لیکن وہ کہتا ہے کہ اس کا اثر تمہاری ذات پہ پڑتا چلا جاتا ہے۔ اگر یہاں قانون شکنی ہو اور محسوس شکل میں سامنے بھی آ جائے تو ہوسکتا ہے کہ آپ پولیس کی گرفت میں نہ آئیں' کچھ ایسا رسوخ پیدا کر لیں کہ سفارش لے آئیں' مجسٹریٹ کے ہاں جائیں تو وہاں بھی یہ کچھ ہوسکتا ہے کہ سزا نہ مل سکے' قید میں بھیج دیا جائے تو جیلر کے ساتھ مل جائیں گے۔ یعنی یہاں کی قانون شکنی سے بہر حال آدمی سزا سے بچ سکتا ہے اور روز سارے رونا ہی اس چیز کا روتے ہیں کہ صاحب! جو یہاں دیانتداری اور ایمانداری سے زندگی بسر کرتا ہے اس کا تو جینا حرام ہو جاتا ہے۔ اور انہیں دیکھیے کہ یہ اسمگلر' چور اور بلیک کرنے والے' یہ سارے پنپتے جاتے ہیں۔ یہ یہاں کے قانون کی بات ہے کہ گرفت میں نہیں آئے۔

وہ کہتا ہے کہ جس کا ایمان یہ ہو کہ ان تمام چیزوں کا اثر میری ذات پہ پڑتا ہے یعنی یہاں کوئی بھی مجھے نہ دیکھے' کوئی بھی مجھے نہ پکڑے' کوئی بھی مجھے سزا نہ دے لیکن اس کے باوجود اس کا نتیجہ مجھے بھگتنا ہے' اس سے مفر نہیں ہے۔ یہاں زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہو کہ جو مر جاتا ہے وہ یہاں کے قانون کی حدود سے بالا ہو جاتا ہے' اُس کے بعد کوئی جرم اس پہ عائد نہیں ہوتا۔ وہ یہ ایمان رکھتا ہے کہ موت کے بعد ہی تو اصل میں گرفتاری ہوتی ہے اور وہاں سے چھوٹ نہیں سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ اصل یہ چیز ہے کہ جو نظریہ ہم نے دیا ہے' یہ محض کوئی Academic سی چیز نہیں ہے کہ اسے مان لیا تو کیا اور اسے نہ مانا تو کیا۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی زندگی پہ' اس کے معاشرے پہ' نظامِ انسانیہ پر' اس کا بڑا گہرا اثر ہے۔ اگر وہی Physical Law (طبعی قانون) والا تصورِ حیات ہے تو اس کے بعد ایک فرد بھی جتنی قوت حاصل کر لے' جتنی فریب کاریاں' شاطرانہ عیاریوں کی ترکیبیں سوچ لے' وہ کامیاب ہوتا چلا جائے گا۔ جس کے ہاتھ میں قوت ہوگی' جس کی لاٹھی ہوگی اس کی بھینس ہوگی۔ محض قوت کے زور کے اوپر جو جی میں آئے کرتا چلا جائے۔ ایک قوم دوسری قوم کے خلاف جو جی میں آئے کرتی چلی جائے' کوئی ایسی چیز نہیں جو اس کو روک سکے لیکن جس کا ایمان ان اقدار کے اوپر ہوگا وہ خلافِ اقدار بات تنہائی میں

بھی نہیں کرے گا' وہ کسی محنت کش کی محنت کے پسینے کا ایک قطرہ بھی اپنے استعمال میں نہیں لائے گا۔ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

[غالب]

انتظامی امور کے سلسلہ میں مملکتِ اسلامیہ کے سربراہ کی حیثیت نیز مکافاتِ عمل کی اہمیت

مومن یہ بات جانتا ہے جو حضرتِ عمرؓ (581-644/45AD) سے پوچھی گئی تھی کہ خلافت کسے کہتے ہیں؟ اُنہوںؓ نے کہا تھا کہ میں تو زیادہ جانتا ہی نہیں ہوں' اتنا ہی جانتا ہوں کہ یہ پوچھا جائے گا کہ لیا کہاں سے تھا اور دیا کدھر تھا؟ یہ جو چیز ہے یہ ہے اصل شے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جو اس چیز کا انکار کرتے ہیں تو یہ ان کے من کا چور ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ وہ قانونِ مکافاتِ عمل کا سامنا نہیں کرنا چاہتے' وہ اس عدالت کو ہی نہیں مانتے' وہ اس حکومت کو ہی نہیں مانتے' اس قانون کو ہی نہیں مانتے۔ کہا ہے کہ **وَ قَالُوٓا ءَ اِذَا ضَلَلۡنَا فِی الۡاَرۡضِ ءَ اِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡد**(32:10) کہتے ہیں کہ وہ مر مرا گئے' مٹی سے مٹی مل گئی تو معاملہ ختم ہو گیا۔ وہ کہہ رہا ہے کہ یہ محض ایک فلسفیانہ نظریہ نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ ان کا من کا چور ہے۔ **بَلۡ هُمۡ بِلِقَآئِ رَبِّهِمۡ كٰفِرُوۡنَ** (32:10) وہ قانونِ مکافاتِ عمل کا سامنا نہیں کرنا چاہتے اور اسے فلسفیانہ معذرتوں کے اندر چھپا رہے ہیں۔ سامنا نہیں کر سکتے' اس سے بچنا چاہتے ہیں' جی کو چرا رہے ہیں کہ کہیں یہ چیز نہ ہو۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ **قُلۡ یَتَوَفّٰکُمۡ مَّلَکُ الۡمَوۡتِ الَّذِیۡ وُکِّلَ بِکُمۡ** (32:11) ان سے کہو کہ طبعی زندگی (Physical Life) کے لیے ایسی طبعی قوتیں (Physical Forces) مسخر کی ہوئی ہیں جو آہستہ آہستہ تمہارے جسم کے اندر اضمحلال پیدا کیے چلی جا رہی ہیں۔ وہ جو ہم ملک الموت کہتے ہیں یعنی موت کا فرشتہ' وہ کہیں الگ سے نہیں آتا' وہ تو ساری زندگی تمہارے اوپر سوار ہوتا ہے۔ تم ذرا ذرا سی بد پرہیزی کیے چلے جاتے ہو تو موت کا وہ فرشتہ تمہیں اتنا ہی موت کے قریب لیے چلا جاتا ہے۔ وہ تمہیں By Ordinance نہیں مارتا بلکہ By Law (بذریعہ قانون) مارتا ہے۔ **وُکِّلَ بِکُمۡ** (32:11) وہ ساری زندگی تمہارے اوپر سوار ہوتا ہے۔ موت کیا ہوتی ہے؟ یہ کہ شراب کی تندی اور تیزی اور نشہ ختم ہو جائے اور باقی پانی رہ جائے تو اسے موت کہتے ہیں۔ وہ

فرشتۂ موت تو عمر بھر تمہارے اوپر سوار رہتا ہے۔ کہا ہے کہ **ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمۡ تُرۡجَعُوۡنَ (32:11)** اس کے بعد اگلی منزل وہ آتی ہے کہ تمہیں ہماری عدالت میں حاضر ہونا ہے۔ کہا کہ **وَ لَوۡ تَرٰۤی اِذِ الۡمُجۡرِمُوۡنَ نَاکِسُوۡا رُءُوۡسِہِمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ؕ رَبَّنَاۤ اَبۡصَرۡنَا وَ سَمِعۡنَا فَارۡجِعۡنَا نَعۡمَلۡ صَالِحًا اِنَّا مُوۡقِنُوۡنَ (32:12)** اے سننے والے! اگر کہیں تُو اس منظر کو دیکھ سکتا کہ وہ جو عدالت میں کشاں کشاں لائے جائیں گے اور وہاں اعمال نامہ گردن میں لٹکا ہوا ہوگا اور ان سے کہا جائے گا کہ خود ہی پڑھو اور جب اُسے پڑھیں گے تو ندامت کے مارے زمین میں آنکھیں گڑ جائیں گی۔ کیفیت یہ ہوگی کہ انکار ہی نہیں ہو سکے گا۔ نظر آ جائے گا کہ اب اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

گزرا ہوا وقت' خواہ ایک سیکنڈ ہی کیوں نہ ہو' واپس نہیں آیا کرتا

وہی مثال کے طور پہ یا تشبیہاً جہنم کے شعلے نظر آ رہے ہونگے۔ کہیں گے **رَبَّنَاۤ اَبۡصَرۡنَا وَ سَمِعۡنَا (32:12)** یا اللہ! جو چیزیں وہاں یوں کہی جا رہی تھیں ہم نے اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھ لیا' اپنے کانوں سے سن لیا۔ **اِنَّا مُوۡقِنُوۡنَ (32:12)** ہم ایمان لائے اس بات کے اوپر کہ واقعی تم نے ٹھیک کہا تھا جو وہاں کہا تھا۔ **فَارۡجِعۡنَا نَعۡمَلۡ صَالِحًا (32:12)** بس ایک دفعہ واپس بھیج دو پھر دیکھ ہم کتنے اچھے اچھے کام کرتے ہیں۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ زندگی کی ندی جو آگے بڑھ جاتی ہے وہ پیچھے نہیں لوٹا کرتی۔ ٹائم تو کہتے ہی اس کو ہیں جو واپس نہ آ سکے:

میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

[غالب]

خدا تعالیٰ کی طرف سے ایمان لانے کے لیے انسان پر کوئی جبر نہ ہوگا

کہتا ہے کہ یہ وقت کی بات ہے' پیچھے لوٹنے والی بات نہیں ہے۔ پوچھا یہ جائے گا کہ کیا تم تک یہ باتیں پہنچی تھیں یا نہیں' سمجھائی گئی تھیں یا نہیں سمجھائی گئی تھیں؟ تم کس قدر اکڑ کر اس سے انکار کرتے تھے' اب اُس کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر کہتے ہو کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر عذاب کو یوں آنکھوں سے دکھا کر ہی ایمان لانے والی بات ہوتی تو یہ تو جبراً ایمان ہے' یہ علی وجہ البصیرت یا بطیبِ خاطر ایمان نہیں ہے۔ اس قدر Terrorise کرے' اس قدر خوفزدہ کرے' عذاب کو سامنے دکھا کر اگر ہم نے تم سے ایمان لوانا

ہوتا تو **وَ لَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا** (32:13) ہمیں اتنا بڑا پروسیس کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ ہم یہ کچھ کرتے' وہاں جہنم لاتے' تمہیں سامنے دکھاتے کہ دیکھو! یہاں ساڑ ساڑ کیسے پڑ رہی ہیں اور اس کے بعد تم کہتے کہ ہاں ہم ایمان لاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ایمان ہوتا ہی نہیں ہے' کیونکہ یونہی وہ جہنم کا شعلہ بجھا' تم نے پھر ویسا ہی ہو جانا تھا۔ اگر ہمیں اس طرح سے کسی کو ایماندار بنانا ہوتا تو کیا مشکل تھا' ہم سب کو پیدا ہی مومن کرتے۔ کہا کہ عذاب دکھا کے جو ایمان لانے والی بات ہے وہ ایمان ہوتا ہی نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ **وَ لٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ** (32:13) ہم نے انسان کو قوتِ ارادہ دی ہے' انتخاب کی استطاعت دی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کو یہ سارے سمجھنے کے ذرائع دیئے۔ اور اس کے بعد یہ اس کی مرضی پہ چھوڑ دیا کہ ان ذرائع کو استعمال کرنے کے بعد جو جی میں آئے اپنی اس ذات کی نشو ونما کرتا ہوا آگے بڑھ جائے اور جس کے جی میں آئے خود اپنی جہنم کی زندگی اختیار کر لے۔

قرآن کی اس قدر واضح تعلیم کے برعکس ہمارے ہاں کے تراجم کی ایک مثال

اب یہاں جو کہا گیا ہے' اس کا آپ ترجمہ پڑھیے تو قرآن کی ساری تعلیم دِگرگوں ہو جاتی ہے۔ ترجمہ آپ کو یہ ملے گا کہ اب یہ بات نہیں جیسا تم کہہ رہے ہو بلکہ سچی بات یہ ہے کہ ہم نے تو جن وانس سے جہنم کو بھرنا تھا سو بھر دیا۔ ہم سے بغیر پوچھے ہوئے یہاں بھیج دیا' وہ اس لیے بھیج دیا کہ وہاں ایک جہنم بنایا ہوا ہے' 'اوہدے لئی بالن نہیں لبھدا' جیل خانے جو بنڑاتے' تے جے اسی قیدی نہ بھیجئے تے فٹے منہ والی گل اے ❶''۔ عزیزانِ من! سوچیے کہ اس قرآن کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ایک اور جگہ ہے کہ **وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ** (7:179) ۔ اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ہم نے انسانوں کی اکثریت کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ جہنم میں بھیج دیں۔ یعنی **ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا** ۔

اس سلسلہ میں قرآن حکیم کا ارشاد

کہا کہ تمہیں ایسے لوگ بھی نظر آئیں گے جن کی روش تمہیں بتا دے گی کہ یہ تو ہیں ہی جہنمی۔ وہ کیا روش ہے جو تمہیں بتا دے گی؟ اس کے لیے کہا کہ **وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ** (7:179) یہ وہ لوگ

---

❶ اس کے لیے ایندھن نہیں ملتا۔ اب جو جیل خانے بنائے ہیں تو پھر اگر ہم قیدی نہ بھیجتے تو یہ تُف لعنت والی بات ہی ہوتی۔

ہیں کہ ہم نے انہیں آنکھیں دیں لیکن یہ ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے' کان دیئے لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے' سمجھنے کے لیے دل دیا' دماغ دیا لیکن اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے' **اُولٰٓـئِکَ کَـالْاَنْـعَـامِ** (7:179) یہ تو حیوان ہیں بلکہ حیوان نہیں **بَـلْ ھُـمْ اَضَـلُّ** (7:179) ان سے بھی گئے گزرے کہ ان کو تو یہ اختیار وارادہ نہیں دیا ہوا تھا۔ **اُولٰٓـئِکَ ھُمُ الْغٰفِلُوْن** (7:179) یہ وہ ہیں جو اپنے مقصدِ حیات سے اور یہ جو ذرائع حیات دیئے ہوئے ہیں ان تمام کی طرف سے انہوں نے غفلت برتی ہوئی ہے۔ یہ ہیں جن کی روش تمہیں بتا دے گی کہ یہ واقعی جہنمی ہیں۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ **لَاَمْـلَـئَنَّ جَھَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ** (32:13) یہ ہیں وہ لوگ جن سے جہنم بھری جائے گی۔ یعنی عقل وفکر سے کام نہ لینے والے' سوچ اور سمجھ سے کام نہ لینے والے یہ ہیں وہ لوگ جن کی روش تمہیں بتا دے گی کہ یہ جہنم کے ہیں۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ السجدۃ کی آیت 13 تک آ گئے۔ 14 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

چوتھا باب: سورة السجدة (آیات 14 تا 19)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج دسمبر 1979ء کی 7 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ السجدۃ کی آیت 14 سے ہو رہا ہے: (32:14)۔

تجدیدِ یادداشت

سابقہ آیات میں کہا یہ گیا تھا کہ جو لوگ قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں وہ یہاں تو اپنے آپ کو بہت بڑا اچھے خاں سمجھتے ہیں لیکن جب یہ اُس عدالت میں حاضر ہونگے تو کہا ہے کہ اے مخاطب! تُو اگر اُس نقشے کو سامنے لائے کہ یہ اپنے جرائم کی فہرست کو خود اپنے سامنے دیکھ کر، خود اسے پڑھ کر، خود اس کا اعتراف کر کے، اس قدر ندامت سے سر جھکائے ہوئے ہونگے، اس قدر شرمندگی اور بے بسی کا عالم ہوگا تو اس وقت کہیں گے کہ اے خدا! ایک دفعہ پھر دنیا میں واپس بھیج دے، پھر تُو دیکھ کہ ہم کس طرح اچھے کام کرتے ہیں۔ ان سے کہا جائے گا کہ تمہیں وہیں بتا دیا گیا تھا کہ زندگی کا دھارا پیچھے کی طرف نہیں لوٹتا، اسے یا تو آگے بڑھنا ہے یا ایک مقام پر رک جانا ہے، یہ پیچھے نہیں لوٹتا۔ اس وقت ان سے کہا جائے گا **فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ** (32:14) تمہیں بہتیری یاد دہانی کرائی گئی، بار بار تمہیں انذار کیا گیا **Warning** (تنبیہ) دی گئی، اس کے باوجود تم

نے قانونِ مکافاتِ عمل کی اہمیت سے بے اعتنائی برتی، تم نے کچھ پرواہ ہی نہیں کی اُسے اس قابل ہی نہیں سمجھا کہ سنجیدگی سے غور کیا جائے کہ انسان کے ہر کام کا ایک نتیجہ مرتب ہوتا رہتا ہے۔ بار بار تمہیں اس کی یاد دہانی کرائی گئی اور ہر بار تم نے اس سے نافرمانی برتی۔ وہاں لاپرواہی برتی تو پھر آج کیفیت یہ ہے کہ **نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ (32:14)**۔

قرآنِ حکیم نے اپنی تعلیم کو کئی جگہ مجازی طور پر بھی پیش کیا ہے

مجازی انداز میں تعلیم کو پیش کرنا زبان کی بلاغت ہوتی ہے اور عربی زبان میں جیسا آپ کو معلوم ہے کہ ایک ہی لفظ کے معنی Shades کے اعتبار سے بدلتے جاتے ہیں۔ پہلی تو یہ چیز ہے کہ بار بار تم سے کہا اور تم نے اس سے بے اعتنائی برتی۔ اور پھر یہ لفظ آیا ہے کہ تم نے کسی کی حفاظت کی طرف سے بے پرواہی برتی تو آج پھر ہم تمہیں حفاظت نہیں دے سکتے، ہم تمہیں محفوظ نہیں رکھ سکتے، ہم تمہیں پناہ نہیں دے سکتے۔ یہ حفاظت میں لینا اور جہنم میں بھیجنا وغیرہ قرآن مجازی طور پہ استعمال کرتا ہے ورنہ یہ تو ہر عمل کا فطری نتیجہ ہے جو انسان کے سامنے آجاتا ہے۔ اس واسطے اب تو تم نے جو کچھ کیا تھا اُس کی سزا بھگتنی ہی ہوگی اس سے مفر نہیں ہے۔ بار بار تمہیں کہتے رہے اور تم نے اس حقیقت کو کچھ اہمیت ہی نہیں دی، سنجیدگی سے اس کے اوپر غور ہی نہیں کیا، اس کو تسلیم ہی نہیں کیا۔

قرآنی قوانین کو عملی طور پر دل و جان سے تسلیم کرنے والوں کی خصوصیات

کہا ہے کہ **اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ [15:32] تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (32:15.16)** وہ لوگ جو قوانین خداوندی کو حقیقت تسلیم کر لیتے ہیں، یہاں ان کی چند ایک خصوصیات بتائی گئی ہیں۔ چند ایک کیا قرآن تو جہاں ایک خصوصیت بھی بتاتا ہے، وہ منفرد ہوتی ہے، اس میں انفرادیت ہوتی ہے، وہ لوگ باقی انسانوں سے ممتاز حیثیت لیے ہوئے نظر آجاتے ہیں۔ مومن کی تو شان ہی یہی ہے:

مومنے بالائے ہر بالا ترے
غیرتِ او بر نہ تابد ہمسرے

[اقبالؒ]

قرآن مومن کے جو وصف بتاتا ہے اس میں تو غیرِ مومن یا کوئی بھی دوسرا اس کے ہمدوش بھی نظر نہیں آتا چہ جائیکہ اس سے کہیں آگے یا اونچا نظر آئے۔ کہا ہے کہ **اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا** (32:15)۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ ان کے سامنے جب قوانینِ خداوندی کو لایا جاتا ہے تو وہ ان کے سامنے جھک جاتے ہیں' سجدہ ریز ہو جاتے ہیں' سرِ تسلیم خم کر لیتے ہیں۔

تصریفِ آیات کی روشنی میں قرآنِ حکیم کا کوئی مقام بھی مشکل نہیں رہتا

اس مقام پہ میں عرض کروں کہ میں جو بار بار کہا کرتا ہوں کہ قرآنِ کریم تصریفِ آیات سے سمجھ میں آتا ہے یعنی ایک بات وہ ایک جگہ کہتا ہے' اس کی وضاحت دوسرے مقام پہ کرتا ہے' کہیں اُس میں اضافہ کرتا ہے' کہیں اُس میں استثنٰی کرتا ہے۔ اس کے سمجھنے کا طریقہ اُس نے خود کہا ہے کہ تصریفِ آیات میں ہم باتیں بیان کریں گے۔ کوئی موضوع' جو تمہارے سامنے ایک مقام پہ آئے' یہ دیکھو کہ قرآنِ کریم کے دوسرے مقامات میں اس کے متعلق کیا کہا گیا ہے۔ یہ تمام مقامات آپ سامنے رکھ لیں گے تو ساری بات واضح ہو جائے گی۔ عزیزانِ من! قرآن کا کوئی مقام مشکل نہیں رہتا بشرطیکہ جو طریق اس نے بتایا ہے اس کے مطابق اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ یہ وہ چیز ہے جسے ہمارے ہاں تبویب کہتے ہیں یعنی **Chapterwise** ہونا یا **Subject** (مضمون) کے اعتبار سے یا موضوع کے اعتبار سے کسی چیز کا باب باب کرنا۔ اور یہ تھی وہ دشواری کہ ہر ایک اس کو کہاں عمر بھر کی محنت سے کرے گا بہر حال میں نے تو اپنے اس جنون کے تابع یہ سب کچھ کیا کیونکہ مجھے قرآن سے عشق ہے۔ میری جو کتاب ''تبویب القرآن'' ہے' اس کا یہی موضوع ہے۔ اس میں دو تین ہزار عنوانات ہیں۔ ایک عنوان کے تابع قرآن نے جہاں جہاں کچھ کہا ہے اس کے سارے حوالے دیئے ہوئے ہیں۔

قرآنِ تعلیم کے مطابق آیاتِ خداوندی پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان لانا ہوگا

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے۔ یہاں (32:15) میں کہا کہ مومنین کی خصوصیت یہ ہے کہ جب ان کے سامنے قوانینِ خداوندی آتے ہیں تو وہ فوراً جھک جاتے ہیں' ان کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ اب ذہن میں یہ چیز آئی کہ ایسی ہی خصوصیت بتائی ہے کہ جونہی ان کے سامنے قرآن کی وہ آیتیں پیش کیں یا قرآن کے قوانین پیش کیے تو بغیر سمجھے بوجھے وہ فوراً ان کے سامنے جھک گئے۔ یہاں تو صرف **خَرُّوْا سُجَّدًا** (32:15) ہے لیکن تصریفِ آیات کے ماتحت دوسرا مقام دیکھیے۔ وہاں آیا ہے کہ **وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا** (25:73) ان کے سامنے اور تو اور آیاتِ خداوندی بھی

پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان کے سامنے اندھے بہرے گونگے بن کرنہیں جھکتے۔ دنیا کی اور کوئی چیزیں' باتیں' اصول' قوانین' قواعد اور انسانوں کی باتیں' تو ایک طرف رہیں' خدا کے قوانین' اس کی باتیں اور اس کی آیات ان کے سامنے لائی جاتی ہیں تو وہ اندھے بہرے ہوکر ان کونہیں تسلیم کرلیتے۔ ہمارے ذہنوں میں یہ تو ہے کہ

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

وہ کہتا ہے کہ مومن کی صفت یہ ہے' خصوصیت یہ ہے کہ اور تو اور' خدا کے قوانین اور آیات بھی اس کے سامنے آئیں تو ان پہ بھی وہ اندھا بہرا بن کرنہیں جھکتا بلکہ غور وفکر اور علم وبصیرت کی رو سے اس کو تسلیم کرتا ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے عقل اور علم اور بصیرت اور فہم اور تدبر اور تفکر کو یہ اہمیت ہے کہ خدا کی آیات کو بھی وہ اندھا بہرا بن کر تسلیم نہیں کرتا۔ اور اطمینان تو اسی ایمان سے ہوتا ہے جو علیٰ وجہ البصیرت لایا جائے۔ جس بات کو علم وبصیرت کی رو سے سمجھا جائے وہاں سے پھر کوئی شخص اس کو چھڑا ہی نہیں سکتا' اس کے پاؤں میں لغزش آ ہی نہیں سکتی کیونکہ اس نے یونہی جذبات کے طور پر اندھا بہرا بن کر اس کو تسلیم نہیں کیا ہوتا بلکہ اس نے علیٰ وجہ البصیرت' سب کچھ جانتے بوجھتے دیکھتے بھالتے' اعتراضات کو سامنے رکھ کر' جب وہ اس طرح سے یقین کے درجے پہ پہنچ جاتا ہے کہ واقعی الحق یہی بات ہے پھر وہ ان کو تسلیم کرتا ہے۔ یہ ہے مومن کا شعار' یہ ہے مومن کی خصوصیت۔ اب جو یہاں آیا کہ **اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا (32:15)** تو یہاں تو اتنا ہی تھا کہ جب ان کے سامنے آیاتِ خداوندی آتی ہیں تو وہ جھک پڑتے ہیں' سرِ تسلیم خم کرتے ہیں' سجدہ ریز ہوجاتے ہیں۔ اس میں اس بات کا احتمال تھا کہ بغیر سمجھے بوجھے ہی کیونکہ خدا کا فرمان ہے اس واسطے ان کے سامنے وہ جھک جاتے ہیں لیکن اس نے دوسرے مقام پہ واضح کردیا کہ مومن خدا کی آیات کے سامنے بھی اندھا بہرا بن کرنہیں جھکتا۔ قرآنِ کریم میں حضورِ اکرم ﷺ کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ **اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ (12:108)** ہم جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں تو علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتے ہیں۔ میں جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو علیٰ وجہ البصیرت دیتا ہوں۔ اور آگے ہے کہ **اَ نَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ (12:108)** میں بھی ایسا کرتا ہوں اور جو میرا اتباع کرے گا اس کا بھی یہی شیوہ ہوگا کہ وہ علیٰ وجہ البصیرت تمہیں اسلام کی طرف دعوت دیگا۔ اس لیے جو دعوت علیٰ وجہ البصیرت دے گا تو پھر جو سامنے مخاطب ہے وہ بھی اس کو علیٰ وجہ البصیرت مانے گا۔ مومن کہا ہی اسے گیا ہے جو خدا کے کلام پر' اس کی تعلیم پر' علیٰ وجہ البصیرت ایمان لائے۔

ایمان لانے کے سلسلہ میں ہماری حالت

عزیزانِ من! سوچیے تو سہی کہ ہم میں کتنے ہیں جو اس طرح سے ایمان لائے ہیں۔ ہم تو ایمان لائے ہی نہیں ہیں' مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے اور اس فارم کے خانے میں اسلام لکھ دیا' بس اتنا ہی ہے جو ہم کرتے ہیں۔ وہ تو ایمان لانے والے جو ہیں ان کے متعلق یہ کہتا ہے کہ اندھے بہرے بن کر یہ نہیں مان لیتے۔ اور ہماری زندگی میں تو ایمان لانے کا یا ایمان سے انکار کرنے کا یہ **Occasion** (موقعہ) ہی کبھی نہیں آتا۔ ایمان یہ نہیں ہے کہ ازخود جیسا کوئی انسان ہے وہ مسلمان ہو جاتا ہے بلکہ یہ تو ہونا پڑتا ہے۔ ہر پیدا ہونے والا بچہ' ہر انسان جو دنیا میں آتا ہے' وہ ازخود مومن نہیں ہوتا' وہ کافر بھی نہیں ہوتا' وہ صرف انسان ہوتا ہے۔ آپ حیران ہونگے کہ جو میں کہنے لگا ہوں کہ قرآن تو کفر کا لفظ بھی **Verb** (فعل) کے معنی میں استعمال کرتا ہے' **کَـفَـرَ** کہتا ہے یعنی جس نے کفر اختیار کیا۔ پیدائشی جو کچھ ہوتا ہے وہ تو انسان نہیں ہوتا وہ تو حیوان ہوتا ہے۔ اب اُسے خود یہ بننا پڑتا ہے۔ انکار کرتا ہے یا سرکشی برتتا ہے تو **کَفَر** ہے' **یکفرون** ہے۔

انسان کو کافر بننا پڑتا ہے' اور ایمان لانا پڑتا ہے

عزیزانِ من! قرآن کی یہ چیزیں بڑی غور طلب ہیں کہ یہ **Verb** (فعل) کیوں استعمال کرتا ہے کہ وہ کفر کرتے ہیں۔ دوسری طرف وہ کہتا ہے کہ ایمان لاتے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ جو بات تھی کہ میں اللہ کو مانتا ہوں تو مانتا ہوں والی بات تو ہے ہی نہیں بلکہ ایمان لاتا ہوں۔ ایمان کس طرح لانا ہے: علیٰ وجہ البصیرت' سوچ سمجھ کر' علم و بصیرت کی رو کر' چھان پھٹک کر' ٹھوک بجا کر پھر حقیقت کو حقیقت ماننا ہے اس کو ایمان لانا کہتے ہیں۔ یہ لایا جاتا ہے' ازخود کوئی مومن نہیں ہوتا کوئی کافر نہیں ہوتا۔ اور لایا جاتا ہے تو **صُـمٌّ بُـكْـمٌ عُـمْـىٌ** (2:18) نہیں یعنی اندھے بہرے بن کر نہیں۔ پہلی چیز تو مومن کی صفت یہ بتائی۔ دوسری چیز یہ ہے کہ **سَبَّـحُـوْا بِـحَـمْدِ رَبِّهِمْ** (32:15)۔ پہلی چیز جو قرآن نے افتتاحیہ میں یا **Preface** میں کہی ہے وہ ہے **اَلْـحَـمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (1:1) جو حمدیت ہے وہ خدا کے لیے ہے اور اس لیے وہ مستحقِ حمد و ستائش ہے کہ وہ رب العٰلمین ہے یعنی وہ کائنات کی ربوبیت کا ذمہ دار ہے۔ حمد اور ستائش کا حقدار وہ ہے جو ربوبیتِ عالمینی کا ذمہ دار ہے۔

لفظ ربوبیت کا قرآنی مفہوم

ربوبیت کا عام لفظی ترجمہ تو نشوونما کیا جاتا ہے۔نشوونما صرف اتنی ہی نہیں بلکہ رب کہتے ہی اسے ہیں جو کسی شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے اس کی تکمیل تک پہنچائے' جو کچھ اس نے بننا ہے وہ بنا دے اور ان تمام مراحل میں اس کے لیے وہ کچھ بننے کے سامان اور اسباب اور ذرائع مہیا کرتا چلا جائے۔اُسے رب کہتے ہیں۔پہلی چیز اس نے یہ بتا دی کہ اور تو اور خدا بھی مستحقِ حمد و ستائش ہے تو اس لیے کہ وہ ربوبیتِ عالمینی کا ذمہ دار ہے۔کسی ایک فرقے' کسی ایک گروہ' کسی ایک خاندان کا نہیں بلکہ تمام کائنات کا رب ہے۔عالمگیر انسانیت کی ربوبیت کا ذمہ دار ہے' وہ یہ کچھ کرتا ہے تو پھر وہ کہتا ہے کہ وہ مستحقِ حمد و ستائش ہے۔جو یہ نہیں کرتا اسے حق حاصل نہیں ہے کہ اپنی تعریف کرائے۔اس کے مقابلے میں وہ کچھ اور لوگوں کا ذکر کرتا ہے کہ **یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا** (3:187) وہ چاہتے ہیں کہ ان باتوں کے لیے ان کی تعریف کی جائے جنہیں وہ کرتے نہیں ہیں۔یہاں پہلی چیز تو یہ ہے کہ کچھ کرنے کے صلے میں کچھ تعریف ہوگی اور کرنا ہے ربوبیت۔یہ ہے بنیادی چیز۔مومن کیا کرتے ہیں؟ **سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ** (32:15) خدا کی یہ جو ربوبیت کی ذمہ داری ہے یہ انسانوں کی دنیا میں انسانوں کے ہاتھوں سے پوری ہوتی ہے۔اب ہمارے ہاں تو آسانی ہوگئی کہ

جو غم ملا اُسے غمِ جاناں بنا دیا

قرآنی تعلیم کے برعکس مذہب کی دنیا میں قرآنِ حکیم کے لفظ ''سبح'' کا مفہوم

جو بھی لفظ آیا اُس کو مذہب کی دنیا میں لے آئے اور آپ کو معلوم ہے کہ جب قرآن کریم کی تلاوت کے وقت **خروا سجدًا** کا لفظ آتا ہے تو لوگ سجدے میں گر جاتے ہیں۔قرآنِ کریم میں بعض مقامات ایسے ہیں جہاں کہتے ہیں کہ تلاوت کرتے ہوئے اگر وہاں پہنچو تو قرآن کو ایک طرف رکھ کر سجدہ کر لیا جائے تو خدا کا یہ حکم پورا ہوگیا۔یہاں سے اٹھے تو کم از کم مسجد میں جا کر سجدہ کر دیا۔جیسے قوانینِ خداوندی کے سامنے سربسجود ہونا کہتے ہیں' سرِ تسلیم خم کر دینا کہتے ہیں' اس کے سامنے جھک جانا کہتے ہیں' ان کو تسلیم کر لینا کہتے ہیں' یہ ہے سجدہ۔ابھی میں عرض کرتا ہوں' لفظ آگے آتا ہے جس میں وضاحت کی ہے: **سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ** (32:15) کا ترجمہ کر دیا کہ خدا کی حمد کی تسبیح کرتے ہیں۔نماز تو پڑھ لی' اُس کے بعد آپ کو پتہ ہے کہ پھر اس تسبیح کے فریضے سے کیسے عہدہ برآ ہوا جاتا ہے؟ اس طرح

کہ 33 مرتبہ سبحان اللہ' 33 مرتبہ الحمدللہ' 34 دفعہ اللہ اکبر پڑھ لیا تو تسبیح ہوگئی' اس طرح دوسرا فریضہ بھی ادا ہوگیا۔ نہ کبھی زبانِ عربی سے پوچھا' نہ کبھی قرآن سے پوچھا کہ یہ بات کیا ہے۔ وہ دانوں والی تسبیح لی جو اسلامی ہے ہی نہیں' یہ بدھوں کے ہاں سے عیسائیوں کے ہاں آئی' عیسائیوں کے ہاں سے' ہمارے ہاں لے لی۔ **سبح** کے معنی ہوتے ہیں کہ ''کسی مقصد کے حصول کے لیے اس طرح سے دوڑ دھوپ کرنا جیسے گھوڑا چاروں پاؤں سے یا تیراک دونوں ہاتھ یوں زور سے مارتا ہے''۔ یہ لفظ بنیادی طور پہ گھوڑے کی اس قسم کی چال کے لیے ہے۔ **سبح** کے معنی ہیں کہ کسی مقصد کے حصول کی خاطر پوری پوری توانائیوں سے تگ ودو کرنا' جسے آپ دوڑ دھوپ کہہ سکتے ہیں۔ کیا بات تھی ان عربوں کی! انہوں نے دیکھا کہ گھوڑے کی یہ چال ہے یا تیراک کی یہ کیفیت ہے کہ اس میں آدمی یا گھوڑا **Extreme End** (انتہائی سرے) تک جاتا ہے تو انہوں نے کہا کہ کسی مقصد کے حصول کے لیے یہاں تک جا کر جو کوشش کی جائے' وہ سبح ہوتی ہے۔ تسبیح کے معنی یہ ہیں کہ مسلسل یہی کچھ کرتے چلے جانا۔

لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

مردِ مومن کی سعی و کاوش اور اس کی کبریائی کے مقامِ بلند کی کیفیت

عزیزانِ من! مسلماں کیا! زندہ رہنا ہی آساں نہیں ہے۔ وہ تو ہم کبھی خیال ہی نہیں کرتے۔ ''سبح'' تو سانس لینا ہے' یعنی کسی مقصد کے حصول کے لیے پوری پوری توانائیوں سے ساری زندگی تگ ودو کرنا پڑتا ہے اور پورا پورا سانس لینا پڑتا ہے۔ وہ جو دمے کا ایک مرض آجاتا ہے' جس میں پورا سانس نہیں آتا بلکہ آدھا سانس آتا ہے تو دیکھیے کس طرح سے زندگی اور موت کے درمیان آدمی لٹک رہا ہوتا ہے۔ وہ ''سبح'' کی پوری پوری کوشش کرتا ہے اور ساری عمر کرتا ہے۔ وہ ہے انسان کی **Physical Life** (طبعی زندگی) کے اندر ''تسبیح''۔ اور یہ ادھر اس کی انسانیت کی زندگی ہے' اُس میں اقدارِ خداوندی کی اطاعت اور اتباع میں اس طرح کوشش کرنا کہ اس میں پوری پوری توانائی صرف ہوجائے' یہ انتہائی درجے کی کوشش وسعی سے کام لینا اور مسلسل کام لینا ہے۔ یہ ہوا **سبحوا**۔ یہ کاہے کے لیے ہے؟ **بِحَمْدِ رَبِّهِمْ** تاکہ دنیا یہ بات دیکھ لے کہ واقعی یہ وہ جماعت ہے جو خدا کی اس ذمہ داری کو یوں پورا کرتی ہے۔ اور حمد کے معنی تو آپ کو میں نے بتائے تھے کہ اس کے معنی تعریف کرنا نہیں ہے جسے عربی میں مدح کہتے ہیں یا انگریزی میں **Praise** کہتے ہیں' یہ تعریف کرنا بھی نہیں ہے' یہ مدح اور ستائش بھی نہیں ہے۔ یہ حمد ہے' حمد کی بنیادی چیز یہ ہے کہ کسی چیز کا اس قدر دلکشی سے تکمیل لیے

محسوس شکل میں ایسے سامنے آنا کہ بے ساختہ زبان سے واہ واہ واہ نکلے۔ اس شے کے لیے جو بے ساختہ لفظ نکلتا ہے اس کو حمد کہتے ہیں۔ یہ مومنین کی خصوصیات بتائی جا رہی ہیں کہ خدا کی وہ جو ربوبیت اور تربیت کی ذمہ داری ہے' اُسے اس انداز سے سرانجام دیں' ان کا نظام اس قسم کا بنے کہ کوئی دیکھنے والا جب اس کو دیکھے تو بے ساختہ زبان پہ آئے کہ واہ واہ کیا نظام ہے اور کیا یہ انسان ہیں اور کیا کچھ یہ کر رہے ہیں! کہا کہ **سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (32:15)**۔ یہ بڑا عجیب نکتہ ہے۔ آپ حضرات میں سے جو سائیکولوجی کے اسٹوڈنٹ ہیں' وہ اس پہ زیادہ توجہ دیں گے۔ **سجدًا** تو جھک جانا ہے۔ یہی کافی تھا کہ وہ اس کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ اگلی چیز یہ کہی کہ **وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (32:15)** اس کے عام معنی یہ کیے جاتے ہیں کہ وہ تکبر نہیں کرتے۔ یہ جو کبریائی ہے اس کے بغیر تو مومن مومن ہو ہی نہیں سکتا' کبریائی کو اپنی انتہائی شکل میں جو حق حاصل ہے وہ تو خدا کا ہے۔ لیکن خدا کی صفات کو اپنے اندر منعکس کرنے والوں' اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے والوں کے لیے قرآن نے کہا ہے کہ **اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (3:139)** یعنی انسانی دنیا کے اندر بلند ترین درجہ جو ہے وہ انہیں حاصل ہے۔ خدا سے نیچے' ان سے اونچا' ان سے بڑا' ان سے زیادہ کبریائی کا مالک' کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ جو کبریائی ہے' یہ تو مومن کی صفت ہے۔ قرآن نے تو یہ کہا ہے کہ ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ جو غیر مسلم ہیں' کبھی مومنین کے اوپر غالب آ جائیں۔

جماعتِ مومن کی پہچان الاعلون کے سوا کچھ اور ہے ہی نہیں

عزیزانِ من! غور کیجیے کہ یہ ایک خاص جماعت ہے جن کا یہ ذکر ہو رہا ہے' یہ نوے کروڑ نہیں ہیں' جو رو رہے ہیں' چیخ رہے ہیں' جدھر سے دیکھو آواز آ رہی ہے کہ وہ مار گئے' وہ لے گئے' اس نے تباہ کر دیا۔ وہ کہہ رہا ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ غیر مسلم ان مومنین کے اوپر کبھی غالب آ جائیں۔ لہٰذا یہ جو ہمارے ہاں کبرِ نفس اور تکبر کو اتنا مذموم قرار دیا گیا ہے کہ یہ تو شیطان کرتا ہے۔ زندگی کا سب سے بڑا مقصد یا قربِ خداوندی یا مقرب ہونا یہ ہے کہ انسان اپنی خودی کو' میں کو مار دے' نفس کشی سب سے بڑی روحانیت ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ ایک طرف تو مومنین کی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ دنیا میں ہر قسم کی کبریائی اور بلندیاں انہیں حاصل ہونگی:

مومنے بالائے ہر بالا ترے
غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

یہ قرآن کے الفاظ کا ترجمہ ہے۔ مومن ہر بالا سے بالاتر ہے' اس کی غیرت تو ہمسر کو بھی برداشت نہیں کر سکتی چہ جائیکہ کوئی اس سے اونچا ہو۔ یہ قرآن کے الفاظ اعلون (3:139;47:35) کا ترجمہ ہے۔ کیفیت تو مومن کی یہ بتائی۔ اور یہاں ہے کہ **وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ** (32:15). کبریائی یا جسے آپ کبر کہتے ہیں' وہ ان میں نہیں ہوتا۔ **خَرُّوْا سُجَّدًا** (32:15) آیا ہے اور یہیں سے تو معنی واضح ہو جاتے ہیں کہ وہ قوانینِ خداوندی سے سرکشی نہیں برتتے بلکہ ان کے سامنے جھکتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ وہ دنیا میں باقی اقوام کے مقابل میں ہو جا ککھ مسیت دا ہیں تا کہ ''جیہڑا آوے اوتوں لنگ دا جاوے یعنی کنڈے جناوی نہ رڑکے''[1]۔ یہ جو چیز ہے کہ ''خودی خدا داویر'' یہ ساری چیزیں آپ کے ہاں' یہ جو دوسروں کے ہاں سے لیا ہوا تصوف ہے' یہ ساری اس کی تعلیم ہے۔ یہ اس قوم کے سامنے بڑی سازش ہے۔

انسان کی اپنی پہچان اس کی 'میں' سے وابستہ ہے

یہ جسے آپ خودی کہتے ہیں' اپنے ہاں اس کا ترجمہ ذرا ''میں''[2] کر لیں تو کچھ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ یہ کیا ہے۔ جب آپ کہتے ہیں کہ ''میں'' نے اس کو پکڑا تو آپ کا ہاتھ اس کو پکڑ رہا ہوتا ہے' تو یہ ''میں'' کیا ہے؟ جسے آپ کہتے ہیں کہ ''میں'' نے وعدہ کیا' ''میں'' نے اس کا یہ کام کرنا ہے' دس برس پہلے ''میں'' نے اس سے یہ کہا تھا' آج بھی ''میں'' یہی کہہ رہا ہوں۔ تو یہ ''میں'' کیا ہے؟ یہی ''میں'' ہی تو وہ چیز ہے' جس سے آپ 'آپ' ہیں' میں کہنا چھوڑ دیجیے تو آپ کی اپنی ہستی ختم ہو جاتی ہے۔ اور وہاں تصوف کی تعلیم یہ ہے کہ میں دے گل تے چھری''[3]۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بکری میں میں کرتی ہے اور اس کو ذبح کر دیتے ہیں۔ یعنی جو ''میں'' کو ختم کرنا ہے' یہ ہے آپ کے ہاں کا تصوف یعنی آپ کی شخصیت ختم ہو جائے۔ ''میں'' ہی باقی نہ رہے تو پھر اور کیا باقی رہیں گے۔ حیوان ''میں'' نہیں کہہ سکتا۔ میں نے شاید اگلی[4] دفعہ آپ سے کہا تھا کہ جسٹرٹن' جی۔[5] (1874-1936ء) کا وہ قول ہے:

One who can not say I, can not say thou.

---

1. جو آئے اسے روندتا چلا جائے یعنی وہ کانٹے جیسی لسک بھی نہ رکھے۔
2. I amness
3. ''میں'' کے گلے پہ چھری (پھیر دو)۔
4. دیکھیے اسی کتاب کا دوسرا باب' نومبر 1979ء کی 23 تاریخ کا درس' ص۔17۔
5. Chesterton, Gillert Keith: An Essay on Heretics

''جو میں نہیں کہہ سکتا' وہ خدا کو نہیں پکار سکتا''۔ میں تو بڑی چیز ہے۔

بندۂ مومن خدا کے آستانے کے سوا کہیں کسی اور کے سامنے نہیں جھکتا

یہاں یہ چیز جو قرآن نے کہی کہ یہ جو اس کے سامنے سجدہ ریز ہونا ہے' یہ ''میں'' کے خلاف نہیں تھا' دوسری یہ چیز کہی کہ ان میں کبریائی نہیں آتی۔ یہ تو اس کی صفت ہی یہ تھی۔ قرآن نے اس میں کیا فرق کیا؟ سائیکولوجی والے اس کو ذرا سمجھیں۔ ایک ہوتا ہے **Self** (سلف)' ایک ہوتا ہے **Ego** (ایغو)۔ دونوں ہی ''میں'' ہوتے ہیں۔ سائیکولوجی میں تو اس میں فرق ہی نہیں کیا جا سکتا کہ وہاں اقدار کا' **Values** کا' خدا کے قوانین کا تصور ہی نہیں ہے۔ اس میں قرآن فرق کرتا ہے۔ **Self** وہ ہے' جو ایک آستانِ خداوندی کے سامنے جھک کر ساری دنیا کے مقابلے میں اونچا ہو جاتا ہے۔ یہاں جھک جا اور خدا کے قریب ہو جا' چھوٹے پیمانے پہ رب بن جا' کبریائیاں ساری تمہارے حصے میں آ جائیں۔

تیرے سنگِ در نے بدل دیا ہے یہ پستیوں کو فراز میں
کہ ہزاروں سجدے جھلک رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

یہ ہے کہ جہاں ''میں'' کو جھکانا کہتے ہیں' میں کو جھکانا پڑتا ہے۔ اس کے آستانے کے اوپر جھکاؤ' اس جھک جانے میں ساری دنیا کی سرفرازیاں آ جائیں گی۔ کہا کہ ہر جگہ سرفرازیوں کے ساتھ چلتا جا۔ وہاں جب اُس آستانے کے اوپر آ تو پھر **وَ هُمۡ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ** (32:15) وہاں اس طرح سے تکبر سے نہ گذر' وہاں یہ سرکشی اختیار نہیں کر۔ مومن کہیں اور نہیں جھکتے' صرف وہاں خدا کے قوانین و اقدار کے سامنے جھکتے ہیں' باقی دنیا میں کہیں نہیں جھکتے۔ ہر جگہ کبریائی ان کے حصے میں آتی ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ ''اللہ اکبر'' کہتے ہیں۔ یہاں نیچے اپنے آپ کی جو کبریائی ہے اس سے انکار نہیں ہے۔ اسے اُس جھکنے کے اندر کبریائی میسر ہوتی ہے۔

Ego (ایغو) میں اور نفس یا خودی میں فرق

اب **Ego** (ایغو) اُسے کہتے ہیں جو کہیں نہ جھکنا ہے۔ انسان کی **Personality** (شخصیت) یا نفس یا خودی اُسے کہتے ہیں' جو اس کے سامنے جھک کر ساری دنیا سے اونچا ہو جائے۔ سجدے میں اور استکبار کے اندر یہ فرق ہو گیا۔ اگر یہ وہاں بھی نہیں جھکتا تو یہ استکبار ہے' تکبر ہے' شیطنت ہے۔ ابلیس کے متعلق کہا تھا کہ **ابٰی و استکبر** (2:24). اختیار کی کیونکہ اس کے **Ego** (ایغو)

نے اُسے کہا کہ جھکنا نہیں ہے۔ یہ ابلیسیت ہوگئی' یہ شیطنت ہوگئی۔ جو مومن ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ ساری دنیا کے آستانوں سے وہ سرفرازانہ گزر گیا کسی کے سامنے نہیں جھکا۔ **مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** (3:79) دنیا میں کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے خواہ اس کو قانون سازی کے اختیارات ہیں' خواہ اس کے پاس حکومت کی لگام کیوں نہ ہو' خواہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہو کہ کسی دوسرے انسان سے کہے کہ میرے سامنے جھکو **مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** (3:78) وہ کہے گا کہ صرف خدا کے سامنے جھکو' وہ اکبر ہے۔ عزیزانِ من! یہ ہے جہاں یہ **Ego** (ایغو' پندارِ نفس)' **Personality** (شخصیت) بن جاتا ہے۔ **Personality** (شخصیت) وہ محکم خودی ہے جو اقدارِ خداوندی کے سامنے جھک کر اپنے اندر **علوا**[1] پیدا کرتی ہے۔ **Ego** (ایغو' پندارِ نفس) وہ ہے جو قوت کے بھروسے کے اوپر اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے۔

ایسا استکبار جو بغیر الحق ہو' وہ شیطنت ہے

قرآنِ کریم نے مختلف مقامات میں اس کے متعلق کہا کیا ہے؟ اُس نے **علوا یا استکبار** کو یہ نہیں کہا کہ یہ معیوب ہے یا جرم ہے بلکہ **علوا بغیر الحق یا استکبار بغیر الحق** غلط ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم سے زیادہ قوت کس کے پاس ہے۔ یعنی جو محض **Physical Power** (طبعی قوت) کے اوپر اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگ جائے تو یہ استکبار ہے' یہ دنیا کے اندر شیطنت ہے اور جو انسانی خودی میں محکمیت پیدا کرتا چلا جائے' اس کا مقام بلند کرتا چلا جائے یعنی خدا کے سامنے جھکتا ہوا' اس کی اقدار کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہوا' اس کو بلند کرتا چلا جائے تو یہ وہ استکبار ہے جو مومن کا حق ہے' یہ بغیر الحق نہیں ہے۔

روزِ قیامت غیر مسلموں کے متعلق ان کے نیک اعمال کی جزا کا سوال

عزیزانِ من! ایک اور ریفرنس (حوالہ) لے لیجیے۔ مکافاتِ عمل کی بات آ رہی ہے' قیامت سمجھ لیجیے' یوں سمجھیے کہ ان کو جہنم میں بھیجا جا رہا ہے۔ ذہن میں یہ اعتراض عام طور پہ آیا کرتا ہے کہ جی' بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں' جو مسلمان نہیں ہوتے یا اسلام نہیں لاتے حتٰی کہ خدا کو

---

[1] یہ اشارہ قرآنِ کریم کی ان آیات کی طرف ہے:

(ا) وَ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (3:138) (ب) فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ (47:35)

بھی نہیں مانتے اور اچھے کام کرتے ہیں یا نیک کام کرتے ہیں تو کیا ان کے نیک کام کا ان کو اجر نہیں ملے گا؟ اب ایک شخص حیاتِ آخرت کو مانتا ہی نہیں ہے اور بقول ان کے نیک کام کرتا ہے۔ وہ آخرت کی زندگی کو مانتا ہی نہیں ہے۔ قرآن نے کہا کہ اس کیٹگری کے جو لوگ ہیں' انہیں جب جہنم میں بھیجنے لگیں گے تو وہ کہیں گے کہ یا اللہ! ہم نے تو بہت اچھے اچھے کام بھی کیے تھے' اُن کا بھی تو ہم کو یہاں بدلا ملنا چاہیے۔ وہ (مرزا اسداللہ خاں) غالب (1797-1869) تو اور طرح سے کہتا تھا:

نا کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد

یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

وہ کہیں گے کہ یا اللہ! ہم نے اچھے اچھے کام بھی کیے تھے تو ان کا بدلا تو ملنا چاہیے کیونکہ تو تو عادل ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تم اسی دنیا کی زندگی میں Believe (یقین) کرتے تھے' اُس سے آگے تو نہیں۔ **اَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبٰتِكُمۡ فِىۡ حَيَاتِكُمُ الدُّنۡيَا وَاسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهَا** **(46:20)** جس زندگی میں Believe (یقین) کرتے تھے' اُس زندگی میں اس کا اجر تمہیں مل گیا ہے۔ جو حیاتِ آخرت میں Believe (یقین) نہیں کرتا اور اچھا کام کرتا ہے تو اس سے پوچھو کہ تم کیوں یہ کام کرتے ہو تو اس کے پاس اس کیوں کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ اور وہ جو اندر من کا چور ہے یعنی جو Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) ہے وہ تو اس کی جزا' اس کے صلے ' کے بغیر نہیں کرتا۔ اس صلے کے بغیر تو آدمی کوئی کام کر ہی نہیں سکتا جب تک پہلے دل کے اندر ایک آرزو نہ پیدا ہوا اور کوئی صلۂ جزا نہیں تو دنیا میں تعریف کرانا تو بڑی چیز ہے اور سب سے بڑی جزا یا صلہ تو یہ ہوتا ہے۔ قرآن نے اس کی دکھتی ہوئی رگ پکڑ لی کہ تم اسی زندگی میں Believe (یقین) کرتے تھے' اسی زندگی میں تمہیں اس کا اجر ملا۔ آخرت کی زندگی پہ تو تم Believe (یقین) ہی نہیں کرتے تھے اس لیے یہاں آ کر اس کا اجر تم کیسے مانگتے ہو۔ **فَالۡيَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ عَذَابَ الۡهُوۡنِ بِمَا كُنۡتُمۡ تَسۡتَكۡبِرُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ** **(46:20)** تم دنیا میں بڑا بنتے تھے' استکبار تھا' سرکشی برتتے تھے اس کو تکبر کہہ لیجیے یہ بغیر الحق تھا۔ قرآن نے حق کی یہ شرط ساتھ لگا دی کہ اگر استکبار حق کے لیے ہے تو وہ مومن کی شان ہے' اس کے بغیر وہ مومن ہو ہی نہیں سکتا اور اگر حق کے بغیر استکبار ہے تو یہ ہے جو جہنم کی علامت ہے۔ یہ ہے جسے Ego (ایغو) کہیں گے۔

ضد اور اصول پرستی میں فرق یعنی بغیر الحق استکبار کا نتیجہ فرعونیت ہے

ضد میں اور اصول پرستی میں ایک فرق ہوتا ہے۔ اصول پرستی بھی بظاہر آپ دیکھیں تو ضد ہی ہوتی ہے کہ صاحب! میں تو اس اصول کا آدمی ہوں' میں اس کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اور اسلام تو ایسے اصول دیتا ہے جن میں وہ لچک بھی نہیں رکھتا' توڑنا تو ایک طرف رہا۔ وہ کہتا ہے کہ شدت سے اس کے اوپر عمل کرو' کاربند رہو' جم کے رہو۔ اس میں استقامت ہوتی ہے' لوچ نہیں ہوتی' مفاہمت نہیں ہوتی' مداہنت نہیں ہوتی۔ عام الفاظ میں یہ بہت بڑا ضدی ہوتا ہے۔ ''میں یہ اصول نہیں چھوڑ سکتا' میں مفاہمت ہی نہیں کر سکتا''۔ یہ ہے وہ چیز کہ جو حق کے اوپر ہے وہ مفاہمت کر ہی نہیں سکتا:

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

یہ تو **Compromise** (مفاہمت) کر ہی نہیں سکتا تو کیا اس کو ضدی کہیں گے۔ اس ضد کے بغیر تو دنیا میں حق پنپ ہی نہیں سکتا۔ حق پرست کو تو بڑا ضدی ہونا پڑتا ہے۔ لیکن ویسے ضدی ہونا تو ایک عیب ہے اور یہ کونسی ضد ہے جو عیب ہے۔ یہ ضد بغیر الحق ہے یعنی غلط بات کے اوپر اڑ کر بیٹھ جانا۔ یہ ہے جو قرآن نے بار بار کہا ہے کہ جو بغیر الحق استکبار ہے' یہ ہے شیوۂ شیطنت۔ وہ قومِ عاد کے متعلق بتایا کہ **اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً** (41:15) یہ استکبار قوت سے حاصل ہوتا تھا۔ یہ اس کے لیے شیطان نے **Explanation** (وضاحت) دیا تھا کہ **خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّارٍ** (7:12) میرے پاس آگ ہی آگ ہے۔ آگ تو تخریب ہے' جلا دینے والی چیز ہے' اس میں تعمیر تو نہیں ہے۔ اس کے پاس بڑی قوت ہے لیکن قوت تخریب کے لیے استعمال کرتا ہے' جلانے کے لیے استعمال کرتا ہے' بھسم کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس سے یہ جو بات پیدا ہوتی ہے تو قوت ہی اس کے معنی ہیں۔ وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ انہوں نے کہا کہ **مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً** (41:15) قوت ہی قوت ہے' اندھی قوت ہے یعنی یہ اپنے ہی جذبوں کی تسکین کے لیے' اپنے ہی مفاد کے حصول کے لیے' **Sadism** (ایذا پسندی) کے ماتحت' کمزوروں اور ضعیفوں کو کچلنے کے لیے' صرف اپنی **Satisfaction** (طمانیت) کے لیے ہے۔

دلی طور پر کسی بات کو تسلیم کرنے کے باوجود اپنی انا کے بت کی پوجا کرنا

یہ جو اس عمل سے ''میں'' پیدا ہوتی ہے' یہ شیطنت ہے۔ یہ ہے **علوا** بغیر الحق اور یہ ہے **اَبٰی وَاسۡتَکۡبَرَ وَ کَانَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ** **(2:34)**۔ بعض مقامات ایسے ہیں' جنہیں قرآن نے عجیب انداز سے بیان کیا ہے۔ وہی جو میں نے ضد کی بات کہی ہے۔ کہا کہ ایسے بھی لوگ ہیں کہ دل ایک بات کو تسلیم کرتا ہے کہ یہ بات تو ٹھیک ہے' یہ کہتا تو ٹھیک ہے لیکن اس کے باوجود نہیں مانتے۔ وہ اس لیے نہیں مانتا کہ راستے میں **Ego** (ایغو' پندارِنفس) کھڑا ہو جاتا ہے' وہ ''میں'' نہیں ماننے دیتی۔ آپ نے دیکھا کہ یہ ''میں'' کس معنی میں آئی ہے اور اس کا مظاہرہ تو روز ہوتا ہے۔ دل مان رہا ہے لیکن یہ ''میں'' نہیں ماننے دیتی' یہ ہے شیطنت والی ''میں'' یہ ہے **Ego** (ایغو' پندارِنفس) جو راستے میں آ گیا ہے۔ قرآنِ کریم نے فرعون کے متعلق کہا ہے کہ **وَجَحَدُوۡا بِهَا وَاسۡتَيۡقَنَتۡهَآ اَنۡفُسُهُمۡ ظُلۡمًا وَّعُلُوًّا** **(27:14)** دل سے تو وہ قائل ہو گیا تھا کہ موسیٰ! جو بات کہہ رہا ہے یہی سچی ہے لیکن وہ جو ''میں'' کا استکبار تھا اور وہ جو کمزوروں کے اوپر ظلم کرنے میں لذت مل رہی تھی' وہ اسے تسلیم نہیں کرنے دیتی تھی۔ یہاں سے پتہ چل گیا کہ **علوا** جو قرآن نے کہا ہے وہ کیا ہے۔ حالانکہ مومن کو تو **اعلون** **(3:138)** کہا ہے یعنی **علوا** کا بلندترین درجہ۔ اس **علوا** میں اور اُس **علوا** میں کیا فرق ہے؟ وہ حق کا جھنڈا لے کر اس کو بلند کرتا ہے اور اس طرح سے اس کے صدقے میں خود بلند ہو جاتا ہے۔ اور یہ استکبار ہے۔ اسے قرآن نے **ظُلۡمًا وَّعُلُوًّا** **(27:14)** کہا ہے یعنی کمزوروں پر ظلم کرتا چلا جاتا ہے اور اپنے ذہن میں اپنے آپ کو بڑا سمجھتا چلا جاتا ہے۔ یہ ہے وہ استکبار۔

زعمِ باطل انسان کی صلاحیتوں کو غیر شعوری طور پر مفلوج کرتا رہتا ہے

قرآن ایک مقام پہ دو الفاظ لایا ہے' غور کیجیے اور جھوم جائیے کہ کیا کیا چیزیں کہہ جاتا ہے! کہا ہے کہ **وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتۡهُ الۡعِزَّةُ بِالۡاِثۡمِ** **(2:206)**۔ اس آیت میں قرآن دو الفاظ لایا ہے: **اَخَذَتۡهُ الۡعِزَّةُ بِالۡاِثۡمِ** **(2:206)**۔ عام طور پہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ عزت کے معنی عربی زبان میں قوت ہوتی ہے' عزیز صاحبِ غلبہ کو کہتے ہیں۔ کہتا ہے کہ جب ان سے یہ کہا جائے کہ قوانینِ خداوندی کی حفاظت کرو' نگہداشت کرو' ان کے مطابق چلو' ان کا اتباع کرو' اس کے سامنے جھکو۔ تو **اخذت** کہتا ہے۔ ایک چیز ان کو پکڑ لیتی ہے یعنی وہ جو اپنے اندر اپنی قوت کا' اپنے غلبے کا زعمِ باطل ہوتا ہے' وہ چیز ان کو پکڑ لیتی ہے۔ پکڑ لیتی ہے کہ نہ جھکنا۔ کہا

کہ بزعمِ خویش یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری قوت ہے۔ کہا کہ یہ **بالاثم** ہے۔ اثم کے معنی ہوتا ہے اضمحلال' مضمحل ہو جانا' کمزور ہو جانا۔ کہا کہ یہ اس طرح سے جو قوت کے زعم میں ان قوانین سے سرکشی برت کر غریبوں اور کمزوروں پہ ظلم کرنا ہے انہیں پتہ نہیں کہ جسے یہ عزت یا قوت سمجھ رہے ہیں' یہ آہستہ آہستہ ان میں اضمحلال پیدا کر کے کمزوری اور **عذاب الھون** کی طرف لیے چلی جا رہی ہے۔ **ھون** کے معنی بہت کمزور ہو جانا ہوتا ہے۔ یہ جھوٹی عزت ہے' یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم بہت بڑے مقام پہ پہنچ گئے ہیں۔ ان کو پتہ نہیں کہ یہ **اَلْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ (2:206)** ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی۔ دو لفظوں میں ساری بات واضح کر گیا کہ اپنے ذہن میں یہ اس کو بڑی قوت سمجھتے ہیں' بڑا اختیار سمجھتے ہیں کہ ہم نے یہ کر لیا لیکن ان کو معلوم نہیں ہے کہ اس قسم کے غلط مقاصد اور آرزوؤں کی تکمیل یا حصول کے لیے غریبوں اور کمزوروں کے اوپر زیادتی اور ظلم کرنے سے تم اس کو قوت کہہ رہے ہو' یہی تو وہ چیز ہے جو انسان کو تباہ کر دیتی ہے۔ یہاں **اثم** آیا ہے' درحقیقت یہ اضمحلال ہے' قوت نہیں ہے۔ کہا ہے کہ **فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ (2:206)** یہی لوگ ہیں کہ انجام کار جن کے لیے جہنم ہوگی۔

عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ بات بڑی ضروری تھی اور شاید کچھ خشک بھی تھی' آیئے اسے تھوڑا سا تر کریں۔ میں نے کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ ''میں'' کا **Self** کا' تقاضا یہی ہے کہ وہ کسی کے سامنے نہ جھکے لیکن ایک مقام وہ آ جاتا ہے' ایک آستانہ وہ آ جاتا ہے جہاں جھکنے کا نام بھی حقیقت میں عزت ہے' وہ ذلت کا جھکنا نہیں ہے' وہ اقدار (**Values**) کا اتباع ہے' اس کی اطاعت کرنا ہے' وہاں جھکنا ہے۔ دونوں چیزیں سامنے رکھنی چاہئیں کہ کہیں اور نہیں جھکنا لیکن وہاں ضرور جھکنا ہے اور وہاں اگر نہیں جھکا ہے تو اپنے ذہن میں آپ کتنی ہی قوت سمجھ لیں کہ حاصل ہو گئی ہے' قرآن کہتا ہے کہ آخر الامر وہ ذلت اور انتہائی درجے کی مسکنت ہے' ہر مقام کے اوپر سرفرازی نہیں ہے۔ اس کے برعکس ایک مقام وہ ہے' جہاں جھکنا ہے' اس جھکنے کے اندر ذلت نہ محسوس کرو' وہاں تمہارا **Ego** (ایغو) تمہارے راستے میں حائل نہ ہو جائے۔ اس جھکنے کے اندر حقیقت میں سرفرازی ہے۔ اس خشک موضوع کے بعد ایک غزل کا شعر ہے اور میں نے کہا ہے کہ یہ لوگ بھی بعض اوقات ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ عام طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ جگر غزل گو شاعروں میں اچھا مقام تھا۔ ایک جگہ ایک چیز کہہ گیا ہے اور ایک اصطلاح وہ استعمال کر گیا ہے۔ معلوم نہیں آپ احباب اس اصطلاح کو شاید **Appreciate** (پسند) نہ کریں لیکن میں تو اس پہ جھوم جاتا ہوں۔ یہ چیز ہے کہ ایک مقام کے اوپر جھکنا درحقیقت سرفرازیوں کا موجب ہوتا ہے۔ مقام ایسا آتا ہے اور آنا چاہیے جہاں انسان جھک جائے اور وہاں جھکنے میں ذلت محسوس نہ کرے بلکہ فخر محسوس کرے۔ کہا کہ:

تیرے دل کے ٹوٹنے پر ہے کسی کو ناز کیا کیا

تجھے اے جگر مبارک یہ شکستِ فاتحانہ

عزیزانِ من! اس کے دروازے کے اوپر جھکنے میں جو تم شکست سمجھتے ہو تو حقیقت میں یہ شکستِ فاتحانہ ہے۔ یہ ہے **واسجد واقترب** (96:19) جھک جا اور آ! میرے گلے سے مل جا۔ یہ شکستِ فاتحانہ ہے۔ ہلکے پھلکے انداز میں ایک اور نے بھی یہ بات کہی ہے۔ کہا ہے کہ

ہار جانے میں انا کی بات تھی

جیت جانے میں خسارہ اور ہے

ایسے مقام بھی ہیں جہاں جیت جانے میں خسارہ ہوتا ہے۔ یہ بات جگر نے مبہم رکھی تھی اور غزل میں یا شعریت میں خوبصورتی یہی ہوتی ہے کہ اس میں Suggestiveness (ایمائیت) ہو' کھل کر بات نہ کہی گئی ہو بلکہ ایک اشارے میں بات کہے اور انسان خود وہاں پر پہنچے۔ اس نے جو کہا ہے' بات کھل کر کہی کہ جیت جانے میں خسارے کی بات کہی ہے لیکن اس کی جو بات ہے کہ ''تجھے اے جگر مبارک یہ شکستِ فاتحانہ'' یہ ایمائیت والی بات ہے۔ یہ ہے حقیقت میں اسلام۔ اسلام کے معنی ہی جھک جانا ہے' عام الفاظ میں انا کی شکست ہوتی ہے اور یہی تو اس کی فتح ہوتی ہے۔ **خَرُّوْا سُجَّدًا ......وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ** (32:15) دو ٹکڑے ملائے اور دیکھیے ۔ کہا کہ یہ جو تمہارا جھک جانا ہے' یہ وہ مقام تھا جہاں اگر تم جھکتے نہیں اور اسی طرح سر اونچا رکھتے تو شکست تھی۔ جھک جانا کہ جسے عام معنوں میں شکست کہو گے تو حقیقت میں یہی تو تمہاری فتح ہے۔ مومن کی صفات یہ ہیں کہ وہ دنیا میں کسی کے سامنے نہیں جھکتا لیکن ایک آستاں ایسا بھی آتا ہے جہاں سر اٹھا کر نہیں چلتا بلکہ جھکتا ہے۔ **اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ** (32:15)۔ مومن کے یہ شعار ہیں۔ اور آپ نے سائیکولوجی والوں کے نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھ لیا کہ Personality (شخصیت) اور Ego (ایغو' پندارِ نفس) میں کیا فرق ہے۔ قرآن یوں باتیں بیان کر جاتا ہے۔

ایک رات میں ہزار ہزار نفل اور عمر میں نو لاکھ مرتبہ قرآن حکیم کے ورد کی حقیقت

عزیزانِ من! اب آگے مومن کی Definition (تعریف) آئی۔ کہا کہ **تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ**

رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (32:16)۔عام ترجمے میں آپ دیکھیے تو وہی آپ کے ہاں تصوف کی شریعت آ جائے گی کہ ان کے پہلو بستروں سے الگ ہو جاتے ہیں' وہ ڈرتے ہوئے طمع کے ساتھ اپنے خدا کو بلاتے رہتے ہیں۔یہ جتنے بڑے بڑے اولیاء اللہ ہیں ان کے متعلق خصوصیت سے یہ بتایا گیا ہے کہ وہ راتوں کو عبادت میں مشغول رہتے ہیں' سوتے نہیں ہیں۔تو جب سوتے نہیں تو پھر وہ اللہ کی عبادت کرتے ہیں' نفل پڑھتے رہتے ہیں' ایک رات میں ہزار ہزار نفل پڑھتے ہیں۔کبھی پوچھا ہی نہیں کہ دو نفل میں کتنا وقت لگتا ہے اور ہزار میں گن تو سہی کہ کتنا ٹائم ہوا۔ڈیرہ غازی خان کے پاس ''نولکھ ہزاری'' ایک بابا ہیں۔ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی عمر میں نو لاکھ مرتبہ قرآن شریف ختم کیا تھا۔مجال ہے جو یہ قوم حساب کر لے ''حساب تے لالے آں نوں اونداسی' ایناں نوں کا ہنوں اونڑا''❶۔ وہ جو گاؤں کا ''لالہ'' ہمارے ہاں کے زمیندار سے حساب کیا کرتا تھا' وہ ایک دفعہ سو روپیہ قرضہ لے لیتا تھا تو ساری عمر نہیں چھوٹتا تھا۔یہاں کہا ہے کہ راتوں کو یہ سوتے نہیں' عبادت کرتے رہتے تھے' نفل پڑھتے رہتے تھے' قرآن شریف پڑھتے رہتے تھے۔یہ جو ساری رات جگاتے ہیں' وہ یہی ہیں' جو ولی اللہ بناتے ہیں۔

نبی اکرمؐ کے متعلق خدا تعالیٰ کا ارشاد

نبی اکرم ﷺ کے متعلق قرآن میں خدا نے یہ کہا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ (73:1). اس کا ترجمہ انہوں نے کملی والے کر دیا۔خیر یہ اور جگہ بتاؤں گا کہ مزمل کیا ہوتا ہے۔بات یہ ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ . قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا (73:1-2) ٹھیک ہے رات کو بھی کچھ کام کاج کرنا ہوتا ہے' پروگرام کے متعلق کچھ تدبیریں کرنا ہوتی ہیں لیکن تھوڑے سے وقت کے لیے سونا نہایت ضروری ہے۔اللہ تعالیٰ رسول اللہؐ سے یہ کہہ رہا ہے۔یہ ساری رات جگا کر ان کو ولی اللہ بنا رہے ہیں۔کہا ہے کہ ہم یہ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ سارا دن جو تم نے کام کرنے ہیں وہ تو بڑا پروگرام ہے' وہ تو اُسی صورت میں تو کر سکے گا کہ تو رات کو سو لے۔''تے جناں نے دن نوں سارا دن سونا ہووے تے رات نوں جاگنا ہویا' یا اُلواے کرداۓ' یا اے کرداۓ''❷۔نبی اکرم ﷺ سے بڑی ہستی مقرب بارگاہِ الٰہی کون ہو سکتی تھی۔خدا ان سے یہ کہہ رہا ہے۔اور جو میں یہ بتاؤں کہ یہ مزمل کی صورت میں کیوں کہہ رہا ہے تو یہ ایک بڑی چیز ہے' گرانقدر ہے۔

---

❶ حساب تو ہندوؤں کو آتا تھا' انہیں کا ہے کو آنے لگا۔

❷ جنہوں نے سارا دن سونا ہو اور ساری رات جاگنا ہو' وہ تو یا اُلو یہ کام کرتا ہے یا یہ اس کام کو کرتے ہیں۔

ضربیں لگانے والوں کے برعکس راتوں کو کم سونے والوں کی عملی زندگی کی کیفیت

بہرحال یہ جو چیز ہے کہ صاحب! مومن یہ ہیں کہ بستروں سے ان کے پہلو الگ رہتے ہیں' خدا کو پکارتے ہیں' **خَوْفًا وَّ طَمَعًا**۔ یہ مومن کی کیا چیز ہے کہ جو سوتے بھی کم ہیں۔ **اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَاب (3:190)** ارض و سماوات کی تخلیق میں' لیل و نہار کے اختلاف میں' اللہ کے دیئے حقائق کو سمجھنے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں لیکن ان کے لیے ہیں' جو عقل کی انتہا پہ پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ **الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ (3:191)** یہ وہ لوگ ہیں' جو قوانینِ خداوندی کو سامنے رکھتے ہیں: **قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ (3:191)** کھڑے' چلتے' لیٹے۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ **یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (3:191)** تخلیق ارض و سماوات کے اوپر غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ یہاں وہ بات آئی کہ کھڑے بیٹھے لیٹے یہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ یہ ہے وہ جس کے لیے کہا ہے کہ بستروں کے ساتھ ان کے پہلو الگ ہو جاتے ہیں۔ یہ کھڑے بیٹھے لیٹے **یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (3:191)** کرتے ہیں۔ ''ضرباں نہیں لاندے رہندے''[1]۔ اور اتنی تگ و تاز کے بعد' اتنی تحقیق اور تفتیش اور تجسس کے بعد' وہ کہتے ہیں کہ **رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا (3:191)** اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے یہ سلسلۂ کائنات یونہی باطل نہیں پیدا کیا۔ مومن یہ کرتے ہیں' اس مقصد کے لیے ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں۔

قرآنی تعلیم کے برعکس دنیائے تصوف کے نزدیک کائناتی نعمتوں کی قدر و منزلت

یورپ کے ریسرچ اسکالرز سے پوچھو کہ ان کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ یعنی ایک ایک نکتہ لیے ہوئے' بیٹھے ہوئے' لیٹے ہوئے' کھڑے ہوئے' غور کرتے رہتے ہیں۔ چل رہے ہیں افریقہ کے صحراؤں میں' آسٹریلیا کے جنگلوں میں۔ **یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (3:191) ۔ عزیزانِ من! یہ تو قرآن نے مومنین کی صفات بتائی تھیں۔ کون لے گیا ہم سے لوٹ کر یہ سب کچھ اور ہم کہاں رہ گئے ہیں؟ کہا ہے کہ **رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا** (3:191) ہم نے یہ سلسلۂ کارگہ کائنات کو بلا مقصد پیدا نہیں کیا' تخریب کے لیے پیدا نہیں کیا۔ کہا کہ **سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ** (3:191) تو اس سے بڑا بلند ہے کہ اتنا بڑا کارگہ کائنات

---

[1] (دل پر) ضربیں نہیں لگاتے رہتے۔

ہواوراس کو بلامقصد ہی پیدا کردے۔ جواس سے ایسا سمجھتا ہے' وہ جہنمی ہے۔تصوف والے کہتے ہیں کہ دنیا ایک لاش ہےاوراس کے چاہنے والے کتے ہیں۔قرآن کہتا ہے کہ **رَبَّنَآ اِنَّکَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَہٗ** (3:192) اے نشوونما دینے والے! تو نے تو یہ سلسلۂ کارگہہ کائنات نشوونما دینے کے لیے پیدا کی ہے۔

کائنات کے تخلیقی مقصد کو پیشِ نظر نہ رکھنے والوں کی حالت زار

جو یہ سمجھتا ہے کہ یہاں یہ دنیا' یہ کائنات' باطل ہے' تخریب کے لیے ہے' بے مقصد ہے' نفرت کے قابل ہے' وہ جہنمی ہے۔کہا ہے کہ **فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَہٗ** (3:192) وہ دنیا میں ذلیل وخوار ہوکر رہتا ہے۔جن قوموں نے اس کائنات(Physical World) کی فطرت کی قوتوں کو مسخر نہیں کیا بلکہ انہیں قابلِ نفرت سمجھا تو **اخزیتہ** وہ ذلیل وخوار ہیں۔اوراگلی بات ہے کہ **وَ مَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ** (3:192) خود ذلیل وخوار ہوتے ہیں اور دنیا میں سچے معنوں میں ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔جو محتاج ہے اس کا کوئی دوست کیسے ہوسکتا ہے۔ان کے برعکس وہ لوگ بھی ہیں جو **یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا** (32:16) خدا کو پکارتے ہیں' پروگرام سامنے ہے' کبھی یہ خوف ہوتا ہے کہ اس کے اندر بعض چیزیں خطرات کی نہ آجائیں تو وہاں بھی وہ خدا کے قوانین کو دعوت دیتے ہیں کہ یہاں کیا کرنا ہے۔جب خوشگوار نتائج سامنے آتے ہیں تو **طمعًا** وہاں وہ اس چیز کے اوپر اتراتے نہیں ہیں کہ یہ ہماری کاریگری سے یہ کچھ ہوا ہے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو صرف Discover (بےنقاب) کیا ہے'ان چیزوں کو بنایا تو نہیں ہے۔یہ دونوں گوشے ہیں۔ ان دونوں میں وہ خدا کے قوانین کو دعوت دیتے ہیں' پکارتے ہیں۔کائنات کی قوتوں پہ غوروفکر کیا'ان کو مسخر کیا' اتنا بڑا پروگرام ہے' چلتے پھرتے' اٹھتے بیٹھتے'اس میں منہمک رہتے ہیں۔یہ سارا کچھ کرنے کے بعد یہ سب کچھ حاصل کیا۔کہا کہ **وَّ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ** (32:16) ہم انہیں ان کے اس سعی وکاوش کے نتیجے میں جو کچھ دیتے ہیں وہ خود ہی اس کو سنبھال کر نہیں بیٹھ جاتے اور یہ بھی نہیں ہے کہ وہ صرف اپنے ہی قبیلے یا اپنے ہی خاندان یا اپنی قوم یا اپنے ملک تک محدود رکھیں بلکہ عالمگیر انسانیت کے کھلا رکھتے ہیں۔اسی لیے اُس نے لفظ **یُنۡفِقُوۡنَ** استعمال کیا ہے۔آپ کو معلوم ہے اور میں کئی دفعہ بیان کرچکا ہوں کہ **انفاق** کے معنی ہوتے ہیں ''کھلا رکھنا'' یعنی جسے ضرورت ہو لے لے۔قرآن میں ہر جگہ لفظ ہی **انفاق** آیا ہے۔

عربوں کے ہاں رزق اپنے اندر وسیع تر مفہوم کی شکل میں استعمال ہوتا ہے

کہا ہے کہ **وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ** (32:16)۔رزق عربوں کے ہاں بڑا جامع لفظ ہے۔نشو ونما کے لیے خواہ وہ انسان کی جسمانی نشو ونما ہو یا اس کی انسانی صلاحیتوں کی نشو ونما ہو یا اس کی ذات کی نشو ونما ہو‘ان کے لیے جو کچھ بھی سامان اور وسائل اور اسباب اور ذرائع جو دیئے جائیں‘ان کے لیے ان کے ہاں لفظ رزق آتا ہے۔اور بھی لفظ آسکتے تھے لیکن ان کے ہاں رزق میں خصوصیت یہ ہے کہ جس چیز کی جس وقت ضرورت ہو‘ اُسے اُس وقت جو دینا ہے‘ یہ رزق کہلائے گا۔بچے کی کھیر کا جو وقت ہے‘ اس وقت آپ اُسے دیں گے تو اسے تو وہ رزق کہیں گے۔اگر اُس کا وقت آپ نے ٹلا دیا ہے اور کسی دوسرے وقت میں دیتے ہیں تو عربی زبان کے اعتبار سے اس کو رزق نہیں کہتے۔کیا بات ہے اس قوم کی اور کیا بات ہے قرآن کی! دینا اس طرح سے اور ہر ضرورت کے بروقت دینا‘ کہا کہ **وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ** (32:16) وہ اسے ہر ایک کے لیے کھلا رکھتے ہیں۔

رزق کی دوسروں کے لیے کھلا رکھنے پر اجر کی تفصیل لامنتہا ہے

کہا کہ یہ ہیں مومن جو یہ کچھ کرتے ہیں۔اس طرح کا پروگرام ہے جس کے لیے سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔اس کے بدلے میں ہم کیا دیتے ہیں؟ کہا کہ کیا بتائیں کہ ہم کیا دیتے ہیں!! جو ہم نے آج دینا ہے‘ وہ تو تمہاری سمجھ میں بھی نہیں آسکتا۔کہا کہ **فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ** (32:17) ۔ **قرة اعين** کہا ہے جسے ہم آنکھوں کی ٹھنڈک کہتے ہیں۔ہمارے ہاں بھی مائیں کہا کرتی تھیں کہ بچہ ”تینوں ویکھ کے تے اکھاں اچ ٹھنڈ پے جاندی اے“ [1]۔کہا کہ آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان ہم نے ان کے لیے رکھا ہے‘ آج تو کسی کی سمجھ میں بھی نہیں آسکتا کہ وہ کیا ہے اس لیے آج جو سمجھو گے تو اپنے شعور کی موجودہ سطح تک ہی سمجھو گے اور اس کے بعد کی جو زندگی ہے وہ تو تمہارے شعور کی موجودہ سرحد سے آگے کی زندگی ہے۔جو آگے کی زندگی کی چیز ہے‘ اس سرحدِ ادراک کے اندر اس کو کیسے بیان کریں کیونکہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔قرآن میں ہے کہ **لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا** (50:35) وہاں جو مانگو گے ملے گا‘ جو چاہو گے ہوگا۔یعنی اس کے بعد اور چاہیے کیا۔اس کے بعد ہے کہ **وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ** (50:35) ہمارے پاس اس

---

[1] تجھے دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔

سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ کہا کہ تم جو مانگو گے' تم جو چاہو گے وہ تو اپنے اسی محدود ذہن کے مطابق چاہو گے اور ہم تو تمہیں اس سے بھی آگے دیں گے۔ کہا کہ ہمیں پتہ ہے کہ تمہاری جو مانگ اور آرزو ہے وہ تو تمہارے محدود ذہن کی ہے' وہ تو محدود ہے اور وہاں تو یہ محدودیت ختم ہوگی اس کے لیے کہا کہ **وَلَدَيْنَا فِيْهِ مَزِيْدٌ**(50:35) ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ ہے۔ کیا بات ہے اس خدا کی! اس کے بعد یہ کہا کہ **فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (32:17)** ہم تمہارے اوپر کوئی احسان نہیں کریں گے' تم نے تو یہ دن بھر محنت کی ہوگی' شام کو تمہیں اس کی مزدوری دیں گے۔ دیں گے ایسی جو تم سوچتے تھے کہ آج اُس سے طے کیا ہوا ہے کہ شام کو دس روپے ملیں گے۔ تو دس نہیں بلکہ کچھ اور بھی ملے گا۔

عزیزانِ من! یہ جتنی لذت اس سے اوپر کچھ ملنے میں ہوتی ہے' وہ بڑی چیز ہوتی ہے۔ اور یہاں کہا کہ احسان نہیں بلکہ **جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (32:17)**۔ جو کیا ہے یہ اس کا صلہ ہے۔ اس کے بعد کہا کہ اب دیکھو کہ ایک گروہ ہم نے وہ بتایا تھا' جو اس مقام سے' ہمارے آستاں سے' سرکشی سے نکل جاتا ہے اور اپنے آپ کو بڑا قوت والا سمجھتا ہے۔ ایک وہ ہیں جو یہاں پہ جھکتے ہیں اور یہ سب چیزیں ملتی ہیں۔ کہا کہ **اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا (32:18)** کیا یہ دونوں برابر ہوسکتے ہیں؟ پھر خود ہی کہا کہ **لَا يَسْتَوٗنَ (32:18)** یہ دونوں برابر نہیں ہوسکتے۔ کئی مقامات ہیں جہاں قرآن نے کہا ہے کہ اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہوسکتے' تاریکی اور روشنی برابر نہیں ہوسکتی' زندہ اور مردہ برابر نہیں ہوسکتے' جاننے والا اور نہ جاننے والا برابر نہیں ہوسکتے۔ **اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى نُزُلًا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (32:19)** ایمان و عملِ صالح کا نتیجہ جنّت ہیں' باغات ہیں۔

جنت مومن کا کوئی آخری مسکن نہیں

اب میں کیا عرض کروں کہ **ماوٰی** کیا ہوتا ہے! یہ وہی ہے' جیسے کہتے ہیں کہ بابا! تم تو اپنے ہی گھر میں آگئے ہو' **ماوٰی** اپنے ہی گھر میں آنے کو کہتے ہیں۔ اور اس کے اندر اگلی بات یہ ہے کہ جنت بھی آخری مقام نہیں ہے۔ **ماوٰی** تو ایسے ہے کہ جیسے اپنے گھر میں آگئے ہو لیکن یہاں صرف رات بسر کرنے کے لیے رہا جائے' صبح اٹھ کر اور آگے چلنا ہے۔ جنت بھی سلسلۂ ارتقا کا آخری مقام نہیں۔ آگے

بات بڑی دلچسپ ہے کہ تم اپنے ہی گھر میں آ گئے یہ سب کچھ ہم نے تمہیں دیا۔ کہا کہ یہ کوئی ایسے خیال نہ کر لینا کہ تم پہ کوئی احسان کیا ہے۔ یہ تو **نُـزُلًا** (41:32) ہے۔ تم تو ہمارے مہمان ہو' مہمان کو جو دیتا ہے وہ احسان نہیں کرتا۔ یہ چیز عزت کی آئی لیکن یہ سمجھ لو کہ یہ نہیں ہے کہ خواہ مخواہ کے لیے چلتے ہوئے آ گئے ہو' دروازہ کھلا اور تم مہمان بن گئے۔ یہ تو **بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (32:19) ہے۔ بات ساری عمل کی ہے۔

قرآنِ حکیم کو سمجھنے اور سمجھانے کی تخلیقی کاوشوں کی ایک جھلک

عزیزانِ من! سورۃ السجدۃ کی آیت 19 تک آ گئے' بات آگے بھی چلے گی لیکن مجھے آپ سے دو تین منٹ لینے ہیں۔ میں پہلے یہ عرض کر دوں کہ بہر حال اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے' اپنے متعلق کچھ کہنے میں' کچھ لکھنے میں' ہمیشہ کوئی چیز میرا ہاتھ پکڑ لیا کرتی ہے' دامن گیر ہو جایا کرتی ہے لیکن بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنا تعارف نہیں ہوتا بلکہ ایک وسیع چیز آتی ہے' اس کا تعارف ہوتا ہے۔ میں درس دیتا ہوں اور یہ میری زندگی کا مشن ہے' مقصد ہے' جنون ہے: قرآنِ کریم کا سمجھنا اور اس کو سمجھاتے چلے جانا۔ اسے سمجھانے کے مختلف طریقے ہیں' ایک ان میں سے درس بھی ہے' یہی چیزیں تحریر کے ذریعے سے بھی آتی ہیں۔ قرآن کے سمجھانے کے لیے میں نے ''لغات القرآن'' مرتب کیا ہے یعنی عرب جس طرح سے الفاظ کے معنی لیتے ہیں' وہ لیے ہیں' میں نے ''لغات القرآن'' کی روشنی میں سارے قرآنِ کریم کا مفہوم متعین کیا ہے [1]۔ میں نے تصریفِ آیات کے ذریعے انسائیکلو پیڈیا ''تبویب القرآن'' مرتب کیا ہے۔ یہ تقاضا بڑھتا چلا گیا کہ صاحب! قرآن کی تفسیر' شروع سے آخر تک' مسلسل یہ بھی دیتے چلے جائیے۔ ''مطالب الفرقان'' کے نام سے یہ سلسلہ شروع کیا۔ اس کی دو جلدیں پہلے شائع کیں۔ پہلی جلد میں تو سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرہ کی صرف 29 آیتیں آئی ہیں۔ یہ ساڑھے چار سو صفحات کی کتاب ہے۔ آپ سوچ لیجیے کہ اس میں کیا کچھ نہیں آ گیا۔ وہ جیسے ایک درس میں آپ دیکھتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ آ جاتا ہے۔ اس کی دوسری جلد شائع ہوئی وہ سورۃ البقرہ کی 30 آیت سے 112 آیت تک پہنچی۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے یہ تیسری جلد بھی آ گئی ہے۔ اس میں سورۃ البقرہ ختم ہو گئی۔ گویا تین جلدوں میں سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرہ مکمل آ گئی ہیں۔ یوں تو کہنے کو کہیں گے کہ

---

[1] اس کا نام ''مفہوم القرآن'' ہے۔

صاحب! یہ ایک سورۃ کی تفسیر ہے۔ اس کے آخر میں' میں نے ایک انڈکس (اشاریہ) دیا ہے۔ اُس انڈکس (اشاریہ) میں آپ دیکھیے میرا خیال ہے شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جو آپ کے ذہن میں آئے اور اس کے اندر آپ کو نہ ملے۔ وہ انڈکس (اشاریہ) ان تین جلدوں کا ہے۔ گویا ان تین جلدوں میں اتنا کچھ آ گیا ہے کہ اسلام کے متعلق' زندگی سے متعلق' جو بھی اہم مباحث آپ کے ذہن میں آئیں گے' وہ ان میں آپ کو مل جائیں گے۔ اور ابھی تو سورۃ البقرہ ختم ہوگئی ہے۔ زندگی جوئے رواں است رواں خواہد بود' یار زندہ صحبت باقی۔ یہ ابھی مکمل ہو کر آئی ہے۔

عزیزانِ من! ہمارے ہاں ایک اور سلسلہ بھی ہے۔ میں نے ایک طرح ڈالی اور کامیاب رہا کہ اسلام کے متعلق جو کچھ بھی سنو' پڑھو' اس کے متعلق سوچو اور سوچنے کے بغیر اس کو تسلیم نہ کرو۔ یہ کامیابی ہوئی اور سوچنا شروع کیا اور جب سوچنا شروع کیا تو جس چیز کا نام اسلام تھا' جو ہمارے ہاں مروج ہے' اس نے تو قدم قدم کے اوپر شکوک شبہات اعتراضات کی' یہ ساری چیزیں' ابھریں۔ یہ چیزیں پیدا ہوئیں تو میں نے سمجھا کہ ہمارا فریضہ یہ بھی ہے کہ ان کے اعتراضات کا جواب دیا جائے' شکوک کو حل کیا جائے۔ یہ اس طرح سے استفسارات یا سوالات آنے شروع ہوئے۔ ان کا جواب ہم ''طلوعِ اسلام'' میں شائع کرتے چلے گئے۔ اس کے بعد یہ تقاضا ہوا کہ یہ بڑی مفید چیز ہے ان کو کتاب کی شکل میں لے آیئے۔ وہ ہم کتاب کی شکل میں لائے اور اس کا نام تھا ''قرآنی فیصلے''۔ آہستہ آہستہ وہ چیزیں جمع ہوتی گئیں اور ہم ان کو جلدوں میں شائع کرتے چلے گئے' اس کی بھی تین جلدیں شائع ہوگئیں۔ اور اس کے بعد پھر اس کی چوتھی جلد بھی آ گئی۔ اسی فہرست میں آپ دیکھیے گا کہ کیا کیا چیزیں ہیں' کس کس قسم کے اعتراضات ہیں اور قرآن اور علم و بصیرت کی روشنی میں کس کس قسم کے ان کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ میں نے جو ان فہرستوں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ آپ کے گھروں میں یہ چیز ضرور ہونی چاہیے۔ بچوں کو ان کے متعلق کچھ سمجھانا ہو' بالخصوص اسکول میں جب ان بچوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ کپڑا اچھاؤ اور کھجور کی گٹھلیوں کے اوپر سوا لاکھ مرتبہ یہ پڑھو اور تم امتحان میں کامیاب ہو جاؤ گے تو میری چھوٹی سی بچی نے کہہ دیا کہ مس! تم تو کہتی تھی کہ تم ٹیوشن لو پھر تم کامیاب ہوگی اور اب تم کہتی ہو کہ گٹھلیں گننے سے پاس ہوتے ہیں تو پھر میں ٹیوشن کیوں لوں۔ بچی آ کر پوچھتی ہے کہ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے۔ آپ کے گھروں میں یہ بچے پوچھتے ہیں' قسم قسم کے سوالات

کرتے ہیں جن کے جوابات مذہب کی دنیا میں نہیں ہیں۔ اس قسم کی چیزیں ان کتابوں کے اندر آ گئیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے۔ میں نے یہ تعارف ضروری سمجھا ویسے آپ کو معلوم نہیں ہوسکتا کہ ان میں کیا چیز ہے۔ یہ بڑی مفید چیزیں ہیں' میری زندگی میں ان کو لے لیجیے بعد میں بھی یہ چیزیں آتی رہیں گی۔

عزیزانِ من! آج ہم سورۃ السجدۃ کی آیت **19** تک آ گئے۔ آگے آیت **20** میں بات جہنم کی آئے گی۔ اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔ آپ کا شکریہ۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

پانچواں باب: **سورة السجدة** (آیات 20 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج دسمبر **1979**ء کی **14** تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ السجدۃ کی آیت **20** سے ہو رہا ہے: **(32:20)**۔

دنیا بھر کے مسلمانوں کی حالت اور یہودیوں کی تباہی کے لیے دعاؤں کا سلسلۂ دراز

سابقہ آیات میں دو گروہوں کا تقابل چلا آ رہا تھا۔ ایک جنہیں اہلِ جنت کہہ کر پکارا گیا ہے' دوسرے جنہیں جہنمی کہا گیا ہے۔ اور کہا گیا کہ مومن اور فاسق دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے' ان کی زندگی ایک جیسی نہیں ہو سکتی۔ یعنی مسلمان اور غیر مسلم ایک جیسے نہیں ہو سکتے' مومن اور کافر ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ ٹھیک ہے جس زمانے میں مومن ہوتے تھے اُس زمانے میں ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ صحیح

تفسیر یہ تھی جو قرآن نے کہا تھا کہ مومنین پر کفار کبھی غالب نہیں آسکتے۔ آج اتنا سا حصہ تو صحیح ہے کہ مومن اور کافر ایک جیسے نہیں ہوسکتے لیکن جو اگلا ٹکڑا ہے اس میں کچھ فرق آ گیا ہے کہ جو کفار ہیں، وہ مومن پر کبھی غالب نہیں آسکتے۔ یہ حصہ تو ٹھیک ہے کہ ایک جیسے نہیں ہیں لیکن ذرا خصوصیت الٹ گئی ہے کہ یہ ان کے اوپر کبھی غالب نہیں آسکتے۔ ساری دنیا میں جہاں دو مسلمان ملیں تو ان کا ایک ہی رونا ہوتا ہے کہ مسلمان تباہ ہو گئے' اقوامِ یورپ نے ان کو ختم کر دیا' وہ چڑیا جتنی ایک مملکت' جس کے متعلق یہ تیرہ سو سال سے کہتے آ رہے تھے کہ یہودی مغضوب علیہ ہیں' ان کی کبھی مملکت قائم نہیں ہوسکتی' اُنہوں نے ایسی مملکت قائم کر کے دکھائی ہے کہ تیس سال سے عرفات کے میدان میں جہاں یہ کہتے ہیں کہ ہر دعا قبول ہوتی ہے وہاں بیس بیس لاکھ مل کر' رو رو کر' دعائیں مانگتے چلے آ رہے ہیں کہ یا اللہ! اسرائیل کو تباہ کر دے لیکن اسرائیل ہے کہ محکم سے محکم تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ بات تو ٹھیک ہے کہ مومن اور کافر ایک جیسے نہیں ہوسکتے۔ قرآن بھی ہم پڑھتے چلے آ رہے ہیں' یہ آیتیں بھی ہمارے سامنے آ رہی ہیں بس اس کے بعد یہ ہے کہ بہرحال ان آیتوں کا ثواب تو ہوتا ہی ہے۔ اہلِ جنت کے متعلق تو قرآن نے کہا تھا کہ جنت میں یوں سمجھیے جیسے اپنے گھر میں تم آ گئے ہو' تکلف کی بھی ضرورت نہیں ہے اور عزت کے اعتبار سے یہ کہا تھا کہ **نُزُلًا** (41:32) ایسے آئے جیسے کسی کے ہاں مہمان آتا ہے۔ خدا کے نزدیک یہ بڑا مقام ہے جیسے کوئی مہمان کسی کے گھر میں آ گئے۔ اور اس کے بعد مہمان اور اس میں کچھ فرق کرنا ضروری سمجھا' قرآن کہیں سے نکلنے ہی نہیں دیتا۔ کہا کہ **بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (32:17) لیکن یاد رکھو! یہ عمل کے نتیجے میں ایسا ہوگا ''ایویں ناں پروہنے بن کے آ جانا کہ چلو موج لگی ہوئی ہیگی اے سویاں تے لبن گیاں ناں کھان نوں''[1]۔

جہنم میں جہنمیوں کی بے بسی کی کیفیت

وہ کہتا ہے کہ **بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْن** (32:17) وہ عزت و تکریم تو ہوگی کہ جیسی مہمان کی ہوتی ہے لیکن یہ جو مہمانی ہے یہ اس کی قیمت تو پہلے ادا کی جائے گی' پھر اس کے بعد مہمانی ہوگی۔ اس کے مقابلے میں اہلِ جہنم ہیں جن کو فاسق کہا تھا۔ ان کے لیے کہا کہ **وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰهُمُ النَّارُ** (32:20)۔ جو فاسق ہیں' ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ آگے ایک چیز آئی ہے کہ انسان کانپ جاتا ہے۔ کہا ہے کہ **كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا** (32:20) جہنم کی کیفیت یہ ہوگی کہ وہ اہلِ جہنم اس زندگی سے

---

[1] ایسے ہی مہمان بن کر نہ آ جانا کہ چلو بھئی! موج ہوگئی' کھانے کو سویاں تو ملیں گی ہی۔

تنگ آ کر اگر چاہیں گے کہ وہاں سے نکل ہی جائیں تو ان کو دھکے دے کر وہیں واپس لوٹا دیا جائے گا۔ ہمارے ہاں تو ان تمام آیات کی عملی تصویر کو قیامت پر اٹھا رکھا ہے کہ وہاں یہ ہوگا۔ پھر انہوں نے ہمیں جنت کا بھی وہ نقشہ دیدیا اور جہنم کا بھی دیدیا' سروے کر کے دیدیا' انہوں نے تو حوضِ کوثر کی لمبائی چوڑائی بھی بتائی ہوئی ہے' یہ بھی بتایا ہوا ہے کہ وہاں جو آبخورے ہونگے وہ کتنی تعداد میں ہونگے۔ بہت کچھ Detail (تفصیل) میں بتایا گیا ہوا ہے۔

جہنم کا ذکر ہو یا جنت کا' یہ سب کا سب تمثیلی طور پر ہی بیان کیا گیا ہے

جہنم کے متعلق بھی اس طرح سے بڑی تفصیل ہے۔ ان کے ذہن کے اندر تصور کچھ ایسا ہی ہے کہ جیسے ایک بہت بڑا گڑھا ہو اور اس میں بہت سی لکڑیاں جلا رکھی ہوں' شعلے ہوں اور اس کے اندر کسی کو ڈالا جائے۔ اب وہاں سے نکلنے کی بات بھی اسی طرح سے ہے' تفاصیل میں وہ ایسا ہی ہے کہ جیسے وہاں سے کوئی دیوار کے اوپر اس طرح سے ہاتھ رکھ کر اوپر چڑھتا ہے اور جب آخر میں جا کر وہ اوپر ہاتھ پڑ جاتا ہے تو وہاں فرشتے موجود ہوتے ہیں' وہ ان کا ہاتھ وہاں سے کچل کر پھر نیچے ڈال دیتے ہیں۔ وہ ہزار نکلنا چاہیں گے لیکن نکل نہیں سکیں گے۔ قیامت اور اس کی جنت اور جہنم کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یہ سارے تمثیلی انداز ہیں۔ ہم نے سابقہ درس میں وہ آیت (32:17) دیکھی ہے کہ کوئی شخص جان نہیں سکتا کہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے ہم نے کیا رکھا ہے۔ اور جہنم کے متعلق تو کہا ہے کہ اس کی آگ دلوں کو لپیٹ لے گی۔ قرآن اس قسم کے اشارے کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اس کے متعلق صحیح اندازہ نہیں کر سکتے کہ وہ کیا ہوگا کہ تم عالمِ محسوسات میں ہو اور وہ دنیا اس سے آگے کی دنیا ہے لیکن اس نے بتایا یہ ہے کہ یہ جنت اور جہنم یہاں سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں کی جنت اور یہاں کا جو جہنم ہے' وہ تو ہمارے سامنے ہے۔

انسان نے کرّہ ارض پر ہی لکیریں نہیں کھینچیں بلکہ پوری انسانیت کو ہی ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے

یہی جو آیت ہے تو شاید اُس زمانے میں اس کی صحیح تاویل سمجھ میں نہ آ سکتی ہو لیکن آج تو ہمارے سامنے ہے۔ خدا کی یہ دنیا (کرۂ ارض) پہ اس نے آدم کے متعلق کہا تھا کہ تمہارے لیے **مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ** (7:24) ہے یعنی مستقر کرۂ ارض بنی آدم کا ہے۔ پورا کرہ ارض انسانوں کا مستقر ہے' رہنے کی جگہ ہے جہاں جی چاہے رہیں۔ پورا کرۂ ارض پورے انسانوں کے لیے ہے۔ مگر انسانوں نے کرۂ ارض کے اوپر لکیریں کھینچ لیں اور اب ان لکیروں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ لکیروں کے اندر Geographical

Territories (جغرافیائی حدود) کے اندر جو ایک سلطنت ایک مملکت قائم ہوتی ہے اس لکیر سے اِدھر والا نہ اُدھر جا سکتا ہے' نہ اس لکیر کے اندر والا باہر آ سکتا ہے۔ یعنی اب نوعِ انسانی کے لیے ارض یا پوری زمین مستقر نہیں ہے بلکہ وہ جو لکیریں کھینچ دی گئی ہیں اس کے اندر رہنے والا بنی آدم اس کے لیے وہی خطۂ ارض جو ہے وہ مستقر ہے اور اگر لائن سے ذرا آگے چلیے تو ایک نئی زمین شروع ہوتی ہے اور وہاں کے انسان کے لیے مستقر وہی ہے۔ گویا اس طرح سے تقسیم کیا ہے۔ تقسیم تو زمین کو کیا ہے لیکن درحقیقت انسانوں کو تقسیم کیا ہے۔ قرآن نے پوری نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری بنایا تھا؟ **كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً** (2:213) آج انسان کی سیاست نے' اس کی مفاد پرستیوں نے' اس عالمگیر انسانیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے:

قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

اور پھر ایک لکیر یا دائرے کے اندر بسنے والے انسان دوسرے انسانوں کے ابدی دشمن چلے آ رہے ہیں۔ My Country, right or wrong کا سوال پیدا ہو گیا ہے۔

ہجرت کا تصور

ایک بات جو میں کہہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم میں اس زمانے میں ہجرت ایک بڑی اہم چیز تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اگر کسی ایک خطۂ زمین میں حالات تم پہ تنگ آ جائیں' نا مساعد ہوں' وہاں کی زندگی گزارنا تمہارے لیے مشکل ہو جائے تو وہاں پاؤں توڑ کر مت بیٹھے رہو۔ خدا کی زمین بڑی وسیع ہے' دوسرے خطۂ ارض میں چلے جاؤ جہاں کے حالات مساعد ہوں۔ چنانچہ انبیائے کرام کے ضمن میں آپ دیکھیں گے کہ وہاں ہجرت کا مقام آتا ہے' قریب قریب ہر نبی کے سلسلے میں آتا ہے۔ جہاں وہ ہیں' وہاں حالات ناسازگار ہوتے ہیں تو وہ وہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ چلے جاتے ہیں جہاں حالات سازگار ہوں۔

خدا کی زمین کا انسانوں کے ہاتھوں ہی تنگ ہو جانے کی ایک سبق آموز مثال

عزیزانِ من! آج کا انسان تو اس لکیر سے پار قدم نہیں رکھ سکتا۔ یہ ساری پابندیاں آپ کے ہاں ہیں یعنی پاسپورٹ کی پابندیاں' ویزے کی پابندیاں' نیشنلٹی کی پابندیاں۔ اور ایک خطۂ زمین کسی کے لیے کتنا ہی اذیت ناک جہنم کیوں نہ بن جائے اگر وہ اس

---

❶ اس کے لیے دیکھیے اسی کتاب کا چوتھا باب اور ''رزق کی دوسروں کے لیے کھلا رکھنے پر اجر کی تفصیل لامنتہا ہے'' کا عنوان۔

سے نکلنے کا ارادہ کرے گا تو قرآن کہتا ہے کہ **اُعِیۡدُوۡا فِیۡهَا** (32:20) دھکا دے کے وہیں لوٹا دیا جائے گا کہ تم اس جہنم سے نکل کر کہیں نہیں جا سکتے۔ قرآنِ کریم نے ایک واقعہ میں اذیت کی شدید ترین شکل یہ کہی تھی کہ اس پر زمین تنگ ہوگئی۔ اب ہر خطۂ زمین میں بسنے والے انسان کے اوپر زمین تنگ ہوگئی ہے۔ کوئی دس سال ادھر کا ذکر ہے' **1970**ء کی بات ہے کہ یوگنڈا یا کینیا افریقہ وغیرہ کی جو ریاستیں تھیں وہاں نئے قوانین بنے تھے اور وہ جو وہاں کے غیر ملکی تھے یعنی ہندوستانی بھی بہت گئے ہوئے تھے اور پاکستانی بھی وہاں بہت تھے تو ان پر عرصۂ حیات تنگ ہوگیا۔ یوں تو معلوم نہیں کہ وہاں کے ہر ایک پر کیا گزرتی ہوگی۔ ایک واقعہ ایسا تھا' جس نے انگلستان میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ وہاں کی زندگی سے تنگ آ کر ایک ہندوستانی لڑکی کسی طرح سے چوری چھپے' ایک جہاز میں بیٹھ گئی جو انگلینڈ آتا تھا۔ جب وہ انگلینڈ کے ائرپورٹ پر پہنچی ہے تو وہاں اسے روک دیا کہ تمہارے پاس تو ویزا نہیں ہے' تم قانوناً نہیں آ سکتیں' ملک میں داخل نہیں ہوسکتیں۔ زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہاں سے وہ لڑکی کسی اور جہاز میں کہیں بیٹھی' نو دن وہ اسی طرح سے مختلف ملکوں کے جہازوں میں جاتی رہی' ہر ائرپورٹ کے اوپر اس کو دھکا دے کر لوٹایا گیا۔ اس میں لکھا یہ تھا کہ اس سارے دوران میں اس نے ستر ہزار میل کا فاصلہ طے کیا۔ واپس پھر وہیں کینیا جانا پڑا اور انہوں نے قید کر لیا۔ ہندوستان کے اخباروں نے اس کے اوپر بہت کچھ لکھا تھا کہ تمہاری کالونیز ہیں' تمہاری آبادیاں ہیں' وہاں کے لوگ وہاں کے مظالم سے تنگ آ کر تمہارے ہاں پناہ لینے کے لیے آتے ہیں اور تم بھی ان کے اوپر راستے مسدود کرتے ہو۔ ان کے ہاں پارلیمنٹ میں بھی شور مچا تھا کہ ان Rules (قواعد) میں کوئی ترمیم کرو کہ کوئی پناہ لینے والا انسان کہیں آئے تو اس کو تو پناہ ملنی چاہیے لیکن اس کی بڑی سخت مخالفت ہوئی۔ Rules (قواعد) میں اس قسم کی Relaxation (رعایت) نہیں کی گئی۔ اس کا آخری بیان تھا کہ مجھے آٹھ دن ہوگئے ہیں کہیں سے کوئی ڈبل روٹی کا ٹکڑا ملتا ہے تو میں کھا لیتی ہوں' میں آٹھ دن سو نہیں سکی کہ رات کو سونے کے لیے بستر نہیں تھا' یہ ساڑھی جو پہن کے چلی تھی وہ اس وقت تک میرے بدن کے اوپر ہے اور کیفیت یہ ہے کہ دنیا کا کوئی ملک مجھے اپنے اندر نہیں آنے دیتا۔ اور وہاں کے مظالم کی جو وہ داستان سناتی تھی کہ خودکشی کر لینا منظور ہے لیکن وہاں نہیں جا سکتی۔

ربِ کریم نے انسانی اختیارات کو وسیع تر کرنے کے لیے کرہ ارض کو مستقر بنایا تھا

کہا کہ **كُلَّمَآ اَرَادُوۡۤا اَنۡ يَّخۡرُجُوۡا مِنۡهَآ اُعِيۡدُوۡا فِيۡهَا** (32:20)۔ میں نے اسی آیت کے تابع یہ کچھ لکھا تھا۔ اس

زمانے میں تو یہ ایک لڑکی کا قصہ سامنے آیا تھا اب تو یہ روز مرہ کا قصہ ہے۔ یہ ویتنام کی طرف کے جو علاقے ہیں، روز یہ قصے سننے میں آتے ہیں کہ وہاں کے لوگ وہاں کے مظالم سے تنگ آ کر چوری چھپے بھاگتے ہیں، کشتیوں میں سوار ہوتے ہیں، وہ کشتیاں کسی بندرگاہ پہ جاتی ہیں تو کسی بھی بندرگاہ کے اوپر ان کو اترنے نہیں دیا جاتا۔ اور بعض مقامات میں تو ان کی کشتیوں کو سمندر میں ڈبو دیا جاتا ہے۔ کئی کئی دن وہ لوگ سمندر میں کشتیوں میں ہزاروں کی تعداد میں رہے۔ وہ ملک قبول نہیں کرتا، یہ ملک قبول نہیں کرتا، فلاں ملک نے کہا ہے کہ ہم تو اس میں سے بیس آدمی لے سکتے ہیں، کسی نے کہا کہ سو لے سکتے ہیں۔ نوعِ انسانی کے لیے، بنی آدم کے لیے کرۂ ارض مستقر بتایا گیا تھا۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ مارے مارے پھر رہے ہیں تاکہ کوئی ایسا خطۂ زمین مل جائے جہاں ہمیں پناہ ملے۔ ان کو یا تو ڈبو دیا جاتا تھا اور یا اس کے بعد دھکیل کے وہیں واپس اسی ملک کے اندر بھیجا جاتا ہے۔ کسی ایک جگہ کے ستائے ہوئے انسان کو آج دنیا میں کسی انسانوں کی بستی میں پناہ نہیں مل سکتی۔

انسان کی اس میکاوَلی سیاست نے پوری دنیا کو ایک وسیع جہنم میں تبدیل کر رکھا ہے

عزیزانِ من! اس سے زیادہ دردانگیز کوئی اور نقشہ بھی ہوگا جو قرآن نے کہا ہے کہ **كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا (32:20)** انسان اپنے ہاتھوں سے اس کرۂ ارض کو اس قسم کی جہنم بنالے گا کہ وہاں کیفیت یہ ہو جائے گی۔ اور آج ہر انسان کی یہاں یہ کیفیت ہے، کوئی شخص بھی اپنے ملک سے ان حدود و قیود کو توڑتے ہوئے نکل نہیں سکتا۔ جو مظالم اس کے اوپر گزر رہے اس سے مفر نہیں ہے، کہیں جا ہی نہیں سکتا۔ میں تو جب یہ خبریں پڑھتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں کہ یا اللہ! تیرے ان انسانوں کے اوپر بیت کیا رہی ہے جن کے لیے تو نے الارض کو مستقر کہا تھا۔ اور ارض کو واسعۃ کہا تھا کہ یہ زمین بڑی وسیع ہے۔ اس زمانے میں یہ زمین وسیع ہوگی کہ ابھی اس میکاوَلی سیاست کی گرہیں اس قدر مضبوط نہیں ہوئی تھیں، جغرافیائی Territory (علاقہ) کے ماتحت ابھی حصے نہیں بانٹے گئے تھے اور اگر مملکتیں قائم بھی تھیں تو ان میں یہ قیود اور یہ پابندیاں نہیں تھیں کہ ایک مملکت کا انسان دوسری جگہ جا ہی نہیں سکتا۔ یہ تو قرآن تھا جس نے سب سے پہلے یہ اعلان کیا تھا کہ **وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (3:96)** تمام نوعِ انسانی کے لیے یہ خطۂ زمین ایسا ہے جہاں ہمارا نظام قائم ہوگا جو اس میں آ جائے گا اس کو امن نصیب ہو جائے گا۔ یہ اس زمانے کا اعلان تھا کہ کوئی تو خطۂ زمین ایسا ہو کہ اس میں جو داخل ہو جائے اس کو امن مل جائے۔ بات تو بہت آگے بڑھے گی۔ ہم، آپ، میں، سب کو معلوم ہے کہ یہ تو کسی ایک لڑکی، رنجن دیوی،

کا قصہ نہیں بلکہ بڑی بڑی ہستیاں دنیا کے اندر ماری ماری پھرتی ہیں' مگر انہیں اس کرۂ زمین پر کہیں ایک دن کے لیے پناہ گاہ نہیں ملتی۔قرآن کہتا ہے کہ **كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَ قِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (32:20)** کیفیت یہ ہوگی کہ تم اس کی تکذیب کرتے تھے کہ ہم جو غلط نظام بنا رہے ہیں اس کے نتیجے میں کوئی عذاب نہیں ہوگا' کوئی سزا نہیں ہوگی' کسی قسم کی اذیت نہیں ہوگی' تکلیف نہیں ہوگی۔مگر آج اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے زنداں میں تم اس طرح سے گرفتار ہو :

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیار

(اقبال:ضرب کلیم)

جنتی معاشرے میں کسی مجرم کو ذلیل نہیں کیا جائے گا تاکہ اس کی انسانیت پامال نہ ہو

یہ ثوابت اور سیار ستارے ہوتے ہیں' بعض اپنے مقام پہ جمے ہوئے ہوتے ہیں ہلتے نہیں ہیں جیسے کہتے ہیں کہ قطب ستارہ ہوتا ہے اور بعض سیارے ہوتے ہیں جو ادھر سے اُدھر چلتے رہتے ہیں۔افرنگ یعنی مغرب والوں کو انہوں نے سیار کہا اور خاور کہا' مشرق والوں کو ثوابت کہا ہے کہ یہاں جمود ہے وہاں حرکت ہے۔وہ کہتا ہے کہ جمود والے ملک ہوں یا حرکت والے ملک ہوں' سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں محبوس ہیں۔کسی اور نے ان کو قید نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے آپ کے لیے قید خانے بنا رکھے ہیں۔ ہر ملک کا ایک قید خانہ ہے جس کے بارڈر کو آپ کراس نہیں کر سکتے۔سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس: **كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَ قِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (32:20)**۔

عزیزانِ من! جنت کی زندگی اس کرۂ ارض کے اوپر تو یہ نظامِ خداوندی ہے جو قرآن کی رو سے ہوتا ہے۔وہاں انسانوں کی تفریق ان لائنوں کی بنا پہ' ان لکیروں کی بنا پہ' نہیں کی جائے گی' لکیریں کھینچی ہی نہیں دی جائیں گی۔کرۂ ارض ہوگا اور بنی آدم ہوگا۔ وہاں تفریق تو ایک ہی ہوگی کہ شریف انسان کون ہے اور بدمعاش انسان کون۔جسے ہم بدمعاش یا مجرم کہتے ہیں اس کی بھی کیفیت یہ نہیں ہوگی کہ اس کو ذلیل وخوار کیا جائے گا بلکہ اس کی ذہنیت کا علاج کیا جائے گا کہ جس کی وجہ سے وہ جرم پہ آمادہ ہوجاتا ہے یا جرم کرتا ہے لیکن

انسان ہونے کی حیثیت سے وہ ہوگا جو قرآن نے کہا ہے کہ **لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70)** ہر انسان انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہے۔ مجرم کی انسانیت بھی واجب التکریم ہوتی ہے البتہ اس کا جو جرم ہے وہ سزا کا' مواخذے کا' طالب ہوتا ہے۔ جیسے انسان جب بیمار ہوتا ہے تو انسان تو وہ رہتا ہے وہ ایک بیماری ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کو درد ہو رہا ہے' دکھ ہو رہا ہے' تکلیف ہے' اذیت ہے' کمزور ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ انسان ہوتا ہے۔ قرآن کسی انسان سے اس کی انسانیت کو نہیں چھینتا۔ یہ لباس نہیں ہے کہ ایک اتارا اور دوسرا پہن لیا۔

دنیا بھر کے ستم ظریف انسانوں کے لیے قرآنی نظام کی طرف سے اعلانِ ضمانت

انسان بنی آدم ہے' بنی آدم رہتا ہے اور واجب التکریم رہتا ہے۔ کرۂ ارض پر پھر وہ لکیریں نہیں کھینچے دیتا۔ وہاں جو اس نے اس زمانے میں اعلان حریمِ کعبہ کے متعلق کہا تھا تو یہ اصل میں کعبے کی بات نہیں تھی بلکہ جو اسلامی نظام قائم ہوا تھا' اس نظام کا اعلان تھا کہ جو شخص بھی اس نظام کے تحت پناہ لینے کو آ جائے گا' اسے امن مل جائے گا۔ یہ انسانیت کے لیے کتنی بڑی ضمانت ہے۔ دنیا بھر کا ستایا ہوا انسان' جسے یہ کہا جائے کہ اگر تم یہاں آ جاؤ تو تمہیں یہاں پناہ مل جائے گی۔ امن مل جائے گا' کتنی بڑی ضمانت ہے۔ یہ اس نظام کی پہلی خصوصیت ہوگی جو خدا کے بتائے ہوئے اقدار کے مطابق کہیں قائم ہوگا۔

ابتدائی طور پر بیماری کی شکل میں درد کے چھوٹے چھوٹے جھٹکے بھی ایک رحمت ہے

اُن سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ سزا جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔ یہ بھی تمہارے اپنے اعمال کے نتیجے میں ہی ہے۔ بیماری جو آتی ہے تو وہ باہر سے کسی کے چپت مارنے سے نہیں آتی بلکہ وہ خود ہی اپنی بد پرہیزی سے آتی ہے۔ یہاں عجیب بات کہی ہے۔ کہا ہے کہ **وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (32:21)** قوموں کی زندگی کے اندر ہمارا یہ قانون نہیں ہے کہ کسی نے پہلی دفعہ بد پرہیزی کی ہو تو اس پہ موت وارد ہو جائے۔ یہ قومیں یا افراد بھی جو بد پرہیزیاں کرتے ہیں تو اس میں پہلے تھوڑا تھوڑا کہیں درد ہوتا ہے' نزلہ ہو جاتا ہے' زکام ہو جاتا ہے' کھانسی آتی ہے' پھر ہلکی سی حرارت بھی ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان بد پرہیزیوں کے نتیجے میں یہ چھوٹی چھوٹی تکلیفیں بھی آتی ہیں۔ پہلے تو یہ چھوٹی چھوٹی آتی ہیں اس لیے کہ **لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (32:21)** یہ اس بد پرہیزی سے باز آ جائیں۔ یہ خود ڈاکٹروں کی یا طب کی تشخیص کے مطابق بھی انہوں نے کہا ہے کہ یہ جو درد ہے یہ تو

بہت بڑا Message (پیغام) ہے' یہ خدا کی طرف سے رحمت ہے۔ ورد نہ ہو تو انسان کبھی محسوس ہی نہ کرے کہ میرے اندر کوئی چیز بگڑ گئی ہے' نہ ہمیں ڈاکٹروں کو پتہ چلے کہ اس کو ہوا کیا ہے۔ یہ تو بہت بڑی Indication (علامت) ہے' بہت بڑی Warning (تنبیہ) ہے۔ اسے قرآن نے **الْعَذَابِ الْاَدْنٰی** (32:21) کہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی سی تکلیفیں ہم دیتے ہیں تا کہ تم اس سے متنبہ ہو جاؤ کہ واقعی کوئی غلط روش ہم نے اختیار کی ہے' غلطی ہوگئی ہے' بد پرہیزی ہوگئی جس کی وجہ سے صحت پہ اثر پڑا ہے۔ **لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ** (32:21) تا کہ یہ واپس وہاں سے لوٹ آئیں اور صحیح راستے پہ آ جائیں۔

قوموں کی زندگی میں بھی پہلے ہی جھٹکے سے قوم کو تباہ نہیں کر دیا جاتا بلکہ ان کو یہ چھوٹی چھوٹی وارننگ دی جاتی ہیں کہ اب بھی باز آ جاؤ' اب بھی صحیح روش اختیار کرو۔ جب وہ نہیں سنتیں اور اپنی غلط روش میں بڑھتی چلی جاتی ہیں تو پھر وہ آخری جہنم آ جاتا ہے جہاں سے پھر نکل نہیں سکتا۔ کہا کہ **وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ** (32:22) انہیں تو چھوڑ دیجیے کہ جن تک خدا کی یہ ہدایات' اس کے قوانین' اس کی تعلیم' اس کا پیغام پہنچا ہی نہیں ہے' وہ لوگ تو حیوانی سطح پہ ہوتے ہیں۔ کہا ہے کہ یہ لوگ جن تک یہ پیغام پہنچ جائے' وارننگ دیدی جائے' بات بتا دی جائے' واضح کر دیا جائے کہ یہ یہ چیزیں تمہارے لیے مضرِ صحت ہیں اور اس کے باوجود **ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا** (32:22) وہ اعراض برتیں۔ عزیزانِ من! آپ سن رہے ہیں یا سوچ رہے ہیں کہ یہ کن لوگوں کی بات ہو رہی ہے؟ یہ تو امتِ مسلمہ کی بات ہو رہی ہے' جن کے سامنے یہ قوانین آ گئے' ان کو سنا دیا اور وہ وارث قرار دیدے۔ **ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا** (32:22) پھر انہوں نے اعراض برتا۔ یہ وہ قوم ہے جس کے کہا ہے کہ **اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ** (32:22) یہ وہ مجرم ہیں' آگے **مُنْتَقِمُوْنَ** (32:22) کہا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ہم ان سے انتقام لیتے ہیں۔ یہ غور طلب نکتہ ہے کہ آیا خدا کے متعلق انتقام لینے کا تصور صحیح بھی ہے؟

خدا تعالیٰ کی ذات کے متعلق انتقام لینے کا تصور صحیح نہیں ہے

اس ترجمے سے خدا کے متعلق کچھ اچھا Impression (تاثر) قائم نہیں ہوتا۔ انتقام کا لفظ ہمارے ہاں برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے' انتقام میں انسانی جذبات ہوتے ہیں جس کے اندر کچھ ذاتی بدلہ لینا ہوتا ہے۔ انتقام وہی لیتا ہے کہ کسی نے کسی کو اذیت پہنچائی ہو اور وہ اس کا ذاتی بدلہ لے۔ اگر یہ کہا جائے کہ خدا پھر ان سے انتقام لیتا ہے تو اس کی رو سے تو واضح ہو جائے گا کہ خدا کو کچھ

نقصان پہنچایا تھا اور اس کے بعد پھر وہ کہتا تھا کہ اچھا ''ساڈے محلے وی تے آئیں گا کدی''[1] ۔ (معاذ اللہ) یہاں تو خدا کا بس نہیں چلتا اور جب وہ مر جاتا ہے تو پھر اس کے محلے میں جاتا ہے تو پھر وہ قبر سے ہی عذاب کو شروع کر دیتا ہے۔ اور پھر جیسا میں نے عذاب کے متعلق کہا ہے کہ مولوی صاحبان جس طرح'' کچی چپیاں وٹ کے دسدے[2] نیں'' وہ انتقام کا صحیح جذبہ ہوتا ہے' وہ خود اپنے سامعین سے انتقام لے رہے ہوتے ہیں۔ ''او ساہڈے کولوں انتقام لیندے نیں تے اونوں کہندے نیں کہ اللہ میاں اے کرن ڈیا ہیگا''[3] ۔ خدا اور انتقام (معاذ اللہ)۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کے مطابق انتقام کا صحیح مفہوم

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم کے ان ترجموں نے' اور تو اور رہا' خدا کا تصور بھی ہمارے ذہنوں کے اندر بڑا غلط سا کیا ہوا ہے۔ یہ ڈکٹیٹر کا تصور ہے' جابر کا ہے' مستبد کا ہے' پھر انتقام لینے والے کا ہے۔ بنیادی طور پہ یہ لفظ ہے کہ یہ مویشی چرانے والے یا بھیڑیں چرانے والے جو ہیں' ان کو کہیں آپ نے دیکھا ہوگا۔ یہ بھیڑ بکریوں کا چرانا بڑا ہی دشوار گزار مرحلہ ہوتا ہے' ایک کو ادھر لائیے' دو اُدھر کو نکل جاتی ہیں۔ اُس گڈریئے کی حالت پہ رحم آتا ہے کہ وہ بکریاں اگر دن میں پچاس میل چلتی ہیں تو اس کو سو میل بھاگنا پڑتا ہے۔ وہ کرتا یہ ہے کہ وہ جو اُدھر بھاگتی ہے اس کو پھر ادھر لاتا ہے' ادھر بھاگتی ہے تو پھر اُدھر صحیح راستے پہ لاتا ہے۔ عزیزانِ من! عربی زبان میں یہ جو اس طرح سے راہ گم کردہ یا سرکش بھیڑ بکریوں کو دوبارہ صحیح راستے پہ لاتا ہے' اسے انتقام کہتے ہیں۔ اب جو خدا نے کہا کہ ہم منتقم ہیں کہ یہ جو کچھ کرتے ہیں جسے تم دیکھتے ہو کہ کچھ تھوڑی تھوڑی سی سزائیں کہتے ہو' یہ سزا کا سوال نہیں ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ یہ جو صحیح راستہ درمیان کا ہوتا ہے' اس کو چھوڑ کر جو کچھ ادھر نکل جاتی ہیں تو ان کو گھیر کر ہم ادھر لاتے ہیں' پھر جو ادھر نکل جاتے ہیں تو پھر ہم ادھر لاتے ہیں کہ درمیانے راستے میں چلیں' تو وہ خطرے سے محفوظ رہ جائیں۔ یہ سارا کچھ جو ہے ہم اس لیے کرتے ہیں۔ مجرم اسے کہا جو اس صحیح راستے کو چھوڑ کر دوسری طرف نکل جائے اور انتقام یہ ہے کہ اس کو گھیر کے وہاں صحیح راستے کر اوپر باقی ریوڑ کے ساتھ ملا دیا جائے۔ کہا کہ ہمارا یہ پروسیس

---

[1] پھر ہمارے محلے میں بھی تو کبھی آؤ گے (وہاں تم سے نپٹ لیں گے)۔

[2] غصے میں غرّاتے ہوئے' لال پیلے ہو کر' ناک بھویں چڑھاتے ہوئے' بتاتے ہیں۔

[3] وہ ہم سے انتقام لیتے ہیں مگر اسے کہتے یہ ہیں کہ یہ کچھ اللہ میاں کر رہا ہے۔

اس لیے ہے لیکن جو بکری خود ہی دوڑ کر جنگل میں چلی جائے اور بھیڑیا اس کو کھا جائے تو پھر اس کو کیا کیا جائے۔ **مُنۡتَقِمُوۡنَ (32:22)** اور قرآن فوراً اس کی تاریخی شہادت پیش کر دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ **وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ فَلَا تَکُنۡ فِیۡ مِرۡیَۃٍ مِّنۡ لِّقَآئِہٖ وَ جَعَلۡنٰہُ ہُدًی لِّبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ (32:23)**۔ یہ نئی بات نہیں جو ہم کہہ رہے ہیں۔

تاریخی لحاظ سے قرآن حکیم کا انداز بیان

قرآن کا انداز یہ ہے کہ جب بھی کوئی واضح ہدایت دیتا ہے' جب بھی وہ کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ صحیح روش کا یہ نتیجہ نکلے گا' غلط روش کا یہ انجام ہوگا تو وہ فوراً تاریخی شہادت پیش کرتا ہے۔ اور تاریخی شہادت میں وہاں جہاں قرآن کا نزول ہوا' وہاں یہ قریب ترین یہودی یعنی بنی اسرائیل تھے' ان کی داستان بڑی عبرت آموز تھی' کہاں شوکتِ داؤدیؑ اور سطوتِ سلیمانیؑ اور کہاں یہ Wandering Jews' یعنی دنیا میں کہیں ٹھکانہ ہی بیچاروں کا نہیں تھا' چھت ہی نہیں ملتی تھی' خانہ بدوش تھے' قرآن ان کی مثال ہمیشہ دیتا تھا کہ دیکھو تو سہی۔ یا عاد و ثمود کی بستیوں کی مثال دیتا تھا کہ حجاز اور عرب کے قریب ترین تھیں۔ کہا کہ اس سے پیشتر موسیٰؑ کو بھی ہم نے ضابطہء ہدایت دیا تھا' بنی اسرائیل کی طرف وہ ضابطۂ ہدایت آیا تھا۔ اس میں بھی یہی کہا تھا' ساری تعلیم کی لم یہی ہے۔

خدا سے ملاقات کا قرآنی مفہوم اور ذکر سے مراد

کہا کہ **فَلَا تَکُنۡ فِیۡ مِرۡیَۃٍ مِّنۡ لِّقَآئِہٖ (32:23)**۔ وہ جو میں نے کہا ہے کہ ترجمے میں یہ بات آتی ہے کہ خدا کے ساتھ تمہاری ملاقات ہوگی اس پہ تم شک نہ کرو۔ یہ ملاقات کا سوال نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ قانونِ خداوندی کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ کہا یہی گیا تھا کہ تمہیں قانونِ مکافاتِ عمل کا سامنا کرنا پڑے گا' اس کو نظر انداز نہ کرو۔ یہ جسے خدا کا ذکر کہتے ہیں' اس کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ قانون کو ہر وقت اپنے سامنے رکھو۔ ''تے اک ایہہ جیہڑا ہُو' حق ہوندا ہیگا اے کہ نہ آپ سوندے نیں' تے نہ لوکاں نوں سون دیندے نیں''❶۔ کہا یہ کہ تم اس چیز کی تکذیب نہ کرو' اس میں شبہ نہ کرو کہ جو قانونِ مکافاتِ عمل ہے وہ ایک زندہ حقیقت ہے' اس میں شبہ ہی نہ کرو۔ یہی بات بنی اسرائیل سے کہی گئی تھی۔

---

❶ ایک یہ جو ''ہوحق'' ہوتا ہے' وہ کرنے والے نہ خود سوتے ہیں نہ لوگوں کو سونے دیتے ہیں۔

اقتصادیات پر یہودی اور بنیا کا قبضہ اور ان کے قبضے میں مسلمان کی جان

وہاں مسلمانوں کے شدید ترین مخالف یہ یہودی تھے۔ نہ ان کی سلطنت تھی' نہ مملکت تھی' نہ قوت تھی اور نہ رہنے کا ٹھکانہ تھا۔ اب سوال ہوگا کہ پھر مخالفت کس بات کی تھی؟ شروع سے ہی یہ جسے **Jews** (یہودی) کہتے ہیں یہ ہر قوم کی اقتصادیات اپنے ہاتھ میں رکھ لیتے تھے۔ مدینے میں یہ یہودی بستے تھے اور لوگوں کی جو معاشی زندگی تھی' وہ ساری یہودیوں کے ہاتھ میں تھی۔ مار پڑتی تھی' جوتیاں کھاتے تھے' نکالے جاتے تھے لیکن ان کے پاس یہ ایک ایسی تکنیک تھی' اور یہ تکنیک یہاں تو ہماری سمجھ میں نہیں آتی' کم از کم ہم یا میں تو تقسیم سے پہلے گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ہمارے ہاں بھی یہ جو **Jews** یا یہودی ہیں' یہ بنیا کی شکل میں ہوتے تھے' یہ ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں۔ سارے گاؤں میں ایک بنیا دوکاندار ہوتا تھا' اسے لالہ جی کہتے تھے۔ قومی اعتبار سے مسلمان ان کو کہیں اپنی خاطر میں نہیں لاتے تھے' ان کو ''ہندو کراڑ'' کہتے تھے' ان کو ذلت سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ مقابلے میں کبھی سامنے نہیں آتے تھے۔ وہ اتنے بڑے گاؤں میں جہاں اتنے اتنے بڑے طرّے باز بستے تھے وہاں ایک لالہ ہوتا تھا اور اتنی سی کٹیا (**Cottage**) میں اس کی دوکان ہوتی تھی۔ اس کی دوکان نام کے لیے ہوتی تھی۔ سارے گاؤں کے جو چھوٹے اور بڑے تھے' اس کے ہاتھ میں ان کی جان تھی۔ یہ وہی ہے' جو اقبالؒ (**1877-1938**ء) نے کہا تھا کہ

فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے

تو فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں تھی۔ یہ مسلمان بیچارے کیا تھے؟ کچھ بھی نہیں۔ ایک لالہ کے ہاتھ میں سارے گاؤں کی جان تھی۔ ساری زمینیں اس کے پاس یوں تو گروی ہوتی تھیں اور ویسے وہ ان زمینوں کا مالک ہوتا تھا۔ اس ریوینیو کے رجسٹر میں اس لالہ کا نام بھی کہیں نہیں ہوتا تھا اور گاؤں بھر کی زمینوں کا مالک بنا ہوا ہوتا تھا۔ بس کسی ایک نے دس روپے دیئے' سمجھ لیجیے کہ پشتوں تک پنجۂ یہود کے اندر اس کی رگِ جاں آجاتی تھی۔ یہ کیفیت تھی۔ مخالفت اتنی تھی لیکن قرآن کی کشادہ ظرفی دیکھیے' اس نے کئی مقامات میں کہا ہے کہ اس قوم کے اندر اچھے افراد بھی ہوتے تھے جنہوں نے اس ہدایت پر جو ہم نے موسیٰؑ کو دی تھی کی پیروی کی' ان کی کیفیت یہ تھی کہ **وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ (32:24)** انہوں نے مصیبتیں جھیلیں' مشقتیں اٹھائیں' استقامت سے کام لیا' اس ہدایت پر چلے تو **جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً (32:24)** ہم نے ان کو امام بنادیا۔

لفظ امام کا حقیقی مفہوم

ائمــہ امام کی جمع ہے' امام لیڈر کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔کہا کہ ہم نے ان کواور قوموں کا بھی امام بنا دیا' لیڈر بنا دیا۔ عزیزانِ من! وہی بات پھر دہراتا ہوں کہ اس قوم کی زبان کے اوپر بھی جایئے اور ذہنیت کے اوپر بھی جایئے اور پھر یہ دیکھیے کہ ان کے نزدیک امام کا تصور کیا تھا' خصوصیت کیا تھی۔ یہ لفظ تو صبح سے شام تک ہم سینکڑوں بار بولتے ہیں اس لیے کہ امام تو ہمارے ہاں وہ امام مسجد ہی رہ گیا ہے۔باہر امام کا لفظ لیڈر کے معنوں میں آتا ہے' ہمارے ہاں تو استعمال نہیں ہوتا' وہاں ہوتا ہے۔کوئی بھی جو لیڈ کرتا ہے یا لیڈر میں جو بھی چیزیں ہیں ان کو ذہن میں رکھیے کہ اس قوم کے نزدیک یہ لیڈر تھا اس کی خصوصیت یا اس کا مقام کیا تھا۔امام کا لفظ بھی جو ام سے ہے ام کے معنی ماں ہیں کہ جس کا تعلق رعایا کے ساتھ' ماں جیسا ہو' وہ لیڈر ہوسکتا ہے۔کیا قوم تھی! دنیا میں جاہل ترین خطہ اس کو گنا جاتا ہے۔کوئی حکومت وہاں قائم نہیں ہوئی تھی' کوئی مملکت نہیں تھی' کوئی تہذیب نہیں تھی' تعلیم نہیں تھی' خواندگی تک کی بھی کیفیت یہ تھی کہ مکہ میں نزولِ قرآن کے وقت سترہ آدمی تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔عزیزانِ من! آپ دیکھیے کہ اس قوم کے اندر لیڈر کا تصور کیا ہے ۔آج اگر یہ تصور یعنی صرف لفظِ امام جو ہے' وہ اپنے حقیقی معنوں کے اندر عام ہوجائے تو دنیا جنت بن جائے۔ جسے آپ لیڈر کہتے ہیں' امام کہتے ہیں' وہ ماں کا درجہ رکھتا ہو۔ٹھیک ہے امام لیڈ بھی کرتا ہے' جیسے ماں بچے کو لیڈ کرتی ہے۔سارا کچھ بچے کو سمجھاتی ہے' سکھاتی ہے' تربیت دیتی ہے' تعلیم دیتی ہے' سیدھے راستے کا بتاتی ہے' آگ سے بچاتی ہے' ڈوبنے سے بچاتی ہے' مرچوں سے بچاتی ہے۔یہ سارا کچھ وہ کرتی ہے لیکن جلاد کی طرح نہیں کرتی بلکہ ماں کی طرح کرتی ہے۔پھر وہ اس کی پرورش کرتی ہے' نشوونما کرتی ہے' دعائیں دیتی ہے' خوبصورت بچہ ہوتا ہے تو ماتھے پہ تھوڑا سا سرمہ لگاتی ہے کہ کسی کی نظر نہ لگ جائے۔یہ ہے امام۔یہ جنہیں ہم **Followers** (متبعین) کہیں گے تو یہ امت کا لفظ بھی انہوں نے ماں سے لیا ہے اور اس میں سے جو امام بنتا ہے وہ بھی ماں سے لیا ہے۔ایک ہی مادہ سے وہ یہ الفاظ بناتے چلے جاتے ہیں۔اور پھر قرآن کا انتخاب ہے۔قرآن نے یہ زبان منتخب کی اور یہ صحیح ہے کہ اس زبان کے سوا کسی زبان میں بھی یہ حقائق نہیں آسکتے تھے۔

عزیزانِ من! وہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن کو سمجھنا ہے تو پہلے قرآن کے ان الفاظ کے معنی عربی زبان کے مادے کے اعتبار سے دیکھیے تو سارا قرآن سمجھ میں آجاتا ہے۔سوچیے تو سہی کہ اگر امام کے معنی ان کی زبان کے اعتبار سے دیدیئے جائیں اور جہاں جہاں

قرآن نے اس کو استعمال کیا ہے وہاں دیکھا جائے تو لیڈر کی کتنی خصوصیات ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ لیڈر کی خصوصیات نہیں بلکہ اس پورے نظام کی خصوصیات جس میں اس قسم کا لیڈر ہوگا۔ وہ کس طرح سے لیڈر بن گئے تھے؟ اس کے لیے کہا کہ پہلی شرط یہ ہے کہ **كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ** (32:24)۔ اس کو ہمارے ان قوانین کی اہمیت کا یقین محکم ہو۔ یہی نہ ہو کہ وہ کہیں کسی کتاب میں لکھا ہے اور وہ اس کو Mechanically (میکانکی طور پر) Objectively (معروضی انداز سے) نافذ کر رہا ہے یا Introduce کر رہا ہے۔ پہلے تو ان کی محکمیت پر خود یقینِ محکم ہو، پھر اس یقینِ محکم کے بعد اسے نافذ کرے یعنی اسے بچے کی پرورش، اس کی نشوونما کے متعلق قوانین قواعد کی محکمیت پر یقینِ کامل ہو، پھر وہ ماں بنے، پھر ماں بن کر وہ ان بچوں کی پرورش تربیت تعلیم نشوونما کرے، ان کو سیدھے راستے پہ چلائے، ان کو خطرات سے بچائے۔ اور جب وہ بچے نشوونما پا کر اپنے فیصلے خود کرنے کے قابل ہوں تو پھر ان کے حق میں بس دعا ہی کرے۔

مسلمانوں میں باہمی اختلافات کے سلسلہ میں ایک غلط روایت کی تشہیر

آپ کے ہاں پتہ ہے کہ پھر کس طرح سے دھوکے دیئے جاتے ہیں، مقدس فریب دیئے جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے بار بار کہا ہے کہ اختلاف خدا کا عذاب ہے، روسیاہی کا موجب ہے۔ رسول اللہؑ سے فرمایا کہ جو لوگ اس میں اختلاف کریں تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے وہ جہنم کے لوگ ہیں۔ اب جب یہاں ان لوگوں سے کہا گیا کہ صاحب! یہ مولوی صاحبان جو آپس میں مختلف فرقے بنائے ہوئے ہیں اور سر پھٹول ہوتی ہے اور یہ اختلاف تو عذاب بتایا ہوا ہے، تو کہا کہ نہیں، وہ جو خدا نے کہا ہے، وہ یہودیوں کے متعلق کہا ہے۔ مسلمانوں کے متعلق تو رسول اللہؑ نے فرمایا ہے کہ میری امت کا جو اختلاف ہے، وہ رحمت ہے۔ یہ تو یہودیوں کا اختلاف ہے جو عذاب ہے۔ اور اسے حضورِ نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے بہ نصِ صریح فرقہ بندی شرک ہے۔ کہا ہے کہ **وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ** (30:31-32) دیکھنا کہیں مومن ہونے کے بعد مشرک نہ ہو جانا یعنی کہیں فرقوں میں نہ بٹ جانا۔ پھر ہر فرقے کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ **كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ** (30:32) وہ کہتا ہے کہ میں تو جنتی ہوں باقی سارے جہنمی ہیں۔ اور وہ اسی میں مگن رہتا ہے۔

صدیوں سے موجود باہمی اختلافات مٹانے کا علاج قندیلِ آسمانی کے سوا کہیں اور نہیں مل سکتا

میں بیس برس تک یہاں کہتا رہا کہ قرآن کی اس آیت کے متعلق ان لوگوں سے پوچھو جو مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں کہ کیا

جواب دیتے ہیں۔کوئی جواب نہیں تھا۔پھر درمیان میں ایک نے کان میں خناس پھونکا'اس نے کہا کہ صاحب!یہ تو فرقے ہیں ہی نہیں' یہ تو مکاتبِ فکر ہیں۔یہ دیوداس نہیں یہ تو عبدالرحمٰن ہے۔ایک مسجد کے اندر اونچی آمین کہنے والا' دوسری مسجد میں جا کر نماز پڑھ لے تو قتل تک نوبت آجاتی ہے' مسجدوں میں تالے پڑ جاتے ہیں' پولیس آجاتی ہے' مقدمے دائر ہوتے ہیں۔یہ سارا کچھ ہو رہا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ یہ تفرقہ تو ہے ہی نہیں' یہ تو فکری اختلاف ہے۔میں کہہ رہا تھا کہ قرآن نے کہا ہے کہ ان کی یہ حالت اس لیے ہوئی کہ **كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ** (32:25) ان کا جو اختلاف ہے'اب مٹائے تو مٹ نہیں سکتا کیونکہ وہ جو اختلاف مٹانے والی خدا کی کتاب تھی' وہ تو انہوں نے پسِ پشت ڈال دی' وہی اختلاف مٹا سکتی تھی کہ اپنے اپنے اعتقادات اور مسالک کو الگ کر کے کہیں کہ ہمارے درمیان سند قرآن ہے' جو یہ کہے گی ہم سب کو منظور ہے۔پھر تو اختلاف مٹ سکتا ہے اور اس پہ جو مذہب پرست طبقہ ہے' وہ خدا کی کتاب پہ کبھی نہیں آیا کرتا۔قیامت میں یہ اختلاف مٹیں گے۔اور انہوں نے کہہ دیا کہ ٹھیک ہے جی!قرآن نے خود کہہ دیا ہے کہ یہاں تو اختلاف مٹ ہی نہیں سکتے' یہاں سنی' شیعہ' وہابی' اہلحدیث' دیوبندی اور بریلوی ہیں۔قرآن نے کہا ہے کہ یہ اختلافات یہاں نہیں' قیامت میں جا کر مٹیں گے۔پوچھو کہ وہاں جا کر مٹ جائیں گے تو اس کا فائدہ کیا ہوگا۔

زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا نتیجہ اور قیامت کا مفہوم

یہاں پھر وہی چیز جو میں نے عرض کی ہے کہ یہ قیامت اور آخرت' اور یہ ساری چیزیں جتنی بھی ہیں' یہ انہوں نے وہاں آخرت پہ اٹھا رکھی ہیں کہ یہاں کی زندگی کے اوپر ان کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان چیزوں کا ہم پہ کوئی اثر ہی نہیں ہوتا کہ اس زندگی سے ان کا تعلق ہی کچھ نہیں ہے۔قرآن اس کا تعلق یہاں کی زندگی سے شروع کرتا ہے۔پھر وہی عربی زبان کا قاعدہ آ گیا۔یہ جسے آپ قیامۃ کہتے ہیں' یہ قیام سے ہے' قیام سے تو آپ سمجھتے ہیں کہ کھڑے ہو جانا ہے۔یہ اس کے آگے جو ایک ''ۃ'' لگی ہے'اس کے معنی ہوتے ہیں کہ ''یکلخت کسی چیز کا ہو جانا''۔کہا کہ تنگ ہونے کے بعد پھر یکلخت ایک انقلاب آتا ہے۔وہ وقت ہوتا ہے' جب پھر ان کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا ہے اور سارے اختلافات سیدھے ہو جاتے ہیں۔صدرِ اول کے بعد جو یہ امتِ مسلمہ بنی تو ان کے باقی قوموں کے ساتھ جتنے ٹکراؤ ہوئے ہیں یہ قیامت تھی۔ان قوموں کے لیے ایک قوم جو ان کے نزدیک سب سے زیادہ کمزور تھی' جسے وہ کسی خیال دھیان میں بھی نہیں لایا کرتے تھے' میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ایرانی عربوں کے ساتھ جنگ نہیں کرتے تھے' کہتے تھے کہ اس قوم کے ساتھ لڑائی کرنا

ہمارے لیے باعثِ ننگ ہے۔ یہ قوم جن کی کیفیت یہ تھی' یہ جو کھڑی ہوئی ہے تو یہ کوئی بتدریج ایسا نہیں ہوا کہ محسوس ہو کہ اب یوں ہو گیا بلکہ یہ قوم یکلخت کھڑی ہوئی ہے۔ ایرانیوں کو' رومنز کو' عیسائیوں کو' حیرت تھی کہ یہ قوم کس طرح سے کھڑی ہو گئی۔ یہ ان کا جو اس طرح سے کھڑا ہونا تھا' اس نے ایران میں اور عیسائیوں کے رومن ایمپائر کے اندر' قیامت برپا کر دی۔ یہ ہے وہ قیامت۔ اگلی آیت نے تو بات واضح کر دی کہ یہ وہ قیامت نہیں ہے جو یہ اگلی دنیا والی کہتے ہیں۔ کہا کیا اس سے بھی یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ قیامت کیا ہوتی ہے؟ **اَوَلَمْ یَهْدِلَهُمْ** (32:26) کیا اس سے بھی یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی جو ہم کہہ رہے ہیں؟ کہا کہ **كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ یَمْشُوْنَ فِیْ مَسٰكِنِهِمْ** (32:26) جن بستیوں میں چلتے پھرتے ہیں' کیا ان کے کھنڈرات ان کو نہیں بتا رہے کہ قیامت کیا ہوتی ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی! کہا ہے کہ **یَمْشُوْنَ فِیْ مَسٰكِنِهِمْ** (32:26) . ان کے اجڑے ہوئے مکانوں کے کھنڈرات میں یہ لوگ چلتے پھرتے رہتے ہیں۔

عزیزانِ من! یہ مرنے کے بعد والی قیامت تو نہیں ہے' قرآن تو شہادت پیش کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ **اَوَلَمْ یَهْدِلَهُمْ** (32:26) کیا اس سے بھی ان کی سمجھ میں بات نہیں آتی کہ جن قوموں کی بستیوں کے کھنڈرات میں یہ چلتے پھرتے ہیں' ان کی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ان پہ کیا قیامت گزر گئی؟ کہا کہ **اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ.** (32:26) جو ہم کہہ رہے ہیں' اس میں بات سمجھنے کے لیے بہت بڑی نشانیاں ہیں' ان کے کھنڈرات قیامت کی نشانیاں ہیں' اس قیامت کی کہ جس میں پھر اختلاف مٹا کرتے ہیں۔ لیکن کہا کہ **اَفَلَا یَسْمَعُوْنَ.** (32:26) بات تو یہ ہے کہ دل کے کانوں سے سنیں تو پھر بات سمجھ میں آتی ہے ورنہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

سلطنتِ عباسیہ کے دور میں مذہبی اختلافات کی ناگفتہ بہ حالت کے باعث ہلاکو اور چنگیز کی چڑھائی

عزیزانِ من! یہ کسی قوم کا باہمی اختلاف اور تفرقہ یا فرقہ بندی تو سخت ترین قسم کا اختلاف ہوتا ہے۔ اس سے پہلے بھی کسی قوم کے اندر جو اختلاف ہے تو وہ کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ جہنم کی زندگی ہوتی ہے کہ جس کا جی چاہے ان کے اوپر قیامت برپا کر دے' ان کے خلاف اٹھ کر کھڑا ہو جائے وہی تباہ کر دے گا۔ یہ ساری ہلاکو اور چنگیز کی جو داستانیں آپ کے سامنے ہیں' وہ اسی طرح سے ان کے خلاف اٹھ کے کھڑے ہوئے تھے۔ یہ یونہی نہیں تھے کہ یہ لوگ اچھی بھلی محکم سلطنت کے اوپر چڑھائی کر دیتے تھے۔ جب ہلاکو بغداد [1] میں

---

[1] ہلاکو خاں نے 656ھ بمطابق 1258ء میں بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی' مستعصم باللہ کو قتل کر کے سلطنت عباسیہ کا خاتمہ کر دیا۔

آئے ہیں، جس دور میں سلطنتِ عباسیہ تھی، تو اس زمانے میں ان کے اندر جو مذہبی فرقہ بندی اور اختلافات تھے اس کی تاریخ پڑھ کر دیکھیے کہ ان کی حالت کیا ہو چکی ہوئی تھی۔ ان کے بیسیوں فرقے تھے، ٹکراؤ تھا، اختلاف تھا، افتراق تھا۔ یہ سب کچھ ان کے اندر ہو چکا ہوا تھا۔ جب یہ کچھ ہوا تھا تو

جہاں باز وسمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

سلطنتِ عباسیہ (750-1258AD) کے علاوہ مغلیہ سلطنت اور مسلمانوں کی ہزار سالہ ہسٹری کا سیاہ دور مذہبی فرقہ بندی کا ہی ثمر ہے

ان کی یہ کیفیت تھی۔ خود ان کے اندر بیٹھے ہوئے ان کے وزیرِ اعظم نے وہاں ہلاکو کے ساتھ ساز باز کر کے اُسے دعوت دی تھی۔ ان کے ہاں اس قدر فرقہ بندی، اس قدر اختلافات تھے۔ آپ کے ہاں جو مغلیہ سلطنت آخر میں آ کر تباہ ہوئی ہے، جہاں بھی آپ کے ہاں کی سلطنتیں تباہ ہوئی ہیں، یہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد یہ مسلمانوں کی جو سلطنت ترکی تھی، اس میں کس قدر اختلافات، کس قدر تفرقات تھے۔ کہا کہ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ عربوں جیسی قوم، کس طرح ہمارے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی اور انہوں نے کیسے قیامت برپا کر دی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عدالت میں ہرمزان کا حقائق پر مبنی بیان

تجدیدِ یادداشت کے لیے میں پھر اس واقعہ کو دہراؤں جو ہرمزان نے حضرتِ عمرؓ (581-644/45ء) سے کہا تھا۔ عزیزانِ من! ایران جیسی مملکت کہ ہزاروں سالوں سے ان کی تہذیب کا ڈنکا بج رہا تھا، وہ قوم آدھی دنیا کی مالک تھی۔ عربوں کے ساتھ جنگ کرنا باعثِ ننگ سمجھتے تھے۔ اور اس کے بعد جب یہی عربوں کی قوم اٹھی ہے تو اس نے قیامت برپا کی ہے۔ اور چیزوں کو چھوڑیئے کہ سارا کچھ کیسے فتح کیا، ان کا جو شہنشاہ یزدگرد تھا، وہ جان بچانے کے لیے مارے مارے پھرتا تھا، بالآخر ایک رات ایک پن چکی میں جا کر اس نے پناہ لی اور پن چکی والے کو معلوم ہوا کہ یہی بادشاہ ہے، اس نے شاید اس کے دادا یا چچا وغیرہ کسی کو قید کیا ہوگا یا اس کے لباس یا چہرے مہرے سے اسے پہچان لیا ہوگا۔ اس نے پن چکی میں بادشاہ کو قتل کر دیا۔ وہاں کا گورنر، ہرمزان جب گرفتار ہو کر حضرتِ عمرؓ (581-644/45) کے سامنے آیا ہے تو حضرتِ عمرؓ نے یہ کہا کہ ہرمزان! آخری وقت میں ایک بات بتاؤ کہ تم وہ ایرانی تھے کہ ہم عربوں کے ساتھ جنگ کرنا بھی باعثِ ذلت سمجھتے تھے، یہ آج کیا ہے کہ تمہیں ہتھکڑیاں لگی ہوئی ہیں، تمہارا ملک ان عربوں نے فتح کر لیا

ہے' یا بجولاں یہاں انہی عربوں کے سامنے تم کھڑے ہو'یہ **Change** (تغیر) کیا آیا ہے؟ یہ عرب بھی کوئی اگلی نسل نہیں' وہی نسل ہیں۔ تم ایرانی بھی اگلی نسل نہیں وہی نسل ہو۔ ابھی کل ہی کی بات ہے۔ یہ فرق کیسے آ گیا؟ عزیزانِ من! وہ لوگ تھے جوان چیزوں کو پہچانتے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ عمرؓ! بات تو بڑی سادہ سی اور سیدھی سی ہے'اس میں کوئی زیادہ فلسفیانہ نکتہ داریاں نہیں ہیں۔ اس سے پہلے ایرانیوں اور عربوں کی جولڑائی ہوتی تھی تو ایک طرف ہم ایرانی ہوتے تھے اور دوسری طرف تم عرب ہوتے تھے۔ ہم یقیناً عربوں سے بالا دست تھے اور ہمیں فتح ہوتی تھی۔ اب جو ہم میدان میں آتے ہیں تو ایک طرف ایرانی تنہا ہوتا ہے' دوسری طرف عرب اور ان کے ساتھ ان کا خدا ہوتا ہے تو ان دو کا مقابلہ ہم کیا' دنیا میں کوئی قوم نہیں کرسکتی۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ یوں سمجھو کہ **اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّا نَسُوۡقُ الۡمَآءَ اِلَى الۡاَرۡضِ الۡجُرُزِ فَنُخۡرِجُ بِهٖ زَرۡعًا تَاۡكُلُ مِنۡهُ اَنۡعَامُهُمۡ وَ اَنۡفُسُهُمۡ (32:27)** ۔ دیکھتے ہو کہ یہ تمہاری بنجر زمینیں پڑی ہوئی تھیں' روئیدگی کا نشان تک نہیں ہے' گھاس کی پتی تک نہیں ہے۔ ہم پانی بھرے ہوئے بادل کہیں سے لا کر اس زمین پر برسا دیتے ہیں اور اس زمین سے لہلہاتی ہوئی کھیتیاں ابھرتی ہیں' تم بھی کھاتے ہو تمہارے مویشی بھی کھاتے ہیں۔ دیکھتے ہو کہ یہ کیسے ہوتا ہے؟ ہمارے ابرِ گوہر بار کے ایک چھینٹے سے یہ تبدیلی ہوتی ہے۔ اس قوم کو وہی آسمان کی بارش مل گئی ہے' اس بنجر سے تم دیکھو کہ کس قسم کی کھیتیاں ابھرتی ہیں۔ کیا خوب سمجھانے کا طریقہ ہے! تم یہ ناممکنات میں سے سمجھتے تھے کہ بنجر زمین میں سے کچھ ہوگا لیکن اس کا ممکن بنانا ہمارے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔ ایک ابرِ گوہر بار آتا ہے' بارش برسا دیتا ہے' وہی زمین اتنا کچھ سونا اگلنے لگ جاتی ہے۔ کہا یہ ہوتا ہے جب وہ قوم زندہ ہوتی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ

ہاتھوں سے تیرے دامنِ افلاک نہ چھوٹے

وحی کے ذریعے قرآنِ حکیم کا آخری پیغام ہی انسانیت کا آخری سہارا ہے

قرآن کہتا ہے کہ اپنا رشتہ اور تعلق بادلوں کے ساتھ قائم رکھو' پھر تمہاری زمینیں لہلہاتی کھیتیاں دیں گی۔ کہتا ہے کہ **اَفَلَا يُبۡصِرُوۡنَ (32:27)** یہ تو بصیرت سے کام لیں گے تو جب بات سمجھ میں آئے گی۔ کہا کہ **وَ يَقُوۡلُوۡنَ مَتٰى هٰذَا الۡفَتۡحُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ (32:28)** یہ کہتے ہیں کہ تم کہتے تو کئی دنوں سے چلے آ رہے ہو کہ یہ ہوگا اور وہ ہوگا۔ ہمارے ہاں فتح تو **Victory** (فتح) ہی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے' اس کا تو متبادل لفظ ہی دوسرا نہیں ہے۔ شکست کے مقابلے میں یہ لفظ ہمارے ہاں استعمال ہوتا

ہے۔ فتح کے معنی کسی دوسری قوم کے اوپر غالب آ جانا یا ان کی مملکت کو اپنے زیرنگوں کر لینا ہی نہیں ہے۔ فتح کے معنی ہوتا ہے' دروازوں کا کھل جانا۔ یہ قوم اس لفظ کو ایسے استعمال کرتی تھی کہ راستے میں جو رکاوٹیں ہوں' جو آگے نہ بڑھنے دیں' ان رکاوٹوں کا ہٹتے چلے جانا۔ یہ اس کو فتح کہتے تھے۔ یہ کسی قوم کو' ملک کو فتح کرنا نہیں ہے' ان کو مغلوب بنانا نہیں ہے بلکہ زندگی کی شاہراہ کے اوپر جو کاروانِ انسانیت چلا جا رہا ہے' اس کے راستے میں جتنے بند دروازے ہیں' ان کا کھولتے چلے جانا ہے' یہ فتح ہوتی ہے۔ کہا کہ **اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَالۡفَتۡحُ (110:1)** جب خدا کی نصرت آئے یعنی جب یہ سامنے کے دروازے کھلیں۔ **وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا (110:2)** پھر تم دیکھو کہ وہی انسانیت جس کا ہجوم پیچھے رکا ہوا تھا' وہ کس طرح سے فوج در فوج نظامِ خداوندی کی طرف چلا آ رہا ہے۔ یہ ہے فتح یعنی دروازوں کا کھل جانا۔ جو آپ ہی قید خانے میں ہوں وہ دوسروں کا دروازہ کیا کھولیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ **وَ یَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی ھٰذَا الۡفَتۡحُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (32:28)** اگر تم اپنے دعاوی میں سچے ہو تو بتاؤ کہ یہ کب ہوگا۔ کہا تم تو یہ اس طرح سے پوچھ رہے ہو اور اس کے لیے اس قدر انتظار کر رہے ہو کہ گویا وہ عید کا چاند ہے جو تمہارے لیے نکلے گا۔ پوچھتے ہو کہ ''انتیاں دا ہووے گا یا تیہاں دا ہووے گا''❶۔ کہنے لگے کہ کیا تمہیں پتہ بھی ہے کہ **قُلۡ یَوۡمَ الۡفَتۡحِ لَا یَنۡفَعُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِیۡمَانُھُمۡ وَ لَا ھُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ (32:29)** جب وہ وقت آئے گا تو یاد رکھو! اس وقت تو اگر تم یہ کہو گے کہ ہم ایمان بھی لائے ہیں تو یہ چیز بھی کوئی فائدہ نہیں دے گی اور پھر کوئی مہلت بھی نہیں ملے گی۔ وہ یوم الفتح ہے۔ اس سے پہلے سدھرنا ہے تو سدھر جاؤ' کم بختو! کیوں اس کے لیے شدت سے تقاضا کر رہے ہو کہ یوم الفتح کیوں نہیں آ رہا۔ ابھی وقت ہے پھر اُس وقت مہلت نہیں ملا کرتی' اس وقت کا تقاضا نہ کرو' اس وقت تو پھر Final Settlement (آخری تصفیہ) ہو جاتا ہے' اس سے پہلے پہلے باز آ جاؤ۔

نبی اکرمؐ کے لیے ہجرت کا حکم قوم کی تباہی کی آخری علامت تھی

عزیزانِ من! اب سورۃ السجدۃ کی آخری آیت آ گئی۔ اس پروگرام میں یہ آخری مرحلہ آتا ہے۔ حضور ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ تم نے ان کو بہت کچھ سمجھا دیا' تمہارا ہی کام تھا کہ ان کی طرف سے اتنی ایذائیں برداشت کر کے' تیرہ سال کی مکے کی زندگی میں' ہر قسم کی صعوبتیں برداشت کیں' تکلیفیں اٹھائیں۔ قلب کا اس قدر سوز و گداز تھا کہ قرآن کہتا ہے کہ ہمیں ڈر ہے کہ تو ان کے غم میں اپنی جان

---

❶ (عید کا یہ چاند) انتیس کا ہوگا یا تیس کا۔

گھلا دے گا کہ یہ تباہی سے کیوں نہیں بچتے۔ کہا کہ تم نے سب کچھ کرلیا لیکن اس کے بعد اب یہ جو پروگرام ہے' اس کی دوسری کڑی شروع ہوجائے گی' اب ان لوگوں کو چھوڑ دو: **فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ** (32:30)۔ایک وقت ایسا آ جاتا ہے اور وہ وقت تو بڑا ہی مایوس کن ہوتا ہے کہ جب ڈاکٹر کسی مریض کے سرہانے سے یہ کہہ کر اٹھ جائے کہ اب اس کی کوئی امید نہیں ہے۔ رسول کا اس قوم سے ہجرت کر جانا اس قوم کے لیے تباہی کی آخری علامت ہوتا ہے۔ کہا کہ اب ان سے اعراض برتو۔ پھر اس کے بعد انہیں کہو کہ **وَانۡتَظِرۡ اِنَّهُمۡ مُّنۡتَظِرُوۡنَ** (32:30) تم اپنا پروگرام جاری رکھو' میں تمہارے پروگرام میں مزاحم نہیں ہوتا' میں اپنا پروگرام جاری رکھونگا۔ **اِعۡمَلُوۡا عَلٰی مَكَانَتِكُمۡ اِنِّیۡ عَامِلٌ** (39:39) پروگرام کا نتیجہ فیصلہ کردے گا کہ کون سچا تھا' کون جھوٹا تھا۔ اب میں تمہارے ساتھ وقت ضائع کرنے کی بجائے پورا وقت اپنے پروگرام کی تکمیل کے لیے صرف کرونگا اور تمہیں اجازت ہے کہ تم جو جی میں آئے' کرو۔ کیا بات ہے' یہ کتنا فیئر پلے (عمدہ کھیل) ہے! جسے آپ Sports man Spirit کہتے ہیں۔ کہا کہ میرے کام میں تم دخل نہ دو' تمہارے کام میں' میں دخل نہیں دیتا۔ اپنے مشن کی سچائی کے اوپر اور اس کی نتیجہ خیزی کے اوپر اتنا یقینِ محکم ہے۔ کہا کہ کوئی بات ہی نہیں ہے۔ وہ جو تم مانگتے ہو کہ یوم الفتح کب آئے گا تو یوم الفتح تو یوں آ جائے گا' مجھے میرا کام کرنے دو اور تم اپنا کام کرو اور اس کے بعد دیکھو کہ وہ یوم الفتح کتنی جلدی آتا ہے۔ میں نے تو اس لیے اتنا عرصہ تم میں گزارا کہ کسی طرح سے تم بچ جاؤ۔ تم مرنے پہ آئے ہوئے تو ٹھیک ہے' یہ کر کے دیکھ لیجیے۔

عزیزانِ من! سورۃ السجدۃ کی آخری آیت ختم ہوئی۔ اب آگے سورۃ الاحزاب آتی ہے' اسے لیتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں
ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن
فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی
کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان
ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح
نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور
جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے' وہ میرے
ذہن کی نارسائی۔

(پرویز۔ معراجِ انسانیت)